سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

جولائی 2018

عید الفطر مبارک

نگران اعلیٰ
معراج رسول

Sarguzasht Digest July 2018

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

بسم اللہ الرحمن الرحیم
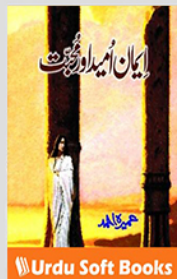
قارئین کرام!

السلام علیکم!

اور عید بھی گزر گئی۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہم سب خوب لٹے۔ رمضان کا مہینا توبہ واستغفار کا مہینا ہوتا ہے، اپنے گناہوں سے برأت کا مہینا ہوتا لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس مہینے ہم سب نادانستگی میں مزید گناہوں کا بوجھ خود پر لاد لیتے ہیں۔ مہنگائی کا طوفان جس شدت سے آتا ہے اور اس مہنگائی سے نمٹنے کے لیے ہم سب مزید گناہوں کے بوجھ تلے دبتے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کی خواہشوں کو پوری کرنے کے لیے کہاں کہاں سے انتظام کرتے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں دیگر ممالک میں خاص کر یورپ امریکا میں مذہبی تہواروں پر اشیائے ضرورت کی قیمتیں کم کی جاتی ہیں، حد یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ میں بڑے اسٹورز نے رمضان سے ہی مسلمانوں کے لیے رعایتی نرخوں پر خریداری کے لیے علیحدہ حلال شعبے قائم کر دیئے ہیں۔ یہ اسٹورز مسلمانوں کے نہیں، بلکہ عیسائی اور یہودی مالکان کی ملکیت ہیں، تاکہ ہر کوئی خوشیاں منا سکے لیکن ہم بالکل الٹ چلتے ہیں اور ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں۔ کیا ہمارے ہاں ایسا کوئی قانون نہیں بن سکتا کہ مہنگائی کا یہ طوفان نہ اٹھے؟

معراج رسول

جلد 28 ❖ شمارہ 06 ❖ جولائی 2018ء

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

شاعرِ پہلی بارش

ساٹ جولائی 1952ء کی رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ منٹگمری (ساہیوال) کی اس معصوم سی دوشیزہ کی زندگی میں یہ رات یادگار بن کر آئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت آہٹ ہوئی۔ وہ چونک گئی۔ اس نے گھونگٹ کی آڑ سے دیکھا۔ اسے دولہا نظر آرہے تھے۔ وہ مزید سکڑ گئی۔ دروازہ پھر بند ہوگیا' چٹخنی لگ گئی۔ آنے والا مزید نزدیک آنے لگا۔ وہ شجرالحیا بن کر مزید سٹ گئی۔ وہ اس کے مقابل تھا۔ دونوں کے لیے یہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ نو وارد نے اپنے سر سے کلاہ اتاری' سہرے کو الگ کیا اور اس یادگار لمحے کو امر بنانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ لرزتے ہاتھوں نے سرخ گھونگٹ کو الٹ دیا۔ ماہ تاباں جگمگا اٹھا۔ وہ اس حسین چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت جل اٹھی تھی' وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا تھا۔ تبھی دولہا نے ایک عجیب بات کہی۔ دلہن چونک گئی۔ شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اس نے دولہا کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اس کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔

''ہاں' تم میری دوسری بیوی ہو' میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔'' دولہا نے اپنا جملہ دہرایا۔ لمحہ بھر پہلے دلہن کا چہرہ کھلا کھلا سا تھا' اس پر سیاہی سی پھیل گئی۔ اس کے چہرے کے تغیر کو محسوس کرتے ہی دولہا سنبھل گیا اور پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا ''اپنی اس سوتن کا نام نہیں پوچھو گی؟''

دلہن خاموش رہی تو دولہا کو اس کے حال پر رحم آ گیا' اس نے شیروانی کی بڑی سی جیب سے ایک کتاب نکالی اور اس کے حنائی ہاتھوں پر رکھ دی ''یہ ہے تمہاری سوتن' میری پہلی بیوی! میں نے بہت پہلے شاعری سے شادی کرلی تھی۔ اور یہ ''برگ نے'' آج ہی مارکیٹ میں آئی ہے' ایک کاپی تمہارے لیے بھی لے آیا یعنی دوسری بیوی کی خدمت میں پہلی بیوی بطور تحفہ پیش کر رہا ہوں۔''

ایسا سنجیدہ مذاق اس کی فطرت تھی۔ اس نے زندگی کو بھی مذاق سمجھ لیا تھا۔۔۔۔ وہ ہجرت سے پہلے انبالہ کو اپنا وطن سمجھتا تھا۔ اس نے وہیں جنم لیا تھا۔ اس کے دادا سید شریف الحسن کاظمی خاندانی رئیس تھے۔ نجیب الطرفین سید تھے۔ شجرہ حضرت علیؓ سے ملتا تھا۔ امام موسیٰ کاظمؒ کی اولادوں میں سے تھے۔ ان کا شمار شہر کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ مکرپور' نصیر پور اور راج گڑھ میں ان کی لمبی چوڑی اراضی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر' کنیز باندیوں کی قطاریں تھیں۔ اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی سید شریف الحسن کو چین نہ تھا۔ وہ بھی اپنے دوستوں کی طرح ملازمت کے خواہش مند تھے۔ پھر انہیں یہ بطور انسپکٹر ملازمت مل گئی۔

شریف الحسن بڑے کروفر سے نوکری کر رہے تھے۔ انہوں نے بچوں کو بھی تعلیم کا تاج پہنایا تھا۔ سید محمد سلطان نے جب بی اے کا امتحان پاس کیا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے ملازمت کے لیے فوج کا انتخاب کیا۔ اس دور میں جب مسلمانوں میں میٹرک پاس نوجوانوں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر تھی' گریجویشن بہت بڑا اعزاز تھا۔ فوج میں انہیں بہت اچھا عہدہ مل گیا۔ انہوں نے سید محمد سلطان کی شادی بھی ایک علم پرور خاندان میں کی تھی۔ سید نیاز نبی جو انبالہ کے جانے پہچانے شاعر تھے محفل مقاصدہ کی جان تھے' کسی امام کی پیدائش کی محفل ہو یا مجلس سید الشہدا ہر جگہ انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ منبر پر پہنچتے ہی محفل پر چھا جاتے تھے۔ انہی کی لاڈلی بیٹی کنیز فاطمہ عرف کنیزہ بیگم سے سید محمد سلطان۔۔۔۔۔ کی شادی کرائی گئی تھی۔ 8 دسمبر 1925ء کو کنیزہ بیگم کی گود میں جب ناصر آئے تو سب سے زیادہ خوشی سید شریف الحسن کو ہوئی۔ انہوں نے دیگیں چڑھوائیں لیکن جب ناصر تین سال کا ہوا تو دادا کی قربت سے اسے دور کر دیا گیا۔ سید محمد سلطان کا تبادلہ پشاور ہوگیا تھا۔ پشاور کے نیشنل ہائی اسکول میں اسے داخل کر دیا گیا مگر وہ وہاں زیادہ دن پڑھ نہ سکا کیونکہ والد کا تبادلہ ڈکشائی میں ہوگیا تھا۔ ڈکشائی کے ڈی بی مڈل اسکول میں وہ پڑھ ہی رہا تھا کہ والد کا تبادلہ پھر نوشہرہ چھاؤنی ہوگیا' وہ اپنے ساتھ ناصر کو بھی لے آئے۔ سید محمد سلطان کو جو مکان الاٹ ہوا تھا وہ ریلوے لائن کے قریب تھا۔ سیٹی بجاتی' دھواں اڑاتی' چھک چھک کرتی ریل گزرتی تو وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہتا۔ اس کے صرف دو ہی شوق تھے' ریل کو دیکھنا یا پھر چھت پر چڑھ کر پورے چاند کی چاندنی سے لطف لینا' چھوٹے بچوں کے لیے چاند بے معنی ہے' اس کے حسن سے محظوظ ہونا عجوبہ ہے لیکن وہ اتنی چھوٹی سی عمر میں فطرت کے حسن کا پجاری بن چکا تھا۔

وقت کے ساتھ وہ بڑا ہوتا گیا۔ میٹرک کے بعد اسے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ ملا تھا۔ لاہور ادبی مرکز تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی شاعری کو جلا ملی۔ اسی دوران قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ اس وقت وہ انبالہ میں تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ خاندان والوں کے ساتھ لاہور پہنچا' پرانی انارکلی میں ایک کا بک جیسا گھر ملا اسی میں زندگی گزارنے لگا۔

''برگ نے'' کے بعد اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''دیوان'' بعد از مرگ بازار میں آیا۔ پھر 1975ء میں ''پہلی بارش'' (غزلیں) 1977ء میں ''نشاط خواب'' (نظمیں) 1981ء میں ''سُر کی چھایا'' (منظوم ڈراما) 1982ء میں۔ ''خشک چشمے کے کنارے'' (نثر) 1990ء میں۔ نیا ایڈیشن (مضامین' ریڈیو فیچرز' مقالے' اداریے) 1989ء میں انتخاب میر' 1990ء میں انتخاب نظیر 1991ء میں' انتخاب ولی 1991ء میں ہی انتخاب انشا بازار میں آئی۔

2 مارچ 1972ء کو البرٹ وکٹر اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے ناصر کاظمی نے آخری ہچکی لی اور جسم کی قید سے آزاد ہوگیا۔ ابھی اس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ 47 سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے اس عمر میں تو پختگی آتی ہے لیکن زندگی بھر سب کو ہنسانے والا ایک سب کو رلا گیا۔ ☆☆☆

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی سے۔ ''انصاف پسند منصف کی زیر نگرانی جمہوریت کا سب سے بڑا منصب اس بات کا تقاضا کر رہا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ قومی سینے پر جمہوریت کا تمغہ آویزاں کرنے کے بجائے کچھ ماہ جمہوریت کے بغیر گزار لیے جائیں اور اس دوران جمہوریت نما جمہوری مجرموں کو دیدۂ عبرت بنا دیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ووٹر کی عزت پامال کر کے صرف ووٹ کو عزت دو کا نعرہ کس قدر بھونڈا ہے۔ کرپشن کی سڑک پر بگٹٹ دوڑنے والے ہمارے جمہوری رہبر و رہنماؤں نے ہمیں اغیار کے پاس گروی رکھ دیا ہے اور گروی بھی ایسا کہ چھٹکارے کی کوئی صورت بھی نہیں چھوڑی۔ لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ اب لگام اور مشکیں کس دی جائیں ورنہ ہماری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ بتیس صفحات بشمول ایک صفحہ شہرِ خیال کا کم ہو جانا گوارہ نہیں کیا جا سکتا اور اس صورت میں تو بالکل بھی نہیں کہ محترم نزابت افشال اور محترمہ سدرہ بانو ناگوری کو انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑے لہٰذا قیمت بڑھا دیں کیونکہ ڈالر کی قیمت ابھی مزید بڑھے گی۔ آپ پرچے کا لے آؤٹ دوبارہ بحال نہیں کر پائیں گے۔ پیر صاحب شاہ سلیمان پھلواریؒ کو عقیدت سے دیکھا اور شہرِ خیال میں تاک جھانک کے ساتھ رانا محمد شاہد صاحب کی قسمت پر رشک کیا اور فلم کار اور قلم کار کی طرف متوجہ ہوئے۔ شیلڈن سڈنی کی کامیاب زندگی اس بات کی مثال ہے کہ خدا نے کیوں خودکشی حرام قرار دی ہے۔ نہ جانے اس نے ہماری کتاب زندگی کے اگلے صفحے پر ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے جسے مایوس لوگ پڑھے بغیر اس کتاب کو بند کر دیتے ہیں۔ بابائے پشتو خلیق صاحب کی عظمت کو سلام۔ زویا اعجاز نے کیپٹن احسان کے زخم نہاں دکھا کر آنکھوں کو نم کر دیا۔ قوم کے اس سپوت کا احسان ساری زندگی قوم یاد رکھے گی۔ سانحہ مشرقی پاکستان اغیار کی سازش تھی۔ جناب انور فرہاد، طلعت حسین کی فنی خدمات میں رطب اللسان تھے اور ٹھیک تھے۔ ایک باوقار فنکار کو اس کی شان کے مطابق خراج تحسین اس کا حق تھا۔ انداز و بیاں خوب صورت تھا اور بے مثال بھی۔ نشان، قتل کی عام سی روداد تھی۔ ناقابلِ یقین واجبی سی اس لیے کہ آج کل انٹرنیٹ خصوصاً یوٹیوب پر غیر تحقیق شدہ ایسا بہت سا مواد ہر وقت موجود رہتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے۔ ندیم اقبال صاحب کی شخصیت کے نئے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ ٹورنٹو میں رہ کر بھی ہمیں یاد رکھتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی کی ہم دل شکنی کرنا نہیں چاہ رہے لیکن شکاریات پر آدم خور جیسی تحریریں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں لہٰذا آپ اب کچھ نیا لکھیں۔ ''ناسور'' بہتر سے بہتر ہو رہی ہے۔ ماڈل گرل پیدل مارچ اور حقیقی اداکار بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر لیونارڈو کے بے مثال فنکار ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، حیرت ہے کہ اسے ٹائی ٹے نک میں بہترین اداکار کا آسکر ایوارڈ نہیں ملا۔ ''ستاروں پر کمند'' انتہائی شاندار محنت تھی۔ منظر امام صاحب نے واقعی منفرد کام کیا ہے۔ ملک کے نایاب ترین گوہروں کو یکجا کر دیا۔ سمیل حسن، ہارون طارق، عائشہ علی معین، ارفع کریم، فائزہ خان، مہک گل، نمیرہ، سعد علی، لاریب عطاء اللہ، فاطمہ خلود ضیاء کے والدین اور اساتذہ کو سلام محبت، سچ بیانیوں میں واپسی، خلش اور ہانیڈ بالترتیب ہیں۔ اب آخر میں ذکر ہو جائے فتح و شکست کا۔ اعتزاز سلیم وصلی کا کمال یہ ہے کہ اپنے انداز بیاں سے ازبر یادوں کو دہرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اب بھلا ان سے کیونکر کہا جائے کہ ہماری یادوں کو اس بری طرح نہ کریدا کریں کہ کم حقائق کی تلخیاں آپ کی تحریر پڑھنے کا مزہ کرکرا کر دیں۔ ہم آپ کی اس بات سے تو بالکل بھی اتفاق نہیں کرتے کہ قومی کرکٹ ٹیم کے کروڑ پتی پروفیشنل کھلاڑی اگر میچ ہار جائیں تو قوم کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کرے۔ بلاشبہ ہار جیت کھیل کا حصہ ہیں لیکن اگر ہار پروقار نہ ہو تو انگلیاں تو اٹھیں گی اور یہ بھی طے ہے کہ غصہ اور ناراض ہونے کا حق بھی صرف اسی کا ہے جو محبت اور پیار کرتا ہے اور پیار بھی اتنا کہ مایوس ہو کر خودکشی کر لے اپنی املاک توڑ پھوڑ دے۔ ہم جسٹس عبدالقیوم رپورٹ کا تذکرہ نہ بھی کریں جس میں وسیم اکرم، عطاء الرحمٰن، سلیم ملک، وقار یونس، مشتاق احمد اور دیگر پر

شک کا سایہ پڑتا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ محمد عامر سلمان بٹ اور محمد آصف پر افسوس کہ جنہوں نے چند روپوں کے عوض نہ صرف اپنا شاندار کیریئر تباہ کیا بلکہ ملکی وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ چند دیگر حالیہ کھلاڑی بھی قومی مجرم ہیں، کیا یہ بات غصہ کرنے اور ناراض ہونے کی نہیں ہے۔ اب آتے ہیں چند مخصوص اور مشکوک میچز کی طرف۔ باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھارت کے ساتھ ہونے والے ہمارے میچز وہ بھی ورلڈ کپ میں جن میں ہمیشہ ہار ہمارا مقدر بنی، مشکوک تھے۔ 1996ء میں برسراقتدار جناب آصف علی زرداری نے ورلڈ کپ جیتنے کی شکل میں ہر کھلاڑی کو ایک ایک کروڑ روپے دینا تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ کوارٹر فائنل میں بھارت کے ہاتھوں حیرت انگیز شکست بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ 2011ء میں کپتان شاہد آفریدی کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی کہ کیسے سیمی فائنل ان کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ 1988ء میں سلیم جعفر سیمی فائنل میں ہماری ہار کا سبب بنے جب کہ اس دن ان کی ٹیم میں جگہ ہی نہیں بنتی تھی۔ 1992ء کا ورلڈ کپ ہم عمران خان کی الوالعزمی کی وجہ سے جیتے لیکن ہمیں شکر گزار ہونا پڑا! آسٹریلیا کا جو اگر اپنا آخری لیگ میچ نہ جیتتی تو ہم بہتر اوسط کے باوجود سیمی فائنل کی دوڑ سے باہر ہو جاتے۔ 2003ء اور 2007ء دونوں میں ہم پہلے راؤنڈ میں ہی باہر ہو گئے۔ 2015ء کے ورلڈ کپ میں بھی وقار یونس کی عاقبت نااندیشی ہمیں لے ڈوبی۔ وہ سرفراز احمد کو کسی قابل سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مختصر یہ کہ اہم مقابلوں میں ہماری بے تکی ہار میں کھلاڑیوں کی پرفارمنس سے زیادہ دیگر ان دیکھے عوامل بھی کار فرما ہوتے ہیں۔ گزشتہ رمضان میں ہونے والی چیمپئنز ٹرافی میں بھارت کے مقابل جیت اس وجہ سے تھی کہ ٹیم میں کوئی گروپ بندی نہ تھی۔ آفیشلو کے اپنے اپنے گروپ ریٹائر ہو چکے تھے نیا کپتان، نیا کوچ، نیا چیف سلیکٹر اور نئے کھلاڑی ہر طرح کی آلودگی سے پاک تھے اس لیے جیت پر وہ قوم کی آنکھ کا تارہ بن گئے۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ اگر یہی کھلاڑی بے تکے طریقے سے ہار جائیں تو قوم ان سے ناراضگی کا اظہار بھی نہ کرے۔ تمام ساتھیوں کو عید مبارک قبول ہو۔''

☆ **نزابت افشاں** نے گاؤں مہورہ تحصیل فتح جنگ سے لکھا ہے۔ ''اٹھائیس مئی کی تپتی دوپہر کو سرگزشت ملا۔ شاہ سلمان پھلواری کا مختصر تذکرہ اچھا لگا۔ ''بابائے پشتو'' ایک بھرپور تحریر تھی جو کہ شوکت رحمان خٹک صاحب کی محنت اور تحقیق کا نتیجہ تھی۔ شوکت رحمان صاحب سخت بیمار تھے خدا جانے اب کس حال میں ہیں؟ ''زخم نہاں'' پاک فوج کے ایک بہادر ہیرو کی داستانِ حیات تھی مگر افسوس کیپٹن احسان ملک کی پیدائش و وفات، سلسلہ تعلیم اور اس بات کا ذکر بھی نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہیں اور آج کل کہاں رہتے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت ہی زبردست اور عروج پر ہے لیکن اس بار صرف ایک جگہ نسرین کا ذکر تھا۔ لگتا ہے کہ ندیم صاحب ''حورانِ فرنگ'' کی صحبت میں نسرین کو بھول گئے اس بار، سر جی نے ان مغربی لڑکیوں کو خوب اُلو بنایا، ساتھ ہی مطیع اللہ اور شہباز کے چٹکلے واہ کیا تڑکا لگا ہوا تھا، اس بار، ندیم صاحب کے بقول یہ سفرنامہ ختم ہونے کو ہے۔ اب پتا نہیں نسرین اور ندیم صاحب کا ملن ہوتا ہے کہ نہیں۔ ''ستاروں پر کمند'' منظر امام صاحب کی تحقیق اور محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ''آدم خور شیر'' شکار کہانی پڑھنے کو ملی زبردست رہی۔ واپسی سبق آموز تحریر تھی۔ اپنے آبائی گھر واپسی ہی موصوفہ کے لیے فائدہ مند ہوئی۔ ''سزا'' بہت ہی حیران کن تحریر تھی۔ نیلوفر دوسروں کی زندگی میں زہر گھولتی رہی۔ جنید صاحب نے وہ اڑنگا لگایا کہ بے چاری آسمان سے زمین پر آگئی۔ ''جرم چھپتا نہیں'' بہترین اور سبق آموز کہانی تھی۔ ''خلش'' زبردست اور حقیقت آشکارا کرنے والی تحریر تھی لیکن راحیل نے جو کچھ کیا وہ بہت برا تھا اور اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی شکر ہے نازش کسی لوفر لفنگے کے ہاتھ نہیں لگی ورنہ عزت کے ساتھ جان سے بھی جاتی۔ ''تبدیلی'' بہت ہی مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ موضوع سے اچھا انصاف کیا گیا۔ ''زہریلا مسیحا'' بھی ٹھیک تھی۔ واقعی حیوان غصے میں آجائے تو اپنے مالک تک کو نہیں چھوڑتا۔ ہم چونکہ اٹک کے مشہور جنگل کالا چٹا پہاڑ کے دامن میں واقع گاؤں میں رہتے ہیں لہٰذا یہاں اونٹ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے بھی کئی لوگوں نے اونٹ رکھے ہوئے ہیں۔ کئی دفعہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ ابھی دو سال پہلے ہی ہمارے پڑوسی کے اونٹ نے اس کی ایک ٹانگ اور بازو توڑ دیا تھا۔ ''خواہشوں کا سراب'' بھی بہتر رہی۔ ''شہرِ خیال'' میں رانا محمد شاہد صاحب صدارت پر تھے۔ 26 مئی کو رانا صاحب کے والد صاحب فوت ہو گئے ہم دکھ کے ان لمحات میں رانا بھائی کے ساتھ ہیں ویسے انسان کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں۔ جون ایلیا نے اس بارے میں کہا تھا کہ ہم حسین ترین، ذہین ترین، امیر ترین اور زندگی کے ہر لحاظ سے بہترین ہونے کے باوجود بالآخر مر ہی جائیں گے۔ اللہ پاک رانا صاحب کو صبر اور ان کے والد محترم کو اپنا قرب نصیب کرے (ہم بھی رانا صاحب کے غم میں شریک ہیں) آفتاب نصیر اشرفی صاحب بھی بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ قیصر خان، ندیم اقبال، ساگر تلور کر یاد کرنے کا شکریہ۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب نے چار سالوں کے دوران پہلی دفعہ ناچیز کو یاد کیا، بہر حال شکریہ۔ رانا سجاد آف مظفر گڑھ بھائی یاد کرنے کا شکریہ۔ عبداللہ چاند تبصرہ پر سراہے جانے کا شکریہ ویسے اگر آپ اپنے نام کے ساتھ ملتان نہ لکھتے تو میں آپ کو سعید احمد چاند (مرحوم) کا بیٹا سمجھا تھا۔ سدرہ بانو ناگوری، سسٹر مبارک باد کہ آپ بھی میری طرح لیٹ کمرز میں شامل ہیں۔ شبانہ حنیف، بشریٰ افضل، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری آپ سب کیوں غیر حاضر ہیں؟''

☆ رضا احمد اعوان بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ''اس بار ''قلم نگری'' کے سلسلے میں طلعت حسین پر مضمون ''بے مثال'' کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑ سکا۔ کیونکہ طلعت حسین کبھی بھی ہمارا پسندیدہ فنکار نہیں رہا۔ اداکار مصطفیٰ قریشی پر بھرپور لکھیں کیونکہ وہ ایک عہد ساز شخصیت ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے ندیم اقبال صاحب سے ایک وضاحت درکار ہے کہ یہ شہباز صاحب اداکار جمیل فخری (مرحوم) کے وہی بیٹے ہیں نا جو امریکا میں قتل ہو گئے تھے؟ آپ اس پر بھی کچھ تحریر کریں۔ ''ستاروں پر کمند'' منظر امام کا مضمون خاصے کی چیز تھی۔ زویا اعجاز کی تحریر ''زخم نہاں'' خون گرما دینے والی تحریر تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے محافظوں پر فخر ہے۔ ''ناسور'' کی ہر قسط اپنے اندر دلچسپی سمیٹے ہوئے ہے۔ سچ بیانیوں میں ''واپسی'' مائرہ جنید کی ''سزا'' اور محمد سلیم کرد کی ''زہریلا مسیحا'' بہترین سچ بیانیاں تھیں۔ ''شہرِ خیال'' میں رانا محمد شاہد، آفتاب احمد نصیر اشرفی، اعجاز حسین ستار اور رانا سجاد کے تبصرے پسندیدہ تھے۔ ''بیت بازی'' کا سلسلہ بند کر کے اس کی جگہ موضوعاتی شعری سلسلہ شروع کریں۔''

☆ قیصر عباس خان کا بھکر سے نوازش نامہ۔ ''اداریہ میں انکل نے صفحات کم کرنے کی وضاحت دی۔ اگر دس بیس روپے قیمت بڑھا دی جائے تو بھی ہمیں قبول ہے مگر معیار پر سودا نہ کریں۔ رانا شاہد کرسی صدارت پر تھے، مبارکاں۔ صفحات کم ہونے کی وجہ سے بہت سے دوستوں کے تبصروں سے محروم ہوئے (جی نہیں، لائن گیپ کم کر کے 8 صفحے کا ہی میٹر ہے)۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب کے تبصرہ میں غلطی کی طرف توجہ تھی۔ رانا سجاد صاحب کافی عرصہ بعد حاضر تھے۔ اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اب انشاء اللہ آتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ رومی صاحب اور پیارے انکل ندیم اقبال صاحب، حاجی اعجاز صاحب وغیرہ حاضر تھے۔ تبصرے اچھے لگے۔ زویا اعجاز صاحبہ نے قومی ہیرو کا حق ادا کیا واقعی ہمارے ملک احسان صاحب مایہ ناز فوجی آفیسر تھے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بری قسمت کہ ان کو ہتھیار ڈالنے پڑے، آج کل ملک احسان صاحب کہاں ہیں۔ اس سلسلے میں بھی کچھ بتایا جائے۔ انور فرہاد صاحب نے اس بار ایک لیجنڈ کی روداد پیش کی ہے۔ طلعت حسین صاحب واقعی بے مثال اداکار، صداکار ہیں۔ اللہ ان کی عمر لمبی کرے، (آمین)۔ اداکارہ نیلی کے بارے میں مضمون لکھیں، سنا ہے وہ لاہور میں انتہائی کسمپرسی میں ہے۔ نشان، فتح و شکست، ناقابل یقین مضمون اچھے تھے۔ ندیم اقبال انکل کی نئی تصویر کے ساتھ سفرنامہ کمال کا تھا۔ منظر امام صاحب نے تو پورے رسالے کی کمی دور کر دی۔ ان بہترین ٹیلنٹ جن کو ہم نہیں جانتے تھے ان کی نشاندہی کی۔ واقعی کرکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، ویلڈن انکل منظر امام صاحب۔ ''آدم خور'' سید مقصود علی صاحب کا ایک اور کارنامہ پڑھنے کو ملا۔ پیدل مارچ ماڈل گرل حقیقی اداکار اور ناسور بہترین کہانیاں تھیں۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ''طویل ترین انتظار کے بعد آٹھ بجے رات سرگزشت ملا، دل فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گیا۔ صبح مطالعہ شروع کیا۔ ''علمی آزمائش'' میں میرا جواب معہ ٹوکن درست ہونے کے باوجود اشاعت پذیر نہیں کیا گیا۔ بہت ہی زیادہ قلق ہوا۔ اس سے قبل ماہ مارچ کے شمارے میں میرا ارسال کردہ شعر معہ ٹوکن بھی شائع نہیں کیا گیا تھا، میں سخت اضطراب سے دوچار ہوا۔ اس بار احتجاجی طور پر بیت بازی میں شعر اور علمی آزمائش میں جواب ارسال نہیں کر رہا بلکہ رئیس امروہوی پر مضمون لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ مضمون پڑھ کر اس کی اہمیت و افادیت آپ پر ظاہر ہو جائے گی۔ اقتباس رئیس امروہوی خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم، میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے ان کے نام کے ساتھ نقوی نہیں لکھا گیا ہے۔ مجھے سخت غصہ آیا ہے اور میں نے یہ تحقیقی مضمون لکھا ہے تاکہ تشنگی کا احساس باقی نہ رہے۔ (ایسے بہت سے لوگ ہیں جو خاندانی نام کی جگہ اپنے علاقے کا لاحقہ لگاتے ہیں۔ جب وہ امروہی لکھتے ہیں تو ہم نقوی کیسے لگا دیتے؟) ابنِ صفی کا تعارف خوب لکھا گیا ہے۔ اقتباس میں ڈاکٹر سید محسنہ نقوی لکھا ہے جب کہ ڈاکٹر سیدہ محسنہ نقوی لکھنا چاہیے جیسا کہ ڈاکٹر سیدہ ناظرہ سلطانہ بخاری۔ کتب، اخبار میں لکھا ہے سادات مرد کے ساتھ سید اور عورت کے ساتھ سیدہ لکھنا لازمی ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا، آفتاب عظیم آباد۔ شہر خیال میں میرا خط شائع ہوا، شکریہ۔ ''بیت بازی'' میں شعر شائع ہوا، شکریہ! زیادہ کیا لکھوں سرگزشت کا مطالعہ جاری ہے گرمی آتے ہی لوڈ شیڈنگ شروع ہو گئی ہے اچھا خط نہ لکھنے پر معذرت چاہتا ہوں انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔''

☆ انجم فاروق ساحلی لاہور سے لکھتے ہیں۔ ''سرگزشت میں تحریر ''کوبرا کار یچھ'' کی اشاعت دیکھ کر مسرت ہوئی۔ کچھ دیر بعد سلسلہ بحال ہوا (ہمیں شدید صدمہ پہنچا کہ آپ کی دونوں تحریر ہلکی سی رد و بدل کے بعد بالکل ''شیر آیا شیر آیا'' جیسی مشہور کتاب میں شامل کہانیوں جیسی ہے۔) وقار الرحمٰن نے بھی مبارک باد دی۔ تحریروں کا اسلوب اور جملوں کی تراش خراش دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ مدیر سرگزشت الفاظ کی حرمت کو کتنا مقدم رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ ادارتی گفتگو خاصی فکر انگیز تھی۔ خطوط دلچسپی سے بھرپور تھے۔''

☆حمیرا کوکب واسطی بہاولپور سے۔ ''آپ سے گزارش ہے کہ ماضی کی ایک گلوکارہ روبینہ بدر جس نے ایک گانا گایا تھا، 'تم سنگ نیناں لاگے مانے نہ ہی جیارا۔ پیا پیا بولے پیا من کا پپیہارا'۔ اس کی سرگزشت شائع کر دیں۔ اس کو آپ نے کیوں نظر انداز کیا ہوا ہے؟ اس کے علاوہ اکبرالہ آبادی، پنڈت ہری چند اختر، ڈاکٹر این میری شمل کو بھی آپ نے مسلسل نظر انداز کیا ہوا ہے۔ تاریخ میں جو منفی کردار کے حامل ہیں میر جعفر، میر صادق اور گھسیٹی بیگم ان پر بھی کچھ لکھ دیں۔''

☆بلال رضوی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کے کچھ شمارے دیکھے جو کافی پسند آئے، خاص طور پر امام احمد رضاؒ پر ڈاکٹر ساجد امجد کا تفصیلی مضمون تو انتہائی معلوماتی اور ایمان افروز تھا۔ آپ کو کچھ مضامین بھجوا رہا ہوں۔ اُمید ہے چھاپ کر شکریہ کا موقع دیں گے (سرگزشت کی تحریروں کا ایک اپنا مزاج ہے۔ آپ کی تحریر اخبارات کے انداز میں ہے)۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی حیات مبارکہ کے کچھ گوشے ارسال کروں گا (سلطان نورالدینؒ اور سلطان صلاح الدینؒ پر مکمل تحریر چھپ چکی ہے) کیا اس ماہنامہ میں اصلاحی مضامین بھی چھاپے جاتے ہیں جیسے شادی بیاہ پر بے جا رسمیں اور اس کے معاشرتی نقصان، تربیت اولاد وغیرہ کے حوالے سے؟ (سرگزشت کے اپنے انداز میں ہی ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں)۔''

☆طارق خان تمر کھولہ لکھتے ہیں۔ ''میرا پسندیدہ سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' سب سے پہلے پڑھا۔ خدا بخشے مرحوم آفاقی صاحب کو، ان کے بعد ندیم اقبال کے ساتھ سفر کر کے بہت مزہ آتا ہے۔ اس کے بعد ''ناسور'' پڑھی۔ ناسور کی کہانی بہت دکھی ہوگئی۔ ''واپسی'' بھی سائرہ افضل کی اچھی کاوش ہے۔ ''جرم چھپتا نہیں'' پڑھ کے عبرت حاصل ہوئی۔ ''ستاروں پہ کمند'' منظر امام کی تحقیق پُر اثر رہی۔ واقعی پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں مگر حالات ایسے ہیں کہ ٹیلنٹ غریبوں میں بہت ہے مگر ان کو کوئی اوپر آنے نہیں دے رہا۔ ''آدم خور'' پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے، شاہ صاحب نے خواب میں شیر کو شکار کیا ہے، کئی جگہ لکھا ہے کہ وہ میگزین کا مطالعہ کررہے تھے کہ اچانک شیر کی دہاڑ سنائی دی، حیرت ہے۔ پیر صاحب نے یک صفحے کی کہانی میں دریا کو کوزہ میں سمویا ہے۔ ''بیت بازی'' میں ناہید سلیم کا تبصرہ اچھا ہے اور احمد حمزہ خان لہڑی کا شعر بھی اچھا ہے۔ جناب معراج صاحب یہ لوگ اتنے بڑے بڑے تبصرے کیسے لکھ لیتے ہیں۔ کیا ان کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے۔ باقی میری دعا ہے کہ اللہ پاک میرے وطن کی حفاظت فرمائے اور حکمرانوں کو ڈیم بنانے کی توفیق دے۔ ہندوستان ہم سے ایک دن بعد یعنی 15 اگست کو آزاد ہوا مگر اس وقت وہاں چھوٹے بڑے چار ہزار ڈیم ہیں اور وہ بھی پاکستان کے دریاؤں پر بن رہے ہیں۔ خدا بخشے صدر ایوب خان کو جتنے ڈیم انہوں نے بنائے کوئی مائی کا لال نہیں بنا سکا۔ پاکستانی سیاستدان باتیں تو بہت بناتے ہیں مگر ایوب خان مرحوم کے بعد کوئی ڈیم نہ بنانا ہماری حکومتوں کی نااہلی ہے۔ اس وقت پاکستان میں فیکٹریاں بند ہیں۔ بجلی سے چلنے والی تمام ملز بند ہیں۔ بجلی ہوگی تو پاکستان ترقی کرے گا خدا ہمارے حکمرانوں کو عقل اور نگزیب عالمگیر عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔''

☆امیر حمزہ اشرف کی تشریف آوری کوٹ رب نواز ملتان سے۔ ''جون کا شمارہ 24 مئی کو ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ بہت سا ہار سنگھار کرنے کے باوجود ہمیں متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ فہرست میں نظر دوڑائی تو اندازہ ہوا کہ حسبِ معمول دلچسپ مواد پڑھنے کو ملے گا۔ اداریہ میں انکل کاغذ کی مہنگائی کے حوالے سے بات کررہے تھے۔ انکل جی بے فکر رہیے، اس بحران سے نمٹنے کے لیے ہم آپ سے مکمل تعاون کریں گے (انشاء اللہ)۔ ''شعرِ خیال'' میں بھائی رانا محمد شاہد کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ اصل میں ہم مغربی معاشرے کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ اپنی مسلم تہذیب و تمدن کو فراموش کرتے جارہے ہیں۔ رانا سجاد کافی عرصہ بعد نظر آئے، ویلکم بیک جناب۔ عبدالجبار رومی انصاری نے بھی بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ باقی تمام بہن بھائیوں کے تبصرے بھی زبردست تھے۔ سچ بیانی ''واپسی'' میں جوائنٹ فیملی سسٹم کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ پاکستانی معاشرے کا حسن ہے ورنہ مغربی ممالک میں تو تقریباً مشترکہ خاندانی نظام کا رجحان ہی ختم ہوگیا ہے۔ ''خلش'' جیسی کرنی ویسی بھرنی کی عملی تفسیر تھی۔ راحیل تو انتقام کی آگ میں اتنا اندھا ہوگیا کہ نازش کے سچے جذبات بھی اس کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بھٹی صاحب کی ''ناسور'' کی تو کیا ہی بات ہے۔ نعمان صاحب عرب کے صحراؤں میں دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں ہیں اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر ساجد امجد کی بجائے تنویر ریاض نے ''قلم کار قلم کار'' سے ملوا دیا، ویلڈن تنویر صاحب۔ کوثر اسلام کی مختصر مگر نہایت ہی دلچسپ و حیرت انگیز تحریر ''ناقابلِ یقین'' یقینی بے یقینی کی کیفیت میں پڑھی۔ ہوسکتا ہے نیویارک سے میامی کے لیے اڑان بھرنے والا وہ جہاز ابھی بھی محوِ پرواز ہو اور کبھی نہ کبھی میامی ایئرپورٹ پر اتر جائے؟ ''زخم نہاں'' زویا اعجاز کی بہترین تحریر تھی۔ ''ستاروں پر کمند'' میں منظر امام نے پاکستان کی کم عمر نامور شخصیات کے بارے میں لکھا ہے ہماری خدا سے دلی دعا ہے کہ ان ستاروں کو آسمان پر یونہی چمکتا دمکتا

رکھے (آمین)۔عیدالفطر کی آمد آمد ہے میری طرف سے آپ سب کو دل کی گہرائیوں سے عید مبارک ہو آخر میں سب کو السلام علیکم۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی آمد بورے والا سے۔''عمدہ سرورق کے ساتھ سرگزشت کا شمارہ وقت پر مل گیا، کاغذ کی مہنگائی نے پرچے کی روایت پر خوب اثر ڈالا اور مواد بھی اتنے کا اتنا ہی ملا جیسے پہلے ہوتا۔ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن قارئین کے لکھنے کے صفحات جن میں تبصرہ نگاری اور بیت بازی اہم ہیں۔ بیت بازی کے لیے دیے گئے پہلے دو صفحے ہی تھے اب ان میں بھی ایک کم کر دیا، پلیز اس پر نظر ثانی کریں اسے تو دو ہی رہنے دیں۔ اتنے بڑے بڑے مضامین ہوتے ہیں ان میں ایک کم کر کے بیت بازی کی روایت تو لازمی برقرار رکھیں، باقی تو ہم ہر حال میں تعاون کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے (نوازش)۔ یک ملکی سرگزشت میں شاہ سلمان پھلواری کے بارے میں پڑھا بہت اچھا لگا۔ ایسے اللہ والے بزرگوں کا تذکرہ دل میں ایمان تازہ کر دیتا ہے۔ رانا محمد شاہد اوج صدارت پر تمکنت تھے۔ تبصرہ نگاری کے موتی بکھیرتے اچھے لگے اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے جیسی بیزاری تو ہر محب وطن پاکستانی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کھری کھری باتیں اچھی لگیں۔ قیصر خاں کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ پروفیسر کیوا ے قاسمی بھی اپنی پسند کے موتی سمیٹتے ہمارے درمیان موجود تھے، اچھا لگا۔ عبداللہ چاند کا خلوص نامہ بھی اچھا لگا۔ ڈاک خانے کے عملی مظاہرے تو گاہے بگاہے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اعجاز حسین سٹھار کی طرح اور بھی ساتھی متاثر ہوتے ہیں۔ بہر حال عمدہ تبصرہ متاثر کن رہا۔ مشی گن سے ندیم اقبال کا محفل میں شامل ہونا اچھا لگتا ہے۔ غضنفر عباس، رضا احمد عباس، محمد احمد رضا انصاری، رانا سجاد احمد، سید امتیاز حسین شاہ، ساگر تلوکر اور عبدالحکیم ثمر کے تبصرے بھی محفل کی جان رہے اور جو معروف تبصرہ نگار غیر حاضر ہیں جن کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا، ان سب سے بھی گزارش ہے کہ محفل کو چار چاند لگائیں نوازش ہوگی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا نیا خاکہ آ گیا۔ نیا انداز بھی بہت عمدہ ہے اختتام کی جانب گامزن سفر نامہ برابر دلچسپی قائم رکھے ہوئے ہے۔ مشرقی مغربی گروپ کے ملنے سے گھومنے کا لطف دوبالا ہوا تو ساتھ میں نئی نئی باتوں کا بھی پتا چلا۔ عمدہ سفرنامہ۔ ''ستاروں پر کمند'' پاکستان کا روشن چہرہ ہیں اور ہمیں فخر ہوتا ہے ان سب پہ کہ پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے۔ ''صحراؤں میں پیدل مارچ'' سے نیا جہاں تلاش کرنے والوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کارنامہ انجام دیا اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں، عمدہ اور معلوماتی تحریر تھی اچھی لگی۔ ہمت و شجاعت دینے والے جری سپاہی مشرقی پاکستان میں مجبوری کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے ورنہ وہ انڈین آرمی کو دھول چاٹنے پر مجبور کرنے والے تھے۔ ''زخم نہاں'' جیسی تحریر پڑھ کر دل افسردہ ہو جاتا ہے کہ کاش مشرقی پاکستان ہم سے جدا نہ ہوا ہوتا۔ اینا نکول ماڈل گرل بھی اپنے ہی بے حس معاشرے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پہلی سچ بیانی ''واپسی'' دلچسپ اور عمدہ رہی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے جو تھوڑے بہت نقصان ہوں بھی تو برداشت کریں اور انا کا مسئلہ نہ بنائیں تو دڑبے جیسے گھروں میں دم گھٹنے سے بھی بچ جائیں۔ وائیلڈ شریر جن نے ثانیہ کو بہت تڑپایا آخر ایک عام سے دکاندار نے اپنے عمل سے جن کو قید کیا اور ثانیہ کی جان چھوٹی۔ پاگل اونٹ کتنا خطرناک ہوتا ہے یہ صرف سنا ہی تھا، عبدالرحمٰن کی سرگزشت نے دل دہلا دیا۔ دونوں جگہ اونٹ سے سانپوں نے بچایا عمدہ کہانی۔ ''ناسور'' میں تومی اور فوزیہ نے ایک دوسرے کی دید کی پیاس بجھائی اور پھر الگ الگ بیرونِ ملک روانہ بھی ہو گئے۔

☆ اکبر انصاری نے حیدرآباد سے لکھا ہے۔''اداریہ کی ہر سطر سے میں متفق ہوں۔ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہم بھرپور انداز میں ترقی نہیں کر پا رہے ہیں۔ پیر صاحب، مختصر سی تحریر ہوتے ہوئے بھی اتنی جامع ہے کہ تعریف کرکے زبان نہ تھکے۔ فلم کار قلم کار بھی خاصے کی چیز ہے۔ بابائے پشتو ایک اچھی کوشش ہے اس لیے کہ اتنی بڑی شخصیت اور پشتو ادب سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم لوگ ان کے نام اور کام سے ناواقف تھے، اسی طرح دیگر زبان کے مشہور ادیب و شعراء پر بھی تحریر آنی چاہیے۔ سندھی، بلوچی، سرائیکی، پنجابی کے شعراء و ادیب پر تحریر ضرور دیں۔ ''زخم نہاں'' از زویا اعجاز، ویلڈن، بہت عمدہ۔ ہمارے سپاہی ہمارے محافظ۔ ایسے بہادر جوان صرف پاک فوج میں ملتے ہیں۔ ''بے مثال'' از انور فرہاد نے بھی بہت مزہ دیا۔ گزرا زمانہ نظروں میں آ گیا۔ ''فتح و شکست'' از اعتزاز سلیم وصلی اور کوثر اسلام کی ''ناقابلِ یقین'' بہت عمدہ، معلوماتی تحریر ہے۔ ستاروں پر کمند از منظر امام۔ اس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، سچ بیانیوں میں واپسی، سزا، جرم چھپتا نہیں اور یادوں کا زہر بہت پسند آئی، خواہشوں کا سراب بھی بہتر سچ بیانی تھی۔''

☆ نادر شاہ نے ژوب سے لکھا ہے۔''شمارہ جون پڑھ کر احساس ہوا کہ اس بار بھی تحریریں زبردست تھیں۔ ''واپسی'' ایک سبق بھری سچ بیانی۔ واقعی ہمارے بزرگوں نے جو جوائنٹ فیملی کا سسٹم رائج کیا تھا اس کے فوائد کتنے تھے، اسد عباس کی ''جرم چھپتا نہیں'' پڑھ کر بے ساختہ زبان سے واہ نکلا۔ بہت عمدہ کہانی ہے۔ محمد فاروق انجم کی ''خلش'' نے بھی خوب مزہ دیا۔ ''خواہشوں کا سراب'' از ثمینہ طاہر بٹ بھی دلچسپ تھی۔ اب آتے ہیں اس شمارے کی سرتاج تحریر پر۔ اس مہینے زویا اعجاز نے ''زخم نہاں'' لکھ کر دل

موہ لیا۔ کیا خوب صورت تحریر ہے۔ اس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ زبردست تحریر ہے۔ ''بابائے پشتو'' بھی معلومات سے لبالب بھری تھی۔ اتنا بڑا فنکار اور ہم اس سے واقف بھی نہیں تھے۔''

☆ ممتاز اشعر نے ڈی آئی خان سے لکھا ہے۔ ''پہلی بار حاضر بزم ہیں۔ اُمید ہے سینئر تبصرہ نگار خوش آمدید کہیں گے۔ جون کے شمارے میں سب سے زیادہ پسندیدہ تحریر ''واپسی'' تھی۔ اس کے بعد جرم چھپتا نہیں، زہریلا مسیحا اور خواہشوں کا سراب بھی پسند آئی۔ ''یادوں کا زہر'' سو سو تھی۔ ''خلش'' بھی اچھی لگی۔ منظر امام کی ''ستاروں پر کمند'' نے بہت دیر تک سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں، بس انہیں سامنے لانے میں تھوڑی سی مدد درکار ہے۔ ''آدم خور'' جسے انجم فاروق ساحلی نے لکھا ہے صرف اس لیے پسند نہ آئی کہ اس میں جتنا کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ہم پہلے سے پڑھے ہوئے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میری پسندیدہ تحریر ہے۔ معلوماتی بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اس سفرنامے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''فلم کار قلم کار'' بہت زیادہ پسند نہ آئی۔ شخصیت میں ہم صرف اپنوں کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ (اپنوں کی نشاندہی کرنی چاہیے تھی۔ اگلے تبصرے میں اس بات کی تشریح ضرور کر دیں گے) ''نشان'' بھی کوئی اچھا تاثر چھوڑ نہ سکی۔ ''پیدل مارچ'' بہت مختصر سی تحریر تھی۔''

☆ انعام الحق عطاری نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''بابائے پشتو اور زخم نہاں کو ہم درجہ اوّل پر رکھتے ہیں۔ عمدہ ہی نہیں بہت عمدہ تحریر ہے۔ ''ستاروں پر کمند'' بھی بہت پسند آئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے، ساقی۔ ہم پاکستانی آگے بہت آگے جاسکتے ہیں لیکن ہمیں موقعے نہیں ملتے۔ سچ بیانیوں میں واپسی، خلش، جرم چھپتا نہیں اور خواہشوں کے سراب زیادہ پسند آئی، باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔''

☆ رابعہ کوثر کا خط فیصل آباد سے۔ ''پیر صاحب بہت عمدہ تحریر تھی۔ صرف ایک صفحہ میں مکمل زندگی کا احاطہ کرتی یہ تحریر قابل ستائش ہے اور یہ صرف سرگزشت کا خاصا ہے کہ اتنے کم جملوں میں پوری تحریر سمیٹ دی جاتی ہے۔ ''فلم کار قلم کار'' کچھ خاص اثر چھوڑ نہ سکی۔ ''بابائے پشتو'' بھی اچھی تحریر تھی۔ ''بے مثال'' کی بات ہی کچھ اور ہے۔ طلعت حسین لیجنڈ اداکار ہیں۔ ان کے بارے میں اتنی بھرپور تحریر، مزہ آگیا۔ ''زخم نہاں'' کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اتنے خوب صورت انداز میں ہمارے اس ہیرو کی زندگانی پیش کی ہے کہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمارا اتنا بڑا ہیرو اور نظروں سے اوجھل، ہم اس سے واقف بھی نہیں تھے۔ ایسے کم نام مجاہدین کا تذکرہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ کچھ ملک دشمن عناصر ہماری بہادر فوج کے کارناموں کو گھٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، دنیا کی بہترین فوج میں ہماری فوج کا شمار ہے اور یہ مقام انہیں گھر بیٹھ کر نہیں ملا ہے۔ یہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ہمارے لیے امن و سکون کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ہماری افواج ہی ہے جس نے دشمنوں کی آنکھیں نوچ لی ہیں۔ 1965ء کی جنگ اس کا ثبوت ہے کہ ہماری فوج نے دشمن کا کیسا حشر نشر کیا تھا۔ رہی بات 1971ء کی تو اس میں بھی فوج کا پلڑا بھاری تھا، یہ اور بات ہے کہ اپنوں نے پیٹھ میں چھری گھونپی اور فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑا لیکن ان کی بہادری ان کے کارناموں پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ''ستاروں پر کمند'' بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی تحریر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ہماری فیورٹ ہے۔ ندیم اقبال خوب ہی نہیں بہت خوب لکھ رہے ہیں۔ اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ تحریر سرگزشت کی سب سے دلچسپ تحریر ہے۔ ہر ماہ باقی آئندہ پڑھ کر دل پر گھونسا سا لگتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس تحریر کے صفحات مزید بڑھا دیں۔ ''واپسی'' اور ''جرم چھپتا نہیں'' بہت پسند آئی۔ ''ہائیڈ'' کا انداز تحریر تو بہت اچھا ہے لیکن موضوع پسند نہیں آیا۔ پر اسرار کہانیاں مجھے کبھی بھی پسند نہیں آتیں۔ ''یادوں کا زہر'' بھی دلچسپ تھی۔

☆ آفاق محسن کی آمد شیخوپورہ سے۔ ''پیر صاحب نے ایمان تازہ کر دیا۔ ایسے بزرگوں کے بارے میں ہر ماہ کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیا کریں۔ تاکہ بچے بھی ان واقعات سے مستفیض ہو سکیں۔ یہ ہمارے بزرگوں کی ہی محنت ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، یہ اولیاء اللہ، بزرگان دین نے کتنی محنت کی تھی کہ وہی ہندجہاں کافروں کا راج تھا۔ تمام کے تمام لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے ان کو صراط مستقیم پر لے آئے۔ اسلام پھیلا ہی ان لوگوں سے۔ شوکت رحمٰن خٹک کا نام دیکھ کر علی سفیان آفاقی کی یاد آگئی۔ ان کے کالم میں شوکت رحمٰن خٹک کی تحریر ضرور ہوتی تھی۔ فلمیں یا کے مریض کے نام سے انہیں یاد کیا جاتا تھا۔ ''زخم نہاں'' اور ''ناقابل یقین'' بھی پسند آئی۔ ''ستاروں پر کمند'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' سرفہرست رہی۔ ندیم اقبال کے قلم میں جادو ہے کہ وہ قارئین کو باندھ لیتے ہیں۔ ہر ماہ ان کی تحریر کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ سچ بیانیوں میں واپسی، سزا، جرم چھپتا نہیں۔ یادوں کا زہر، خلش زیادہ پسند آئی۔ میری طرف سے تمام قارئین کو عید مبارک۔''

☆ کوثر علی کوثر کا پیام کوئٹہ سے۔ ''ستاروں پر کمند'' نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے نوجوان بہت آگے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اس

کا موقع دیا جائے لیکن افسوس ہمارے اپنے لوگ ہی ٹیلنٹ کو برباد کر دیتے ہیں۔ کاش ہم سفارش کے گھیرے سے نکل سکتے لیکن یہ وڈیرے، چوہدری اور ملک وخاناں انہیں دانستہ کچل دیتے ہیں۔ انور فرہاد کی قلم نگری بھی بہت دلچسپ جا رہی ہے۔ علی سفیان آفاقی کی کمی محسوس ہی نہیں ہو رہی ہے۔ طلعت حسین کی زندگی کو اتنے بہتر انداز میں پیش کیا ہے کہ ایک نہیں دو بار میں نے پڑھا۔ ناقابلِ یقین بھی اچھی تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا جادو کم نہیں ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں اسی کو پڑھتا ہوں۔ ''واپسی'' بھی بہتر تھی۔ ''خلش'' اور ''جرم چھپتا نہیں'' بھی اچھی تحریر تھی۔ یادوں کا زہر چھوٹی تھی لیکن دلچسپ لگی۔ ''خواہشوں کے سراب'' بھی اچھی لگی۔ جب تک سرگزشت مارکیٹ میں آئے گا۔ عید گزر چکی ہوگی اس لیے تمام دوستوں کو عید مبارک۔''

☆ عنایت حسین بھٹی کی آمد ساہیوال سے۔ ''سرگزشت میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ اتنا معلوماتی کہ اس کا مقابلہ کوئی دوسرا ڈائجسٹ کر ہی نہیں سکتا۔ جون کے شمارے میں ''زخم نہاں'' نے آنکھوں میں آنسو بھر دیئے۔ 1971ء کا زخم یاد آ گیا۔ ہماری فوج نے کس طرح بیک وقت دو دشمنوں کا مقابلہ کیا اس پر بہت کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کچھ لوگ سانحہ مشرقی پاکستان کا بوجھ فوج پر ڈال کر خوش ہوتے ہیں جب کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ ہماری فوج نے کسی جگہ بزدلی نہیں دکھائی تھی، اس کا ثبوت احسان ملک صاحب جیسے بہادر ہیں۔ یہ تو عالمی سازش تھی کہ پاکستان کو دولخت کر دو اور الزام پاکستان کے سر دھر دو فوج کو بدنام کرو۔ ہماری فوج دوطرفہ طور پر پھنس گئی تھی۔ ایک جانب دشمن کی فوج دوسری جانب مکتی باہنی کے نقاب میں بھارتی غنڈے بدمعاش اور سپاہی جو مسلسل پیٹھ پر وار کر رہے تھے۔ دونوں محاذ پر ہماری فوج کامیاب تھی۔ بارڈر سے ایک چڑیا کا بچہ بھی داخل نہ ہو سکا لیکن اندر کے دشمنوں کی وجہ سے سقوط ڈھاکا رونما ہو گیا۔ ''ستاروں پر کمند'' بھی مزے کی تحریر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بھی اچھی جا رہی ہے۔ اس بار.... اس سفر نامے کی ہیروئن کا تذکرہ نہیں تھا اور ہم اس انتظار میں ہیں کہ ندیم صاحب کب دوسری شادی کا اعلان کرتے ہیں۔ ''واپسی'' بہت عمدہ سچ بیانی تھی۔ خط لمبا نہ ہو جائے اس لیے اجازت کا طلب گار ہوں۔''

☆ خالد محمود نے ملتان کینٹ سے لکھا ہے۔ ''مشہرِ خیال کے لیے ایک تبصرہ ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے وقت پر پہنچ جائے گا۔ جون 2018ء کا شمارہ دیکھا۔ جسامت کم لگی۔ دوبارہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ صفحے کم ہیں پھر جناب معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا اور تصدیق ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بہتری کرے گا۔ تبصرہ سے پہلے مجھے دو باتیں عجیب لگیں۔ ان کا ذکر ضروری ہے۔ محترمہ زویا اعجاز صاحبہ کی کہانی پاک فوج کے بہادر کیپٹن احسان ملک صاحب کا ناقابلِ فراموش قصہ ہے۔ ان کی فوٹو بھی ساتھ چھپی ہے۔ ان کی یونیفارم دیکھ کر معلوم ہوا کہ ان کا رینک کرنل کا ہے۔ غالباً ان کی بعد میں ترقی ہوگئی ہوگی۔ اگر ایک سطر لکھ دی جاتی کہ وہ کرنل کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تو مناسب تھا۔ دوسری بات جو تشریح طلب ہے وہ طارق عزیز صاحب کا مضمون ''پیدل مارچ'' ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ پہلا انسانی قدم آسٹریلیا میں 40 ہزار سال پہلے انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے قدیم باشندوں کا تھا۔ میری معلومات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں تقریباً 10 ہزار سال پہلے تشریف لائے۔ اس سے پہلے دنیا میں انسان کا وجود نہ تھا۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے یا ترجمہ غلط کیا گیا ہے (سائنس اپنے طور پر اظہار خیال کرتی ہے کہ انسان کی ارتقا کیسے ہوئی تحریر نے سائنس دانوں کی کہی کو لکھا ہے۔ جب کہ قرآن بالکل الٹ کہتا ہے اور یہی سچ ہے کیونکہ قرآن میں انسانوں کے خالق کا بیان ہے) اب دیگر باتیں ''ناسور'' کی قسط نمبر 17 بڑی دلچسپ لگی۔ اُمید ہے کہ آئندہ یہ سلسلہ بہتر ہو جائے گا دیگر سچ آپ بیتیوں میں واپسی، سزا، خلش، خواہشوں کا سراب، یادوں کا زہر اور ہانٹیڈ بہت زیادہ پسند نہیں آئی۔ ایسی کہانیوں کی تعداد کم رکھیں تو بہتر ہوگا۔ ''تبدیلی'' پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ یہ رمضان مبارک کا تحفہ ہے۔ میری طرف سے تمام بہن بھائیوں کو ایڈوانس عید مبارک۔''

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

نادیہ خان، انور شاہ، امجد حسن، شوکت کمال (کراچی)۔ اختر کوکب، بلقیس بتول، شاہینہ بتول، شاد علی (لاہور)۔ شازیہ اکرام، بہادر خان اچکزئی (پشاور)۔ کلیم الحسن، افروز جہاں، اختر عباس، زبیر احمد، امروز اقبال (حیدرآباد)۔ احسان علی (فیصل آباد)۔ زاہد شاہ بخاری، چوہدری اشفاق، محمد فیضان (سرگودھا)۔ ثانیہ حسن، اطہر حسین (سیالکوٹ)، بانو برجیس، احمد رشید مصطفائی (جھنگ)۔ احسان خان (ٹوبہ ٹیک سنگھ)۔ ثناء اللہ، اشفاق حسن (شیخوپورہ)۔ نادیہ خان (جہلم)۔ علی نواز شاہ (گجرات)۔ شوکت ملک، افروز جہاں، نوشین اختر (کوئٹہ)۔ تمکین جعفری، صنوبر علی شاہ، پنو عاقل شاہ (شجاع آباد)۔ محمد عماد (بھکر)۔ طٰہٰ حسین (مظفر گڑھ)۔ زرین پروین (شہداد کوٹ)۔ فرید اسلم ڈوگر (ڈی آئی خان)۔ حکیم فیروز ملک، اقراء تبسم (راولپنڈی)۔ چوہدری ممتاز علی، فرید اسلم، ثانیہ حسن ثانی (اسلام آباد)۔ زبیر ملک، عتیق اسلم (شادی پور)۔ منور سلیم (خیر پور آزاد کشمیر)۔ عرفان مروت، دلاور حسن (منڈی بہاؤالدین)۔ عباس علی (رحیم یار خان)۔ فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، گل باز خان (کوئٹہ)۔

ڈاکٹر ساجد امجد

جب کفر کے اندھیرے کا سینہ چیر کر ایمان کا نور پھیلا تو لبیک کہنے والوں میں وہ سرفہرست تھے۔ وہ غلام تھے، رنگت بھی کالی تھی۔ اپنی رنگت کی وجہ سے وہ خود کو کمتر سمجھتے تھے مگر اللہ کے نزدیک حسین ترین ٹھہرے۔ یہ اعزاز ہفت اقلیم کی بخشی ہوئی نعمتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ انہیں یہ اعزاز قربانیوں کی فصیل کھڑی کرنے پر ملی۔ ایمان کی راہ اپنانے پر انہیں جس طرح زدوکوب کیا گیا، ایذائیں دی گئیں اس کی مثال نہیں ہے۔

برگزیدہ ہستیوں کی روداد پڑھنا اور سبق حاصل کرنا خوش قسمتی ہے

ابھی مکہ کی تنگ گلیاں دھوپ سے بھری نہیں تھیں کہ دکانیں گاہکوں کا استقبال کرنے لگیں۔ دو دن بعد عکاظ کا سالانہ میلہ سجنے والا تھا۔ مکہ کے لوگ اسے مذہبی تہوار کی طرح منایا کرتے تھے۔ چہروں کے علاوہ ہر چیز بدل جاتی تھی۔ پرانے کپڑے بدل جاتے، نئے کپڑوں کی خریداری ہوتی، ہتھیار تیز کرائے جاتے تھے کہ ہتھیار باندھ کر میلے میں شریک ہونا اظہار امارت سمجھا جاتا تھا۔ اس میلے کی رونق سے لطف اندوز ہونے کے لیے اردگرد کے علاقوں سے قافلے آنا شروع ہو جاتے تھے۔ ان دنوں مکہ کی آبادی دوگنی ہو جاتی تھی۔ لڑکے بالے ٹولیوں کی شکل میں بازاروں کے چکر کاٹتے تھے۔ ان کے دم سے میلے سے پہلے ہی میلہ سج جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہ ٹولیاں بھنورا بنی اِدھر اُدھر ڈولتی پھر رہی تھیں کسی پر فقرہ کس دیا، آنکھ بچی اور کسی کا مال اڑا لیا۔ کوئی اس نشے میں اکڑتا پھر رہا تھا کہ اس کا قبیلہ سب سے بڑا ہے۔ کسی کو یہ ناز تھا کہ اس کا باپ شاعر ہے۔ کسی کا خوف تو کیا حجاب بھی نہیں تھا۔

''وہاں محمد بھی تو آئیں گے۔'' ایک لڑکا کہہ رہا تھا۔

''آئیں گے بھی اور اس مرتبہ جو دین انہوں نے گھڑا ہے اس کی تبلیغ بھی کریں گے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو فرشتہ ان کے پاس آتا ہے اس نے انہیں تبلیغ کرنے کی ہدایت کی ہے۔''

''عکاظ کا میلہ تو ان کے لیے میٹھی کھیر ہوگا۔ مکہ والوں کے سامنے تو زبان کھول نہیں سکتے، مکہ کے باہر سے جو لوگ آئیں گے انہیں بہکانے کی کوشش کریں گے۔''

''ہم انہیں ایسا کرنے دیں گے جب نا۔''

''ہم کیا کرلیں گے۔ بڑے بڑے سردار سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ اب کیا کیا جائے۔''

''جو وہ نہیں کر سکتے وہ ہم کریں گے۔ وہ جب میلے میں آئیں تو دوستو، ان کے ساتھ ساتھ چلنا اور مزمم، مزمم کا شور بلند کرتے رہنا (مکہ کے لوگ محمدؐ کے بجائے مذمم کہا کرتے تھے یعنی جس کی برائی کی گئی)۔''

''اس سے کیا ہوگا۔ محمد تو ایسے ہیں کہ انہیں کچھ بھی کہا جائے وہ سر جھکا کر سنتے رہتے ہیں۔''

''ہمیں ان سے کیا، مکہ کے باہر سے جو لوگ آئے ہوئے ہیں انہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ محمدؐ سچے نہیں ہیں اس لیے مکہ کے لوگ انہیں پسند نہیں کرتے۔ محمدؐ ہماری باتیں سن لیتے ہیں لیکن غیروں کے سامنے اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرسکیں گے۔''

☆......☆

امیہ بن خلف اپنے غلام کے ہمراہ خانہ کعبہ کی طرف جارہا تھا۔ اس کا ریشمی ملبوس زمین کا منہ چوم رہا تھا۔ غلام کے لیے لازم تھا کہ وہ اس کے ساتھ اتنا فاصلہ دے کر چلے کہ اس کا ملبوس غلام کے قدموں کے نیچے نہ دب جائے۔ آقا کی ہیبت ظاہر کرنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ غلام کے اوپری حصے پر کوئی لباس نہ ہو۔ یہ حبشی غلام تھا۔ سرخ آنکھیں، بال گھنگریالے، موٹے موٹے ہونٹ کسی قدر باہر کو نکلے ہوئے، جسم چھریرا لیکن مضبوط۔ آبنوسی رنگ جو دھوپ کی تمازت میں چمک رہا تھا پسینے کے قطرے اس کی ننگی پشت پر پہرا دے رہے تھے۔

خانہ کعبہ کی دیوار نے دھوپ کو اپنی طرف آنے سے روک رکھا تھا۔ اسی سائے میں کچھ عرب کچھ یمنی تاجر بیٹھے ہوئے تھے۔ امیہ بن خلف بھی ان کا ہم نشین ہوگیا۔ اس سائے میں کچھ فاصلے پر دو غلام اور بیٹھے تھے جو اپنے اپنے آقاؤں کے

ساتھ آئے ہوئے تھے۔ امیہ بن خلف کا غلام بھی اپنے آقا سے دور ہٹ کر ان غلاموں کے پاس بیٹھ گیا لیکن اس طرح جیسے اس کے سوا وہاں کوئی نہ ہو۔ مکہ کے اس معاشرے میں غلاموں کا کام صرف سننا تھا بولنا نہیں تھا۔ کسی محفل میں اگر دو غلام جمع ہو بھی جاتے تو سرگوشیوں کے سوا ان کے مقدر میں کچھ اور نہیں تھا۔ امیہ کا غلام تو کچھ زیادہ ہی وفادار تھا۔ آقا کے سوا کسی کو آنکھ بھر کے دیکھتا بھی نہیں تھا، بولنا تو درکنار، اس وقت بھی اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ اس کے دو ہم قسمت اور بھی بیٹھے ہیں پھر اس نے گھٹنوں میں سر دے کر زمین پر نظریں جمادی تھیں۔ وہ اپنے کانوں سے آقا کو دیکھ رہا تھا کہ آقا کی آواز کو جنبش ہو اور وہ زمین چھوڑے۔ اس کی سماعت بڑھ گئی تھی یا پھر اس کے اور آقا کے درمیان فاصلہ کم تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اس روز سب بازاروں میں تھے اردگرد سناٹا بہت تھا اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آج کچھ باتیں ایسی ہونے والی تھیں جو قدرت چاہتی تھی کہ غلام کے کان ان باتوں سے آشنا ہوجائیں۔

غلام کے کانوں میں آواز آئی، کوئی کہہ رہا تھا لو ابولہب آگئے۔ پھر اس کے کانوں میں آواز آئی، ان کے ساتھ ابوالحکم (ابوجہل) بھی ہیں۔ گفتگو کا لطف تو اب آئے گا۔ آقا کی آواز پر غلام نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس وقت تک ابولہب اور ابوجہل دونوں دیوار کعبہ کے سائے میں تشریف فرما ہو چکے تھے۔ غلام نے گردن پھر گھٹنوں میں چھپالی، اس کے بعد اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کچھ سننے کی کوشش کرتا۔

جب انسان خاموش ہوتا ہے تو اس کی روح بولتی ہے۔

وہ غلام تھا مگر انسان بھی تو تھا۔ خاموشی نے اس کا دھیان بٹایا تو وہ اپنے خیالوں میں گم ہوگیا۔ میرا باپ بھی ایک غلام تھا۔ وہ رات میں کیسے بھول سکتا ہوں جب وہ میری ماں سے کہہ رہا تھا، ہمیں چاہیے کہ ہم اسے مار ڈالیں۔ ہم نے اسے پیدا کر کے ہی غلطی کی۔ ہماری طرح یہ بھی زندگی بھر غلامی کرتا رہے گا۔ ہماری طرح ننگے پاؤں گھومتا رہے گا۔ ہماری طرح اس کی ہڈیاں بھی درد کرتی رہیں گی اور کوئی یہ سوچنے والا بھی نہیں ہوگا کہ یہ بھی انسان ہے۔ اسے بھی درد ہوتا ہوگا۔ میری ماں یہ سن کر رونے لگی تھی اور شاید اسی وجہ سے میری ماں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میرے باپ نے اپنا ارادہ نہ بدلا ہوتا پھر میری ماں مرگئی تھی۔ میں جوان ہونے لگا تھا۔ میں فروخت ہونے کے لائق ہوگیا تھا مگر شاید کسی غلام کو یہ حق بھی نہیں تھا۔ میرے باپ کا بھی آخری وقت آگیا اور اس نے مرتے وقت میرا ہاتھ امیہ بن خلف کے ہاتھ میں دے دیا اور جب سے آج تک میں
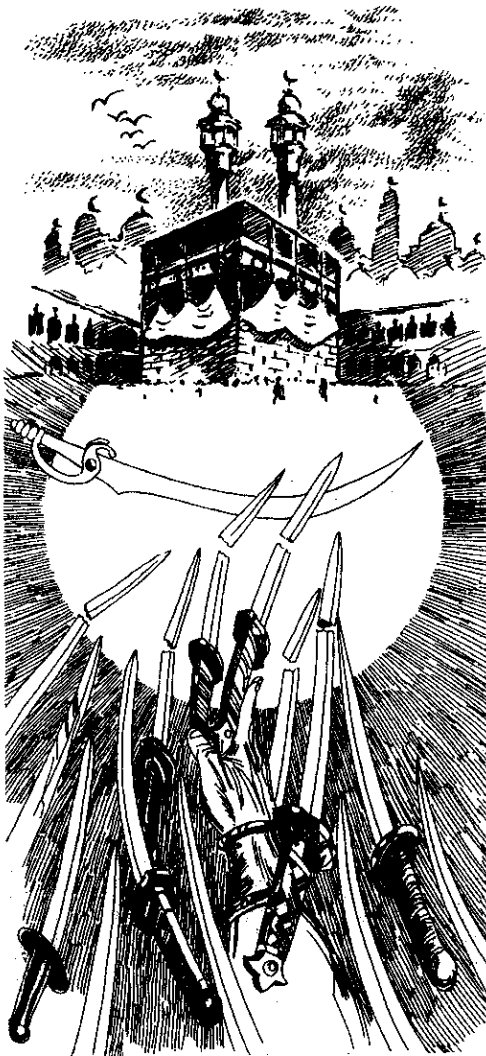
بنی جمح میں غلامی کے دن گزار رہا ہوں۔
وہ ان باتوں کو سوچتے سوچتے بڑی دور نکل گیا تھا۔ ابھی یہ سوچنا باقی تھا کہ اس کے والدین حبشہ سے مکہ کیوں آئے اور غلام کیوں بنا لیے گئے کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی محمدؐ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔
''اس نے تو وہ کام کیا ہے کہ آج تک کسی نے نہ کیا ہو گا۔ ہمارے خداؤں کو برا کہتا ہے۔ بھلا بتاؤ ہمارے تین سو ساٹھ خدا ہیں اور وہ کہتا ہے خدا تو صرف ایک ہے۔''
''وہ ایسا کیوں کہتا ہے۔ بظاہر تو اس کی ذہنی حالت ٹھیک ٹھاک ہے۔''
''اسے یہ وہم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا ہے جو اسے یہ سب بتاتا ہے۔''
کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے پھر کسی نے کہا۔ ''ہمارے خدا خود اس سے نمٹ لیں گے۔ کہنے دو جو وہ کہتا ہے۔''
''بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ صرف خداؤں کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو ایسی حرکتیں کر رہا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ہی بکھر کر رہ جائے گا۔ وہ کہتا پھر رہا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا ہے۔''
اس موقع پر امیہ کی آواز ابھری۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا میں اور میرے غلام برابر ہو سکتے ہیں۔''
یہ امیہ کی آواز تھی لہٰذا غلام نے اپنی عادت کے مطابق سر اٹھایا۔ مالک جب بھی آواز دے، غلام کو چوکنا ہو جانا چاہیے کہ کب کوئی حکم صادر ہو۔
''ابولہب! محمدؐ تمہارا بھتیجا ہے۔ تم ہی بتاؤ اسے ہوا کیا ہے۔ اچھے خاندان کا ہے۔ دولت مند بیوی کا شوہر ہے لیکن عیش و آرام کو چھوڑ کر غار حرا میں راتیں گزار دیتا ہے۔'' ابوالحکم نے پوچھا۔
''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' ابولہب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہمیں یوں شرمندہ کرے گا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ صادق بھی تھا امین بھی۔ ہم لوگ اس سے اپنے فیصلے کرایا کرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ......'' ابولہب اس کے آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔
امیہ کی آواز پھر ابھری۔ غلام نے پھر گھٹنوں سے سر اٹھا لیا اور اپنے آقا کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں ابوطالب کا خیال آ جاتا ہے کہ محمدؐ ان کا چہیتا ہے ورنہ ہم دیکھ لیتے۔''
''وہ تو ایسی راہ چل رہا ہے کہ اگر کامیاب ہو گیا تو غریب و نادار لوگوں کو ہمارے برابر لا کھڑا کرے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس طرح تو ہمارا کروفر ہی رخصت ہو جائے گا۔''
امیر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ''بلال!'' اس کی آواز گونجی۔
غلام یوں اس کے سامنے پہنچ گیا جیسے وہیں بیٹھا تھا۔
''کیا تو اور میں برابر ہیں؟ بتا ان سب کو۔''
غلام کی زبان ہی کب ہوتی ہے۔ وہ نظریں جھکائے، ساکت کھڑا رہا۔ امیہ نے اپنے ریشمی ملبوس کو جھٹکا دیا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔
ابوسفیان پہلے ہی جا چکا تھا ابوجہل بھی امیہ کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ غلام نے قدم ناپے اور اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔
اس وقت بھی امیہ اور ابوجہل محمدؐ ہی کی باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ غلام کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ سوچنا اسے آتا ہی نہیں لیکن اسی وقت وہ سوچ رہا تھا۔ محمدؐ نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ یہ لوگ ان کے دشمن ہو گئے ہیں جب کہ وہ انہی میں سے ہے۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں کچھ نہیں آئی تھیں۔ وہ بس اتنا سمجھ سکا تھا کہ محمدؐ جو چاہتے ہیں یہ لوگ نہیں چاہتے یہ بات اسے بھی عجیب سی لگی تھی کہ محمدؐ کہتے ہیں آقا اور غلام برابر ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ ہو نہیں سکتا لیکن اسے خوشی ہوئی تھی۔ محمدؐ تو بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں پھر یہ لوگ ان کے خلاف کیوں ہیں؟
حضرت محمدؐ کو اس نے صرف دو بار دیکھا تھا۔ اپنے خیالوں میں گم، پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے حرم کی طرف جا رہے تھے۔ اس کو ان کا اس طرح چلنا اچھا لگا تھا۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ کتنا بڑا انقلاب برپا کر چکے ہیں لیکن آج کی گفتگو سن کر وہ سوچنے لگا تھا کہ ان میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جو انہیں دوسروں سے مختلف بنا دیتی ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب اگر وہ کہیں نظر آئے تو ان کی طرف غور سے دیکھے گا۔
یہ موقع اسے صرف دو دن بعد ہی مل گیا۔ اس کا آقا امیہ بن خلف کہیں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اسی وقت ابوالحکم (ابوجہل) بھی دروازے پر آ گیا۔ اس کے مالک نے سواری کے لیے سرخ اونٹ نکلوایا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ کسی خاص جگہ جا رہا ہے، کہاں؟ یہ غلام کو نہیں بتایا جاتا اور غلام پوچھ نہیں سکتا۔
امیہ نے اونٹ پر سوار ہونے کے بعد اسے اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اونٹ کی رسی پکڑ لی۔ اونٹ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ابوجہل کا اونٹ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
راستے نے بتا دیا تھا کہ اس کا مالک عکاظ کے میلے کی

طرف جارہا ہے۔ اس کا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ کاش وہاں محمدؐ بھی آئے ہوئے ہوں۔ آج وہ انہیں غور سے دیکھے گا اور یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ ان میں ایسی کیا تبدیلی آگئی ہے کہ یہ لوگ ان سے دشمنی پر اتر آئے ہیں۔

وہ عجیب سرشاری کے عالم میں چل رہا تھا۔ حسب معمول اس کی پیٹھ ننگی تھی۔ غلام کی پیٹھ لباس کے لیے نہیں کوڑوں کے لیے بنی ہوئی ہے۔

وہ میدان قریب آتا جارہا تھا۔ کئی جانے پہچانے چہرے اس کے قریب سے ہو کر گزرے لیکن آج اسے صرف ایک چہرے کی تلاش تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس نے محمدؐ کی شان میں گستاخانہ الفاظ سنے جو ابوجہل کی زہریلی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ اپنے مالک کا قہقہہ سنا لیکن آج وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی نظریں آنے جانے والوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اونٹ کو ایک جگہ بٹھانے کے بعد وہ اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ابوجہل بھی ساتھ تھا۔

آتش بیان شعراء اپنے قصائد سے ماحول کو گرما رہے تھے۔ فخر و مباہات کی داستانیں سنائی جارہی تھیں۔ کہیں تیر اندازی کے مقابلے ہورہے تھے۔ کسی جگہ نیزے اچھالے جارہے تھے۔ یمنی، شامی اور فارس کے تاجر اپنا مال فروخت کرنے کے لیے دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔

یہ سب چیزیں ایسی تھیں جن میں اسے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا ان چیزوں کو بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا لیکن اب اسے اکتاہٹ ہورہی تھی۔ محمدؐ یہاں کیوں نہیں ہیں۔ وہ ہوتے تو میں انہیں دیکھتا۔ اس سے پہلے وہ نظر آئے تھے تو بھلا ایک غلام ان جیسے اعلیٰ درجے کے انسان کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔ بس ایک نگاہ ڈالی اور ہٹالی لیکن آج تو مجھے ان کے چہرے میں کچھ تلاش کرنا ہے۔

وہ اس دھن میں چلا جارہا تھا کہ اس کے آقا نے ایک دکان کے آگے پہنچ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ آقا کے ہر اشارے کو سمجھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دکان میں جارہا ہے اور غلام سے کہہ رہا ہے یہیں کھڑا رہ۔ شاید اس کی مراد پوری ہونے والی تھی اسی لیے اسے روکا گیا تھا۔ وہ اندھیرے میں جگنو تلاش کررہا تھا کہ روشنی میں نہا گیا۔ اسے سامنے سے حضرت محمدؐ آتے دکھائی دیئے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست ابوبکر صدیقؓ بھی تھے۔ انہیں وہ خوب جانتا تھا۔ وہ نہ جانتے ہوں لیکن وہ جانتا تھا ابوبکر صدیقؓ بھی بنی تیم کے محلے میں رہتے تھے جہاں امیہ کا گھر اور غلام کا غلام خانہ تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ وہ ہر وقت محمدؐ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔ اتنی دیر میں ایک روشنی سی اس کے قریب آگئی تھی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر آپؐ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھ کر آپؐ کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ ابھری۔ ایسی مسکراہٹ جو کسی عزیز کو دیکھ کر ہونٹوں پر جگہ بناتی ہے۔ وہ ان سے ہم کلام ہونے کے لیے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ امیہ کے قدم دکان سے باہر نکلے۔ وہ شاید اس وقت ان قدموں کو بھی نظر انداز کردیتا لیکن اس کے آقا نے خلاف معمول اسے آواز دے کر بلایا تھا۔ وہ اسے نام سے کبھی کبھی ہی بلاتا تھا ورنہ تو غلام یا غلام زادہ ہی اس کے ہونٹوں پر رہتا تھا۔

حضورؐ آگے نکل گئے تھے۔ وہ گردن گھما کر انہیں دیکھ بھی نہیں سکا اور آقا کی آواز پر دوڑا چلا گیا۔ امیہ نے کچھ سامان اس دکان سے خریدا تھا جسے اٹھانے کے لیے اس کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ بلالؓ نے سامان کی گٹھڑی کندھے پر دھری اور مالک کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چند قدم چلنے کے بعد امیہ نے بلالؓ سے پوچھا۔ ”غلام تو نے کچھ دیکھا۔“

”میں اپنے آقا کے سوا کس کو دیکھتا ہوں۔“

”کیا تو نے نہیں دیکھا محمدؐ تیرے سامنے سے گزرے تھے۔“

”میں تو انہیں پہچان بھی نہیں سکا۔“

”اچھا ہی ہوا۔ پہچاننے کی کوشش بھی مت کرنا۔ وہ ہم سب کا دشمن ہے۔ میرا دشمن ہے اور یاد رکھ جو میرا دشمن وہ تیرا دشمن۔“

بلالؓ نے اس کی بات کی تصدیق کی نہ تردید کی۔ یہ ایسی بات بھی نہیں تھی جس کی امیہ کو پروا ہوتی۔ وہ اکثر خاموش ہی رہتے تھے بلکہ تمام غلاموں کا یہی وتیرہ تھا۔ جب کچھ غلام کسی جگہ آپس میں مل جاتے تھے تو ایک دوسرے کو یہی تلقین کیا کرتے تھے کہ غلام وہ ہے جو سر جھکا کر آقا کی بات سنتا رہے۔

”یہ بات میں تجھ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ محمدؐ آج کل تم جیسے ناکارہ غلاموں کو ورغلاتا پھر رہا ہے۔ وہ غلاموں کو ان کے آقاؤں کے خلاف کردیتا ہے اور ان کے آقا ان غلاموں کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔“

یہ سیاہ فام غلام اپنے قدموں سے نہیں چل رہا تھا ورنہ الٹے قدموں لوٹ جاتا اور کہیں نہ کہیں محمدؐ کو تلاش کرلیتا ان کے تبسم کا ٹھنڈا پانی ایک مرتبہ پھر پی لیتا مگر وہ تو غلام تھا۔ غلاموں کی تو خواہشیں تک بک جاتی ہیں۔ وہ صرف جسم ہوتے ہیں

رئیس امروہوی

(1914ء-1988ء)

سید محمد مہدی نقوی رئیس امروہوی 14 ستمبر 1914ء کو امروہہ ضلع مراد آباد (یوپی بھارت) میں علامہ سید شفیق حسنؒ ایلیا کے ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایتؒ، ابن سید علیؒ بزرگ نسلِ مبارک سے تھے جو جید عالم دین اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ امام زادہ حضرت سید جعفر الذکیؒ ابنِ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے فرزند جلیل حضرت سید ہارون کی ساتویں پشت سے تھے جو سید علی بزرگ وسط شہر سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان آئے۔ 653ھ میں سوہدرہ کے مقام پر حضرت مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت کی ولادت باسعادت ہوئی اور حضرت سیدہ فاطمہ بنتِ حضرت مخدوم اعظم سید شیر شاہ جلال الدین حیدر سرخ پوش بخاریؒ (اوچ شریف بہاول پور) سے عقد ہوا۔ جو حضرت سلطان سید احمد کبیر بخاریؒ کی ہمشیرہ تھی۔ حضرت مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایتؒ نے 90 سال کی عمر میں 743ھ میں انتقال فرمایا۔ امروہہ میں آپ کا مزارِ مبارک مرجع خلائق ہے۔ آپ قبیلہ سادات نقوی امروہوی کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ آپ کے دو جلیل القدر فرزندِ ارجمند امیر قاضی سید علیؒ اور سید حسنؒ المعروف عبدالعزیز تھے۔ رئیس امروہویؒ امیر قاضی امروہی سید علی کی نسلِ مبارک سے تھے۔ نقوی امروہوی قبیلہ میں سید محمد میر عدلؒ ایک شجاع جنگ جو عادل منتظم گورنر بھکر سندھ تھے۔ شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر اعظم کے عہد میں "میر عدل" جیسے ممتاز عہد پر فائز تھے۔ میر سید

روح نہیں۔ ان کی بینائی صرف وہ دکھاتی ہے جو ان کا آقا انہیں دکھانا چاہتا ہے۔

یہی سیاہ فام غلام جب میلے سے واپس آیا اور رات غلام خانے میں زمین پر پڑ گیا تو اسے اس تبسم دلنواز کا خیال آ گیا جس کا دیدار اس نے بازار عکاظ میں کیا تھا۔ کیسی شفقت تھی اس تبسم میں، کیسی تسکین کیسی ٹھنڈک تھی۔ ہم غلام ہیں کسی اعلیٰ طبقے کا انسان ہماری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور محمدؐ نے میری طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے یا ان کی اعلیٰ ظرفی۔ کچھ بھی ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ محمدؐ اچھے اور سچے آدمی ہیں۔ پھر امیہ، میرا آقا یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ محمدؐ سے اس کی دشمنی ہے۔ انہوں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔ پھر اسے دیوار کعبہ کے سائے میں ہونے والی گفتگو یاد آئی۔

وہی اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا تھا کہ محمدؐ کہتے ہیں سب انسان برابر ہیں۔ میرے آقا نے مجھے نزدیک بلا کر مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا میں اور تو برابر ہیں۔ اس کا مطلب ہے ان لوگوں کو سب زیادہ تکلیف اسی ایک بات سے پہنچی ہے اور پہنچنی بھی چاہیے۔ ان لوگوں کی تو امارت ہی اس فرق پر قائم ہے۔ امیر لوگ آقا ہیں غریب غلام ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ یہ فرق ختم ہو۔ غلام تو محمد بھی خرید سکتے ہیں اور انہیں وہی ایذائیں پہنچا سکتے ہیں جو امیہ مجھے پہنچاتا ہے لیکن وہ تو اس نظام ہی کو ختم کیے دے رہے ہیں۔ پھر محمدؐ تو بہت اچھے آدمی ہوئے اور اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور فرشتہ ان کے پاس آتا ہے تو ضرور آتا ہوگا۔ وہ ضرور اللہ کے رسول ہوں گے۔ میرا آقا ان سے دشمنی رکھے میں تو انہیں دشمن نہیں سمجھ سکتا۔

اس دن کے بعد سے بلالؓ جب بھی آقا کے کسی کام سے باہر نکلتے ان کی آنکھیں کچھ ڈھونڈتی ہوئی نکلتی تھیں لیکن یہ معجزہ پھر نہیں ہوا کہ کھوئی ہوئی چیز دوبارہ مل جاتی۔ کئی مرتبہ انہوں نے سوچا کہ محمدؐ کے گھر چلے جائیں اور اس دلنواز تبسم سے فیض یاب ہو جائیں لیکن امیہ کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ وہاں جاتے تو امیہ کو ضرور خبر ہو جاتی۔ ابھی غلامی کی عادت اس پاکیزہ مسکراہٹ پر غالب نہیں آئی تھی بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آقا کا دشمن غلام کا دشمن۔

بازار عکاظ کے بیس دن پورے ہو چکے تھے۔ بیرونی قافلے ایک ایک کر کے مکے سے نکلے اور گرد و غبار میں گم ہو گئے۔ مکہ پھر اتنا رہ گیا جتنا تھا۔ وہی روز و شب تھے وہی معمولات تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن دیوار کعبہ کے سائے میں محفلیں جمتی تھیں۔ وہ بھی امیہ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان دنوں ایک ہی تذکرہ تھا۔ مکہ میں جو انقلاب برپا ہو رہا تھا اس کا تذکرہ۔ محمدؐ کی تعلیمات کا تذکرہ۔ اس تذکرے کا کوئی تعریفی پہلو نہیں تھا بلکہ ہر تقریر مخالفت میں ہو رہی تھی۔ ان شریر لڑکوں کی کارستانیاں۔ بیان کی جاتی تھیں جو محمد کو ستانے کے لیے ابوجہل کی جانب سے مامور کیے گئے تھے۔

بلالؓ ان باتوں کو روز سنتے تھے مگر حیرت کے سوا کچھ نہیں

سعادت علی سعادت جو ایک عظیم شاعر تھے خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل میر محمد تقی میر کے استاد گرامی کا اعزاز جاوید رکھتے تھے۔ رئیس امروہوی کے دادا سید نصیر حسن ابنِ سید امیر حسن اور والدِ معظم گرامی القدر علامہ سید شفیق حسن ایلیا جید عالم دین اور صاحب اسلوب شاعر، ادیب تھے۔ ابن خانہ ہمہ آفتاب است کا یکتائے روزگار نمونہ تھے اور آپ کے تین بھائی سید محمد تقی نقوی فلسفی صحافی، ایڈیٹر، سید محمد عباس نقوی ڈائجسٹ ایڈیٹر صحافی سید حسین اصغر جون ایلیا صاحب طرز شاعر، ادیب کالم نگار تھے۔ ان چاروں بھائیوں نے اقلیم سخن وصحافت پر شان وشوکت سے حکمرانی کی جب کہ سید امیر حیدر نقوی کمال امروہوی ابن سید انیس حسن نے فلم کی دنیا میں حکمرانی کی اور اداکاری کے جوہر دکھائے جو رئیس امروہویؒ کے چچازاد بھائی تھے۔ قبیلہ نقوی امروہوی عالمی شہرت یافتہ ہے ادیب اعظم علامہ سید ظفر حسن نقوی امروہوی بھی اسی قبیلہ کے قابل فخر چشم و چراغ تھے جو ایک جید عالم دین ومصنف مؤلف مترجم تھے۔ سید صادقین احمد نقوی بین الاقوامی شہرت یافتہ خطاط تھے۔ رئیس امروہویؒ روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر، کالم نگار، قطعہ نگار، شاعر، ادیب، ماہر نفسیات، صحافی، دانشور اور بیسیوں کتابوں کے مولف مصنف مترجم تھے۔ متعدد اعزازات اور صدارتی ایوارڈ یافتہ تھے۔ یکتائے روزگار ہر فن مولا تھے۔ 22 ستمبر 1988ء کو اپنے گھر کراچی میں حادثاتی موت سے انتقال کر گئے۔ اس وقت کالم لکھ رہے تھے علامہ عقیل ترابی نے نماز جنازہ پڑھائی اور سخی حسن قبرستان میں سپردِ خاک کر دیئے گئے۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

کر سکتے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ اتنے اچھے آدمی کو برا کیوں کہا جا رہا ہے۔

☆......☆

بلالؓ ان دنوں عبداللہ بن جدعان کی بکریاں معاوضے پر اپنے آقا کی مرضی سے چرایا کرتے تھے۔ صبح بکریاں لے کر نکلتے اور دوپہر کے بعد تک انہیں اچھی طرح کھلا پلا کر لے آتے (اکثر لوگ اپنے غلاموں کو اس طرح کے کاموں پر لگا دیتے تھے تاکہ جو کچھ وہ کمائیں اس میں بھی ان کا حصہ ہو۔ یہی وہ استحصالی نظام تھا جس کے خلاف حضرت محمدؐ آواز بلند کر رہے تھے)۔

اس دن وہ بکریوں کا ریوڑ لے کر مکہ سے باہر نکلے اور ہونے والی بات تھی، اس پہاڑ کی طرف جا نکلے جہاں غارِ حرا واقع تھا اور یہ بھی اتفاق کہ اس وقت حضرت محمدؐ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ غار میں تشریف فرما تھے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ سورج سر پر آ گیا تھا جھلسا دینے والی گرم ہوا چل رہی تھی۔ پیروں کے نیچے کی ریت آگ بن گئی تھی۔ سنگریزے انگارے بنے ہوئے تھے۔ بلالؓ کے ننگے بدن پر سورج کی کرنیں تیروں کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ یہاں سے نکل کر سایہ دار مقام تلاش کریں۔ واپس چلے جاتے تو سزا کے سزاوار ہوتے۔ مالک تو یہی کہتا کہ دھوپ سے گھبرا کر غلام بھاگ آیا۔

گرمی ایسی تھی کہ شاید جانور بھی جھلسنے لگے تھے۔ ایک بکری کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی۔ وہ ریوڑ سے الگ ہوئی اور دوڑتی ہوئی پہاڑی پر چڑھ گئی۔ یہ وہی مقام تھا جہاں غارِ حرا تھا۔ بلال اس بکری کو پکڑنے کے لیے اوپر کی طرف دوڑے۔ ان کی آواز شاید غار کے اندر تک پہنچ گئی تھی۔

حضورؐ نے آواز سن کر ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا۔ ”شاید کوئی چرواہا ہے جو اپنی بکریاں لے کر ادھر آ گیا ہے۔ اس سے پوچھو اگر اس کے پاس دودھ ہے تو ہم اُجرت دے کر خرید لیں۔“

حضرت ابوبکرؓ نے غار کے اندر سے باہر کی طرف دیکھا۔ ”ارے یہ تو بلال حبشی ہے، امیہ کا سیاہ فام غلام۔ مجھے جانتا بھی ہے۔ یہ ضرور ہمیں دودھ دے دے گا۔“

بلالؓ کے کانوں میں آواز آئی۔ کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ اس پکار میں حکم کا انداز نہیں تھا۔ شفقت ہی شفقت تھی۔ انہوں نے دھوپ سے نظریں بچا کر اس طرف دیکھا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ وہ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ یہ ہیں تو وہ بھی ہوں گے۔ ہر وقت ساتھ ہی تو رہتے ہیں۔ شاید اس وقت بھی......وہ اس طرف دوڑ پڑے لیکن اس قدر بوکھلائے ہوئے کہ ایک جگہ ٹھوکر بھی لگی۔

”بلال، تمہارے ریوڑ میں کوئی ایسی بکری بھی ہے جس کے تھنوں میں دودھ ہو۔“

”صرف ایک ہی بکری ہے وہ یہی بکری ہے جو پہاڑ پر چلی آئی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی یہاں آ گیا اگر

ارشاد ہوتو اس کا دودھ نکال کر پیش کروں۔''
بلال نے جواب کا انتظار کیے بغیر دوڑ لگا دی۔ بکری ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہی برتن میں دودھ نکالا اور غار کے دہانے پر آگئے۔ ابوبکر صدیقؓ نے اندر ہی سے آواز دی کہ وہ دودھ لے کر اندر آجائیں۔

غار حرا کے اندر جانے کا راستہ اتنا نیچا تھا کہ بلالؓ کو اندر جانے کے لیے اتنا جھکنا پڑا جیسے کوئی نماز کے دوران رکوع کی حالت میں ہوتا ہے۔ داخل ہونے کے بعد بائیں جانب چھت بھی اتنی نیچی تھی کہ جھک کر بیٹھنا پڑتا تھا اور وہ بھی آرام سے نہیں کیونکہ سطح بھی ہموار نہیں تھی۔ غار کی چٹانوں میں لمبی لمبی دراڑیں قدرتی طور پر تھیں جس سے ہوا اور روشنی اندر آرہی تھی۔ ان درزوں سے خانہ کعبہ کی عمارت صاف نظر آرہی تھی۔ اس غار کا کل رقبہ اتنا تھا کہ دس پندرہ آدمی آجائیں۔

بلالؓ اندر پہنچے تو دودھ کا برتن ان کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سانس لینا بھول گئے۔ ان کی مراد ان کے سامنے تھی۔ ایک گوشے میں حضرت محمدؐ تشریف فرما تھے۔ وہی دل کو چھو لینے والا تبسم ان کے ہونٹوں پر تھا جو بلال نے عکاظ کے بازار میں دیکھا تھا۔

دودھ کا برتن ابوبکر صدیقؓ نے ان کے ہاتھ سے لے لیا اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کردیا۔ حضورؐ نے ایک نظر دودھ کے برتن پر ڈالی اور بلال سے مخاطب ہوئے۔

''بلال، بیٹھو۔ کھڑے ہوئے کیوں ہو، تم نے میرے لیے دودھ لانے میں کتنی مشقت کی ہے تھک گئے ہوگے۔''

بلالؓ کی عادت حکم ماننا تھا اور یہ تو محمدؐ کا حکم تھا لیکن وہ ان اعلیٰ مرتبت ہستیوں کے قریب کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ وہ غار کے آخری سرے پر جا کر بیٹھ گئے جس طرح دیوار کعبہ کے سائے میں اپنے آقا سے دور بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی باتیں بھی صاف سنائی نہیں دیتی تھیں۔

''بلالؓ! اتنی دور کیوں بیٹھ گئے۔ میرے قریب آکر بیٹھو تاکہ میں تم سے باتیں کروں۔''

''میں تو ادنیٰ سا ایک غلام ہوں۔ میں آپ کے قریب کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔''

''یہی تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ کے نزدیک کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ نہیں۔ سب انسان بحیثیت انسان برابر ہیں۔ ہاں ان کے کام ادنیٰ یا اعلیٰ ہوسکتے ہیں۔''

بلالؓ اپنی جگہ سے اٹھے تو خوشی سے یا غم سے ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے اور حضورؐ کے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔

رسول اللہؐ نے بلال کے لائے ہوئے برتن سے دودھ نوش فرمایا اور خوب سیر ہو چکے تو برتن ابوبکر صدیقؓ کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے پیا اور وہ بھی سیر ہوگئے۔ انہوں نے دودھ کا برتن بلالؓ کی طرف بڑھا دیا۔ واہ! کیا خوب سودا تھا۔ بلالؓ تو بیٹھے بیٹھے جھومنے لگے۔ جس برتن کو رسول خدا کے ہونٹوں نے مس کیا تھا اسی برتن سے وہ دودھ پی رہے تھے، خوب سیر ہوکر پیا۔

''بلال! کیا تم نے سن رکھا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کیا تمہیں اس پر یقین ہے؟''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ غلط کہہ رہے ہوں گے۔''

''کیا تم نے وہ باتیں سن رکھی ہیں جو اللہ میری زبان سے کہلواتا ہے۔''

''میں نے تو صرف یہ سنا ہے کہ آپ بتوں کی پرستش کو منع کرتے ہیں۔ ایک خدا کو ماننے کا حکم دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تمام انسان برابر ہیں۔''

''بس اس کے سوا رہا کیا۔ جو کچھ تو نے سنا وہی تو میں ہوں۔ خدا تجھ پر اپنی رحمت کا سایہ ڈالے۔''

ان لفظوں میں تاثیر کی ایسی دنیا چھپی ہوئی تھی کہ وہ مضبوط سیاہ فام جس کی آنکھیں تک پتھر ہوگئی تھیں، موم کی طرح پگھل گیا۔ کب کے رکے ہوئے آنسو خراج بن کر پچھلی اذیتوں کا کفارہ ادا کرنے لگے۔

''بلال، روتے کیوں ہو۔''

''ایک یہی کام تھا جو مجھ سے آج تک نہیں ہوسکا تھا۔ وہ شفقت دیکھی ہی نہیں تھی جو دل پگھلاتی ہے۔ میرے تو والدین کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے۔ میں اچانک رئیس ہوگیا۔ آپؐ نے اتنی محبت میرے حوالے کردی کہ میں رونے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکا۔ اچھا اب تم جاؤ تمہارا آقا تمہارا منتظر ہوگا۔''

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' بلالؓ نے کہا اور حضورؐ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

''بلال، تمہیں اسلام مبارک ہو مگر اس کے اظہار میں جلدی مت کرنا۔ ابھی اہل مکہ میرے مخالف ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ ایسا نہ ہو تمہاری اذیتوں میں مزید اضافہ ہوجائے۔

جب حضورؐ کے حکم سے بلالؓ جانے کے لیے اٹھے تو حضورؐ اور ابوبکر صدیقؓ نے انہیں باری باری گلے لگا کر رخصت کیا۔ کوئی یاد ایسی نہیں تھی جو بلال کو یہ بتاتی کہ انہیں آج تک کسی نے گلے لگایا ہو۔

بلالؓ غار سے باہر آئے تو ان کی بکری اسی طرح کھڑی تھی۔ بلندی سے نشیب کی طرف دیکھا تو ریوڑ کی بکریاں اسی طرح ان کی منتظر تھیں۔ سب کچھ وہی تھا لیکن دل کی دنیا بدل گئی تھی۔ پہاڑ سے نیچے اترنے لگے تو محسوس ہوا بلندی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک لمحے کو یہ خیال بھی آیا تھا کہ انہوں نے اپنے آقا کی حکم عدولی کی ہے۔ ان کے دشمن سے دوستی کی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے احساس گناہ احساس فخر میں بدل گیا۔ غلام تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتے رہیں۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے امیہ سے اچھا آقا ملا ہے۔ اگر رازداری کا مرحلہ درمیان میں نہ ہوتا تو میں آج ہی امیہ سے کہہ دیتا کہ میری قیمت بہت اچھی لگی ہے۔ میں بک چکا ہوں۔ اب میرا آقا تو نہیں، کائنات کے سب سے افضل انسان نے مجھے خرید لیا ہے۔

وہ ریوڑ لے کر مکہ کی طرف چلے تو ان کی بکریوں کی چال ہی دوسری تھی۔ انہیں ایسا چرواہا اس سے پہلے کہاں ملا ہوگا۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو پھر وہی غلام بلال تھے۔ کوئی آنکھ بھر کے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ کسی کی نظر پڑتی بھی تھی تو بے اعتنائی سے منہ دوسری طرف پھیر لیتا تھا۔

وہ عبداللہ بن جدعان کے گھر کے قریب پہنچے تو اچانک ایک خوف نے حصار کرلیا۔ بکری کے تھن خالی ہو چکے ہیں۔ عبداللہ ضرور پوچھے گا دودھ کہاں گیا۔

اس دودھ کی جو اجرت حضورؐ نے ادا کی تھی وہ ان کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی لیکن وہ یہ کیسے بتائے گا کہ یہ دودھ اس نے کسے فروخت کیا۔

بلالؓ نے گھبرا کر بکری کے تھنوں کی طرف دیکھا۔ یہ کیا اس کے تھن اسی طرح دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ انہیں خود شک ہونے لگا کہ یہی وہ بکری تھی یا کوئی دوسری تھی۔

ان کے پہنچتے ہی عبداللہ بن جدعان نے حکم دیا کہ بکری کا دودھ نکال کر اس کے پاس لائے۔ حضورؐ کی دعا سے

برطانیہ سے تعلق رکھنے والے رچرڈ براؤنی نامی شخص نے ایک ایسا انوکھا کاسٹیوم تیار کیا ہے جسے پہننے والا آئرن مین کی طرح ہوا میں اڑان بھرتا ہوا دکھائی دے گا۔ چھوٹے جیٹ پیک سے مزین اس آئرن مین کاسٹیوم کے دونوں بازوؤں میں چھپے گیس ٹربائنز نصب ہیں اور ہر ٹربائن آٹھ سو ہارس پاور کی قوت پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ سوٹ پہننے والا 32.02 میل فی گھنٹے کی رفتار سے فضا میں اڑان بھر سکتا ہے جس کا عملی مظاہرہ بذات خود رچرڈ پیش کرچکا ہے۔ اس انوکھے سوٹ کی قیمت چالیس ہزار پاؤنڈ مقرر کی گئی ہے اور یہ جلد ہی مارکیٹ میں دستیاب ہوگا۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مے۔ لنڈن

بکری کے تھنوں میں دودھ نہ اترا ہوتا تو کتنی شرمندگی ہوتی۔ بلالؓ نے سوچا اور دودھ نکالنے بیٹھ گئے۔

دوسرے دن وہ بکریوں کا ریوڑ لے کر نکلے تو ان کے قدم خود بخود غار حرا کی طرف اٹھ گئے۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ بھی تھا کہ مکتب رسولؐ سے ابھی بہت سے سبق حاصل کرنے تھے۔ بکریاں پہاڑ کے نیچے چرتی رہیں اور بلالؓ اور عشق الٰہی کے اسباق پڑھتے رہے۔

مکہ کی فضا اتنی پُراسرار ہوگئی تھی کہ آنکھیں نگراں بنی ہوئی تھیں۔ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جارہی تھی۔ ہر بڑھتے ہوئے قدم کو دیکھا جارہا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے اٹھ رہا ہے۔ مکہ کی اعلیٰ سوسائٹی کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ محمدؐ کا پیغام آگے بڑھے، ان کے چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

بلالؓ کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک آنکھ نے انہیں بھی دیکھ لیا ہے۔ ابھی صرف چار دن گزرے تھے کہ ابوجہل، عبداللہ بن جدعان کے گھر آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اصل مقصد پر آگیا۔

''آج کل تمہاری بکریاں خوب موٹی ہورہی ہیں۔ دودھ بھی کچھ زیادہ ہی دے رہی ہوں گی۔''

''ہاں دیکھ تو میں بھی رہا ہوں۔ یہ سب بلال کی محنت ہے۔''

''بلال واقعی بہت محنت کر رہا ہے۔'' ابوجہل نے

تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ ''کون سی چراگاہ میں لے کر جاتا ہے؟''

''یہ سب باتیں غلاموں سے پوچھی تو نہیں جاتیں۔''

''تم بڑے بھولے ہو عبداللہ۔ ابھی میں امیہ کو اس معاملے میں ڈالنا نہیں چاہتا لیکن یہ بتا دوں کہ تمہارے غلام نے وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں ابوطالب کا بھتیجا بیٹھتا ہے۔''

پھر اس نے کہا۔ ''یہی تو میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔ تم اسے وہاں بکریاں چرانے سے منع کر دو۔ تمہارا غلام مذمم (محمدؐ) سے ملاقاتیں کرتا ہے اگر اب وہ وہاں گیا تو میں اس سے نہیں تم سے پوچھوں گا۔ میں نے سوچ لیا ہے جو محمدؐ سے ملے گا میں اس کا جینا دوبھر کر دوں گا اور جو ایسے لوگوں کی سرپرستی کرے گا اسے بھی معاف نہیں کروں گا۔''

''میں خود یہ برداشت نہیں کرسکتا۔''

ابوجہل تو ان دھمکیوں کے بعد وہاں سے اٹھ گیا لیکن عبداللہ بن جدعان سوچ میں پڑ گیا اگر میں بلال کو نکال دوں تو امیہ کا تو کچھ نہیں جائے گا۔ میرے بہت سے کام رک جائیں گے اور بلال اگر ابوالحکم سچ کہتا ہے، محمدؐ سے ملاقاتیں کرتا رہا تو میں اس کے انتقام کا نشانہ بنوں گا پھر اس کی خودغرضی نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ بلال کو غار حرا کے اردگرد بکریاں چرانے سے منع کر دے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ نہ مانا تو ابوالحکم جانے اور بلال۔

عبداللہ بن جدعان نے بلالؓ کو طلب کیا۔ گردن سینے سے لگی ہوئی، ہاتھ بندھے، آنکھیں جھکی ہوئیں۔ ایسا وفادار غلام حکم عدولی کیسے کرسکتا ہے، ابوالحکم کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ پھر بھی سرزنش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ عبداللہ بن جدعان نے بلالؓ کو منع کر دیا کہ بکریوں کو مکہ سے باہر اس طرف نہ لے جایا کرے جہاں غار حرا واقع ہے۔ غلام کی کیا مجال کہ حکم ٹال سکے۔ وہ کرے جو وہ چاہے، وہ نہ کرے جو اس کا مالک چاہتا ہے۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ابھی جذبوں کی بغاوت پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس کا احساس بھی ہوگیا کہ ان کی نگرانی کی جارہی ہے۔ انہوں نے چراگاہ بدل دی۔ مکہ سے باہر ضرور نکلے لیکن دل پر پتھر رکھ کر کسی اور طرف نکل جاتے۔ ایک مرتبہ چوری کر بھی لی۔ چھپ چھپا کے غار حرا پہنچ گئے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر جھانکا۔ غار خالی پڑا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں قسمت ہمیشہ یاوری کرے۔ دو گرم آنسو رخساروں کو تسلی دیتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ فرمان رسول یاد آیا۔ ''اسلام کے اظہار میں جلدی مت کرنا۔ ایسا نہ ہو تمہاری اذیتوں میں اضافہ ہو جائے۔''

ابھی تک فرمانِ رسولؐ پر عمل کیا تھا۔ کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ایمان لے آئے ہیں۔ اس مہتاب کی طرح دمکتے چہرے کی یاد آتی تھی تو اندھیری کوٹھڑی میں، سونے سے پہلے آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیا کرتے تھے۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کفار کی سختیوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس مخالفت میں سرداران مکہ کی مرضی شامل تھی اس لیے مفسدوں کو خوب شہ مل رہی تھی۔

ان سرداران مکہ کو جن کا سرغنہ ابوجہل تھا اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ تحریک زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں بلکہ ایک انقلاب ہے۔ اگر کامیاب ہوا تو ہر اس ستون کو گرا دے گا جس پر ہمارے نظریات کی چھت ٹکی ہوئی ہے۔ جو ہمارے زیردست ہیں، روایتوں کے قفس سے نکل بھاگیں گے۔ دولت کی تقسیم کا گورکھ دھندا ہی بکھر کر رہ جائے گا۔ ہمارے عیش وعشرت کے سب سامان خاک میں مل جائیں گے۔ یہ تحریک صرف نظام کو نہیں، یہ تو انسان ہی کو بدل دے گی۔ محمد کہتا ہے جو دولت مند ہیں اپنی دولت میں غریبوں کو شریک کریں۔ وہ تو ہماری اقدار ہی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کہتا ہے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ وہ ہمارے رسم ورواج ہی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ عورتوں اور مردوں میں بھی مساوات قائم کرتا ہے۔

بلال غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں باہر نکلنے اور لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن تھے تو وہ مکہ میں، اڑتی اڑتی بہت سی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی دو غلام کسی جگہ مل جاتے تھے تو تبادلہ خیال ہو جاتا تھا۔ ایک دن کسی نے یہ خبر سنائی کہ ابوسفیان کی بیوی اس راستے پر گندگی ڈال دیتی ہے جدھر سے محمدؐ کو گزرنا ہوتا ہے۔ شریر بچے آپؐ پر آوازیں کستے ہیں، کنکریاں اچھالتے ہیں، راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں۔

کفار کی ان حرکتوں کی ہر خبر پر بلالؓ کے دل میں خون کی ایک بوند جم جاتی تھی۔ انہیں شدت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک غلام ہیں۔ اگر وہ کسی باعزت خاندان کے فرد ہوتے تو محمدؐ کے لیے سینہ سپر ہو جاتے۔ فرمان رسول بھی یاد آتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے جلدی مت کرنا۔ اب تک وہ اس عہد پر قائم تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مکہ کا انقلاب ان کے دل کو مرکز بنا کر اس میں ٹھہر گیا ہے۔ انہیں احساس ہوگیا تھا کہ ان کا آقا امیہ اور ان جیسے دوسرے سردار ہم غلاموں کا

خون چوس چوس کر ریشم پہن رہے ہیں، شراب پی رہے ہیں، سود کھا رہے ہیں اور محمدؐ کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ان سب باتوں سے انہیں روکتے ہیں۔

ہر آنے والا دن بلالؓ کے غصے میں اضافہ کرتا رہا۔ ایک روز وہ حرم کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انہیں کعبہ دیکھ کر یاد آ گیا کہ یہاں بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہی بت جنہیں یہ کفار پوجتے ہیں۔ ان سے منتیں کرتے ہیں۔ ہبل تم میرا اونٹ تلاش کردو۔ میں بار بار تمہارے در پہ حاضری دوں گا۔ یہ عجیب بات ہے۔ خدا کو مانتے بھی ہیں اور بتوں سے مانگتے بھی ہیں۔ ان کی ناقص عقلوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لکڑی اور پتھر کے ان بتوں میں روحانی جوہر چھپا ہوا ہے۔ ہر قبیلے کا الگ بت ہے جب کہ خدا رب العالمین ہے۔ بتوں کی پرستش انسانوں کو آپس میں بانٹتی ہے۔ کبھی کبھی تو آپس میں خونریزی ہو جاتی ہے۔ ایک قبیلہ کہتا ہے میرا بت بڑا ہے دوسرا قبیلہ کہتا ہے میرا بت عظیم ہے۔ اگر سب ایک خدا کو مانیں تو بڑے اور عظیم کا فرق ہی مٹ جائے۔ یہ بت بول نہیں سکتے، کوئی ہدایت نہیں دے سکتے اس لیے بھی ان نادانوں کو یہ بت عزیز ہیں کہ ان کی بداعمالیوں پر یہ بت سرزنش نہیں کر سکتے کوئی ہدایت جاری نہیں کر سکتے۔ من مانیاں کرنے کی کھلی آزادی مل گئی ہے۔ خدا کو مانیں تو اس کے احکام پر عمل بھی کرنا پڑے گا۔ محمدؐ ان کی بنیادیں ہلا رہے ہیں۔ وہ رانیت کا سبق پڑھا رہے ہیں، اسی لیے یہ لوگ متحد ہو کر ان کی مخالفت پر اتر آئے ہیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے خیالوں میں گم رہے۔ اپنے آپ سے سوال جواب کرتے رہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ گرم دوپہر کا سناٹا سب کو ہڑپ کر گیا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ بس ایک نفرت تھی جو ان کے دل میں دھڑک رہی تھی۔ وہ کسی ارادے سے کعبے میں داخل ہوئے۔ ایک مرتبہ پھر اچھی طرح اطمینان کرلیا کہ کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اسی وقت چند قریشی بھی اندر داخل ہوئے بلالؓ انہیں دیکھ نہیں سکتے اور بتوں پر تھوکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے۔ ”جس نے بھی تمہاری عبادت کی اور پوجا کی وہ نقصان میں رہا۔“

قریش نے دیکھا تو چیخنے لگے اور انہیں پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ بلالؓ نے جب دیکھا کہ دیکھ لیے گئے ہیں تو پورے قوت سے بھاگے اور کعبہ سے نکل کر عبداللہ بن جدعان کے گھر کی راہ لی۔ یہ رات کا اندھیرا نہیں تھا کہ انہیں چھپا لیتا۔ دن کی چمکیلی دھوپ تھی۔ بہت سے لوگوں نے انہیں دیکھا۔ یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جا کر چھپے ہیں۔

قریش، عبداللہ کے گھر کے آگے جمع ہو گئے۔ جس جس کو معلوم ہوا دوڑا ہوا آیا۔ ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ شور سن کر عبداللہ بن جدعان گھر سے نکل آیا۔

”عبداللہ، کیا تو صابی ہو گیا ہے۔“ لوگوں نے زور زور سے کہنا شروع کر دیا۔

”تم لوگ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اگر میں صابی (جو مسلمان ہو جاتا تھا اسے صابی کہتے تھے یعنی جو دین سے پھر گیا ہو) ہو گیا ہوں تو میرے لیے ایک سو اونٹ کی قربانی لات وعزیٰ کے نام پر واجب ہے۔“

”تو نہیں تو پھر تیرا غلام صابی ہو گیا ہے۔“

”کیا ہوا۔ کیا کیا ہے اس نے۔“

”اس نے ہمارے بتوں پر تھوکا ہے ان کی تذلیل کی ہے۔“

”تمہاری مراد بلال سے ہے۔“

”ہاں، تم نے اسے چھپا لیا ہے۔“

”میں نے اسے نہیں چھپایا۔“

”تو پھر اسے باہر نکالو۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”وہ میرا نہیں امیہ کا غلام ہے۔ میرے پاس تو وہ معاوضے پر بکریاں چراتا ہے۔“

”ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کس کا غلام ہے۔ اسے ہمارے حوالے کرو۔“

”تم لوگ امیہ کے پاس جاؤ۔ اسے بلا کر لے آؤ پھر وہ جو فیصلہ کرے۔“

یہ جرم معمولی نہیں تھا کہ لوگ واپس پلٹ جاتے۔ انہوں نے عبداللہ کے گھر کا گھیراؤ کرلیا کہ بلال جو اندر چھپے ہوئے ہیں بھاگ نہ جائیں اور کچھ لوگ امیہ کو بلانے چلے گئے۔ وہ آیا تو ابوجہل بھی اس کے ساتھ تھا۔ عبداللہ نے بلال کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔

”تم اس کے مالک ہو۔ اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔“

اس آواز کے ساتھ ہی شور کی آواز دب گئی جیسے مجمع سانس لینا بھول گیا ہو۔ یہ خاموشی سننا چاہتی تھی کہ امیہ اس حبشی غلام کے حق میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا

جب بلالؓ کی گردن اپنے آقا کے سامنے آنے کے باوجود نہیں جھکی تھی۔ اس کی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن نہیں پڑی تھی۔ بے خوفی چہرے سے ظاہر تھی۔ امیہ اس گستاخی کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور غلام کے ہونٹوں سے نکلنے والا خون اس کی ٹھوڑی تک پھیل گیا۔

''حبشی غلام کان کھول کر سن لے، تیرا خدا وہی ہے جو تیرے آقا کا خدا ہے، کوئی نیا خدا میرے غلام خانے میں نہیں لایا جاسکتا۔ بھیڑوں کے ساتھ بکنے والے مکروہ انسان! تیری اصلاح کرنی پڑے گی۔''

وہ لوگ اب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ بلال بہت تیز دوڑتا ہے، کسی وقت بھی بھاگ سکتا ہے۔ اس مرتبہ بھاگا تو محمدؐ کے گھر میں پناہ لے گا۔ وہاں پہنچ گیا تو اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ کہیں سے رسی منگوائی گئی اور اس کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب باندھ کر ایک سرا لوگوں نے پکڑ لیا اور امیہ کے غلام خانے تک لے گئے۔ یہاں پہنچ کر اس کی ٹانگیں بھی رسیوں سے جکڑ دی گئیں۔ قربانی کی گائے کی طرح اسے غلام خانے کے فرش پر گرادیا گیا۔

''حبشی غلام! صبح کا انتظار کر یا اپنا فیصلہ بدل ڈال۔''

امیہ نے کہا اور غلام خانے سے باہر آگیا۔

بلالؓ نے دروازہ بند ہوتے اور خود کو اندھیرے میں اترتے ہوئے دیکھا۔ پھر کوٹھڑی میں چاروں طرف جگنو چمکنے لگے۔ ایک سراپا اس کے سامنے آگیا۔ پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، بلند گردن، سرگیں چشم، باریک ابرو، کلائیاں دراز، ہتھیلیاں فراخ، انگلیاں موزوں، رنگ سرخی مائل، چاندی سے بدن ڈھلا ہوا۔

ان کا شعور اپنے لاشعور کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی سراپا تھا جس سے وہ چند ملاقاتیں کر چکے تھے۔ ان کے شفقت بھرے تبسم کو وہ کیسے بھول سکتے تھے۔ وہی تبسم میرا مشعل راہ بنے گا۔ احتیاط کی ہر دیوار گر گئی۔ میں اسی تبسم کی روشنی میں چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں اب مجھ سے کہا جائے گا کہ میں اس تبسم کو بھول جاؤں، نہیں، اب اگر امیہ آیا تو میں اس سے کہہ دوں گا۔ میں اب کہیں فروخت ہو چکا۔ اب میں تیرا غلام نہیں رہا۔ اب میں تیرے کسی کام کا نہیں۔ تو مجھے آزاد کردے ورنہ میری روح مجھے آزاد کردے گی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ بلالؓ جانتے تھے کہ طلوع فجر کے ساتھ ہی ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن آج کی رات خوف ان سے دور ہٹ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ طاقت اور دلیری کا سیلاب تھا جو ہر طاقت کو تنکے کی طرح بہالے جانے کے لیے بل کھا رہا تھا۔ اسی وقت دروازے کو جنبش ہوئی۔ کوئی تھا جس نے اندر آتے ہی چراغ روشن کیا بلالؓ نے لیٹے لیٹے ایک آنکھ کھولی۔ امیہ اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ کیا صبح ہوگئی؟ بلال نے سوچا۔

''میں صبح ہوتے ہی پہلے تجھے ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں۔'' امیہ نے کہا۔ ''سچ سچ بتا تیرا معبود کون ہے۔''

''محمدؐ کا معبود میرا معبود ہے۔'' بلالؓ نے ایسی بے خوفی سے کہا جس کی اس سے کیا کسی بھی غلام سے اُمید نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ جواب سن کر امیہ پر کیا گزر رہی ہوگی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

''تو ہمارے خداؤں سے منکر ہوگیا ہے۔''

''خدا تو ایک ہوتا ہے اس کے علاوہ جتنے ہیں وہ لکڑی ہیں یا پتھر۔''

''بدبخت! مجھے تیری جان لینی پڑے گی۔''

''آقا! اب میری یہ جان میری نہیں رہی۔''

''محمدؐ نے تجھے اور کیا سکھایا ہے۔''

''کہ اللہ کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔''

''اور۔''

''وہ نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں۔''

''اور۔''

''تمہاری طرح بتوں کی پرستش کو منع کرتے ہیں۔''

''اور۔''

''ایک خدا کو ماننے اور اس کی عبادت کی تلقین کرتے ہیں۔''

''اور بتا بدبخت۔''

''اور یہ کہتے ہیں کوئی آقا کوئی غلام نہیں۔''

''کیا تو میرا غلام نہیں؟''

''شاید اب نہ رہوں۔''

''اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تیری جان لے کر تجھے آزاد کردوں گا تو یہ تیری بھول ہے۔ میں تجھے مرنے نہیں دوں گا لیکن تیری حالت مُردوں سے بدتر کردوں گا۔ تو اگر میرے لائق نہیں رہا تو میں تجھے محمدؐ کے لائق بھی نہیں رہنے دوں گا۔''

امیہ بے بس بچے کی طرح بلال کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ اسے اس وقت یہ غصہ نہیں تھا کہ بلال وحدانیت کی

گردان کر رہا ہے۔ اسے تو یہ جھنجلاہٹ تھی کہ اس کا غلام آج اس کے سامنے زبان کھول رہا ہے۔ ایک امیہ ہی نہیں عرب کا پورا معاشرہ خود غرضی کا شکار تھا۔ سرداران مکہ اس لیے اسلام کی مخالفت کررہے تھے کہ اسلام کا فلسفے سے براہِ راست ان کی شان و عظمت پر چوٹ پڑ رہی تھی۔ امیہ کی شان و عظمت اس وقت مٹی میں مل گئی تھی۔ اس کا غلام اس سے بحث کررہا تھا۔

امیہ نے جھنجلائے ہوئے آدمی کی طرح زمین پر پڑے رسیوں میں جکڑے ایک آدمی کے جسم پر کئی ٹھوکریں رسید دیں، کمزور آدمی کی طرح کئی غلیظ گالیاں بکیں اور زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں باہر کی روشنی کمرے میں پڑے بلال کو جھانکنے لگی، پھر وہ ان کی مزاج پرسی کے لیے کمرے میں داخل ہوگئی۔

دن نکل آیا۔ امیہ اب تک نہیں آیا۔ بلال سوچ رہے تھے۔ میری سزا مجھ سے دور نہیں ہے لیکن یہ سزا کیا ہوسکتی ہے۔ سزا کوئی بھی ہو، اب میرے عزائم کو موت نہیں آسکتی۔ جب بات کھل ہی گئی ہے تو اب جو بھی ہو میں احد احد کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ کمرے میں دھوپ بھر گئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وقت اتنا ہوگیا ہے کہ جوتوں میں پاؤں جلنے لگیں گے۔ صحرا کے رخسار گرم ہوگئے ہوں گے۔ ریت کہہ رہی ہو گی مجھ پر پاؤں مت رکھو۔ چٹانوں پر سورج اتر آیا ہوگا، سنگریزے انگارے بن گئے ہوں گے۔ اس احساس کے ساتھ ہی باہر کی گرمی اندر اترنے لگی۔ ہونٹوں پر زبان پھیریں تو زبان چھل گئی۔ کون ہے جو مجھے پانی پلائے۔ کون پلاسکتا ہے؟ غلام کو تو ہر کام خود کرنا پڑتا ہے اور غلام کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وہ گھسیٹتے ہوئے پانی کے مٹکے تک گئے جو ایک کونے میں رکھا ہوا تھا اور اپنے سر سے مٹکے کو لڑھکا دیا پانی گرتے ہی انہوں نے زبان، پانی پر رکھ دی۔ اتنا ہوا کہ زبان تر ہوگئی۔ اسی وقت اس کی طرح کے دو بدقسمت غلام کمرے میں داخل ہوئے۔ سیاہ فام نہیں تھے لیکن تھے تو غلام۔ ان سے جو کہا جارہا تھا وہ وہی کررہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی بلال کی رسیاں کھول دیں۔ خوش فہمیاں بھی کیا ہوتی ہیں۔ بلالؓ یہ سمجھے کہ انہیں آزاد کیا جارہا ہے۔ امیہ ان کی کسی دلیل سے مطمئن ہوگیا ہے اور ابھی اپنے حضور طلب کرکے کہے گا، میری طرف سے تو آزاد ہے جس طرف جی چاہے بھاگ جا۔ ان کے پاس آنے والے دونوں غلام ان کے شناسا تھے۔ ان میں سے ایک ابوجہل کا غلام تھا دوسرا ابوسفیان کا۔ یہ دونوں کہیں ملتے تھے تو خوب باتیں ہوتی تھیں لیکن اس وقت دونوں کی زبان پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ بلالؓ نے پوچھا بھی کہ وہ اسے کہاں لے جارہے ہیں مگر دونوں خاموش تھے جیسے کوئی چھپ کر انہیں سن رہا ہو۔

وہ دونوں بلال کو لے کر محلے سے ذرا دور ایک میدان میں آگئے۔ یہاں قریشی جمع تھے۔ بلال نے امیہ اور ابوجہل کو بھی دیکھا۔

''بلال، تو اب کیا کہتا ہے کون ہے تیرا معبود۔''

''محمدؐ کا معبود میرا معبود ہے۔''

''سن لیا تم سب نے۔ اب اس کی اصلاح ضروری ہوگئی ہے۔ اس نے ہمارے خداؤں کی توہین کی ہے۔ اہل مکہ اب اتنے مفلس بھی نہیں ہوگئے کہ ان کا ایک خدا ہو، تین سو ساٹھ نہ ہوں۔''

بلالؓ کو معلوم بھی نہ ہوا اور کسی نے انہیں دھکا دے کر زمین پر گرادیا۔ پھر اس طرح لٹا دیا کہ ان کی کمر جلتی ہوئی ریت پر ٹک گئی۔ ایک بھاری چٹان جو دھوپ کی تپش سے جلنے لگی تھی، ان کے سینے پر رکھ دی گئی۔ اب وہ اٹھنا بھی چاہتے تو نہیں اٹھ سکتے تھے۔ کمر ریت کے کوئلوں میں بھن رہی تھی۔ سینے پر رکھے پتھر کا اتنا بوجھ تھا کہ تپش کا خیال ہی جاتا رہا تھا۔ سینے اور پسلیوں میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ سانس لیتے وقت پتھر کو جنبش بھی دے سکیں۔ ایسے رخ پر لٹایا گیا تھا کہ سورج کی کرنوں کے نیزے آنکھوں میں اتر رہے تھے۔ اس لیے آنکھیں بند کرلینا لازمی تھا۔

''شواپ۔'' ایک آواز ابھری۔ درد کی ایک لہر اٹھی اور بلالؓ کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ انہوں نے دیکھا امیہ بن خلف کے ہاتھ میں کوڑا ہے اور وہ اسے ہوا میں لہرا رہا ہے پھر یہ کوڑا نیچے کی طرف آیا۔ بلالؓ کا جسم ایک جھٹکے سے اوپر کی طرف اچھلا اور پھر ریت پر گر گیا۔

امیہ کوڑے برساتے برساتے تھک چکا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور بلالؓ سے پوچھا۔ ''ایک خدا کا نشہ اترا یا نہیں۔''

''احد احد، خدا ایک ہے، خدا ایک ہے۔''

امیہ نے پھر کوڑا رسید کیا۔ انسانیت پھر چیخنے لگی۔ بلالؓ کی چیخیں احد احد میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ پھر یہ چیخیں مدھم ہوتے ہوتے خاموش ہوگئیں۔ وہ بے ہوش ہوچکے تھے۔ دھوپ کی شدت میں بھی کمی آنے لگی تھی۔ کوڑے مارنے والا ہاتھ بھی تھک چکا تھا۔ انہیں اٹھا کر غلام خانے

کے ننگے فرش پر ڈال دیا گیا۔
جب کوئی زخمی ہوتا ہے تو اس کی تیمارداری کی جاتی ہے، اس کے زخموں پر مرہم لگایا جاتا ہے لیکن بلالؓ کا تیماردار کون تھا؟ ان کے زخموں پر مرہم کون رکھتا؟ وہ خود ہی ہوش میں آگئے۔ ہلنے کی کوشش کی تو ہلکی سی ایک کراہ نکل گئی۔ اندھیرے میں کوڑوں کے نشان نظر نہیں آتے تھے لیکن تکلیف بتا رہی تھی کہ کوڑے اپنے نشان چھوڑ گئے ہیں۔ وزنی پتھر جسم پر رکھے رہنے سے پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ وہ دکھتے ہوئے بدن کو گھسیٹتے ہوئے پانی کے گھڑے کی طرف گئے۔ ابھی اس میں پانی موجود تھا۔ اس وقت یہ پانی آب حیات سے کم نہیں تھا۔ پانی پیا تو حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ ابھی پہلا دن تھا بدن پر نشان تو تھے لیکن یہ نشان ابھی زخم نہیں بنے تھے۔ امیہ کو بھی یہ توقع تھی کہ اس سزا کے بعد ہوش ٹھکانے آگئے ہوں گے لہٰذا وہ ان کے پاس آیا۔ ایک غلام ایک برتن میں شوربا اور کچھ روٹیاں لیے ہوئے اس کے ساتھ تھا۔
''مجھے یقین ہے، تجھے اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ تو کتنا بڑا جرم کر بیٹھا ہے۔ یہ کھانا کھالے اور اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ۔''
امیہ انہیں مشورہ یا دھمکی دے کر چلا گیا۔ بلال کے سامنے روٹی رکھی تھی۔ دن بھر کے بھوکے تھے اور اتنی اذیت سے گزر چکے تھے۔ دوسرے دن کا علم نہیں تھا کہ اور کیا بیت جائے۔ انہوں نے اللہ کا نام لیا اور روٹی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔
دوسرے دن جب دن چڑھ گیا اور زمین گرم ہو گئی تو بلال کو ایک مرتبہ پھر غلام خانے سے نکالا گیا اور جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر پہلے سے بھی زیادہ وزنی پتھر رکھ دیا گیا۔ امیہ نے کوڑا اٹھایا اور مارتے مارتے تھک گیا۔ ہر ضرب کے بعد تقاضا کرتا تھا کہ بلال اس کے خداؤں کو تسلیم کرے۔ بلال ہر تقاضے کے جواب میں احد احد پکارتے۔
ابھی ایک دن پہلے کے کوڑوں کے نشان ختم نہیں ہوئے تھے کہ کوڑے پھر برسنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خون رسنے لگا۔ پتھریلی گرم زمین کمر کو جھلسا رہی تھی لیکن بھاری پتھر سینے پر رکھے ہوئے تھے جنبش بھی نہیں کر سکتے۔
یہ ایسی سزا تھی کہ امیہ کے خیال میں بلالؓ کو نصیحت ہو جانی چاہیے تھی لیکن جب دھوپ ڈھل گئی اور امیہ کے بازو شل ہو گئے تو وہ حیران رہ گیا۔ بلال کی زبان پر اب بھی اللہ کی وحدانیت کے سوا کوئی کلمہ نہیں تھا۔ پتھر ہٹا دیے گئے۔ بلال کو سہارا دے کر اٹھایا تو قریش نے دیکھا بلال کی پیٹھ پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے ہیں جنہیں یقیناً دوسرے دن زخم بن جانا تھا۔
بنو جمح کے لوگوں کو بلال کی حالت دیکھ کر افسوس تو ضرور تھا لیکن ان کے نزدیک یہ بھی ضروری تھا کہ بلال کی اصلاح کی جائے، اگر بلال کو سزا نہیں دی گئی تو دوسرے غلاموں کی ہمت بڑھ جائے گی۔
تیسرے دن بلالؓ کو دھوپ بھرے میدان میں لایا گیا تو تماشائیوں نے دیکھا کہ بلالؓ کی کمر کے چھالے پھوٹ گئے ہیں اور ان سے خون اور پانی بہہ رہا ہے۔ سخت اذیت میں ہیں لیکن زبان سے احد احد کی آوازیں ادا ہو رہی ہیں اور جب انہیں زمین پر لٹایا گیا تو کافروں کے پتھر دل بھی رونے لگے۔ بلال کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں لیکن امیہ کو رحم نہ آیا۔ ایک بڑا پتھر ان کی چھاتی پر رکھ دیا گیا۔ امیہ نے کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ جب وہ تھک گیا تو انہیں دھوپ میں جلتا چھوڑ کر خود ایک جگہ سایہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔
ورقہ بن نوفل اس تماشائیوں کی بھیڑ میں کھڑے تھے۔ وہ اس تشدد کی تاب نہ لا سکے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے بلالؓ کے قریب پہنچے اور ان کے کان میں سرگوشی کی۔
''بلال! تکلیف سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے لیے جو یہ کہتے ہیں اس کو قبول کر لو کہہ دو کہ تم آئندہ لات اور عزیٰ کی پرستش کرو گے، مجھ سے تمہاری یہ تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ تم امیہ کا مطالبہ مان لو اور وقتی طور پر ہی سہی، چھٹکارا حاصل کر لو۔''
بلالؓ کی نحیف آواز ابھری۔ ''میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ مجھے قتل بھی کر دیں تو اللہ تعالیٰ بہترین انتقام لینے والا ہے۔ وہ میری مغفرت فرمائے گا۔ میں کسی صورت ان کی بات ماننے والا نہیں ہوں۔ میرا رب الصمد اور احد ہے۔''
ورقہ بن نوفل ان کے استقلال کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے اور امیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تو نے اسے مار ڈالا تو میں اس کی قبر پر درگاہ تعمیر کروں گا۔''
امیہ نے جب دیکھا کہ ورقہ بن نوفل جیسا عالم، بلال سے متاثر ہو رہا ہے تو اس نے حکمت عملی تبدیل کر لی۔

دوسرے دن اس نے بنو جمح کے لڑکوں کو جمع کیا اور بلال کے گلے میں رسی ڈال کر وہ رسی ان لڑکوں کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ان لڑکوں نے رسی کو زور سے جھٹکا دیا جس سے بلال نیچے گر گئے۔ لڑکوں نے انہیں زمین پر گھسیٹنا شروع کیا اونچی نیچی پتھریلی زمین پر گھسیٹتے پھرے۔ یہ سزا پہلے سے بھی بڑھ کر تھی۔ نوکیلے پتھروں کی رگڑ سے پورے بدن پر زخم ہی زخم ہو گئے۔ گردن کی رسی کو وہ اس زور سے کھینچ رہے تھے کہ دم گھٹ رہا تھا۔ لڑکوں کے قہقہے بازار کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور جب ان کی نظر بلالؓ پر پڑتی تھی تو وہ بھی اس تماشے میں شریک ہو کر قہقہے لگانے لگتے تھے۔ بعض تو یہ کہتے نظر آ رہے تھے کہ اس حبشی غلام نے ہمارے خداؤں کی توہین کی تھی، اب خدا اسے سزا دے رہے ہیں۔ جب شام ہونے لگی تو ان لڑکوں نے زخموں سے چور بلالؓ کو غلام خانے میں لا کر ڈال دیا۔

لڑکوں کے ہاتھ تو مشغلہ لگ گیا تھا۔ دوسرے دن وہ پھر اپنے تماشے کو آگے بڑھانے کے لیے امیہ کے گھر پہنچ گئے۔ بلال کے گلے میں رسی ڈالی اور کھینچتے ہوئے باہر لے آئے۔ پھر وہی ناہموار رستے تھے اور بلالؓ کی زخمی کھال تھی۔ ایک دن پہلے کے زخم بھرے نہیں تھے کہ دوسرے زخم لگ گئے۔ اب بلالؓ کا بدن نہیں ایک بڑا زخم تھا جو بلال کا بدن کہلا رہا تھا۔

ابھی مسلمانوں کی تعداد چھ یا سات سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ ان کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ مکہ کے نامور سرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ یہ سب کچھ ان کی منشا سے ہو رہا تھا۔ ابو جہل سب سے پیش پیش تھا۔ مسلمانوں کو بلالؓ کے بارے میں معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ ان کے حق میں دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ خود حضور اکرمؐ کفار کی شرارتوں سے محفوظ نہیں تھے۔ بلال تو ایک غلام تھے۔

امیہ، بلالؓ کو اذیت دینے کے لیے نئے نئے حربے سوچتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے بلالؓ کے کپڑے اتروا کر لوہے کی زرہ پہنا دی اور اس وقت جب سارا مکہ تپ اٹھا تھا، انہیں دھوپ میں ڈال دیا۔ لوہا گرم ہو کر آپ کے جسم کو جلا رہا تھا۔ وہ صرف چیخ سکتے تھے۔ ان چیخوں میں بھی اللہ کے سوا کوئی نام ان کے ہونٹوں پر نہیں تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے، یہ کیسا نشہ ہے جو اترنے ہی میں نہیں آتا۔ کیا کسی آدمی میں اتنی ہمت بھی ہو سکتی ہے جس کا مظاہرہ بلال کر رہے ہیں۔ یہ کیسا جادو ہے۔ یہ کیسی طاقت ہے۔

بلالؓ کا حوصلہ باقی تھا لیکن امیہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے وہ حربہ اختیار کیا کہ اگر بلال مردہ بھی ہوتے تو چیخ اٹھتے۔ اس نے زمین پر کوئلے بچھائے اور انہیں اچھی طرح دہکا دیا۔ جب ہر کوئلے کی سیاہی، سرخی میں بدل گئی تو بلالؓ کو ان کوئلوں پر لٹا دیا گیا اور سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ چربی جلنے کی بو پھیل گئی۔ بلال کی چیخیں کچھ دیر دلوں کو دہلاتی رہیں پھر ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

کوئلوں نے ان کی جلد کو جگہ جگہ سے جلا دیا تھا۔ امیہ نے ان داغوں کے ٹھیک ہونے تک اپنا کوڑا پھینک دیا۔ بلال کو غلام خانے میں ڈال دیا۔ کھانا پینا وہیں پہنچا دیا جاتا تھا۔ صبح شام امیہ آکر پوچھ بھی لیتا تھا کہ انہوں نے امیہ کے خداؤں کو تسلیم کیا یا نہیں۔

زخم ابھی پوری طرح بھرے بھی نہیں تھے کہ نئے زخموں کی تیاری ہونے لگی۔ ایک دوپہر کو غلام خانے سے باہر نکالا اور دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر ڈال دیا۔ دھوپ ڈھلی تو لڑکے، گلے میں رسی ڈال کر کھینچتے پھرے پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔

بلالؓ کے زخم بدبو دینے لگے تھے۔ ان زخموں سے ہر وقت خون رستا رہتا تھا۔ بلال کا ایک ہی وظیفہ تھا، ''احد احد'' امیہ کے حربے ایسا ہتھیار بن گئے تھے جو خود اسے زخمی کر رہے تھے۔ تماشائی اس تماشے کو دیکھ دیکھ کر اکتا چکے تھے۔ بعض لوگ تو امیہ کو سمجھانے لگے تھے کہ بلال کی جان چھوڑ دے، اب یہ وہ نہیں کہہ سکتا جو تو کہتا ہے۔

لوگوں کے یہ مطالبے امیہ کی کھلی شکست تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہو گا جو اب تک نہیں ہوا۔ اذیتوں کی انتہا زندگی کا خاتمہ۔ بلال کی موت۔

امیہ اس رات ایک ایسے جواری۔۔۔ کی طرح غلام خانے میں داخل ہوا جو ہار گیا تھا لیکن اپنے آپ کو فاتح سمجھ رہا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے کمزور اور زخمی آدمی کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بلال، تو نے میری رعایت سے بہت فائدہ اٹھا لیا۔ اب میں وہ دکھاؤں گا، جس کا تو حق دار ہے۔ کل تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

''مجھے اس اذیت سے تو نجات ملے گی جو تو مجھے پہنچا تا رہا ہے تو میری اذیت خود ہی ختم کر رہا ہے تو میں کیا کر

سکتا ہوں۔''

''اب بھی اپنے کفر سے توبہ کر لے۔''

''اب تو میں تجھ سے بھی کہتا ہوں، اپنے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ دے۔''

امیہ اب اتنا تھک چکا تھا کہ اتنا سخت جواب سننے کے بعد بھی بلالؓ کی طرف کوئی ڈنڈا کوئی کوڑا کوئی گھونسا اچھالے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اپنے ہی ملبوس میں الجھ کر گر گیا تھا۔ بلال میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اس کی اس حالت پر ہنس سکتے۔

امیہ کے جاتے ہی بشری کمزوری نے بلال کو اپنے حصار میں لے لیا۔ زندگی کیسی بھی ہو موت سے تو بہرحال حسین ہوتی ہے۔

زندگی اور موت کے درمیان بس چند گھنٹوں کا فاصلہ تھا۔ ایک خیال دل میں یہ بھی آیا کہ اگر میں ان لوگوں کی بات مان لوں تو زندگی میسر آسکتی ہے، موت ٹل سکتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایک خدا کے تصور میں ڈوب گئے۔ اس تصور کے ساتھ ہی وہ میٹھی مسکراہٹ یاد آگئی جو انہیں دیکھ کر حضور کے ہونٹوں پر ابھر آتی تھی۔ اگر میں نے ان کافروں کی بات مان لی تو یہ مسکراہٹ میرے لیے نہیں رہے گی۔ مجھ میں اور ان ظالموں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں پھر وہی غلاموں کی زندگی گزاروں گا۔ اس زندگی سے بابرکت موت کتنی اچھی ہو گی۔ اس رات انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی۔ عبادت کا کوئی طریقہ یاد نہیں تھا۔ بس اس کی حمد و ثناء اور یہ احساس کہ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں یہی ان کی عبادت تھی۔

امیہ کے ساتھ کئی اور لوگ بھی تھے جو انہیں مقتل گاہ کی طرف لے جانے کے لیے آئے تھے اور یہ سوچ کر آئے ہوں گے کہ بلال موت کے خوف سے ان کے قدموں پر سر رکھ دے گا۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا ہوگا۔ امیہ نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا تھا جنہیں موت کی سزا دی جاتی تھی۔ انہیں مقتل کی طرف لے جایا جاتا تھا تو ان کی ٹانگیں اس کے جسم کا ساتھ نہیں دے پاتی تھیں۔ بلال کا دماغ چل گیا ہے کہ موت کے خوف سے آزاد ہو چکا ہے۔

امیہ کے غلام نے بغاوت کی تھی، حکم عدولی کی تھی، اس کی بات نہ مان کر اسے رسوا کیا تھا۔ اس کے یہ سب جرائم اہل مکہ کے سامنے تھے۔ وہ سب امیہ کے ساتھ تھے لیکن کوئی بلال کے ساتھ بھی تھا جسے ان لوگوں کی اندھی آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ یہی وہ ہستی تھی جو بلالؓ کو طاقت ور بنا رہی تھی۔

بنو جمح کے محلے میں رات بھر یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ ہر گھر میں بلال کی بغاوت اور موت کی سزا کے تذکرے ہو رہے تھے۔ کسی دل میں ان کے لیے ہمدردی نہیں تھی۔ ایک غلام کے ساتھ اس کا آقا کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اس محلے میں گھروں کی کھڑکیاں صبح ہوتے ہی کھل گئی تھیں۔ سب کی نظریں امیہ کے گھر پر جمی ہوئی تھیں۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ کھیل دن چڑھنے کے بعد کھیلا جائے گا جب دھوپ اچھی طرح پھیل چکی ہو گی لیکن بے قراری نے صبح ہی سے انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔

قریش کے کچھ لوگ آئے اور بلال کو کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مزاحمت کر رہے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچائی جائے۔ ان کے پیچھے تالیاں بجاتا، شور مچاتا مجمع تھا۔ وہ انہیں ایک میدان میں لے گئے۔ اس میدان کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا پتھر پڑا تھا یا خاص اسی مقصد کے لیے ڈال دیا گیا تھا جو دھوپ کی شدت سے گرم بھی ہو چکا تھا۔ بلال کو اس پتھر پر اس طرح اوندھا ڈال دیا گیا کہ پتھر ان کے پیٹ اور سینے کے نیچے تھا۔ ایک طرف ان کا سر جھول رہا تھا دوسری طرف ان کی ٹانگیں۔ اس پتھر کے ساتھ انہیں رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ جب یہ انتظام مکمل ہو گیا تو قریش کے ایک مضبوط آدمی کے ہاتھ میں کوڑا دے دیا گیا۔

''اس پر اس وقت تک کوڑے برساتے رہو جب تک یہ مر نہ جائے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ تو میرے کام کا نہیں رہا تو میں تجھے محمد کے کام کا بھی نہیں رہنے دوں گا مگر یہ نہ مانا۔'' امیہ نے اس پہلوان سے کہا اور اس آدمی نے کوڑے برسانے شروع کر دیے۔

ایک دو تین پھر کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وقفہ تھا تو صرف اتنا کو کوڑا فضا میں بلند ہوتا اور پھر بلالؓ کے بدن تک پہنچتا۔

لوگوں کے شور میں بلالؓ کی چیخیں دب سی گئی تھیں۔ پھر بھی امیہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر دیکھ لیتا تھا کہ غلام زندہ ہے یا مر گیا۔

ان کی چیخیں کچھ دیر احتجاج کرتی رہیں پھر خاموش ہو گئیں۔

''شاید مر گیا۔'' امیہ نے اپنے آپ سے کہا اور بلال کے قریب پہنچ کر انہیں جھنجوڑ کر تصدیق کرنی چاہی۔ بلالؓ کے

ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ امیہ نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ احد احد۔ بلال آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ امیہ غصے سے مٹھیاں بھینچتا ہوا اٹھا اور کوڑے مارنے والے کے ہاتھ سے کوڑا چھین لیا۔ ابھی یہ کوڑا امیہ کے ہاتھ میں آیا ہی تھا کہ اس نے حضرت ابوبکرؓ اور محمدؐ کے منہ بولے بیٹے زید بن حارث کو آتے دیکھا۔ کوڑے والا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ابوجہل بھی اسی طرح امیہ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا جیسے خطرے کے وقت گھوڑا اپنی کنوتیاں کھڑی کر لیتا ہے۔ ابوبکرؓ ان لوگوں کے قریب آکر رک گئے۔

''امیہ، تو اپنے غلام کے ساتھ یہ سلوک کیوں روا رکھتا ہے۔''

''اتنے بھولے مت بنو ابوبکرؓ کیا تمہیں نہیں معلوم یہ لات عزیٰ کو چھوڑ کر محمد کے ایک خدا کو ماننے لگا ہے۔''

''تو تم اس کی اصلاح کر رہے ہو؟''

''شاید ایسا ہی ہے۔''

''تم تو اسے جان سے مارنے پر تل گئے ہو۔''

''یہ میرا غلام ہے میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''اللہ کی قسم! تم لوگ اس کے جذبات کو نہیں دبا سکتے۔''

''پھر اسے موت سے ہم کنار ہونا پڑے گا اور تم اسے نہیں بچا سکتے۔ ہمارے اصول کے مطابق غلام کو سزا دینا اس کے مالک کا حق ہے۔ میں نے اسے رقم دے کر خریدا ہے۔''

''غلام بیچے بھی تو جاتے ہیں تمہارے اصول میں یہ بھی تو شامل ہے۔''

''یہ اب تمہارے دین پر ہے۔ تم تو بڑے پیسے والے ہو، تم خرید لو اسے۔'' امیہ بن خلف نے اپنے ساتھیوں کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''اگر تم فروخت کرنا چاہتے ہو تو میں اس کو خریدنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس وقت ابوجہل نے امیہ کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''امیہ کیا کرتے ہو۔ کیا تم اس صابی غلام کو بیچ دو گے۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے کہ غلام کو سزا ختم ہونے سے پہلے خریدا یا بیچا جائے۔''

''سزا ختم ہی سمجھو ابوالحکم۔ اب تو بلال کی کھال بھی ہمارے کام کی نہیں رہی۔ ابوبکرؓ اگر اس کے سو درہم بھی دے تو بہت ہوں گے۔''

''امیہ، تم اسے فروخت کر کے ایک مسلمان کا اضافہ کرو گے، اسے مار دو۔''

''یہ مر گیا تو مجھے اس کا کوئی ایک درہم بھی نہیں دے گا۔''

دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ مکہ کے معاشرے میں ایسے قصے روز سننے کو ملتے تھے۔ پورا معاشرہ دولت کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ایک ناکارہ غلام جو تقریباً مر چکا ہے، بک بھی سکتا ہے۔ یہ سن کر امیہ کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ ابوبکر اس سے سو درہم کا وعدہ کر چکے تھے۔ امیہ نے ایک مرتبہ پھر بلالؓ کے قریب پہنچ کر انہیں جھنجوڑا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گئے۔ گھبراہٹ میں بلالؓ کو کئی آوازیں بھی دے ڈالیں۔ وہی جواب تک ان کے مرنے کی دعائیں مانگ رہا تھا اب ان کے جینے کی آرزو کر رہا تھا کہ کہیں سودا غارت نہ ہو جائے۔ کئی آوازوں کے بعد بلالؓ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ امیہ چیخ اٹھا۔ ''زندہ ہے زندہ ہے غلام زندہ ہے۔''

''میں اس غلام کے دو سو درہم لوں گا۔''

''آپ کو وعدہ خلافی کرتے ہوئے حیا نہیں آتی؟'' ابوبکرؓ نے کہا۔

''میرا مال ہے میں جتنے میں بیچوں۔ اس میں حیا کی کیا بات ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دو سو درہم گن دیئے۔ امیہ نے بلالؓ پر رکھے ہوئے بھاری پتھر ہٹا لیے۔ رسیاں کھول دی گئیں۔ بلال کی آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہ جان سکے تھے کہ انہیں خریدنے والا کون ہے یا وہ بیچے گئے ہیں۔ خون اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں نے صرف یہ دیکھا کہ ایک نوجوان آگے بڑھا اور انہیں سہارا دے کر اٹھایا۔

''ابوقحافہ، تم دھوکا کھا گئے۔'' امیہ نے ابوبکرؓ سے کہا۔ ''تم اگر ذرا دیر لگاتے تو میں اس غلام کو سو درہم میں بھی دے دیتا مگر تم نے دو سو درہم دے دیئے۔''

''امیہ، اگر اس کے بدلے تم ابوحافہ کی تمام دولت بھی مانگتے تو وہ تمہیں دیتا۔'' ابوبکرؓ نے فرمایا اور سہارا دینے کے لیے بلال کی بغل میں ہاتھ ڈال دیا۔ ایک طرف سے زید سنبھالے ہوئے تھے دوسری طرف سے ابوبکرؓ نے سہارا دیا اور انہیں اپنے گھر لے آئے۔

وہ جن اذیتوں سے گزر کر آئے تھے اس کا تقاضا تھا کہ صحت یاب ہونے کے لیے علاج اور آرام سے گزرا جائے۔ جسم پر کوڑوں کے نشان اور کوئلوں کے داغ تھے۔

ٹانگوں میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ حرکت بھی دے سکیں۔ کئی دن تک زخموں پر مرہم رکھا جاتا رہا۔ تیل ملا جاتا رہا۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں انہیں صرف یہ یاد تھا کہ کسی نے ان سے کہا تھا، بلال! اب تم آزاد ہو یا کبھی کبھی ابوبکر صدیق کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔ اپنے محسن کو کون بھولتا ہے۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد وہ صحت یاب ہوئے اور چند قدم اٹھانے کے لائق ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں سلام عرض کرنے پہنچے۔

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے خرید ابھی اور آزاد بھی کر دیا۔''

''دیکھو بلالؓ! میں نے تم پر نہیں خود پر احسان کیا ہے۔ میں تو تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے مجھے یہ موقع دیا کہ اللہ کو راضی کر سکوں۔ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ نے بلال کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان کے پاس سے اٹھ گئے۔ واپس آئے تو دودھ کا ایک پیالہ آپ کے ہاتھ میں تھا۔

''لو بلال، یہ دودھ پی لو۔ کمزوری بہت ہوگئی ہے۔ کچھ دن اپنی غذا کا خیال رکھنا ہوگا۔''

دودھ کا پیالہ ہاتھ میں تھا اور بلال سوچ رہے تھے یہ کیسے عظیم لوگ ہیں۔ میں اب غلام نہ سہی لیکن ہوں تو ایک ادنیٰ حبشی۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ابوقحافہ جیسا اعلیٰ طبقے کا فرد مجھے اپنے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ پیش کر رہا ہے اگر یہی انقلاب ہے تو کیسا عظیم انقلاب ہے۔

''ابھی ہم کاشانۂ نبویؐ میں چلیں گے۔ حضورؐ کو تمہاری بہت فکر تھی۔ جب تم بے ہوش تھے تو کئی مرتبہ تمہیں دیکھنے آئے تھے۔ اب تمہیں دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے۔''

جب کوئی نو وارد حضورؐ کے گھر تک جاتا تھا تو رات کے اندھیرے کا انتخاب کرتا تھا۔ احتیاط کی جاتی تھی کہ کفار کی نظروں میں نہ آجائے لیکن بلالؓ کا ایمان تو سورج کی طرح روشن ہو چکا تھا۔ مکہ کے سنگریزوں تک کو معلوم ہو چکا تھا کہ بلال کی روح ایمان کے گلزار میں چہل قدمی کے لیے ان کے بدن میں رہ گئی ورنہ امیہ تو اپنی دانست میں انہیں مار ہی چکا تھا۔ اس لیے ابوبکرؓ انہیں دن کی روشنی میں لے کر نکلے۔ گھروں کی کھڑکیاں ایک مرتبہ پھر کھلیں اور بند ہو گئیں۔ یہ وہی بلال تھے جن کے گلے میں رسی ڈال کر لڑکے کھینچتے پھر رہے تھے، اب اس شان سے جا رہے تھے کہ رسول اللہ کے دوست ابوبکر صدیقؓ ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے چل رہے تھے۔ بلال ابھی اچھی طرح چل نہیں سکتے تھے اس لیے ابوبکرؓ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔

بارگاہ نبوت میں پہنچے تو ہوش و خرد ایک مرتبہ پھر رخصت ہو گئے۔ وہی پاکیزہ چہرہ، دلنواز تبسم سامنے تھا جس کے عشق میں دہکتے انگاروں کو ٹھنڈا کیا تھا، رسی کے پھندے کو گلے کا ہار سمجھا تھا۔ اسلام میں کسی انسان کی پرستش جائز نہیں ورنہ ان کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس ہستی کو حرم بنا کر طواف کیا جائے۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ حضور کے قدموں میں بیٹھ کر دریا بہا دیے۔ آنکھیں تھیں کہ اٹھتی نہ تھیں، دل تھا کہ دھڑکنا بھول گیا تھا۔ شادمانی کے انہی لمحوں کے لیے جدائی کے اتنے دن گزارے تھے۔ اب منزل سامنے آئی تو بیعت کے لیے ہاتھ بڑھ گئے۔ کلمہ تو انہوں نے پہلے ہی پڑھ لیا تھا لیکن دست مبارک پر بیعت حاصل کرنے کی بات ہی اور تھی۔

حضورؐ نے ان کے دونوں کندھے پکڑے اور انہیں اپنے ساتھ اس چٹائی پر بٹھا لیا جس پر آپ تشریف فرما تھے۔ بلالؓ نے ہچکچا کر ان کی طرف دیکھا اور آنکھیں ایک مرتبہ پھر برسنے لگیں۔ حضور ان کی اس کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ بلالؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''دیکھو بلال! میں جس دین کا داعی ہوں اس میں کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ نہیں۔ قبیلے صرف اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ہم پہچانے جائیں اس لیے نہیں کہ کوئی قبیلہ اپنے آپ کو اعلیٰ کہے دوسرے کو ادنیٰ سمجھے۔ اسلام کی راہ میں کون کتنی جاں نثاری دکھاتا ہے اعلیٰ تو وہ ہے۔ تم سے زیادہ اذیت کس نے جھیلی ہوگی۔ کیا اب بھی تمہیں کوئی ادنیٰ کہے گا۔ ایک اللہ کو مانتے رہو، اسی کی عبادت کرو اور دیکھو ابھی مسلمانوں کی مشکلیں دور نہیں ہوئیں۔ ثابت قدم رہنا۔'' یہ گویا وہ الفاظ تھے جو آپؐ بیعت کے وقت فرمایا کرتے تھے۔

اس کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ سے مخاطب ہوئے۔

''بلالؓ کا کوئی گھر نہیں ہے۔ اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ مہمان کی طرح رکھو اس کی تعلیم و تربیت تمہاری ذمہ داری ہے۔ اسے لکھنا سکھاؤ اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرو۔''

ابھی بہار سے لطف اندوز ہونے نہ پائے تھے کہ

خزاں کی نوید آ گئی۔ بلال تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ اب ہمیشہ کے لیے حضورؐ کے قدموں میں رہنے کا موقع ملے گا۔ آنکھیں ایک ہی چہرے پر جمی رہیں گی۔ دل ایک ہی نام پر دھڑکے گا۔ سماعت میں ایک ہی آواز رس گھولتی رہے گی۔ اب فراق کے لیے کہا جا رہا تھا۔ انکار کی مجال نہیں تھی۔ جھومتے ہوئے آئے تھے، لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے۔ ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''بلال تم ہمیشہ کے لیے حضور سے جدا نہیں ہو رہے ہو۔ ملاقات تو ہوتی رہے گی۔ بس تمہیں رہنا میرے ساتھ ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں حضور کے قدموں کی خاک بنا رہوں۔''

''ہم سب کی یہی آرزو ہے لیکن ابھی ہمارا الگ الگ رہنا ہی ضروری ہے۔''

دھوپ دبے قدموں مکہ کی پہاڑیوں پر چڑھ کر کسی طرف اتر گئی تھی اور اپنے پیچھے ہلکا اندھیرا چھوڑ گئی تھی جو کچھ دیر بعد گہرے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔

☆......☆

بلال کا ایمان لانا قریش کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت اہم آدمی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ غلام تھے۔ مکہ کا معاشرہ اپنی آب و تاب اسی طبقہ ازذل کے کندھے پر کھڑے ہو کر قائم رکھ سکتا تھا۔ اگر یہ طبقہ ان سے ٹوٹ کر محمدؐ کے ساتھ مل جاتا تو ان کا دبدبہ ہی ختم ہو جاتا۔ پھر وہ کس پر حکومت کرتے؟

ابوجہل کے گھر میں کئی میٹنگیں ہوئیں، ان سب میں بلالؓ کے نام کی گونج سنائی دی اور یہ طے ہوا کہ محمدؐ کی سرگرمیاں سختی سے کچل دی جائیں۔ اس سے پہلے کہ محمدؐ کا دین اس نچلے طبقے میں نفوذ کر جائے محمدؐ کو بتا دیا جائے کہ مکہ میں ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں۔

''کیا ابوطالب بھی نہیں؟'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''ابوطالب ہی تو رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ورنہ ہم محمدؐ کو قتل کر چکے ہوتے۔'' ولید بن مغیرہ کی آواز ابھری۔

''ہمیں ابوطالب سے بات کرنی ہوگی۔''

''اسی وقت ایک وفد ترتیب دیا گیا جو ابوطالب کے پاس پہنچا اور اپنا غصہ ابوطالب کے سامنے رکھ دیا۔ اس وفد کی سربراہی ولید بن مغیرہ کر رہا تھا۔''

''ابوطالب آپ ہمارے رہنما ہیں اور ہم میں سب سے معزز بھی۔ آپ سے پوشیدہ نہیں کہ آپ کا بھتیجا ہمارے مذہب کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ آپ محمدؐ کو ان سرگرمیوں سے باز رکھیں یا ہمیں اجازت دیں کہ ہم جس طرح چاہیں اس سے نمٹ لیں۔''

حضرت ابوطالب نے ان لوگوں کی گفتگو کو بہ غور سنا۔ ان سے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیق کریں گے۔ یہ وفد مطمئن تو کیا ہوتا، حجت پوری کرنے اور وقت دینے کے لیے لوٹ آیا۔ چند ہفتوں بعد یہ وفد پھر حضرت ابوطالب کے گھر پہنچا لیکن ناکام لوٹ آیا ابوطالب اپنے بھتیجے کی حمایت سے ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں تھے۔

ابوجہل کے گھر میٹنگ پھر جمی۔

''ہم نے مصلحت کا ہر دروازہ کھٹکھٹا کے دیکھ لیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔'' ابوجہل نے ترنگ میں آ کر کہا۔

''نہیں یہ جذباتی فیصلہ ہوگا۔'' ولید کی آواز گونجی۔

''ہماری اس حرکت کو بنو ہاشم بھی معاف نہیں کریں گے۔ پھر کسی کے تن پر سر باقی نہیں رہے گا۔''

''اب کوئی مصلحت نہیں سنی جائے گی۔''

''چال ایسی چلو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' ولید نے تجویز پیش کی۔ ''محمدؐ پر اور اس کے پیروکاروں پر عرصہ حیات تنگ کر دو اس قدر تنگ کر دو کہ انہیں ہمارے سامنے سر جھکائے بغیر چارہ نظر نہ آئے۔''

اس دن کے بعد سے گنے چنے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ سازشیوں نے مکے کے آوارہ لوگوں کو نبی کریمؐ کے پیچھے لگا دیا۔ آپ جس طرف سے گزرتے غنڈے آپ پر مٹی پھینکتے اور آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، غلاظت پھینکتے۔

اس مہم میں سب سے زیادہ نقصان ان عام مسلمانوں کو اٹھانا پڑ رہا تھا جو چپکے چپکے آپ پر ایمان لے آئے تھے اور ان کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے نہیں تھا۔ انہیں ناقابل بیان ایذاؤں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ دشمنوں کا خیال تھا کہ جب آپ کے ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے تو محمدؐ خود بخود اکیلے رہ جائیں گے۔

کانٹوں بھرے دن گزرتے رہے، خاموشی سے مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔
نبوت کا دعویٰ کیے چھ سال گزر گئے تھے پھر بھی

مسلمانوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہ تعداد بھی دشمنوں کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔

اب تشدد کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ قتل تک نوبت پہنچنے لگی کوئی دن نہ گزرتا تھا کہ مسلمانوں پر کوئی نہ کوئی ظلم نہ ہوتا ہو۔ جب کئی مسلمانوں کی شہادتیں ہو چکیں خطرے کی تلوار برہنہ ہو کر سامنے آ گئی تو عملی قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی۔

اس رات حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضرت بلالؓ کاشانہ نبوی میں حاضر تھے۔ حضرت علیؓ بھی موجود تھے۔ چند دوسرے مسلمان بھی تشریف فرما تھے کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا۔ ''بلال تم دروازے کو اچھی طرح بند کرلو اور دروازے کے ساتھ کھڑے رہو۔ ایسا نہ ہو کسی دشمن کو خبر ہو جائے اور وہ بری نیت سے داخل ہونے کی کوشش کرے۔'' حضورؐ نے اپنا نیزہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

یہ ایسا اعزاز تھا کہ بلال نے دل ہی دل میں اپنی نظر خود اتاری۔ شمع رسولؐ کے پروانوں نے اٹھ اٹھ کر بلالؓ کو مبارک بادیں دیں۔ بلالؓ نے نیزہ سنبھالا اور دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ اللہ میرا یہ مرتبہ کہ میں اللہ کے رسول کے متوالوں کا محافظ ہوں۔ یہ سوچتے ہی نیزے پر بلال کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جو لوگ کمزور ہیں اور جنہیں مکے میں کسی کی پشت پناہی حاصل نہیں، وہ ہجرت کر جائیں۔ صرف وہ رہ جائیں جنہیں خون خرابے کے ڈر سے کوئی ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک مقررہ رات کو تقریباً تراسی مرد اور عورتیں حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار کی سربراہی میں صحرا میں نکل گئے۔ خبر پھیلتے ہی گھڑسواروں کا ایک دستہ ان کے تعاقب میں روانہ ہوا جس کی قیادت ولید کر رہا تھا۔ اس دستے نے بہت ریت اڑائی لیکن مسلمانوں کا قافلہ حبشہ پہنچ گیا جہاں کا بادشاہ نجاشی عیسائی تھا اور مسلمانوں کے لیے نرم جذبات رکھتا تھا۔

اپنا شکار یوں ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر ابوجہل اور دوسرے سرداران مکہ کے تن بدن شکست کی آگ میں جل اٹھے۔ ابوجہل اٹھا اور عمرو بن العاص کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''مکے میں تمہاری خطابت کی دھوم ہے۔ تم جھوٹ کو سچ ثابت کرتے ہو۔ اپنے جوہر دکھاؤ اور حبشہ جا کر نجاشی کے دربار میں پہنچو اور اس سے کہو ہمارے شہر کے چند نوجوانوں نے اپنا مذہب ایجاد کر لیا ہے اور آپ کے ملک میں پناہ لے لی ہے۔ یہ اگر یہاں رہے تو آپ کے لوگوں کو بھی خراب کریں گے۔ یہ ہمارے مجرم ہیں انہیں ہمارے حوالے کرو۔''

عمرو بن العاص کے لیے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ اس نے ہامی بھر لی۔ نجاشی کو قائل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی خطابت کام نہ آئی لیکن بادشاہ نے انہیں صاف جواب دے دیا۔ ''ہم سونے کے پہاڑ کے عوض بھی ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔''

عمرو بن العاص واپس آ گئے۔ افسوس کہ جو بات عیسائی بادشاہ کی سمجھ میں آ گئی اہل مکہ اس سے غافل ہی رہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد تو مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ وہ ہستی جو صبر مجسم تھی، یہ دعا کرنے لگی کہ اللہ کسی ایسے شخص کو اسلام لانے کی توفیق دے جو مسلمانوں کے لیے سہارا بن سکے، جو کفار کی چالوں کو اپنی طاقت سے توڑ دے۔

☆......☆

اس دن ابوجہل اپنے چند اوباش دوستوں کے ساتھ کوہ صفا کے دامن میں بیٹھا تھا ام الخبائث اس کے دماغ پر چڑھی ہوئی تھی۔ ان دنوں زیر بحث ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ تھی محمدؐ کی ذاتِ مبارک اور ان کا پیغام۔ اس وقت بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ابوجہل اپنی ترنگ میں محمدؐ کے بارے میں ہرزہ سرائی کر رہا تھا کہ امیر حمزہؓ کا اس طرف سے گزر ہوا۔ آپ گھوڑے پر سوار تھے اور کسی شکار سے واپس آ رہے تھے۔ ابوجہل کی زبان سے چند فحش کلمات ادا ہوئے اور امیر حمزہ کے کانوں تک پہنچ گئے۔ آپ کا گھوڑا آگے نکل چکا تھا۔ کچھ دور جا کر آپ نے ابوجہل کے تبصرے پر غور کیا۔ حضرت محمدؐ آپ کے بھتیجے تھے۔ اسی وقت ہونے والی بات کہ لہو نے جوش مارا۔ آپ اسلام نہیں لائے تھے لیکن بھتیجے کے بارے میں ایسے الفاظ برداشت نہ کر سکے۔ اپنے گھوڑے کو پھرایا اور ابوجہل کے سامنے جا کر پہاڑ کی طرح جم گئے۔

''تم کیا کہہ رہے تھے محمدؐ کے بارے میں۔ ذرا وہ الفاظ پھر تو دہراؤ۔''

وہ بے وقوف نشے کی ترنگ میں امیر حمزہ کے تیور پہچان ہی نہ سکا بلکہ الٹا یہ سمجھا کہ امیر حمزہؓ وہ الفاظ دوبارہ سننا

چاہتے ہیں۔ شاید خوش ہوں گے۔ اس نے وہی الفاظ من و عن دہرا دیئے۔ کمان حضرت امیر حمزہ کی پشت پر تھی۔ آپ نے کمان اتاری اور ابوجہل کی پیشانی پر پوری قوت سے دے ماری۔ اس کا سفید چہرہ سرخ ہوگیا۔ آپ گھوڑے سے کود پڑے۔

''تو کیا سمجھ رہا تھا۔ محمدؐ لاوارث ہے؟ اس کا چچا امیر حمزہ مر گیا ہے۔ آج سے جو مذہب میرے بھتیجے کا وہ میرا۔ اس کا اللہ میرا اللہ۔''

ابوجہل کی کیا جرأت تھی کہ ان کے مقابلے پر آتا۔ زمین پر لیٹے لیٹے ان کا منہ تکتا رہا۔ امیر حمزہ نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور گھوڑا آگے بڑھ گیا۔

''بلال، جا کر دیکھو دروازے پر کون ہے۔'' حضورؐ اکرم نے بلالؓ سے جو ان دنوں آپ کی دربانی پر متعین تھے۔

''دروازے پر امیر حمزہ کھڑے ہیں۔ خدا خیر کرے۔'' بلالؓ نے واپس آ کر کہا۔

''دروازہ کھول دو اور احترام سے اندر لاؤ۔ وہ میرے چچا ہیں اور آپ ان کے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑے ہوگئے امیر حمزہ اندر آئے تو غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا چہرے سے نرمی نہیں سختی نظر آ رہی تھی۔

''آخر میری طرف سے آپ کا دل کب صاف ہو گا۔'' حضورؐ نے فرمایا۔

''وہ وقت آ گیا ہے۔ میں ایمان لانے کی غرض سے آیا ہوں۔ جو مذہب میرے بھتیجے کا وہی میرا۔''

''یہ مذہب میرا گھڑا ہوا نہیں۔''

''آپ کا اللہ میرا اللہ۔''

''اللہ تو سب کا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ مجھے اللہ کا رسول تسلیم کریں۔''

''میں نے تسلیم کیا۔''

''تو پھر صدق دل سے کلمہ پڑھیے۔''

انہوں نے بہ آواز بلند کلمہ پڑھا اور حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ امیر حمزہ نے قریب کھڑے بلالؓ کو گلے سے لگا لیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ انہوں نے ادنیٰ اور اعلیٰ کا تصور مٹا دیا ہے۔

''بلال، مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ تم پر اتنے ظلم ہوتے رہے اور میں خاموش رہا لیکن خدا گواہ ہے میں کسی سازش میں شریک نہیں رہا۔ بس اپنی دنیا میں مست تھا۔''

حضرت امیر حمزہ کو ایمان لائے ابھی تین دن ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ بھی ایمان لے آئے۔

یہ دو مضبوط حضرات حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تو مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری جانب ابوجہل، ابولہب، امیہ اور بہت سے بااثر دشمن جو نہ جانے کیا کیا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔ اب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ امیر حمزہ اپنی نجابت کی وجہ سے اور حضرت عمرؓ اپنی تندخوئی کی بنا پر ان کفار کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ بہت دن تک مکہ کے بازاروں میں یہی دونوں موضوع بحث بنے رہے۔

مسلمانوں کی صفوں میں اطمینان کی نوید سنائی دے رہی تھی۔ بنوقبیس کی پہاڑی کے دامن میں ایک صحابہ ارقمؓ کا مکان تھا حضور نے اس مکان میں ایک مسجد بھی قائم کر لی تھی۔ نماز کے اوقات میں خاص طور پر مسلمان یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ حضور اکرمؐ کبھی کبھی یہاں عارضی سکونت اختیار کر لیا کرتے تھے۔ امیر حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے وقت بھی آپ یہیں قیام پذیر تھے۔ بلال حضور اکرمؐ کی قربت کے مزے بدستور لوٹ رہے۔ سودا سلف لانے کی ذمہ داری بھی آپ کی تھی۔ جب مسلمان نماز میں مشغول ہوتے تو آپ نیزہ ہاتھ میں تھام کر پہرہ دیتے رہتے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد مسلمان قدرے بے فکر ہو گئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکان کے سامنے میدان میں مسجد تعمیر کر لی تھی جہاں چند بااثر مسلمان نماز پڑھنے کی ہمت کر لیا کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے لیے طوفان تھم گیا تھا۔ سر راہ کوئی مسلمان نظر آ جاتا تو اہل مکہ نفرت سے منہ پھیر لیتے لیکن کہتے کچھ نہیں تھے سرداران مکہ کسی موقع کی تلاش میں تھے اور یہ موقع انہیں بہت جلد مل گیا۔ حضرت ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ حضورؐ کی محبت کا مجسم نمونہ اور مسلمانوں کا سہارا اٹھ گیا۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی کفار مکہ کھل کر سامنے آ گئے۔ وہ طوفان جو خاموش تھا مکہ کی گلیوں میں سانس لینے لگا۔

اس برائی میں ایک برائی کا اور اضافہ ہو گیا۔ حضورؐ کا دشمن ابولہب خاندان بنو ہاشم کا سردار بن گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کفار مکہ برسر اقتدار آ گئے۔ ابولہب اور ابوجہل کے گٹھ جوڑ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اب مسلمانوں کا مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہو گیا۔ رسول اکرمؐ خود جن سختیوں

سے دوچار ہو رہے تھے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ عام مسلمانوں کا تو جینا دوبھر ہو گیا تھا اور اس دن تو ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، سارے خواب بکھر گئے جب رسول اکرمؐ کی تبلیغ پر پابندی لگا دی گئی۔ اب ہجرت کر کے کسی اور شہر میں جا بسنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

☆......☆

مدینے کے کچھ لوگ اسلام لے آئے تھے۔ ان کی طرف سے برابر پیغامات آرہے تھے کہ آپ اپنے ساتھیوں سمیت ان کی بستیوں کی طرف ہجرت کریں اور ان کے ساتھ مقام فرمائیں۔ آپ کچھ دنوں تو اس دعوت کو نظر انداز کرتے رہے لیکن جب خطرات بہت بڑھ گئے تو آپ نے ان کی دعوت قبول کرلی۔ حکمت عملی یہ طے ہوئی کہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں رات کے وقت صحرا میں نکل جائیں اور الگ الگ راستوں سے ہوتے ہوئے مدینہ پہنچ جائیں۔

حضورؐ نے بلالؓ کو بھی ایک ٹولی کا قائد بنادیا۔ چھ مرد، دو عورتیں اور تین بچے ان کے ساتھ تھے۔ امیہ کا سیاہ فام سابق غلام اب انسانوں کا ایک ذمہ دار قائد تھا۔

بلال کو اتنی بڑی ذمہ داری پہلی مرتبہ ملی تھی۔ وہ خوشی سے جھومتے ہوئے صحرا میں اتر گئے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ یہ وہ دن ہوتے ہیں جب صحرا میں طوفان اٹھتے ہیں۔ ریت کے سمندر قافلوں کو نگلنے کے لیے بپھرتے رہتے ہیں۔ اسی صحرا میں انہیں کم سے کم بارہ دن تک سفر کرنا تھا۔ دل دھڑ کتا رہا سفر کتا رہا۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ مطلع صاف رہا، رات کے وقت ستارے پوری آب و تاب سے چمکتے رہے۔ راستے کا صحیح تعین ہوتا رہا۔ تمام قافلے بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے۔

قریش اس ہجرت سے بہت خوش تھے۔ وہ اسے اپنی فتح سمجھ رہے تھے لیکن یہ حقیقت اب بھی ان کے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ محمدؐ اور ابوبکرؓ ابھی تک ان کے شہر میں موجود ہیں۔ ادھر مدینہ پہنچنے والے ہر مسلمان پریشان تھے کہ کفار کا سارا اعتاد تو انہی دونوں سے ہے۔ نہ جانے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔

اندیشے سر ابھار رہے تھے۔ خطرے ہیولے بن کر اِدھر اُدھر منڈلاتے پھر رہے تھے۔ قریش نے بالآخر پختہ ارادہ کرلیا کہ محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔

یہ نہایت نازک وقت تھا۔ سازش کا علم ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ دشمن سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔ سازش کا مقابلہ تلوار سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مکے سے نکلنا بھی آسان نہیں تھا۔ قدم قدم پر نگرانی کی جارہی تھی۔ رہے سہے سہارے بھی مدینہ جاچکے تھے۔ اس کشمکش میں دن بیت گیا۔ ان امانتوں کا خیال آیا جو لوگوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں۔ انہیں کیسے واپس کیا جائے؟ اگر خود واپس کرتے ہیں تو یہ راز افشا ہو جائے گا کہ آپ مکہ چھوڑ رہے ہیں، آپ نے یہ امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کیں کہ ان کی روانگی کے بعد لوگوں کو واپس کر دیں اور خود بھی مدینہ چلے آئیں۔

رات ہوئی تو آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ مکہ سے نکل گئے۔ نگرانی اب بھی ہو رہی تھی لیکن اللہ نے مشرکوں کی بینائی سلب کرلی تھی کہ دیکھ ہی نہ سکے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب آپ مکہ سے بہت دور جاچکے تھے۔ تعاقب کرنے والوں نے تعاقب کیا لیکن بے سود۔

☆......☆

مدینہ میں آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ اللہ کے رسول مکہ سے ہجرت کر چکے ہیں۔ ایک روز ایک شخص اپنی چھت پر چڑھا ہوا تھا کہ اس نے دور صحرا میں دو سوار دیکھے۔ یہ اونٹ، اونٹنی سوار اتنی دور تھے کہ شناخت ممکن نہیں تھی لیکن کسی قافلے کے بغیر صرف دو سوار! یہ ضرور محمدؐ ہیں جو اپنے کسی ساتھی کے ساتھ تشریف لارہے ہیں۔ وہ چیختا ہوا چھت سے اترا، محمدؐ آگئے، اللہ کے رسول آگئے، ہماری خوش نصیبی کا سامان آپہنچا۔ یہ سننا تھا کہ کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو نے ٹھیک طرح دیکھا بھی ہے۔ شہر کا شہر اللہ اکبر کے نعرے لگاتا صحرا کی طرف بھاگنے لگا۔ ابھی آپ صحرا میں تھے کہ جشن بپا ہو گیا۔ ایک ہجوم کے ساتھ آپ مدینے میں داخل ہوئے۔ بچیاں استقبالی گیت گا رہی تھیں۔

ان پہاڑوں سے جو ہیں سوئے جنوب
چودھویں کا چاند ہے ہم پر چڑھا
کیسا عمدہ دین اور تعلیم ہے
شکر واجب ہے ہمیں اللہ کا

مدینے میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے شور مچنے لگا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ آپ اس کے گھر میں قیام کریں۔ اسے میزبانی کا شرف بخشیں لیکن کسی ایک گھر قیام کرنے سے سب کی دل آزاری ہوتی۔ آپ نے یہ فیصلہ اس اونٹنی پر چھوڑ دیا جس پر آپ سوار تھے۔ ''یہ جہاں رک

جائے گی میں وہاں قیام کروں گا۔''
اونٹنی چلتی رہی۔ لوگ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اب بنونجار کا محلہ آ گیا جو آپ کے ننھیال سے تھے۔ اس اونٹنی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے نتھنے حرکت میں آئے اور وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔
لڑکیوں نے دف پر گانا شروع کر دیا۔
''ہم بنونجار کی لڑکیاں ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمدؐ ہمارے پڑوسی ہیں۔''
''یہ جگہ کس کی ملکیت ہے۔'' حضورؐ نے فرمایا۔
''یہ دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی ہے۔'' ایک مدنی نے بتایا۔
''ان بچوں کو بلاؤ تاکہ میں ان سے یہ زمین خرید کر ایک مسجد تعمیر کراؤں۔''
ان بچوں کو بلایا گیا۔ ان دونوں نے بلا قیمت یہ جگہ آپ کو نذر کرنی چاہی لیکن آپ بہ ضد رہے اور دس دینار دے کر یہ جگہ خرید لی۔
''میں یہاں رہوں گا۔ یہیں میری مسجد بنے گی اور یہیں میں دفن ہوں گا۔'' حضورؐ نے فرمایا۔
''آپ تو یہ فرما رہے تھے کہ ابو ایوب بازی لے گئے۔ انہوں نے اونٹنی سے حضور کا سامان اتارا اور اپنے گھر لے گئے۔ حضورؐ نے انہی کے مکان پر عارضی قیام فرمایا۔
دوسرے دن سے اس احاطے میں مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ مکہ کے قیام کے دنوں میں مسلمانوں کی کوئی مسجد نہیں تھی۔ آخری دنوں میں ابوبکر صدیقؓ نے ایک مسجد اپنے مکان کے سامنے بنوائی تھی۔
یہ مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ مسجد تھی۔ کھجور کے تنوں کے ستون تھے جس پر کھجور کی شاخوں کی چھت ڈالی گئی تھی، جائے امامت کے سامنے دونوں طرف پتھر چن دیئے گئے تھے۔ مٹی سے مسجد کی چار دیواری بنا دی گئی تھی۔
اس مسجد میں پہلی نماز ہوئی تو مہاجرین مکہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ان کے وہ سب زخم تازہ ہو گئے جو مکہ میں ان کی روحوں پر لگے تھے۔ کیا کیف تھا کیا لذت تھی اس زبان میں۔
چند دنوں کے بعد شدت سے محسوس کیا جانے لگا کہ اکثر نمازیوں کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ مسجد میں جماعت کھڑی ہو گئی ہے۔ نمازیوں کو مسجد میں بلانے کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔

علافی سے مشورہ

اس زمانے میں جب کہ راجا داہر اور رل کے راجا میں لڑائی کی ٹھن رہی تھی، عرب کا ایک مشہور سردار محمد علافی جو بنی اسامہ کے قبیلے سے تھا۔ بنو امیہ سے بغاوت کر کے پانچ سو سرداروں کے ساتھ سندھ بھاگ آیا تھا اور راجا داہر کی حمایت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ راجا داہر اپنے وزیر کے مشورے کے مطابق فوراً اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میرا جو سلوک تمہارے ساتھ اب تک رہا ہے اور میں جس قدر تم کو عزیز رکھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اسے تم بھی محسوس کرتے ہو گے، آج رل کے راجا کے ہاتھوں ہمارا ملک خطرے میں ہے۔ تم مجھے مشورہ دو کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ محمد علافی نے داہر کو تشفی دیتے ہوئے کہا کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوئیے، میں ایسی تدبیر کروں گا کہ آپ کا دشمن عمر بھر یاد رکھے گا۔ پھر اس نے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے کچھ فوج دیجیے تاکہ میں اس کو ساتھ لے کر دشمن کا حال معلوم کر دوں۔ دوسری تدبیر یہ اختیار کیجیے کہ یہاں سے تین میل کے فاصلے پر خندق کھود کر وہاں ٹھہریئے۔ راجا داہر نے محمد علافی کو پانچ سو سوار دیئے محمد علافی نے پانچ سو سواروں کو لے کر ایک رات جب رل کی فوجیں بے خبر سو رہی تھیں۔ شب خون مارا اور اچانک اس زور سے حملہ کیا کہ رل کی فوجیں گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں آدمی گرفتار ہوئے اور ہزاروں قتل ہوئے۔ دشمنوں کا بے شمار ساز و سامان ان کو ملا اور اس جنگ میں پچاس ہاتھی بھی ان کے ہاتھ لگے۔

مرسلہ: نصیر الدین، حیدر آباد

کچی مسجد کے کچے فرش پر کئی صحابہ کرام سر جوڑے بیٹھے تھے۔ آنحضرتؐ بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ بھی۔
کسی نے تجویز دی۔ ''نماز کے وقت چھت پر جھنڈا لہرا دیا جائے۔''
''یہ جھنڈا سوتے ہوئے لوگوں کو کیسے جگائے گا۔''
''گھنٹیاں؟''
''یہ تو کلیساؤں میں ہوتی ہیں۔''
''نقارہ بجا دیا کریں۔''

''نقارہ تو جنگ اور خوف کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارا دین امن وسلامتی کا دین ہے۔''

یہ بحث ہوتی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچی اور سب لوگ گھروں کو رخصت ہو گئے۔

حضورؐ نے اذان کے الفاظ بتا کر کہا کہ اسے بلند جگہ پر کھڑے ہو کر پکارنا ہے۔ اب یہ بحث ہونے لگی کہ یہ الفاظ ادا کون کرے گا یعنی کون اذان دے گا۔ اس میں بھی کئی آرا تھیں۔ کسی نوجوان کی آواز میں یا بزرگ کی آواز میں۔ ایک آدمی اذان دے گا یا کئی لوگ مل کر پکاریں گے۔

حضورؐ نے تمام لوگوں کو غور سے سنا اور پھر اپنے فیصلے کے لیے لب کشا ہوئے۔ کچھ دیر بلالؓ کی طرف غور سے دیکھتے رہے پھر فرمایا۔ ''بلال تم اذان دو گے۔ تمہاری آواز بلند بھی ہے اور شیریں بھی۔''

حضورؐ کی زبان سے ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ جتنی آنکھیں اس وقت موجود تھیں بلالؓ کی نظر اتارنے لگیں۔ خود بلالؓ کا عالم یہ تھا کہ خوشی سے غشی طاری ہو رہی تھی۔ الفاظ کا سحر ایسا تھا کہ کچھ اور سننے کی تاب نہیں تھی۔ پہلی مسجد پہلی اذان اور حبشی غلام! بلالؓ بہت دن سے رونا بھول گئے تھے۔ اتنی سعادتیں ملی تھیں کہ شکر ہی شکر ادا ہو رہا تھا لیکن اس وقت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو خوشی کے تھے مگر تھے تو آنسو۔ اسلام نے میرے دامن میں کیا کچھ ڈال دیا ہے۔ میرے پاس کیا ہے جو میں اسلام کو دوں۔ مجھ فقیر پر بادشاہت کا تاج سجا دیا گیا ہے۔ اللہ اللہ یہ سعادت۔ میں نمازیوں کو نماز کے لیے بلایا کروں گا۔

''عبداللہ! تم بلال کو الفاظ یاد کرا دو۔ کل فجر کی نماز میں پہلی اذان دی جائے گی۔ جب تک بلال کو الفاظ یاد بھی ہو جائیں گے۔''

یہ الفاظ کس لحن میں ادا کیے جائیں گے یہ طے کرنا بلال کا کام تھا۔ فجر سے ظہر تک بہت وقت تھا اور ابھی رات بھی پڑی تھی بلالؓ نے عبداللہ بن زید کی مدد سے الفاظ ازبر کیے اور مدینے سے باہر نکل گئے۔ ان الفاظ کو طرح طرح سے ادا کرتے رہے۔ صحرا کے سناٹے میں ان کی آواز گونج رہی تھی۔ اللہ کے رسولؐ کو شاید یہ لحن پسند آئے۔ شاید یہ پسند آئے نہیں اس سے بہتر تو یہ ہوگا۔ یوں کہا جائے تو اور بہتر ہو گا۔ ان کا ذہن انہی لفظوں میں الجھا ہوا تھا۔ ''یا اللہ! مجھے لحن داؤدی عطا کر۔''

''یا اللہ! ایسا لحن دے کہ میرے محبوب کو پسند آجائے۔''

''یا اللہ ایسی شیرینی عطا کر کہ نمازیوں کی تعداد بڑھتی رہے۔''

وہ رات انہی خیالوں، خوشی کے انہی پنڈولوں میں جھولتے ہوئے گزر گئی۔ نہ وہ سوئے نہ آنکھیں سوئیں ابھی پوری رات گزری نہیں تھی کہ بلال مسجد میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر میں حضورؐ اور چند لوگ اور بھی آ گئے۔

اذان کی تیاریاں کی جارہی تھیں کہ اچانک انہیں خیال آیا کس بلند مقام پر کھڑے ہو کر اذان دی جائے۔ مسجد کی چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی تھی اس پر چڑھا نہیں جاسکتا تھا۔

''جاؤ اس چھت پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے لوگوں کو نماز کے لیے بلاؤ۔'' حضورؐ نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔

حضرت بلالؓ کسی نہ کسی طرح اس چھت پر چڑھ گئے۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے گھبرا رہے ہوں پھر فضا میں صدائے اللہ اکبر گونجی۔ وہی صدا جو آج بھی دن میں پانچ مرتبہ سنائی دیتی ہے۔

بلالؓ اذان دے کر مسجد میں آئے تو حضور نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا۔

''بلال تم نے میری مسجد مکمل کر دی۔'' حضورؐ نے فرمایا۔

☆......☆

مدینہ طیبہ میں جب رسول اللہؐ کے زیر قیادت ایک اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔ قواعد وقوانین مرتب ہوئے۔ فوج، عدلیہ، درس وتدریس جیسے مسائل کو حل کرلیا گیا، قبائل کی آپس کی دشمنی آپ کے قدموں کی برکت سے ختم ہو گئی۔ آفتاب نبوت کی روشن کرنیں تمام دنیا کو منور کرنے لگیں جن کے متلاشی مدینہ منورہ دور دراز سے آنے لگے۔ یہ لوگ بطور مہمان آتے تھے ان کی میزبانی سلطنت کی ذمہ داری تھی۔

اس اہم خدمت کے لیے قرعہ فعال بلالؓ کے نام نکلا۔ اب تک اہل مدینہ یہ دیکھ رہے تھے کہ پانچوں وقت کی اذان بلالؓ کی آواز گونج رہی ہے۔ حضورؐ جب باہر نکلتے ہیں تو بلالؓ نیزہ اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حضورؐ جب عیدین وغیرہ کے مواقع پر کھلی جگہ پر نماز پڑھتے ہیں تو بلالؓ اسی نیزے کو زمین پر گاڑ دیتے ہیں اور حضورؐ امامت فرماتے ہیں۔ اب وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ کاشانۂ نبوت کے منتظم بھی

حضرت بلالؓ ہیں۔ ایک غلام کو اللہ کا نبی کن کن نعمتوں سے نواز رہا ہے۔

رسول اللہؐ کے پاس جب کوئی مہمان آتا، آپ اسے بلالؓ کے پاس بھیج دیتے۔ ان مہمانوں میں بعض مفلوک الحال بھی ہوتے اور اکثر یہ بھی ہوتا کہ بیت المال خالی ہوتا۔ انہیں حجاب آتا کہ رسول اکرمؐ کے بھیجے ہوئے مہمان کو خالی ہاتھ لوٹائیں۔ حاجت مند کو بازار لے جاتے، ادھار پر اس کی ضرورت کی اشیاء دلاتے اور بعد میں جب بھی کہیں سے رقم آتی، یہ ادھار لوٹا دیتے۔

ایک مرتبہ رہن رکھنے کو ان کے پاس کچھ نہیں تھا اور وہ مشرک تاجر جس سے قرض لیا کرتے تھے کسی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ حضرت بلالؓ کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا حضورؐ کے بھیجے ہوئے مہمانوں کو وہ خالی ہاتھ لوٹائیں۔ ضرورت شدید تھی اور رہن رکھنے کو کچھ نہیں تھا۔

''کیا میں اپنے آپ کو تمہارے پاس رہن رکھ سکتا ہوں۔''

''کالی چمڑی والے، میں تمہارا کیا کروں گا۔''

''اگر ایک ماہ کے اندر میں نے تمہارا قرض نہ لوٹایا تو میری ذات پر تمہارا حق ہوگا۔ تم مجھ سے جو کام لینا چاہو لینا اگر کچھ نہیں تو بکریاں تو میں چرا ہی سکتا ہوں۔ میں اپنے تجربے سے تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ کسی بکری کو زیادہ دودھ دینے پر کیسے آمادہ کیا جاتا ہے۔''

اس مشرک نے ان کی ضمانت مان لی اور مطلوبہ قرض دے دیا۔ جو ضرورت تھی پوری ہوگئی۔ حضورؐ کی طرف سے تعریف بھی ہوئی کہ انہوں نے اپنی اہلیت سے یہ مشکل وقت ٹال دیا۔ حضورؐ کو تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ رقم کا بندوبست انہوں نے قرض لے کر کیا ہے۔ بھلا یہ کیا معلوم ہوتا کہ خود کو گروی رکھ کے قرض لیا ہے۔

اس مرتبہ یہ ہوا کہ کہیں سے کوئی ایسا ذریعہ نہیں نکلا کہ اس کا قرض اتارا جا سکتا۔ مدت ختم ہونے کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ ایک دن وہ مشرک مسجد میں آ گیا اور بڑی بے ہودگی سے انہیں آواز دی۔ ''اے حبشی!''

''میں موجود ہوں۔'' بلال نے کہا۔ ''اس طرح کیوں پکار رہے ہو۔''

''تم نہیں جانتے کہ تم نے قرض لیا تھا اور ایک ماہ کا وعدہ کیا تھا۔''

''ابھی ایک ماہ پورا تو نہیں ہوا۔''

''صرف چار دن باقی ہیں۔ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ اگر میرا قرض واپس نہ کیا تو تم خود کو میرے حوالے کر دو گے اور میں تمہیں بکریاں چرانے پر لگا دوں گا جیسا کہ تم اسلام لانے سے پہلے بکریاں چراتے تھے۔''

وہ یہ دھمکی دے کر چلا گیا اور بلالؓ کو بہت دن بعد وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ مکہ میں امیہ کے غلام تھے۔ وہ سب اذیتیں یاد آ گئیں جو امیہ کے ہاتھ انہیں جھیلنی پڑی تھیں۔

آپ اسی وقت حضور اقدس کی خدمت میں پہنچے اور تمام ماجرا سنا دیا۔

''آپؐ مجھے حکم دیں تاکہ میں اپنے آپ کو اس رسوائی سے بچانے کے لیے بعض قبائل کی طرف بھاگ جاؤں جو مسلمان ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔''

بلالؓ نے اپنی دانست میں اجازت لے لی تھی۔ حضورؐ نے خاموشی اختیار کر لی تھی اس لیے انہوں نے اسے اجازت ہی سمجھا اور جانے کی تیاری کرنے لگے۔ جوتے پاؤں میں ڈالے، تلوار اور ڈھال اٹھائی اور حجرے سے نکلے۔ اسی وقت ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور یہ پیغام دیا کہ حضورؐ نے انہیں بلایا ہے۔ وہ خدمت اقدس میں پہنچ گئے۔

''خیر تو ہے بلال! یہ تلوار، یہ ڈھال کسی جنگ پر جا رہے ہو؟'' حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''رسوائی سے اچھا ہے میں کہیں نکل جاؤں۔''

''ہمیں چھوڑ کر؟'' حضورؐ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''تم نے مال و اسباب سے لدے ہوئے چار اونٹ باہر بندھے ہوئے نہیں دیکھے؟''

''حضور دیکھے تو ہیں۔''

''وہ سب تمہارے ہیں۔ جاؤ اور قرض ادا کر دو۔''

''بلالؓ نے وہ تمام مال و اسباب بازار لے جا کر فروخت کیا اور جتنا قرض تھا سب اتار دیا۔ جو رقم باقی بچ گئی وہ غریبوں میں بانٹ دی کیونکہ حضور کا حکم تھا کہ ضرورت سے زیادہ کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھو۔''

ایسے ایسے کئی مراحل آئے تھے لیکن اس مرتبہ اس مشرک نے انہیں غلامی کا طعنہ دیا تھا۔ انہیں اپنا سابق آقا امیہ بری طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ امیہ تو مکہ میں عیش کر رہا ہے اور انہیں وطن بھی چھوڑنا پڑا اور یہاں بھی غلامی کے طعنے مل رہے ہیں۔ اس دن انہوں نے اپنے جسم پر لگے زخموں کے نشانات کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ امیہ کا ایک ایک ظلم یاد آیا تھا۔ اس رات وہ ایسی تکلیف

محسوس کر رہے تھے جیسے امیہ اب تک ان پر کوڑے برسا رہا ہو۔ یہ گھڑی کچھ ایسی قبولیت کی تھی کہ امیہ کی موت کے سامان ہونے لگے۔

مسلمان جب سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تھے اس وقت سے قریش کا اہل مدینہ سے اصرار تھا کہ مسلمانوں کا زور توڑنے کے لیے اب بھی وقت ہے ورنہ وہ وقت دور نہیں جب وہ طاقت پکڑتے ہی مکہ پر حملہ کریں گے۔ ہمیں قتل کریں گے اور ہماری عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔

یہی وہ اصرار تھا جس کے نتیجے میں دونوں فوجیں بدر کے مقام پر آمنے سامنے ہوئیں۔ اہل ایمان صرف 313 تھے جب کہ فریق مخالف کی تعداد ایک ہزار تھی۔ جنگی سازوسامان کے لحاظ سے بھی دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں تھا لیکن خدا کی نصرت ساتھ تھی۔ پہلے ہی حملے میں دشمن کے تین سورما موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ان میں لشکر کا سپہ سالار عتبہ بن ربیعہ بھی تھا۔ لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن ابھی ابوجہل موجود تھا۔ لشکر نے پھر سنبھالا لیا۔ مسلمان مشرکین کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ کسی کا باپ مرا کسی کے بیٹے کا سر اڑا۔ تلواروں کی باڑھ اور نیزوں کا جنگل قائم تھا۔ جنگ کا فیصلہ نہ جانے کیا ہوتا کہ ابوجہل بھی مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد ابتری پھیل گئی۔ اسی افراتفری میں بلالؓ کی نظر اپنے سابق آقا امیہ پر پڑی۔ اس نے بھی بلال کو دیکھ لیا۔ اس وقت تک اکڑ کا یہ عالم تھا کہ نہایت حقارت سے بلالؓ کو آواز دی۔ ''او غلام کے بیٹے غلام۔''

اس آواز میں ایسا زہر تھا کہ بلالؓ کے سارے زخم تازہ ہوگئے۔ وہ سارے ظلم یاد آگئے جو اس نے ان پر کیے تھے۔ انہوں نے چلّا کر کہا۔ ''ادھر آؤ میں نے امیہ کو دیکھ لیا ہے۔''

چند انصار قریب کھڑے تھے۔ وہ دوڑے اور امیہ پر ٹوٹ پڑے۔ کئی تلواریں ایک ساتھ اٹھیں اور امیہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

کفار کی اس شکست نے نہ صرف انہیں رسوا کیا اور مسلمانوں کا رعب ان پر قائم ہوا بلکہ مکہ کے ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ مکہ کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس میں ہلاک نہ ہوا ہو۔

اس شکست کے بعد انہیں مسلمانوں کی سیادت قبول کر لینی چاہیے تھی لیکن مقتولین کے ورثا یہ مطالبہ کرنے لگے کہ ہمیں ''بدر'' کی اس شکست کا بدلہ لینا چاہیے اور پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ بھرپور حملہ کرنا چاہیے۔ تیاریاں ایک مرتبہ پھر شروع ہوئیں جن کا نتیجہ جنگ احد کی صورت میں نکلا۔ جنگ احد میں فتح تو مسلمانوں ہی کی ہوئی لیکن بعض غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ اس جنگ میں حضرت امیر حمزہ نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

اس جنگ کے بعد مکہ سے جو خبریں آرہی تھیں وہ حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ اس مرتبہ صرف مکہ کے مشرکین اس جنگ میں حصہ نہیں لے رہے تھے بلکہ انہوں نے عرب کے تمام قبائل کو جمع کر لیا تھا۔ یہ عرب قبائل مکہ پہنچنے شروع ہو گئے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ اب وہ آخری جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ آر یا پار۔ مسلمان سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس طوفان سے مقابلہ کر سکیں گے۔

دس ہزار کے لشکر کا مقابلہ کھلے میدان میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینے کے گرد خندق کھود دی گئی۔ دشمن کا لشکر اس خندق کے قریب آکر رک گیا۔ دونوں طرف کے تیر انداز مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ خندق کو عبور کرنا مشکل تھا۔

آخر کار مسلمانوں نے محاصرے کی شدت کا ذکر کر کے بارگاہ رسالت میں دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دعا فرمائی۔ دعا کے الفاظ ادا ہوتے ہی رحمت خداوندی جوش میں آئی۔ قریش پر تند و تیز طوفان آیا۔ خیمے اکھڑ گئے۔ طنابیں ٹوٹ گئیں، ہانڈیاں الٹ گئیں۔ یہ لشکر اتنا سراسیمہ ہوا۔ یہ خوف بھی خدا ہی نے ان کے دل میں ڈالا تھا کہ انہوں نے خیمے اٹھائے۔ سامان لادا اور واپس ہوگئے۔ یہ ابتری بھی اس لیے پھیلی کہ اس لشکر میں مختلف الخیال لوگ موجود تھے اور ان میں آپس میں اختلافات تھے۔ مشکل کے وقت میں یہ اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔

غزوات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ تین مرتبہ قریش سے جنگیں ہوئیں پھر اردگرد کے یہودیوں نے سر ابھارا تو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ حضرت بلالؓ بدر سے لے کر تبوک تک ہر معرکے میں شامل رہے۔ آپؓ چونکہ کوشش کے باوجود تلوارزنی میں مہارت حاصل نہ کر سکے تھے اس لیے ان معرکوں میں فوج کو راشن فراہم کرنا، فوجیوں کی بھرتی، شہادتوں کا حساب رکھنا، جو وفود مدینہ میں آتے تھے ان کے آرام و ضروریات کا خیال رکھنا۔ بیت المال کا حساب کتاب یہ سب حضرت بلالؓ کے سپرد تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے غلامی سے آزادی کے بعد انہیں لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا جواب

ان کے کام آرہا تھا۔ اس کے علاوہ حضورؐ کے محافظ اور دربان کا قلم دان بھی آپ ہی کے پاس تھا۔ کل کا غلام آج کی مملکت کا اہم رکن بنا ہوا تھا۔ یہ سب اسلام کی برکت تھی کہ ایک غلام آقائی کر رہا تھا۔

مسلمانوں کی پے در پے فتوحات نے قبائل کو اسلام کی طرف راغب کر دیا تھا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے تھے۔ چشم حیرت کو مزید حیرت ہوتی ہے جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ جب آپؐ 10 رمضان المبارک 8ھ کو فتح مکہ کے لیے مدینہ سے نکلے اور مکہ کے قریب نزول کیا تو دس ہزار خدا پرست مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ ان مجاہدوں کی روشن کی ہوئی آگ کے الاؤ ایک بحر نا کنار تھا جو صحرا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ابوسفیان چیخ اٹھا تھا۔

''میں نے اس جیسی آگ اور اس جیسا لشکر جو آج دیکھ رہا ہوں کبھی نہیں دیکھا۔ واللہ ہائے قریش ابوسفیان اس لشکر کی آمد کا سن کر رات کے اندھیرے میں اس کا حال جاننے آئے تھے اور ایسا رعب طاری ہوا کہ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔''

''اللہ کے سوا اگر کوئی اور اللہ ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔''

حضورؐ تو کریم ابن کریم تھے ابوسفیان کو تحفہ دے کر رخصت کیا۔ ''مکہ میں جا کر اعلان کر دو کہ ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو اسے امان ہے۔ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کے لیے بھی امان ہے جو شخص اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لے وہ بھی مامون ہے۔''

حضورؐ نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ بلالؓ کو ایک اور سعادت نصیب ہوئی۔ حضورؐ نے انہیں اپنے دستے میں اپنے ساتھ رکھا۔ یہ دستہ شہر میں داخل ہوا تو شہر سنسان پڑا تھا۔ لوگوں نے امان کے اعلان کے بعد اپنے دروازے بند کر لیے تھے۔ کعبے پر نظر پڑی تو مسلمانوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس عمارت کو وہ کتنے سالوں بعد دیکھ رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھے تو بلالؓ کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ یہاں وہ امیہ کے کاموں کے سلسلے میں آیا جایا کرتے تھے اور وہ بھی بھاگتے ہوئے کہ اگر دیر ہو گئی تو کہیں آقا ناراض نہ ہو جائے۔

کہیں کوئی مزاحمت نہیں تھی۔ فاتح لشکر بھی لوٹ مار میں مشغول نہیں تھا۔ کہیں ایسے بھی کوئی شہر فتح ہوا ہو گا۔ شاید آیندہ بھی نہ ہو۔ خود فاتح مکہ حضرت محمدؐ کا عالم یہ تھا کہ عاجزی اور انکسار سے سر جھکا ہوا تھا، نہ یہ کہ اکڑ اور شان دکھاتے۔ آپ نے صحن کعبہ میں دو نفل شکرانے کے پڑھے۔ اس کے بعد فرمایا کعبے کے گرد رکھے ہوئے بتوں کو نذر آتش کر دیا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بت راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ آج کوئی نہیں تھا جو ان بتوں کو بچانے کے لیے آتا۔ آپ صفا کی طرف گئے۔ یہاں کے بتوں کو توڑا۔

حضرت بلالؓ کو حضور کے ساتھ خانہ کعبہ کے اندر جانے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ کبھی خانہ کعبہ کے اندر نہیں گئے تھے۔ یہاں دیواروں پر مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان مورتیوں کو صاف کرایا گیا۔ حضورؐ نے باب کعبہ پر کھڑے ہو کر تاریخی خطبہ دیا۔ مجمع پر نظر ڈالی تو انہی مجرمین کو کھڑے دیکھا جنہوں نے آپؐ پر ظلم کیے تھے، کانٹے بچھائے تھے، گستاخیاں کی تھیں اور اب اپنی سزا سننے کے منتظر تھے لیکن آپ کی زبان مبارک سے نکلا تو یہ نکلا۔ ''جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

یہ اعلان کیا تھا سناٹے کی دبیز چادر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سب گونگے ہو گئے ہیں۔ اعلان ہی ایسا تھا۔ یہ لوگ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی انہیں معاف کرے گا۔

اس وقت تک ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ رسالت مآب نے بلالؓ کو اپنے قریب بلایا اور حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔ بلالؓ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ چھت پر چڑھا کیسے جائے گا۔ باب ملتزم کے پاس رسے لٹک رہے تھے۔ وہ ان رسوں کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔ نیچے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ارد گرد کی پہاڑیوں پر بھی لوگ جمع تھے کہ بلالؓ کی آواز گونجی۔ ''اللہ اکبر، اللہ اکبر۔''

اہل مکہ اذان کے ان الفاظ کو پہلی مرتبہ سن رہے تھے۔ بلال کی آواز کی شیرینی ان کے دلوں میں اتر رہی تھی۔ بلالؓ آج خود اپنی آواز کے عاشق ہوئے جا رہے تھے۔ ایسی حلاوت انہوں نے اس سے پہلے محسوس نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ان کے ساتھ مکہ کی پہاڑیوں کا ہر سنگ ریزہ توصیف ربانی میں مشغول ہے۔ بت جلے پڑے تھے اور اللہ کا نام بلند ہو رہا تھا۔

فتح مکہ کفر اور اسلام کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ تمام قبائل کی نظریں قریش مکہ پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ خود اپنے اس پیغمبر کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان قبائل کا خیال یہ تھا کہ اگر قریش نے اسلام قبول کر لیا اور

اس کی دعوت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو پھر اسی کے قبول کرنے میں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ فتح مکہ کے بعد تمام عرب کو معلوم ہوگیا کہ دین اسلام واقعی اللہ کا دین ہے چنانچہ فتح مکہ کے بعد ہر طرف سے لوگ بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا شروع ہوگئے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔ اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوگیا۔

ابن سعد نے طبقات میں ساٹھ وفود کا ذکر کیا ہے جو فتح مکہ کے بعد صرف دو سال میں مکہ آئے۔ ان تمام وفود کے انتظام و انصرام میں بلالؓ ہی کا دخل تھا۔ یہ کوئی معمول بات نہیں تھی لیکن بلالؓ کا خلوص ان سے یہ کام بہ احسن تکمیل تک پہنچا رہا تھا۔ کل کا غلام آج سب کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

23 سال کی شبانہ روز دعوت و تبلیغ سے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ کعبے کو مراسم جاہلیت سے بالکل صاف کردیا گیا تھا۔ اب ہاتف غیبی یہ اشارہ کررہا تھا کہ اب دنیا میں قیام کا زمانہ اختتام پذیر ہے۔ حج کی فرضیت کے بعد آپ امت کو یہ دکھا دینا چاہتے تھے کہ انہیں حج کس طرح کرنا ہے۔ آپ نے 10ھ میں حج کا اعلان کردیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اطراف واکناف سے لوگ جمع ہونے لگے کہ وہ بھی آپؐ کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کریں۔

تمام قبائل عرب آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت بلالؓ آپ کو سورج کی گرمی اور روشنی سے بچانے کے لیے ایک کپڑے سے سایہ کیے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

مقام عرفات پر آپ نے خطبہ دیا جس میں صاف صاف آپ نے فرمادیا کہ رحلت کا پیغام آگیا ہے۔ ''اے لوگو! میری بات غور سے سنو کیونکہ میں نہیں جانتا شاید اس سال کے بعد اس مقام پر تم سے کبھی نہ مل سکوں۔'' حج کی تکمیل کے بعد آپ نے مسجد نبوی میں منبر پر جلوہ افروز ہوکر فرمایا۔ ''میں تمہارا امیر کارواں ہوں اور تم سے پہلے جارہا ہوں۔ میرا تم سے حوض کوثر پر ملنے کا وعدہ ہے اور میں اس وقت حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں۔''

☆......☆

مرتدین کا استیصال اور لاتعداد قربانیوں کے بعد مسلمانوں کو کچھ امن نصیب ہوا تھا کہ رسالت مآبؐ واصل بہ حق ہوئے اور تاریخ اسلامیہ نے خلافت راشدہ میں قدم رکھا۔

سارے شہر میں سناٹا تھا۔ گھر گھر سے سسکیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ بعض محبت کرنے والے تو ایسے تھے کہ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا محمدؐ کا وصال بھی ہوسکتا ہے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کردیا۔ ''اگر ہم میں سے کوئی ایسا ہے جو محمدؐ کو معبود سمجھتا ہے تو وہ جان لے کہ محمدؐ کا انتقال ہوچکا ہے لیکن جو اللہ کو معبود سمجھتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔''

بلالؓ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلیا لیکن آنسوؤں پر قابو نہ پاسکے اس لیے کہ آنسوؤں پر کس کو اختیار ہے اور ایسے آنسو جو آنکھوں سے نہیں دل سے نکلتے ہوں۔ تدفین کے بعد قبر پر چھڑکاؤ کرنے اور مٹی ہموار کرنے کی سعادت بھی بلالؓ ہی کے حصے میں آئی لیکن آنکھ کے آنسو کیسے صاف کرتے کہ ہاتھوں پر تو مٹی لگی ہوئی تھی۔ آنسوؤں کے پانی سے اگر مٹی دھل جاتی تو خزانہ ہی چھن جاتا لہٰذا زندگی بھر آنسو بھی خشک نہ ہوئے۔ ہاتھوں سے قبر رسولؐ کی مٹی کی خوشبو بھی نہیں گئی۔

اذان کا وقت ہوا تو سب لوگ بلالؓ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر خاموشی پہرا دے رہی تھی۔ بس آنکھیں بول رہی تھیں۔

''بلالؓ، اذان دو۔ وقت نکلا جارہا ہے۔''

''اب کون سامنے ہے۔ کس کے لیے اذان دوں۔''

''اذان تو اللہ کے لیے ہوتی ہے۔''

''مجھے بھی معلوم ہے۔ میرا دل بھی چاہتا ہے۔ میں ہی تو رسولؐ کا پہلا مؤذن تھا۔ میں اذان دوں لیکن میں جس کے نام کی گواہی دیتا تھا وہ سامنے ہوتا تھا۔ اب وہ نہیں ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دوسرے صحابہ کی بھی سسکیاں بندھ گئیں۔

''بلال ہمت کرو۔''

''اب میں کبھی اذان نہیں دے سکوں گا۔ مجھے معذور سمجھا جائے۔''

ان کی جگہ ابو محذورہ نے اذان دی جو کبھی کبھی بلالؓ کی غیر موجودگی میں اذان دیا کرتے تھے۔

چند روز بعد صحابہ نے پھر اصرار کیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ نے ضد کر کے انہیں چھت پر چڑھا دیا۔ عجیب حالت تھی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ابھی اللہ اکبر ہی کہا تھا کہ آنسوؤں نے لفظ چھین لیے، کبھی کوئی لفظ نکلتا تھا کبھی کوئی۔ حضورؐ کا نام آتے ہی جیسے یادداشت چلی گئی۔ اذان دوبارہ شروع کی۔ پھر محمدؐ کا نام آتے ہی رک گئے۔ پھر لفظ کہیں گم ہو گئے۔ خاموشی طاری ہوگئی۔ نہ ذہن ساتھ دے رہا تھا نہ زبان۔

آخر علیؓ اور ابوذرؓ دونوں نے ترس کھایا اور انہیں نیچے اتار لیا۔

حضورؐ کی وفات کا صدمہ سبھی کو ہوا تھا لیکن بلالؓ کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ ان کا تو گھر بار ہی نہیں تھا۔ ان کے سب کچھ حضورؐ ہی تو تھے۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنا دیے گئے۔ رفتہ رفتہ تمام کاروبار حیات معمول کے مطابق چلنے لگا لیکن بلالؓ کی دنیا تاریک ہوگئی تھی۔ اب ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے سامنے بیٹھے رہتے۔ کبھی روتے رہتے کبھی چپ ہو جاتے۔ بازار میں نکل جاتے جہاں کچھ لوگ مل جاتے، ان سے حضورؐ کی باتیں کرتے۔ وہ واقعات سناتے جو حضورؐ کی قربت میں ان کے سامنے پیش آئے تھے۔ آخر ایک دن اس بے قراری نے طوفان اٹھا دیا۔ آپ ابوبکرؓ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

”آپ نے مجھے اپنے لیے آزاد کیا تھا یا اللہ کے لیے؟“

”بلال، میں نے تمہیں اللہ کے لیے آزاد کیا تھا۔“

”تو پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے دیجیے۔“

”تم کیا چاہتے ہو۔“

”جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں شہید ہو جاؤں۔“

”بلال، تم میری ڈھارس ہو۔ میری خاطر مدینے ہی میں رہو۔“ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں مدینہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔

حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد جب حضرت عمرؓ کا دور خلافت آیا تو بلالؓ نے اپنا وہی مطالبہ دہرایا۔ انہوں نے بھی ابتدا میں اجازت نہیں دی لیکن بلالؓ اصرار کرتے رہے اور بالآخر اجازت مل گئی اور آپ شام روانہ ہوگئے جہاں ان دنوں معرکہ کارزار برپا تھا۔ آپ نے شام پہنچ کر رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ یہ معرکے ختم ہوئے تو یہیں شام کے علاقے خولان میں سکونت اختیار کرلی۔ یہ روایات بھی ملتی ہیں کہ آپ نے یہاں شادی بھی کرلی تھی۔

ایک رات رسول اللہ کو خواب میں دیکھا۔ فرما رہے تھے۔ ”بلال کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہم سے ملنے آؤ۔“

آنکھ کھلی تو آقاؐ کا بلاوا یاد آیا۔ فوراً رخت سفر باندھا۔ مدینے پہنچتے ہی اپنے آپ کو روضہ اقدس پر گرا دیا۔ کیسے کیسے راز و نیاز ہوئے ہوں گے کون کہہ سکتا ہے۔

بلالؓ مدینہ پہنچیں اور کسی کو خبر نہ ہو۔ حضورؐ کے نواسے حسنؓ اور حسینؓ بھی روضہ رسولؐ پر پہنچ گئے۔ بلال کی بے تابی عروج پر تھی۔ کبھی ماتھا چومتے تھے کبھی بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے تھے۔ کبھی آغوش میں بھر لیتے تھے۔

”کل فجر کی اذان آپ دیں گے۔“

”میں نے حضورؐ کی وفات کے بعد کبھی اذان نہیں دی لیکن آپ جگر گوشہ رسولؐ ہیں آپ کی خواہش کیسے ٹال سکتا ہوں۔“

شہر کو خبر کردی گئی کہ کل فجر کی اذان مؤذن رسولؐ حضرت بلالؓ دیں گے۔ شہر میں اب تک وہ لوگ بھی تھے جو پہلے بھی ان کی اذانوں کے بلاوے پر نمازیں پڑھتے رہے تھے اور وہ بھی تھے جنہوں نے صرف نام سنا تھا۔ اشتیاق کے پھول دونوں جانب کھلے ہوئے تھے۔ دور نبویؐ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ شہر مدینہ پوری رات جاگ کر صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آنکھ نہ کھلی تو وہ اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔

صبح ہوئی تو سارا شہر ان کی اذان سننے کے لیے امڈ آیا۔ آپ اذان کے لیے کھڑے ہوئے تو نمازیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بلبل مدینہ نے اللہ اکبر کہا تو سکوت چھا گیا۔ شہادت رسولؐ کے کلمات کہتے ہوئے انگشت شہادت کا رخ روضۂ اقدس کی طرف کیا تو کوئی بھی اپنے جذبات ... پر قابو نہ رکھ سکا۔ یوں لگتا تھا حضورؐ ابھی کسی طرف سے تشریف لے آئیں گے۔ بعض محبت والے تو یہ بھی کہنے لگے کہ رسول اللہ پھر مبعوث ہوگئے ہیں۔

آپ کو پھر دمشق جانا تھا۔ ایک مرتبہ پھر روضۂ رسولؐ پر حاضری دی اور دمشق روانہ ہوگئے۔ مدینہ آنکھوں سے کہیں دور رہ گیا۔ بارونق مگر بلبل مدینہ سے محروم۔ لوگ بڑے دنوں تک اس اذان کو اور اس اذان دینے والے کو یاد کرتے رہے۔

مزار دیکھ آئے تھے اب صاحب مزار سے ملنے کی جلدی تھی۔ دمشق آتے ہی بیمار رہنے لگے۔ پھر وقت نزع قریب آگیا۔

”کل ہم اپنے دوستوں سے ملاقات کریں گے۔ محمدؐ اور آپ کے ساتھیوں سے۔“

وفات سے قبل آپ نے فرمایا۔ ”وافرماہ“ اور آنکھیں بند کرلیں۔

آپ کی سن وفات 20ھ اور بعض روایات میں 21ھ ہے۔

ماخذات

سیدنا بلالؓ...... حکیم محمود احمد ظفر

بلال...... سلیم گیلانی

چارہ گر

زویا اعجاز

انسان کی ترقی محنت میں مخفی ہے، جس نے محنت کو جذبہ بنا لیا، ترقی اس کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اس لڑکی نے بھی محنت کو عظمت جانا اور سب کے منع کرنے کے بعد بھی اپنی دھن میں لگی رہی۔ اسے شہرت کی تمنا نہیں تھی اس لیے اس نے کبھی شہرت کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا وہ جذبہ خدمت کے تحت اس میدان میں آئی تھی اورمحنت کیے جارہی تھی، اسی محنت نے اسے عالمی شہرت کا حامل بنا دیا۔

جذبہ خدمت کس طرح انسان کو کامیاب کراتے ہیں اس کی ایک جھلک

اسکول کی خصوصی میٹنگ کے وہ دونوں شرکاء بہت مشکل صورتِ حال سے دوچار تھے۔

''آپ لوگوں کو آج یہاں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا ہے۔آپ کی بیٹی کے متعلق ضروری امور پر بات چیت کرنی ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر معلمہ نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

''جی میڈم! ہم ہمہ تن گوش ہیں۔'' خوش شکل اور پروقار مرد نے کہا۔

''اینڈریا کا رویہ اسکول انتظامیہ کے لیے ناقابل برداشت ہے۔وہ ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہم اور پراعتماد ہوچکی ہے جس کی بدولت جماعت میں نظم وضبط کے مسائل کھڑے ہورہے ہیں۔''

''یقین نہیں آتا کہ اینڈی ایسی کوئی حرکت کرسکتی ہے۔ وہ تو نہایت سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی ہے۔'' نفیس، مہذب اور سبک نقوش کی مالک اس خاتون نے کہا۔اس کے چہرے پر تشویش کی گہری پرچھائیاں جھلکنے لگی تھیں۔

''تو آپ کے خیال میں کیا ہم غلط بیانی کررہے ہیں؟'' معلمہ نے ابرو اچکائے۔

''اوہ نو میڈم! ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' مرد نے فوری معذرت کی۔

''اینڈی کا یہ رویہ ناقابل فہم ہے۔ہم نے اس کی ایسی پرورش بالکل نہیں کی۔'' خاتون نے تاسف سے کہا۔

''والدین کبھی بھی اولاد کی تربیت ایسے خطوط پر نہیں کیا کرتے لیکن بچہ کہیں نہ کہیں سے منفی عادات اپنے مزاج میں سمو ہی لیتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں والدین کو کلی طور پر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔'' ایک اور معلم نے تدبر سے کہا۔

''ہم آپ کی بات سے بالکل متفق ہیں۔'' ان دونوں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے وزدیدہ نگاہوں سے اپنے پہلو میں کھڑی اینڈریا کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب بھی شرمساری یا ملال کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

''تو پھر آپ ہی بتائیے کہ اینڈریا کو اپنے بڑوں سے بحث ومباحثہ کرنے کی عادت کیسے پڑگئی؟'' انتظامیہ کا اگلا سوال ان کے لیے نیا دھچکا تھا۔

''ناقابل یقین، قطعی ناقابل یقین۔'' مرد نے خود کلامی کی اور پھر سنبھل کر گویا ہوا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں میڈم کہ اینڈی نے ایسی کیا حرکت کی ہے؟''

''وہ کلاس روم میں اوٹ پٹانگ سوال کرتی ہے۔ بچوں کو عجیب وغریب خیالات فراہم کر کے عمل کرنے

ہم سب طلبہ کو خود اس بات پر اکساتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن میں پنپنے والے سوال اساتذہ سے پوچھ کر تشفی کریں ' ذہنی افق وسیع کریں لیکن اینڈریا مقابل کو کوفت زدہ کر دیا کرتی ہے۔ وہ مضامین سے ہٹ کر غیر ضروری باتوں میں الجھنے لگتی ہے۔"

"ہم دلی طور پر معذرت خواہ ہیں۔" مرد نے بے بسی سے کہا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی کم عمری میں وہ اپنے ہی اساتذہ کی خامیاں نکالنے کی جسارت بھی کیونکر کرسکتی ہے؟ کیا اسے گھر میں ایسا ماحول اور لسانی آزادی فراہم کی گئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ لوگ ہی اس کے سامنے ایسے نکات اٹھا دیتے ہوں۔"

"ہرگز نہیں! ہم میں سے کوئی بھی ایسا کیوں کرے گا بھلا؟ ہم اس عمل کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔" اس کے والد نے شرمندگی سے کہا۔

"پھر تو یہ صورتِ حال مزید الجھ گئی ہے۔ اگر اسے والدین کی طرف سے کوئی شہہ حاصل نہیں ہے تو یہ دوستوں کی صحبت کا اثر ہوگا۔ اس کے حلقہ احباب میں یقیناً اپنی عمر سے بڑے اور انقلابی نظریات کے حامل افراد شامل ہوں گے۔ اینڈریا کی یہ حرکات اور اعمال ایسے ہی کسی انقلابی گروہ کا شاخسانہ ہوگا۔"

"میں معذرت کے ساتھ آپ سے غیر متفق ہوں سر! ہمیں اینڈی کے حلقہ احباب کے متعلق مکمل معلومات ہیں۔ اس کے دوستوں کے اہل وعیال سے ہمارے بہت اچھے اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہ بالکل اس مزاج کے نہیں ہیں۔" والد نے پُریقین انداز میں کہا۔

"تو پھر اصل مسئلہ کہاں ہے؟ اگر اینڈریا کو خارجی عوامل کی جانب سے کوئی تحریک حاصل نہیں ہے تو پھر یہ داخلی عوامل کی کارستانی ہے۔ اس کی شخصیت عدم توازن کا شکار ہو رہی ہے۔ اسے احساسِ برتری کا خبط ہو چلا ہے۔ اسی خبط میں مبتلا ہو کر وہ یہ سوچنے لگتی ہے کہ اساتذہ اس سے بہت کمتر ہیں۔ دوسری جانب اسے 'لیڈر' بننے کی تمنا ہوگی جس کی بدولت وہ اپنے ہم جماعت طلبہ کو من پسند راہوں کا مسافر بنا دینا چاہتی ہے۔" ایک اور معلمہ نے اس کا بھرپور نفسیاتی تجزیہ کیا۔ "آپ دونوں بہت باشعور زیرک اور سمجھدار والدین ہیں۔ میرا آپ لوگوں کو پُرخلوص مشورہ ہے کہ اینڈریا کو بہترین ماہر نفسیات کے پاس لے کر جائیں۔ اس کی ذہنی الجھنوں اور

پر اکساتی ہے۔ صرف یہی نہیں! وہ جماعت میں موجود اساتذہ کو بتاتی ہے کہ ان کا طریقہ تدریس کس مقام پر مناسب ہے اور کہاں غیر مناسب۔"

"یا خدا!! یہ کیسے انکشافات سن رہی ہوں میں؟" خاتون نے متوحش ہو کر سر تھام لیا۔ کسی بھی تعلیمی ادارے میں پرائمری سطح کے بچے کی ایسی حرکات کا براہِ راست مطلب وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس روز اینڈریا کے سبھی اساتذہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر مختلف شکایات تھیں۔

"سوال جواب کرنا اچھی بات ہوتی ہے محترم خاتون!

نفسیاتی گتھیوں کا سلجھنا بہت ضروری ہو چکا ہے ورنہ ہم انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اینڈریا کے والدین شدید کشمکش میں مبتلا ہو چکے تھے۔ عزیز از جان بیٹی کی یہ ذہنی حالت اور انتظامیہ کے ردِعمل نے انہیں بہت سے تفکرات لاحق کر دیئے تھے۔ "ہم اس مسئلہ کا بہترین حل تلاش کر لیں گے۔" اس کی والدہ نے عزم سے کہا۔

"یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے۔" اساتذہ نے اینڈریا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جواب بھی لاتعلق انداز میں ہی کھڑی تھی۔

☆......☆

"یہ سب کیا ہے اینڈی؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ آج ہم دونوں کو کس خفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔" گھر آنے کے بعد والدین نے اسے گھیر لیا۔ شمال مغربی لندن کا رہائشی یہ یونانی جوڑا اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت حساس تھا۔

"آئی ایم سوری پاپا! میری وجہ سے آپ کو یہ سب برداشت کرنا پڑا۔" اسے ان کی ذہنی اذیت کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی بہت نفیس اور سلجھے ہوئے مزاج کے نوکری پیشہ افراد تھے۔ اینڈریا اپنے بہن بھائیوں میں درمیانی نمبر پر تھی اور والدین کی غیر حاضری میں دادی ہی انہیں سنبھالتی تھی۔ انگریزی زبان سے قطعی نابلد اور یونانی روایات سے وابستہ اس بوڑھی خاتون نے انہیں ہمیشہ والدین کے احترام اور ملکی وقار پر نازاں رہنے کا درس دیا تھا۔

"صرف سوری کہہ دینے سے یہ مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا میری بچی! آپ کے اساتذہ اس قدر نالاں کیوں ہیں؟ آپ انہیں اتنا زچ کیوں کرتی ہو؟" ماں نے استفسار کیا۔

"میں ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتی ماما!! میں تو صرف اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب طلب کرتی ہوں۔"

"چلو وہ بھی کسی حد تک مناسب ہے لیکن دوسرے بچوں کی لیڈر بننے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟"

"میں انہیں کسی غلط کام کے لیے نہیں اکساتی۔ میں انہیں یہ کہتی ہوں کہ اگر کوئی ٹاپک سمجھ نہیں آ رہا تو ٹیچر سے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟ خاموش کیوں رہتے ہیں؟"

"آپ کو کیونکر علم ہوتا ہے کہ انہیں ٹیچر کا پڑھایا ہوا سمجھ نہیں آ رہا؟" باپ کو اچنبھا ہوا۔

"ان کی نظروں میں بناسمجھی اور حرکات میں بے چینی سے۔" اس نے سادگی سے بتایا۔

"تو پھر یہ سب ٹیچرز کو نظر کیوں نہیں آتا؟"

"کیونکہ ان کا دھیان صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم لوگ کلاس میں زیادہ شور نہ کریں اور کورس جلد از جلد ختم کر لیں۔" اس کم عمری میں ایسی دوٹوک منطق اور تجزیے پر والدین ششدر تھے۔

"دیکھو اینڈی!! وہ آپ کے اساتذہ ہیں اور استاد بہرصورت قابل احترام ہوتا ہے۔" ماں نے بات کو سمیٹنا چاہا۔

"میں نے ان کے احترام میں کبھی کوئی کمی نہیں کی۔"

"اگر ایسا نہیں ہے تو ان کے ساتھ حاکمانہ رویہ اپنانے یا انہیں طریقہ تدریس میں تبدیلی کا کہہ کر توہین کرنے کا کیا مقصد ہے پھر؟" ماں نے اس بار قدرے غصہ سے کہا۔

"میں قسمیہ طور پر کہتی ہوں ماما! میں ان کی توہین یا تذلیل نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ہر صورت میں میرے لیے قابل احترام ہیں۔" اینڈریا روہانسا ہوئی۔

"تو آپ انہیں زچ کیوں کرتی ہو پھر؟ انہیں آپ سے اتنی شکایات کیوں ہیں؟" باپ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں دیگر بچوں کو جب ان کی غیر موجودگی یا غیر حاضری کی صورت میں الٹے سیدھے خطابات دیتے، عدم اطمینان کا اظہار کرتے اور ان کے مضامین سے تنفر کا اظہار کرتے دیکھتی ہوں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ میں تو صرف انہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ایک معمولی سی تبدیلی سے وہ ان سب بچوں کی شکایات دور کر سکتے ہیں۔" اس کے تجزیہ اور توجیہہ پر وہ ایک بار پھر ششدر رہ گئے لیکن اس موقع پر وہ بیٹی کی حوصلہ افزائی کر کے اسے شہ نہیں دے سکتے تھے۔

"دیکھو اینڈی! تم ابھی بچی ہو اور تمہارا ذہنی افق نہایت محدود ہے۔ اساتذہ نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ ان کا تجربہ تمہاری عمر سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ان معاملات کو تم سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں۔" ماں نے لہجہ میں سختی سموتے ہوئے کہا۔ "وہ بچے کبھی بھی ترقی نہیں پا سکتے جو اپنی ذات کو اساتذہ سے بہتر گردانتے ہیں۔ وہ اس مقام پر یونہی تو نہیں پہنچ گئے ناں! حصول تعلیم کا طویل سلسلہ، پیشہ وارانہ تربیت کے لیے تربیتی کورسز، حکومت کی جانب سے طے کردہ اصول وضوابط اور مخصوص طریقہ کار سے کامیابی سے گذرنے کے بعد ہی وہ اس عہدے پر پہنچے ہیں۔ برس ہا برس سے پڑھانے کا ایک کٹھن مرحلہ طے کرتے ہوئے انہوں نے تم جیسے کتنے بچوں کو کسی نہ کسی مقام پر پہنچتے دیکھا ہے۔ اب اگر ایک کم

عمر' نادان' کم فہم اور جذباتی سی لڑکی اپنی خودساختہ برتری کے
زعم میں انہیں ناکردہ غلطیوں کا احساس دلانے لگے تو یہ ان کی
توہین نہیں تو اور کیا ہے؟" ماں کی باتیں سنتے اور اس کی برہمی
بھانپ کر اینڈریا خاموش ہو گئی۔ اس کم عمری میں بھی اسے
رویوں کو سمجھنا بخوبی آتا تھا۔

"میری بچی!! آپ ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ
عزیز ہو۔" باپ نے کہا۔ "آپ سسٹم سے الجھنے چلی ہو اور یہ
عمل باغیانہ ہی نہیں احمقانہ بھی ہے۔ حکومت برطانیہ نے
بہترین دماغوں کی مشاورت اور تجربے سے اپنا تعلیمی نظام
مرتب کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشہ وارانہ اہلیت کے حامل
افراد کو تعلیم دینے کی کمان سونپی ہے۔ آپ کے اس طرز عمل
سے تعلیمی نظام کے زنجیر کی صورت میں باہم مربوط سلسلہ
پر تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ الٹا آپ کی زندگی ایک بھونچال
کی زد میں آجائے گی۔ اس باغیانہ روش کے بعد اگر اسکول
نے آپ پر نااہلی کی مہر لگادی تو اس جرم کا تاوان
تاعمر ادا کرنا پڑے گا۔ آپ کا کیریئر شروع ہونے سے قبل ہی
ختم ہو جائے گا۔"

"آئی ایم سوری پاپا!" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"اپنے دماغ سے ہر قسم کا خناس نکال دو اور صرف
پڑھائی پر توجہ دو۔ اس کٹھن دور میں پڑھائی لکھائی کے بغیر بقاء
حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ سمجھیں؟"

"جی پاپا!" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے
کمرے کی طرف چل دی۔

"اس لڑکی نے تو میرے دماغ کی چولیں ہلادی
ہیں۔ شکر ہے کہ اس کی عقل میں بات سما گئی ہے۔" اینڈریا
کے جاتے ہی ماں نے تھکے تھکے انداز میں اپنی پیشانی مسلتے
ہوئے کہا۔

"امید ہی کی جاسکتی ہے کہ اسے واقعی ہماری باتیں سمجھ
آگئی ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"کک..... کیا کہہ رہے ہو؟ مطلب ہمارے اتنے
لمبے چوڑے لیکچر کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔"

"ایک بات تو ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہماری بچی
غیر معمولی طور پر حساس اور معاملہ فہم ہے۔ اسے قدرت نے
لوگوں کے پوشیدہ جذبات ذاتی طور پر محسوس کرنے کی
صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ زندگی میں کبھی بھی روایتی
طریقوں پر عمل نہیں کرے گی۔"

"تو پھر کیا کرے گی؟ کیا اسے واقعی نفسیاتی علاج کی
ضرورت ہے؟" ماں کا دل کانپ اٹھا۔

"ہرگز نہیں! بس اسے سمجھنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ
ذہنی وقلبی طور پر ہم سے بہت دور ہوتی جائے گی۔"

والدین کے ان خدشات سے لاعلم اینڈریا اپنے
کمرے میں لیٹی متفرق جذبات میں گھری تھی۔ اسے
حقیقتاً اپنے اساتذہ کی ان شکایات اور والدین کے ردعمل
کا بہت دکھ ہوا تھا۔

"اگر کسی معلم کی تدریس بچے کو سمجھ ہی نہ آئے
تو پڑھانے کا مقصد کیا ہوا بھلا؟" اس نے خود کلامی کی۔

"ایک ٹیچر تو اتنا تجربہ کار زیرک اور معاملہ فہم ہوتا ہے
پھر وہ سب مجھے غلط کیوں سمجھ رہے ہیں؟ انہوں نے ایسا کیوں
سمجھا کہ میں ان کی تذلیل کرنے کی کوشش کیا کرتی ہوں۔"
ایک اور سوچ نے ذہن کے دریچوں پر دستک دی۔

"طالب علم اور استاد میں محض خوف' نظم وضبط یا امتحانات
وآزمائش کا رشتہ ہی اس تعلق کی معراج ہے؟ کیا اساتذہ کبھی
اپنے طلبہ کے اصل مسائل اور ذہنی استعداد کو نہیں سمجھ پائیں
گے؟" ایک اور سوال سامنے آن کھڑا ہوا۔

"کسی کو تو بارش کا پہلا قطرہ بن کر طلبہ پر طاری اس حبس
نما جمود کو ختم کرنا چاہیے۔" اس نے اضطراب سے کروٹ
بدلتے ہوئے سوچا۔

"بارش کا وہ پہلا قطرہ' تبدیلی کی وہ پہلی لہر' خوشگوار
ہوا کا اولین جھونکا تم خود ہی کیوں نہیں بن جاتیں
اینڈی؟" اس نے بستر کے پاس ایک اور اینڈریا کو کھڑے
پایا۔

"میں..... میں کیسے بھلا؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں تم' تم کیوں نہیں بھلا؟" ہمزاد نے اطمینان سے کہا۔

"کیا یہ سب میرے لیے آسان ہوگا؟" وہ بے خودی
میں اٹھ بیٹھی۔

"بالکل! تمہارے لیے ہی تو سب سے زیادہ آسان
ہوگا کیونکہ تمہارے سامنے یہ سب مسائل اور ان کا حل پہلے
سے موجود ہوگا۔"

"ہاں! ایسا بالکل ہوسکتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں
چمک لہرائی۔ "میں ان بچوں کا کرب محسوس کرسکتی ہوں۔
مستقبل میں ان کے درد کا درماں اور چارہ گر بھی میں ہی ثابت
ہوں گی۔"

"ضرور ایسا ہی ہوگا۔" ہمزاد نے یقین دلایا۔
مستقبل کے اس نقشہ نے اینڈریا کو خوابوں کی نئی

رہگذر فراہم کردی جہاں اسے اپنے وجود کو ایک چارہ گر بنانے کی تیاری کرنی تھی۔ اس نے جی جان سے اس سفر کو کامیاب کرنے کے لیے کمر کس لی۔

☆......☆

اینڈی کے والدین اب قدرے پُرسکون ہو چکے تھے۔

اس کے رویئے میں مثبت تبدیلی آتے ہی اسکول سے شکایات آنا بھی ختم ہو گئیں۔ اساتذہ اس کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کے قائل تو تھے ہی، انہیں محض اس کے اضطرابی اور غیر معمولی رویہ سے ہی مسائل ہوتے تھے۔ اس کی کم گوئی، اپنے کام سے کام رکھنے کی روش اور اچھے نتائج نے تو گویا سبھی مسائل کا چشم زدن میں ہی خاتمہ کردیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے اسکول کی ہیڈ گرل بنا دیا گیا۔ والدین تک ان کا مثبت ردعمل حوصلہ افزائی بن کر پہنچتا تو ان کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔

بحر حیات میں زندگیوں کا سفینہ ہموار انداز میں کئی سال تک اپنے سفر کے پڑاؤ طے کرتا رہا۔ اس بحر میں تلاطم اس وقت پیدا ہوا جب اینڈریا نے اپنے منتخب شدہ مضامین کا اعلان کیا۔

''تم ہوش میں تو ہو اینڈی؟'' باپ نے قدرے بے یقینی سے کہا۔

''کیا تم نے وہی کہا جو میں نے ابھی ابھی سنا ہے؟'' ماں کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔

''آپ دونوں نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میں بقائمی ہوش و حواس ہی یہ بات کہہ رہی ہوں کہ مجھے سائنسی مضامین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے بے وقوف لڑکی! آنے والا دور جدید ترین ٹیکنالوجی کا ہوگا۔''

''جی ہاں! دنیا بے شک چاند پر قدم رکھ چکی ہے۔ آنے والا دور بھی کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کا ہی ہوگا...... لیکن انسانی جذبات و احساسات کے تقاضے بہرحال اپنی جگہ برقرار رہیں گے۔ میں بھی اپنے جذبات سے فرار حاصل کر کے غیر فطری زندگی نہیں جی سکتی۔ میری ترجیح آرٹ اور ٹیکسٹائل ہی رہیں گے۔'' اس کے حتمی انداز پر وہ خاموش ہو گئے۔ انہیں علم ہی کہاں تھا کہ مستقبل قریب میں بیٹی نے ایک اور جھٹکا ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

پڑھائی مکمل ہوتے ہی پیشہ ورانہ زندگی کا انتخاب مزید حیران کن تھا۔

''تم ٹیچر بننا چاہتی ہو؟'' ماں نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''بننا نہیں چاہتی مام!! میں ٹیچر ہی بنوں گی۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہارا اطمینان تو یہی بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے سے ہی طے شدہ تھا۔''

''آف کورس پاپا!! یہ سب تو اسی روز طے ہو گیا تھا جب اسکول والوں کی شکایات پر آپ نے مجھے ہدایات کا ایک طویل پلندہ تھما دیا تھا۔''

''میں جانتا تھا، بالکل جانتا تھا کہ تم ایسا ہی کوئی غیر معمولی فیصلہ کرو گی۔'' اس نے صوفے کی ہتھی پر جوش سے ہاتھ مارا۔

''مجھے خوشی ہوئی پاپا کہ آپ اپنی بیٹی کو گہرائی سے سمجھنے لگے ہیں۔'' اینڈریا کے چہرے پر حقیقی خوشی کا تاثر دیکھ کر وہ پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو گیا۔

''میں تمہیں اس مہم جوئی سے روکنا نہیں چاہتا اینڈی! لیکن اس میدان میں درپیش معاشی مسائل سے تمہیں آگاہی ضرور دینا چاہوں گا۔''

''مجھے علم ہے پاپا! اساتذہ کی محنت کے بدلے میں انہیں قرار واقعی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا لیکن انہی کے ہاتھ میں مستقبل کی عنان ہوتی ہے۔ یہ اہم ترین ذمہ داری کسی سعادت سے کم تو نہیں۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ہم عمر افراد کو خود سے زیادہ خوشحال دیکھ کر ملال اور خلش کا شکار ہو جاؤ۔'' ماں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا مام! اور کبھی میرا ارادہ کمزور ہونے لگا تو اپنی یہی سعادت اور ذمہ داری یاد کر کے خود کو معتبر محسوس کر لیا کروں گی۔'' اس کا عزم مصمم تھا۔ والدین کو خاموش ہوتے ہی بنی۔

☆......☆

آہنی عزم کی مالک پچیس سالہ اینڈریا کے خیالات پختہ اور ارادے بے حد بلند تھے۔

اس نے سوچ بچار کے بعد 'برینٹ' میں واقع 'Alperton Community School' میں نوکری حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ برینٹ برطانیہ کے قدرے پسماندہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں مختلف اقوام کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ علاقہ کی رہائشی عمارات اپنے

اندر سینکڑوں مکینوں کو سموئے ہوئے ہیں۔ایک فلیٹ میں کئی کئی خاندان اخراجات بانٹ کر رہتے ہیں۔ایک عمومی اندازے کے مطابق برینٹ کے اسکولوں میں 135 سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ایلپرٹن کمیونٹی اسکول کو'اکیڈمی' کا درجہ حاصل ہونے کے باعث ریاستی سرپرستی حاصل ہے اور یہاں زیرِتعلیم طلبہ کے تعلیمی اخراجات براہِ راست حکومت کے ذمہ ہیں۔

مذکورہ اسکول مخلوط نظام تعلیم پر مشتمل ایک ثانوی سطح کا 'سکستھ فورم' ادارہ ہے۔(برطانیہ'شمالی آئرلینڈ' ویلز اور دولت مشترکہ کے چند ممالک کے نظام تعلیم میں سکستھ فورم ثانوی سطح (ہائی اسکول) کے حتمی تین سالوں پر مشتمل ایک ادارہ ہوتا ہے جہاں عام طور پر سولہ تا اٹھارہ سال کے بچوں کو اے لیول یا اس کے متوازی نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے)اینڈریا کے لیے نوکری کا حصول آسان ثابت نہیں ہوا تھا کیونکہ عمومی قومی سوچ اور مزاج کے باعث سائنس'ریاضی' کمپیوٹر'انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے مضامین کو زیادہ توجہ اور اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔نصاب سے آرٹ کے کئی مضامین ختم کر کے اس شعبہ کے لیے مختص بجٹ میں بھی تخفیف ہونے لگی تھی۔اس صورت حال میں اینڈریا کے لیے انتظامیہ کو اپنے وجود اور طریقہ تدریس کی افادیت ثابت کرنا پہلی آزمائش ثابت ہوا۔اس پہ مستزاد طلبہ کا رویہ اور اسکول عمارت کی خستگی اعصاب کے لیے ان چاہا امتحان بننے لگی۔عمارت کی کھڑکیاں بند ہونے سے انکاری ہوتیں اور چھتیں ٹپکا کرتیں۔اسکول میں پہلا دن اس کے لیے ایک ہولناک تجربہ تھا۔

وہ ماہ فروری کا ایک یخ بستہ دن تھا۔اس روز برفباری ہونے لگی تھی۔اینڈریا بہت جوش و جذبہ سے کمرۂ جماعت میں طلبہ کی منتظر تھی لیکن وہ تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔کچھ دیر بعد جب وہ شور شرابہ اور ہلا گلا کرتے وارد ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں برف کے بڑے بڑے گولے تھے جن سے چند ٹکڑے توڑ کر وہ متواتر ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔کچھ منچلے تو برف کے وہ ٹکڑے ایک دوسرے کے کوٹ میں ڈال کر محظوظ ہو رہے تھے۔لاابالی پن'غیر ذمہ داری اور نظم و ضبط کے فقدان کی یہ نئی مثال دیکھ کر وہ شدید حیرت زدہ تھی لیکن یہ وقت جذبات سے مغلوب ہونے کا نہیں تھا۔اس بگڑے ہوئے معاملات کو غیر روایتی طریقہ کار کی مدد لے کر دانشمندی سے سلجھانا تھا۔رستہ طویل اور تھکن آمیز تھا۔اینڈریا کے بچپن کا حسین خواب تعبیر پانے کے لیے اس کی دسترس میں تھا اور یہ تعبیر بھرپور محنت اور لگن ہی سے مل سکتی تھی۔حوصلہ مند اور باعزم اینڈریا نے اس مرحلہ سے نمٹنے کی ذہن سازی کرتے ہوئے طلبہ کو بھرپور محنت اور اعتماد کا احساس دلانا شروع کر دیا۔

''عام طور پر بچے اساتذہ کو غیر مرئی افراد سمجھتے ہوئے اس سے قدرے خائف گریزاں اور گلے شکووں کا شکار رہتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ تدریسی عمل ہمیشہ غیر مؤثر رہتا ہے۔میں آپ سب کے لیے محض استاد ہی نہیں بلکہ ایک سایہ دار شجر بننا چاہتی ہوں۔مجھے آپ بھی کا بہترین دوست بن کر بے حد خوشی ہوگی۔کمرۂ جماعت میں نصاب سے متعلق کوئی مسئلہ ہو یا کوئی اور الجھن، آپ بلاجھجک میرے پاس آیئے۔آپ کی الجھنیں دور کرنا میری اوّلین ترجیح اور در حقیقت فرض ہی کی ادائیگی ہوگی۔''

طلبہ نے متبسم انداز میں اس کے جذبے کو سراہا لیکن بچپن ہی سے چہرہ شناسی کا ہنر سیکھ چکی اینڈریا نے لمحہ بھر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ ان میں سے اکثریت کی مسکراہٹ بے جان تھی۔کھوئی کھوئی سی آنکھیں اور بوجھل ذہن کسی اندرونی کشمکش کا احوال بتاتے تھے۔وہ اپنے تجربات کی رو سے یقینی طور پر یہ کہہ سکتی تھی کہ اس منتشر کیفیت کا تعلق اسکول یا نصابی معاملات سے ہرگز نہیں تھا۔

ذاتی حیثیت میں ان مسائل کا پس منظر جاننے کا ارادہ کر کے اس نے ایک اور معاملہ کو سلجھانے کا فیصلہ کیا جو کافی عرصہ سے التواء کا شکار تھا۔

☆......☆

اینڈریا کسی گہری سوچ میں گھری ایک ریسٹوران میں بیٹھی تھی۔اس کے عارض پر ہلکی سی سرخی چھائی تھی اور آنکھوں میں جگنو دمک رہے تھے۔

''میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں اینڈی!''اس کے سامنے بیٹھے خوبرو سے شخص نے گمبھیر لیکن جذبوں سے بھرپور لہجے میں کہا۔وہ ایک فزیکل ٹرینر تھا اور اینڈریا سے شادی کا خواہاں بھی۔

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں جان!لیکن میرے کچھ تحفظات اب بھی برقرار ہیں۔''اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

''میں تمہارے تمام خدشات اور تحفظات کو ختم کرنے کی بھرپور ضمانت دے سکتا ہوں۔''جان پُراعتماد تھا۔وہ اینڈریا سے حقیقتاً بہت متاثر تھا۔زندگی کے متعلق اس کے

نظریات اورعزم تو ایک مدت سے اپنا اسیر بنائے ہوئے تھے۔دوسری جانب اینڈریا نے بھی قبل ازیں کسی بھی مرد کے لیے ایسے خصوصی جذبات محسوس نہیں کیے تھے۔گھر بسانے کی جبلی آرزو اس کے اندر بھی پوری شدت سے موجود تھی۔وہ اس حقیقت سے بھی باعلم تھی کہ کارحیات میں کسی بھی خطے کی عورت کے لیے والد سے زیادہ شوہر کا حوالہ معتبر ہوا کرتا ہے۔ اس مضبوط سائبان کے بغیر حاصل کی گئی ہر نسوانی کامیابی ازل سے ہی متنازعہ قرار دی جاتی رہی ہے۔

ان جذبات سے قطع نظر اس میں پیشہ وارانہ زندگی کے خواب اور اصول محبت وچاہت پر قربان کرنے کا یارا بھی نہ تھا۔

''میں اپنی جاب نہیں چھوڑ سکتی!''اس نے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔

''تمہیں چھوڑنی بھی نہیں چاہیے۔''وہ مسکرایا۔

''پیشہ وارانہ زندگی کی اہمیت میرے لیے بے حد مسلم ہے۔''

''میری وجہ سے کبھی زندگی کے ان دودھاروں کا تصادم نہیں دیکھوگی تم۔''

''میرے عزائم کی پرواز بہت بلند ہے۔''وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

''میری محبت کی اڑان اسے ہمیشہ محفوظ آڑ فراہم کرتی رہے گی۔''

''سنا ہے مرد کبھی اپنی بیوی کو کسی بھی بیرونی سرگرمی یا ذمہ داری کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا۔''

''ادھوری حقیقت ہے،تم یقیناً یہ نہیں جانتی کہ مرد کے لیے مخلص اور باوفا عورت کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتی۔مجھے تمہارے خلوص اور احساس ذمہ داری ہی نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔جو عورت اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے لیے اتنی مخلص ہوسکتی ہے وہ ذاتی زندگی میں بھی بہت وفا شعار ثابت ہوگی۔اگر میرا گھر اور زندگی اسی وفا کے زیر اثر رہے تو مجھے بھلا تمہاری کسی بھی بیرونی مثبت سرگرمی سے اعتراض کیوں ہوگا؟''

وہ ایک جادوئی لمحہ تھا۔اینڈریا کو اپنا وجود بہت معتبر محسوس ہورہا تھا۔اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ جان ہی اس کے لیے مثالی شریک حیات ثابت ہوگا۔اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اسے تھمادیا۔محبت کی سند خوبصورت انگوٹھی کی صورت میں اینڈریا کی انگلی میں جگمگانے لگی۔

☆......☆

جان سے شادی کے بعد اینڈریا کی زندگی میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوگیا۔

اس کی نجی زندگی بہت ہموار اور پُرکیف ہوچکی تھی لیکن پیشہ وارانہ زندگی کے مسائل میں ناخوشگوار اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا تھا۔وہ اپنے طلبہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی قائل تھی مگر طلبہ میں نظم وضبط کا فقدان بھی اسے قبول نہ تھا۔ان کی شخصی خوبیوں کو پروان چڑھانے کے لیے بھی کسی سمجھوتے کی وہ قائل نہیں تھی۔ایسے میں جب ایک ایشیائی طالبہ نے اس کی جماعت سے غائب ہونا شروع کردیا تو یہ جسارت وہ کیونکر قبول کرپاتی؟

اس موقع پر پیشہ وارانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے انتظامیہ کو سب سے پہلے آگاہ کیا۔

''طلبہ میں اسکول سے بھاگنے کی شرح تشویشناک حد تک بڑھتی چلی جارہی ہے اور قابل غور بات تو یہ ہے کہ ان میں اکثریت ایشیائی افراد ہی کی ہے۔''ایک انتظامی عہدیدار نے کہا۔

''ہمیں ان عوامل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیا؟''اینڈریا نے متانت سے جواب دیا۔

''انتظامیہ جلد ہی اس بارے میں کوئی حکمت عملی مرتب کرلے گی۔''بے نیازی سے کہا گیا۔

اس مبینہ حکمت عملی کے انتظار میں اینڈریا مذکورہ لڑکی کو مزید بدنظمی کے مواقع فراہم نہیں کرسکتی تھی۔اس نے سنیتا کے والدین کو اسکول طلب کیا لیکن وہ آکے ہی نہ دیئے۔بہت سوچ بچار کے بعد اینڈریا نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔گو یہ عمل 'آؤٹ آف وے' تھا لیکن فرض کی پکار پر وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھی۔سنیتا کے گھر جاتے ہی جو صورتِ حال اس کے سامنے آئی وہ حقیقتاً پاؤں تلے سے زمین نکالنے والی تھی۔

وہاں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا ایک جم غفیر سے ہوا۔مختلف رنگ ونسل کے ان افراد کا ہجوم دیکھ کر وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔سنیتا کے والدین جھجکتے ہوئے اسے ایک کمرے میں لے گئے جہاں کئی افراد پہلے سے موجود تھے لاغر صحت اور مسلے ہوئے کپڑے پہنے وہ دونوں افراد کسی بھی طور پر برطانیہ کے رہائشی معلوم ہی نہیں ہورہے تھے۔

''میں آپ سے سنیتا کی بابت کچھ بات چیت کرنا چاہتی ہوں۔''اینڈریا نے سنجیدگی سے کہا۔

ان کے چہرے سے یکدم ہی ناقابل فہم تاثرات جھلکنے

لگے۔ مرد نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اٹکتے ہوئے کہا۔ ”سوری...... آئی...... ناٹ...... انگلش۔“

”میم!! میرے والدین انگریزی زبان پر دسترس نہیں رکھتے۔ وہ آپ کو روانی سے جواب دینے یا آپ کا مکمل مطمع نظر سمجھنے سے قاصر ہیں۔“ سنیتا نے لب کچلتے ہوئے اسے بتایا۔

”اوہ!! یہ تو نہایت افسوسناک صورتِ حال ہے۔ میں ان سے تمہاری غیر حاضریوں کے متعلق استفسار کرنا چاہتی تھی۔ اسکول میں تمہیں بہت دفعہ سمجھانے پر بھی تم نے اپنی روش اب تک نہیں چھوڑی۔“

”آپ مجھ ہی سے جان لیں میم!! شاید آپ کو یہی لگتا ہوگا کہ میں کسی لڑکے کے ساتھ ڈیٹ کے لیے اسکول سے غائب ہوجاتی ہوں لیکن حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ میرے یہ بے بس والدین برطانیہ کی چکاچوند سے متاثر ہوکر کسی نہ کسی طرح یہاں آتو بسے ہیں مگر زبادانی پر عبور سے اب بھی محروم ہیں۔ یہ دونوں ہی نچلے درجے کی ملازمت سے گھر کا خرچ چلاتے ہیں۔ یہاں کچن کی سہولت سے استفادہ کرنے کے لیے سات خاندانوں کے چالیس افراد پہلے سے موجود ہیں۔ ہماری کھانا پکانے کی باری صبح کے اوقات میں آتی ہے۔ میرے بہن بھائی پرائمری اسکول میں پڑھتے ہیں۔ یہ ذمہ داری اب میرے ہی کندھوں پر ہے۔ اسکول سے غیاب کے بعد میں گھر آکر کھانا بناتی ہوں۔ ایک روز کا بنایا ہوا کھانا ہم دو سے تین دن استعمال کرلیا کرتے ہیں۔ یہاں شانتی بالکل ناپید ہے۔ ہم بہن بھائیوں کو اکثر اپنا ہوم ورک باتھ روم میں مقفل ہوکر کرنا پڑتا ہے۔“ سنیتا کے انکشافات اینڈریا کے لیے چشم کشا تھے۔

”میں تمہاری اس جدوجہد کی قدر کرتی ہوں میری بچی! لیکن تعلیم بھی تو ضروری ہے ناں!“

”مجھے اس حقیقت سے کب انکار ہے میم!! لیکن کیا میری بلاناغہ حاضری پر انتظامیہ مجھے اسکول میں کھانا پکانے کی اجازت دے سکتی ہے؟“ سنیتا نے صاف گوئی سے کہا۔

اس روز جب اینڈریا اپنے گھر لوٹی تو اس کے ذہن میں دو سوالات نے اودھم مچا رکھا تھا۔ انتظامیہ کو ان مستحق طلبہ کی مدد کے لیے کس طرح قائل کیا جائے اور انگریزی زبان سے نابلد والدین سے بات چیت کے لیے کون سا رستہ اپنایا جائے؟ اوّل الذکر تو اس کے لیے ایک طویل اور دشوار

مرحلہ ثابت ہوتا تھا تاہم موٴخرالذکر کا منطقی حل اس کے اپنے اختیار میں تھا۔ اس نے جان سے مشاورت اور... اس کی رضامندی کے بعد مختلف غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا باقاعدہ آغاز کردیا۔

☆......☆

''اینڈریا! میں نے سنا ہے کہ تم ایشیائی زبانیں سیکھ رہی ہو۔'' کچھ عرصہ بعد اسکول میں ایک قریبی ساتھی نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''بالکل درست سنا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''میں تمہیں اس قدر بے وقوف نہ سمجھتی تھی۔ تم اپنی توانائی اور وسائل اس طرح کیوں ضائع کررہی ہو؟''

''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ طلبہ اور ان کے والدین سے بہتر رابطہ کے لیے یہ سب ضروری ہے۔''

''انہیں اس قدر سنجیدہ لینے کی ضرورت ہی کیا ہے آخر؟ یہ ایشیائی تو ویسے بھی ہمارے ملک کا ناسور ہیں۔''

''بہت غیر مناسب سوچ ہے تمہاری!! وہ ہمارے ملک کو بہتر اور برتر سمجھ کر یہاں آتے ہیں۔ جوابی طور پر ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ان کے مسائل کو سمجھیں۔ یہ مہاجر بھی اسی خدا کی تخلیق کردہ مخلوق ہیں جس نے ہمیں ایک بہتر زندگی عطا کی ہے۔''

''میں تم سے متفق نہیں ہوں۔'' مقابل نے نخوت سے کہا۔

''ہمارا یہی رویہ معاشرے میں عدم توازن اور ناانصافی ہی اصل بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ اگر ہم ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد نہیں کریں گے تو یہ مایوسی اور ناامیدی کی کھائیوں میں گر کے جرائم کی راہیں اپنا کر ہمارے ہی ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ آج وقت اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں تو کل کے لیے ملال اور پچھتاوؤں کی فصل کیوں بوئی جائے؟''

''میں تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہتی ہوں اینڈی کہ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے بھی کچھ سوچو۔ ان غیر فروعی معاملات میں الجھ کر کیوں وقت گنوار ہی ہو؟''

''یہ چودہ سو طلبہ بھی میری اولاد ہی کی طرح ہیں کیتھی! لیکن تم شاید میرے جذبات کبھی نہیں سمجھ سکو گی۔'' اس نے نرمی سے کہہ کر بات ختم کردی۔

☆......☆

وقت کا پنچھی اپنی مخصوص پرواز سے روز شب کا سفر طے کرتا کئی سالوں کے پڑاؤ عبور کر گیا۔

اینڈریا کی محنت اور لگن روز اوّل کی طرح قائم ودائم تھی۔ اس کی شفقت، محبت، نرمی، خلوص اور دانشمندی طلبہ کے لیے زادِراہ بن چکی تھی۔ وہ اپنے روزمرہ کے بھی مسائل کے حل کے لیے اس کی رہنمائی کے طالب ہونے لگے۔ ان کی مدد کے بعد اسے روحانی و دلی سکون نصیب ہوا کرتا۔ ان کی تکلیف پر وہ خود بھی جی جان سے تڑپ اٹھتی۔ ایسے ہی ایک روز آمنہ نامی ایک طالبہ کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں دیکھ کر وہ لرز سی گئی۔

''یہ سب کیا ہے آمنہ؟ ایسا کس نے کیا؟''

''میم! کیا آپ واقعی انجان ہیں؟'' وہ تلخ ہوئی۔

اینڈریا کی تشویش مزید بڑھ گئی۔ اسکول کے اندرونی معاملات میں سدھار اپنی جگہ مسلم سہی لیکن بیرونی عوامل ہنوز شدید بگاڑ کا شکار تھے۔ ان میں سرفہرست برینٹ کی امن وامان کی صورتِ حال تھی۔ یہاں قتل وغارت کی شرح دیگر برطانوی علاقوں کی نسبت سب سے زیادہ تھی۔ جرائم پیشہ افراد نے مختلف اور منظم گروہ بنا رکھے تھے جن کا خصوصی نشانہ تعلیمی ادارے ہوا کرتے۔ منشیات فروشی سے لے کر جنسی تشدد کے واقعات وہاں ایک معمول تھے۔ اسکول کی حدود سے نکلتے ہی طلبہ غیر محفوظ ہوجاتے تھے۔

''یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟'' اس نے بنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''بغلی سڑک پر۔ وہ دو جیم شحیم افراد تھے۔ میرا اسکارف نوچ ڈالنے کے بعد وہ مجھے گھسیٹ کر وہیں کسی فلیٹ میں لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ یہ خراشیں اسی جدوجہد میں پڑی تھیں۔''

''تم نے بہت اچھا کیا میری بچی!! اب وقت آگیا ہے کہ کوئی انقلابی قدم اٹھا لیا جائے۔'' اس نے ایک عزم سے کہا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ کچھ عرصہ قبل ہی اس نے انتظامیہ سے تفصیلی بات چیت کی تھی۔ طلبہ کو ایک خاص حد تک ہی سیکیورٹی فراہم کی جاسکتی تھی۔ ہر ایک فرد کے ساتھ گھر پہنچنے تک انفرادی سیکیورٹی گارڈ روانہ کرنا بعید از عقل تھا۔ اسکول ٹرانسپورٹ اور پیدل آمدورفت والے طلبہ کی حفاظت کے لیے اینڈریا کے فراہم کردہ منصوبے کو تھوڑی سی ردوکد کے بعد منظور کرلیا گیا۔

اگلے روز جب وہ مکرانے جماعت میں گئی تو اس کے پاس ایک تیز دھار چاقو بھی موجود تھا جو اس نے بچوں کے سامنے

رکھ دیا۔
''یہ کیا ہے بھلا؟ اس سے واقف ہیں ناں آپ؟''
''جی میم!! یہ ایک چاقو ہے۔'' وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ اس نے یہ کون سی نئی کسوٹی کھیلنی شروع کر دی ہے۔
''آپ جزوی طور پر درست ہیں۔ یہ محض ایک چاقو نہیں بلکہ آپ کی عزت اور زندگیوں کی بقاء کی ضمانت ہے۔ آپ سب اسے اپنے ساتھ رکھا کریں گے۔''
''کیا واقعی میم؟'' وہ حیران ہوئے۔
''یاد رکھیے!! قانون ہمیں اپنے دفاع کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ اگر آپ کو کہیں بھی اپنی زندگی یا عزت خطرے میں محسوس ہو تو یہ ساتھی آپ کی یقینی حفاظت کرے گا۔ مجرم ہمیشہ بہت بزدل ہوتا ہے۔ وہ آپ کا حوصلہ، عزم اور ولولہ کبھی بھی سہہ نہ پائے گا۔ اسے بالآخر بھاگتے ہی بنے گی۔ آج سے ٹرانسپورٹ میں جانے والے طلبہ کو میں اور دیگر اساتذہ اپنی نگرانی میں اسٹینڈ تک لے جایا کریں گے۔ ہماری مدد اور تعاون ہر طرح سے آپ کے شامل حال رہے گا۔''
''یہ مجھے دے دیجیے میم! آج آپ یہ راہ نہ دکھاتیں تو میں تعلیم کو خیر باد کہنے کا ذہن بنا چکی تھی۔'' آمنہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔
''اپنا محاذ چھوڑ دینا سب سے بڑی بزدلی اور آدمیت کی توہین ہوتی ہے میرے بچو!! مجھے یقین ہے آپ کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے لیکن یہاں ایک اور بات بھی واضح کر دوں کہ اگر اس چاقو زنی کو بچی، انتقامی یا کسی بھی غلط مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تو اس فرد کو سب سے پہلے میں ہی قانون کے حوالے کروں گی۔ ذاتی دفاع کو قانون شکنی کا جواز بھی ہرگز نہیں بنایا جاسکتا۔'' اس کی ہموار آواز اور چٹانی لہجہ وہاں بیٹھے سبھی طلبہ کے دل و دماغ میں گھر کر رہا تھا۔
عزم و حوصلہ کے بادل تبدیلی کی گھٹائیں برسانے کے لیے تیار تھے۔

☆......☆

35 مختلف ایشیائی، افریقی اور یورپی زبانیں سیکھنے کے بعد اینڈریا کے لیے تدریسی عمل بہت پُرلطف ہو چکا تھا۔
اس کے مضامین میں طلبہ کے نتائج دیگر اساتذہ کے لیے قابلِ رشک تھے تو انتظامیہ کے لیے قابلِ فخر۔ سب سے حیران کن امر تو یہ تھا کہ پیرنٹس ٹیچر میٹنگز کے سلسلہ میں وہ والدین جو اپنی زباندانی کے احساس کمتری میں اسکول آنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے، اب بخوشی وہاں آنا پسند کرتے۔ سالہاسال سے طاری جمود ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ اپنے تحفظات بیان کرتے اور اینڈریا کی تشفی پا کر پُرسکون ہو جاتے۔ ان میں سے اکثریت اپنے بچوں کے آرٹس مضامین پڑھنے پر معترض ہوتی۔
''ہم تو چاہتے تھے کہ یہ سائنس مضامین پڑھ کر کامیابی اور خوشحالی کا سفر طے کرتے۔ آرٹس کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ ہمارے خاندان میں بھی بچے میڈیکل، انجینئرنگ، نیورو سائنس، اسپیس سائنس اور کمپیوٹر پڑھ رہے ہیں۔''
''کامیابی اور خوشحالی کی کنجی سائنس نہیں بلکہ بچے کا اپنا ذہنی میلان ہوتی ہے۔ اس کی عملی مثال میری صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ میرے والدین بھی آپ ہی کی طرح بہت چیں بہ چیں ہوتے تھے لیکن آج وہ سب میری کامیابیوں پر نازاں ہیں۔ آرٹ کو معمولی اور بے وقعت مت سمجھیے۔ یہی وہ رہگذر ہے جو بچوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے کی طرف سفر کرواتی ہے۔ ان میں خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا کرتی ہے۔''

ان سوالات کے علاوہ ایک اور سنجیدہ مسئلہ بھی بہت سے اساتذہ کے لیے دردِسر تھا۔ ایشیائی والدین کی چند تحصیتی قباحتیں ان کے بچوں کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا کرتی تھیں۔ اینڈریا ایسے افراد کی نفسیاتی گرہیں بہت سبھاؤ سے کھولتی۔ وہ ان کے تحفظات کے جواب میں صرف ایک ہی بات کہتی۔ ''بچہ ایک نازک پھول ہوتا ہے۔ وہ اپنے تحفظ اور نمو کے لیے والدین کی بہترین شخصیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر آپ ان کے سامنے جھگڑیں گے، آپس میں مار پیٹ کریں گے یا ان کے ساتھ غصہ اور سختی سے برتاؤ کریں گے تو جوابی طور پر عزت، تابعداری یا بہترین تعلیمی نتائج کی توقع رکھنا آپ کی حماقت ہے۔ ان سے اپنی بات منوانے سے قبل ان کے نفسیاتی تقاضے پورے کرنے بھی تو سیکھیں۔''
اینڈریا کی انہی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ کمیونٹی اسکول برطانیہ کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار ہونے لگا۔ اسے اسکول کی انتظامی کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ اب وہ انتظامی فیصلہ آزادانہ طور پر بھی کر سکتی تھی۔ اس نے اسکول کی دیواروں پر ادارے کا 'اصولِ عمل' (خواہش کرو......محنت کرو......اور کامیابی پالو۔) لکھوا دیا۔ لڑکیوں کے لیے الگ کرکٹ ٹیم بنائی گئی۔ انہیں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں تحفظات درپیش رہتے تھے

جس کے نتیجہ میں کارکردگی بھی اثر انداز ہوجاتی۔ اس انقلابی قدم کے بعدوہ کامیابیوں کے نئے میدان سر کرنے لگیں۔ اسکول کے دفتر کی الماریوں میں دیدہ زیب ٹرافیاں اور انعامی شیلڈز کی بہتات ہونے لگی۔ اینڈریا کی صوابدید پر ایک باکسنگ کلب قائم کرنے کے علاوہ یوگا سکھانے کا اجراء بھی کیا گیا۔ ان سرگرمیوں سے طلبہ کی مثبت توانائیاں مزید نکھر کر سامنے آنے لگیں۔ وہ ایک ساحرہ بھی جو اپنے طلبہ کو مسحور کر کے ان کی زندگیاں ہی بدل دیا کرتی۔ ان کی نفسیاتی الجھنیں دور کرنے کے لیے اس نے کئی بار مالی مدد بھی کی۔ احساس کمتری کے آسیب سے نجات دلوانے کے لیے انہیں اپنی صوابدید پر معاشی وسائل فراہم کرتی رہی۔ اس کے خلوص کی چاشنی میں گھرے وہ بچے جب اس 'قرض' کی ادائیگی کا پوچھتے تو وہ بہت محبت سے گویا ہوتی۔ ''سنجیدگی اور ایمانداری سے اپنی تعلیم مکمل کرلو۔ یہی اس قرض کی ادائیگی ہوگی۔ مستقبل میں جب کسی اچھے مقام پر پہنچ جاؤ تو اپنے اردگرد ایک بار نظر ضرور دوڑانا کہ کہیں کسی کو تمہارے سہارے کی ضرورت تو نہیں۔''

اینڈریا اپنی نوعیت کی پہلی معلمہ تھی جو طلبہ کو ناشتے کے بارے میں پوچھتی' زائد وقت میں ان کی مدد کے لیے کھانا پکانے سے لے کر کپڑے دھلوانے میں ہاتھ بٹا دیا کرتی۔ طلبہ اور والدین اس کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ الپرٹن کمیونٹی اسکول کی دھوم ملک کے طول و عرض میں پھیلنے لگی۔ والدین دیگر تعلیمی اداروں سے اپنے بچوں کے انخلا کے بعد انہیں اینڈریا کے پاس بھیجنا پسند کرتے۔ ادارے کے دیگر شعبہ جات (ریاضی' موسیقی' کمپیوٹر) اپنے نتائج میں بہتری کے لیے اسی سے مدد کے طالب رہتے۔ ان پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں وہ اپنے ذاتی فرائض سے بھی بالکل غافل نہ تھی۔ اس کے چمن میں دو پھول کھلے تھے۔ مصروف تر زندگی میں جان کی محبت بھی روز اول ہی کی طرح برقرار تھی۔ وہ اس کی ذہنی تھکاوٹ' پیشہ وارانہ مسائل کا تناؤ اپنی پُرخلوص محبت اور وارفتگی سے چن لیا کرتا۔

اینڈریا کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک مدت سے ٹیلی ویژن دیکھنا فراموش کر چکی تھی۔ تین گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح ساڑھے سات بجے اسکول روانہ ہوتی تو شام ساڑھے پانچ بجے سے قبل شاذ ہی فرصت مل پاتی۔ کھانے کے وقفے میں بھی مؤخر پروجیکٹس پر کام چلتا۔ گھر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ تھم نہیں پاتا تھا۔ اپنے بچوں اور شوہر کی روزمرہ ضروریات پوری کرنے کے بعد اس کے کام کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوجاتا۔ یہی وہ وقت تھا جب مزید بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے اس نے ایشیائی اور دیگر غیر ملکی طلبہ کو ان کی ثقافت اور قومی روایات سے متعلقہ پروجیکٹس کے ساتھ تعلیم دینے کا آغاز کر دیا۔

''یہ نیا بکھیڑا کیوں پیدا کرلیا ہے اینڈریا؟ وہ برطانوی شہری ہیں۔ انہیں بھی اسی طریقہ سے تعلیم دو جیسے عام برطانوی حاصل کررہے ہیں۔'' ایک ساتھی نے قدرے کوفت سے کہا۔

''وہ برطانوی شہری ضرور ہیں ایڈم! لیکن ان کا خمیر اس مٹی سے نہیں اٹھا۔ تم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ کوئی بھی پودا صرف اسی زمین میں نمو پا کر شجر بنتا ہے جہاں اس کی جڑیں پیوست ہوں۔ ان بچوں کو ہماری تہذیب' ثقافت' ماضی اور آرٹ سے زیادہ اپنے ملک سے محبت ہے اور سدا رہے گی۔ ان کے جذبے کا احترام کرتے ہوئے اگر ہم تھوڑا منفرد طریقہ اختیار کرلیں تو یہی افراد مستقبل میں برطانیہ کے لیے خلوص اور لگن سے پیشہ وارانہ فرائض سرانجام دیں گے۔ میں آج اپنی ذات پر یہ زائد مصروفیت جھیل کر اپنے ملک کے لیے وفادار' ایماندار اور مثبت توانائی کی حامل افرادی قوت تیار کررہی ہوں۔ بصورت دیگر یہ منفی سوچ' بیزاری اور مایوسی میں مبتلا ہو کر ہماری معیشت کے لیے بوجھ ثابت ہوں گے۔''

''تم بے حد عجیب عورت ہو اینڈریا! میں تمہارے یہ فلسفے کبھی سمجھ ہی نہیں پایا۔'' ایڈم نے کہا۔

''میں صرف ایک عورت نہیں ہوں ایڈم!! میں ایک معلمہ ہوں۔ اپنے ملک کا مفاد میرے لیے کسی بھی جذبہ سے بڑھ کر ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

ایڈم کی بات شاید جزوی طور پر ٹھیک ہی تھی۔ اینڈریا واقعی ایک عجیب عورت تھی کیونکہ وہ ہر صبح اپنے طلبہ کو 'سلاما علیکم'..... 'نمستے'..... 'وراکم' اور 'ست سری اکال' کہہ کر کشادہ دلی سے استقبال کرتی۔ وہ واحد معلمہ تھی جس کے پاس والدین کی آمد کا تناسب بچانوے فیصد ہوتا۔ اس کی انہی عجیب و غریب حرکات ہی کا شاخسانہ تھا کہ خستہ حال اور گمنام 'الپرٹن کمیونٹی اسکول' بارہ سال کے عرصہ میں ہی برطانیہ کے نامور اداروں میں شمار ہونے لگا تھا اور جرائم و آوارگی کی راہیں اپنانے والے طلبہ یونیورسٹی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہونے لگے۔ اس کے چند سابقہ اور موجودہ ساتھیوں نے

اصرار کر کے اینڈریا کا نام 'گلوبل ٹیچرز پرائز' میں نامزد کروا دیا۔اس کی لگن اور کامیابیوں نے ورکی فاؤنڈیشن کو متاثر کیا اور 'تیس ہزار انٹریز' میں سے کانٹ چھانٹ کے بعد اسے چالیس امیدواروں میں شامل کرلیا گیا۔

اینڈریا اعداد و شمار کے اس ہیر پھیر سے بے نیاز اپنے کام کو نکھارنے میں مگن تھی۔

☆......☆

''اینڈی!!تم نے کچھ سنا؟'' کیتھی ایک روز بہت پُرجوش ہوکر اس کے پاس آئی۔

''کیا پارلیمنٹ سے تمام جرائم پیشہ افراد کا صفایا ہوگیا ہے یا ہمارے ملک نے تیسری دنیا پر نظریں گاڑے دخل اندازی کرتے یورپی ممالک کا مزید اتحادی نہ رہنے کا اعلان کردیا ہے؟اگر ایسا کوئی تہلکہ مچا ہے تو میں واقعی بے خبر ہوں۔'' اس نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''ارے غافل!!ورکی فاؤنڈیشن کی جانب سے تمہیں حتمی دس بہترین امیدواروں میں شامل کرلیا ہے۔یہ تمہاری بے مثال کامیابی ہے۔اگر یہ مقابلہ تم جیت جاؤ تو ملین ڈالرز کے انعام کی حقدار بنوگی۔کیا کروگی بھلا اس رقم کا؟''

''تم شاید یہ نہیں جانتی کہ اس مقابلہ کا فاتح مزید پانچ سال کے لیے اپنے تدریسی شعبہ سے منسلک رہنے کا پابند ہوتا ہے۔میں بھی آرٹ اور ٹیکسٹائل کی ترقی اور فلاح کے لیے عملی اقدامات اٹھاؤں گی۔'' وہ بے نیازی سے بولی اور پھر ایک توقف سے گویا ہوئی۔''اس دنیا میں بلحاظ کارکردگی و جدوجہد میں ہی سب سے کمتر معلمہ ہوں گی۔مجھے یقین ہے کہ بقیہ نو افراد مجھ سے کہیں زیادہ قابل، مستحق اور بے مثال ہوں گے۔اس لیے میں کسی بھی خوشی کا شکار نہیں ہوں۔'' اینڈریا کے ان الفاظ پر تقدیر وہیں کھڑی خندہ زن تھی۔ورکی فاؤنڈیشن کی جانب سے دبئی آمد کا دعوت نامہ ملنے، وسیع و عریض ہال میں دنیا کے لاثانی اساتذہ کے ساتھ بیٹھنے اور اس کا نام پکارے جانے، عرب امارات کے حاکم شیخ محمد بن راشد المکتوم کے ہاتھوں ایک جگمگاتی ٹرافی ملنے کے تمام تر مراحل اس کے لیے کسی خواب جیسے ہی تھے۔تالیوں سے گونجتے ہال اور کیمروں کی چکا چوند روشنیوں میں اس کی ہمزاد ایک بار پھر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

''دیکھ لو اینڈی!!میں نہ کہتی تھی یہ سب تمہارے لیے ہی تو سب سے زیادہ سہل ہوگا اور تم ان بچوں کے درد کا درماں اور چارہ گر ضرور ثابت ہوگی۔'' اُس نے چپکے سے سرگوشی کی۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا۔یہ سب یقیناً کوئی خواب ہے۔'' اینڈریا کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

☆......☆

ہیتھرو ائیر پورٹ پر کسی تہوار اور جشن کا سا سماں تھا۔

سینکڑوں طلبہ، درجنوں سیاسی اور معزز شخصیات اینڈریا کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔اسے ایک خصوصی گاڑی میں بٹھا کر پارلیمنٹ لے جایا گیا جہاں وزیراعظم 'تھریسا مے' سے ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی۔سیکرٹری تعلیم اور وزیراعظم کے تعریفی کلمات کے عقب میں اسے بچپن میں بیتے سانحہ کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔اپنے ان اساتذہ کی پیش بینی کے مطابق وہ نفسیاتی عدم توازن کا شکار تھی، نہ ہی والدین کے خدشات کے لحاظ سے معاشی تنگی پر احساس محرومی میں مبتلا۔اس کے پاس دنیا کی بہترین معلمہ کا اعزاز تھا جو اس کے طویل سفر کی کامیابی کی ضمانت تھا۔

''آپ کی بے مثال کامیابی ہمارے لیے قومی اثاثہ ہے۔یقیناً یہ سفر بھی آسان ثابت نہیں ہوا ہوگا۔اس موقع پر ہم نظام تعلیم میں آپ کی متعین کردہ اصلاحات سے شناسائی حاصل کرنا چاہیں گے۔'' سیکرٹری تعلیم نے متانت سے کہا۔

''تعلیم ایک مقدس عمل ہے۔اسے کسی کے لیے بھی بوجھ نہ بنائیے۔آج اساتذہ کو بیگار کی طرح سات پاؤنڈ فی گھنٹا کے حساب سے تنخواہ دی جاتی ہے۔انہیں معاشی بوجھ سے آزاد کرنے میں ہی ہمارے تعلیمی نظام کی فلاح ہے۔وہ آپ کی نسل نو کو ایک نیا اوج عطا کرسکتے ہیں۔مہاجرین اور تارکین وطن کو اپنائیت دیجیے۔بدلے میں وہ اپنی وفاداریاں اور خلوص آپ کے نام کردیں گے۔انسانیت کی فلاح جنگ و جدل اور سرحدیں بڑھانے میں نہیں بلکہ اپنے باشندوں کو انسانیت کی معراج عطا کرنے میں ہے۔میں برطانیہ میں ایسا نصاب رائج دیکھنا چاہتی ہوں جو طلبہ مساوات کی افزائش اور تعصبات کا خاتمہ کرے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

ملک کے دو مرکزی عہدیداران کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ اسے جلد یا بدیر اپنے سفر کے لیے مزید راہ اور سہولیات ضرور میسر آئیں گی۔

بابائے کراچی

شکیل صدیقی

عروس البلاد کراچی جو آج دنیا بھر میں ایک پہچان رکھتا ہے، کبھی چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ مائی کلانچی سے شہر کراچی کا ایک طویل سفر ہے۔ مچھیروں کی اس چھوٹی سی بستی کو میٹروپولیٹن شہر میں تبدیل کرنے میں بے شمار افراد کی محنت ہے مگر اس بندے نے تو شہر کو ترقی دینے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

اس محسن کا تذکرہ جس نے کراچی کو ترقی کی اوج پر پہنچایا

نسروانجی رستم جی مہتا کے صاحبزادے جمشید نسروانجی 7 جنوری 1886ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور 66 برس کی عمر میں یکم اگست 1952ء کو کراچی ہی میں وفات پائی۔ وہ نسلاً پارسی تھے۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ پرائمری اسکول میں تعلیم پائی تھی جو آج بھی آر پی ہادی اسکول کے نام سے صدر میں کے ایم سی کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ انہوں نے وی سی اسکول سے میٹرک کیا (جو اس وقت وہاں قائم تھا جہاں اب ڈاؤ میڈیکل کالج بنا دیا گیا ہے) اس کے بعد انہوں نے دیا رام جیٹھامل کالج میں تعلیم حاصل کی۔

جمشید کے والد نسروانجی رستم ایک تاجر تھے جو دور اندیش، باہمت، جوش و ولولہ رکھنے والے ہشت پہلو شخص تھے۔ جب کہ ان کے دادا ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ ان کے والد نے غیر ملکی شراب اور دیگر چیزوں کی ایک دکان الفنسٹن روڈ پر کھول رکھی تھی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے دکان کو بڑھانا شروع کر دیا۔ برف کارخانہ لگا لیا، پھر آٹے کا ایک کارخانہ قائم کیا، اس کے بعد انہوں نے ٹائلز بنانے کی فیکٹری بھی لگالی۔ جب یہ کاروبار چل پڑا تو انہوں نے تیل کے ایک کارخانے کی بنیاد ڈالی۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کارخانے میں بھی انہیں منافع ہونے لگا۔ نسروانجی رستم کی ہمت بڑھی اور انہوں نے ایسے چھوٹے چھوٹے مزید کارخانے قائم کرنا شروع کر دیے۔ چند برسوں کے بعد انہوں نے صوبہ پختونخواہ میں ریلوے کینٹین کے ٹھیکے بھی لے لیے۔ انہیں یقین تھا کہ کاروبار میں جتنی ترقی ہوگی۔ لوگوں کو کام ملے گا اور روزگار میں اضافہ ہوگا۔

جمشید نسروانجی مہتا بچپن میں خوب کھیلتے کودتے تھے وہ تعلیم کے ساتھ کھیلوں سے بھی شغف رکھتے تھے۔ اس زمانے میں انہیں کرکٹ سے بھی بہت دل چسپی تھی۔ اس کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا کھیل ہوگا جو انہوں نے نہ کھیلا ہو۔ پیراکی، ٹینس اور کشتی وغیرہ۔ مگر وہ عام لڑکوں کی طرح بے سروپا مذاق اور ٹھٹھے بازی نہیں کرتے تھے۔ وہ طبعاً سنجیدہ تھے۔ فالتو وقت وہ لائبریری میں گزارتے تھے۔ گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے والد کا کاروبار سنبھال لیا۔ وہ دیکھنے میں دوسروں سے زیادہ خوبصورت لگتے تھے، خاص طور پر ان کی آنکھیں قاتلانہ تھیں، چنانچہ لڑکیاں ان کے گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ لیکن وہ کسی کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔

اپنے زمانۂ طالب علمی میں وہ رابرٹ بیڈن پاول کی اسکاؤٹ تنظیم سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اسکول کے اساتذہ سے مشورہ کر کے بوائے اسکاؤٹ تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کو بعد میں فروغ ملا اور دوسرے اسکولوں میں بھی بوائے اسکاؤٹ تنظیم قائم ہوگئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ان کے مدعو کرنے پر بوائے اسکاؤٹس سے ملاقات کی تھی۔ جمشید تیس برس تک خاموشی سے اسکاؤٹ تنظیم کا حصہ بنے رہے اور اس کے لیے کام کرتے رہے۔ ان کا مشن تھا کہ پاکستان امن اور سلامتی کا گہوارا بنے۔ اپنی موت کے وقت وہ پاکستان میں ڈپٹی چیف کمشنر تھے۔ ان کی ان مساعی جمیلہ پر انہیں اسکاؤٹ تنظیم کا سب سے بڑا اعزاز "سلور وولف" دیا گیا۔ جب تنظیم مضبوط ہوگئی تو اینی بیسنٹ بھی اس میں شامل ہوگئیں۔

کراچی چونکہ سمندر کے کنارے واقع ہے، اس لیے انہوں نے لوگوں کے کہنے پر اکتوبر 1938ء میں "سمندری اسکاؤٹنگ" کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا

کہ پانی میں گھرے ہوئے افراد کی مدد کی جائے۔ جب تنظیم میں لوگوں نے دل چسپی لینا شروع کر دی تو جمشید نے ایک چھوٹا سا جہاز بھی خرید لیا جس پر سی اسکاوٹ سمندر میں بیس میل تک سفر کر کے حادثات میں گھرے افراد کی مدد کیا کرتے تھے۔

☆......☆

نوجوان طالب علموں کو حوصلہ دینے کے لیے وہ نت نئی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ تین دن بعد کرشنا مورتی کی موت کے بارے میں ایک تقریب ہونے والی تھی۔ انہوں نے ایک طالب علم سے کہا۔ ''ایڈوانی! تمہیں سمپوزیم میں کرشنا مورتی کے بارے میں تقریر کرنا ہے۔ تم سے اچھا مجھے کوئی اور مقرر نہیں ملے گا۔''

''مم...... میں۔'' اس نے ہکلا کر پوچھا۔

''ہاں تم۔'' جمشید بولے۔

''مم ... مگر میں نے تو ان کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا صرف ان کا نام سنا ہے۔'' ایڈوانی بدستور تذبذب میں مبتلا تھا۔

''تو تیاری کرلو۔ کیا ان پر کتابیں نایاب ہیں؟'' انہوں نے کہا۔ ''میں نے تمہارا نام پبلسٹی میں دے دیا ہے۔ مجھے شرمندہ نہ کر دینا۔''

ایڈوانی کی جان جب مصیبت میں پھنس گئی تو اس نے کرشنا مورتی کے بارے میں سات آٹھ کتابیں جمع کیں اور انہیں پڑھ کر ایک تقریر لکھ کر جمشید کو دکھائی۔ انہوں نے تعریف کی۔ مقررہ دن پر ایڈوانی نے تقریر کی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جمشید کی حوصلہ افزائی اس کے کام آئی تھی۔

☆......☆

جمشید نسروانجی کے دادا اس کے لیے مشعل راہ تھے۔ اسے گھبرایا دیکھ کر کہتے۔ تم ہر وقت خدا سے کامیابی کے پاسپورٹ کی توقع تو نہیں کر سکتے۔ زندگی میں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں جن پر ہم اپنی ہمت اور دانائی سے قابو پاتے ہیں۔ کسی کی زندگی میں شہد ہی شہد گھلا ہوا نہیں ہوتا ہے۔

جمشید کی والدہ گل بائی بھی انہیں مہمیز کرتی تھیں اس کی شخصیت میں ان کی والدہ کی بہت سی خصوصیات جھلکتی تھیں۔

انہوں نے اپنی والدہ سے راضی بہ رضا رہنے کا انداز سیکھا تھا۔ ان کی والدہ اکثر کہتی تھیں۔ ''بیٹے! یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ جو ہوتا ہے، ہونے دو۔''

جمشید نے اپنی زندگی کا آغاز اپنے والد کے بزنس سے

کیا۔ 1879ء میں ان کے والد نے شراب کی دکان کھولی جس نے خوب ترقی کی۔ والد کا تجربہ اور محنت ان کے کام آئی۔ اس کاروبار کو انہوں نے مزید پھیلا دیا۔ نسروانجی رستم نے اپنا ایک شاندار آفس بھی میانی میں قائم کر رکھا تھا۔ جمشید اس آفس میں بیٹھنے لگے اور اپنے والد سے کاروباری اسرار و رموز سیکھنے لگے۔ انہوں نے والد سے یہ سیکھا کہ مستقبل کی اسکیمیں کس طرح بنائی جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے بزنس کو فروغ دیا اور نئی نئی صنعتیں لگانا شروع کر دیں۔ وہ ہندوستان تاجر ایسوسی ایشن کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ وہ اپنے والد کے متعلق کہتے تھے۔ ''میرے والد ایک کاروباری شخص تھے اور کسی بھی معاملے کو کل پر نہیں ٹالتے تھے۔ انہیں ورزش کرنے کا شوق تھا تاکہ وہ فٹ رہ سکیں۔ وہ ظاہری اور دکھاوے کی عبادات نہیں کرتے تھے، بلکہ خدا کو اپنے دل میں رکھتے تھے اور لوگوں کے دینی جذبات کو مجروح نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے معاملات میں کھرے تھے۔ ان کا کاروبار وسیع تھا جس کی بنا پر وہ خوش رہتے تھے کہ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو روزگار ملا ہوا ہے۔ کاروبار میں نفع نقصان کی انہیں پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں دولت سمیٹنے کی عادت نہیں تھی۔

جمشید ماہر مالیات تھے۔ پھیلے ہوئے کاروبار کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ صنعتی کارخانوں کے مالک، بڑے بزنس مین اور حکومت کے عہدے دار سب ہی ان سے مشورہ کرتے تھے۔ ٹیکس، کرنسی، ریلوے بورڈ، پورٹ ٹرسٹ، کوآپریٹو سوسائٹی اور زراعت کے معاملوں میں لوگ ان سے رائے طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو کسی وقت بھی طلب کر لیا کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالیات میں ان کی سوجھ بوجھ سب پر حاوی تھی۔

وہ گجراتی اچھی طرح بولتے تھے اور اس زبان میں اچھا لکھتے بھی تھے۔ مگر وہ انگریزی میں اتنے اچھے نہیں تھے۔ جب وہ انگریزی میں تقریر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ ان کے دل سے نہیں صرف زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ ان کے دلی جذبات تقریر میں شامل نہیں ہو پاتے تھے۔ ان کی تقریر سن کر پروفیسر بیوٹانی نے کہا تھا۔ ''وہ کسی منطق کے بغیر تقریر کرتے ہیں۔ اکثر ان کی گرامر درست نہیں ہوتی۔ ان کی انگریزی تقریر بس کام چلاؤ ہوتی ہے۔''

☆......☆

بیسویں صدی کا پہلا حصہ ہندوستان کے لیے سیاسی جدوجہد اور انتشار کا دور تھا۔ آزادی کی جنگ کا سہرا بلاشبہ دادا بھائی نوروجی، گوکھل، سرسید احمد، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح کے سر رہا۔ جمشید کو گاندھی کا ''شہری نافرمانی'' کا فلسفہ پسند تھا اور انہوں نے اس تحریک میں شرکت بھی کی تھی لیکن اینی بیسنٹ نے انہیں اس سے منع کیا اور بتایا کہ یہ تھیوسوفی کے منافی ہے تو وہ خاموشی سے اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ جب بمبئی میں دوسری بار ''شہری نافرمانی'' کا اعلان ہوا تو انہوں نے گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے برعکس وہ محمد علی جناح اور ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کے ذریعے آزادی کی جنگ میں شامل تھے۔ اگرچہ انہیں تقسیم کی وجہ سے راہوں کے جدا ہونے کا صدمہ تھا لیکن اس کو انہوں نے معبود کی مرضی سمجھ لیا۔ وہ بے خانماں لوگوں کی آبادکاری میں لگ گئے جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی میں پناہ گزیں ہو گئے۔ سندھ لجیسلیٹو اسمبلی میں جمشید منتخب ہوئے۔ وہ قائداعظم ریفوجی ریلیف کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے مصیبت زدہ اور درماندہ لوگوں کے لیے دن رات کام کیا۔

جمشید کی انتھک محنت کام کی لگن اور خدمت کے جذبے نے کراچی کے رہنے والوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

1938ء میں کراچی کے سابق صدر حاتم علوی نے جمشید کو ''جدید کراچی کا بانی'' قرار دیا تھا۔ اگر ہم کراچی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوگا کہ انگریزوں کے وقت میں یہ ماہی گیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ 1939ء سے لے کر 1947ء تک کراچی کی وسعت و ترقی بے مثال ہے اور اس میں شک نہیں کہ 1947ء کے بعد سے کراچی میں زبردست تغیر آیا اور اس کے محرک جمشید تھے۔

جمشید سے زیادہ کراچی سے شاید ہی کوئی واقف ہوگا۔ ان کے سامنے کسی بھی سڑک کا نام لے لیجیے۔ وہ فوراً بتا دیں گے کہاں واقع ہے اور اس کے دونوں طرف کون کون سی عمارات کھڑی ہیں اور وہاں کون کون مشہور و معروف افراد مقیم ہیں۔

☆......☆

جب وہ بمبئی میں تھے تو انہوں نے ایک ہال کی طرف لوگوں کو رواں دواں دیکھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی تقریر کرنے والا ہے۔ انہیں بھی اشتیاق ہوا کہ وہ بھی اس ہستی کو دیکھیں اور سنیں جس کے لوگ اتنے مداح ہیں۔ ایک عالم خاتون تقریر کر رہی تھیں۔ جن کا نام ڈاکٹر اینی بیسنٹ تھا۔ تقریر سننے کے بعد جمشید نے اس ہستی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے ان سے

مصافحہ کیا اور ان کے لیکچر کی تعریف کی۔ بعد میں جمشید کی عقیدت بڑھی تو اینی بیسنٹ کو "روحانی ماں" کہنے لگے۔ جارج برنارڈ شا کا کہنا تھا کہ وہ بیسویں صدی کی عظیم خواتین میں سے ایک ہیں جنہوں نے غریبوں کے حقوق کے لیے بڑی دلیری سے جنگ لڑی تھی۔ بلاشبہ یہ وہی تھیں جنہوں نے سچائی کی تلاش میں تھیوسوفی کے پردے میں پوری دنیا کے بھائی چارے کے لیے ایک کنجی تلاش کرلی تھی جسے اسلام نے نہایت خوش اسلوبی سے سمجھایا ہے۔ (تھیوسوفی کا مطلب ہے عرفان الٰہی کی جستجو، عرفانیات خصوصاً ایک جدید تحریک جو ہندو اور بدھ تعلیمات کی پیرو اور عالم گیر انسانی اخوت کی قائل ہے)

اینی بیسنٹ نے غریبوں اور مفلوک الحال افراد کے لیے بڑی تگ و دو کی تھی۔ وہ مفلسوں کی بڑی ہمدرد تھیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح سے دنیا سے مفلسی کو ختم کر دیں۔ جمشید کے لیے ان کی رہنمائی مشعل راہ بن گئی۔ وہ ایک دل نواز سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔

انہوں نے 1923ء میں خود تھیوسوفیکل ہال بنایا جہاں وہ ہر ہفتے کی شام کو لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس میں بہت خاص قسم کے لوگوں کو داخلے کا پاس دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ان کی موت 1952ء تک جاری رہا۔ وہاں اور حیدرآباد میں اینی بیسنٹ نے بھی لیکچرز دیے۔ (کراچی میں تھیوسوفیکل ہال ریڈیو پاکستان کے سامنے واقع ہے جہاں اب بھی فلسفے پر لیکچر دیے جاتے ہیں۔ اس ہال میں عام لوگوں کے لیے ایک فری لائبریری بھی ہے)

ان کی پہلی برسی پر جمشید نے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان کے بارے میں جو بات آپ لوگوں کو بتانے جا رہا ہوں۔ اس پر مشکل ہی سے یقین کریں گے کہ ہر سال... 31 دسمبر پر وہ اپنے بینک اکاؤنٹ میں جتنی رقم ہوتی تھی، وہ غریبوں اور مفلسوں میں تقسیم کردیا کرتی تھیں۔ کاش کہ میں بھی ایسا کرسکتا۔

آپ کو ایک بات اور بتاؤں کہ ان کا کہنا تھا کہ ہر اچھے شخص میں بھی کچھ برائیاں ہوتی ہیں اور ہر برے شخص میں کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور ہوتی ہے۔ ہر شخص اس ہیرے کی مانند ہے جس کے چھ پہلو ہوتے ہیں، ان میں سے پانچ اگر خراب ہیں تو ایک اچھا اور چمکدار ہوتا ہے۔"

اینی بیسنٹ رتن تلاؤ کے قریب رہتی تھیں اور ان کے آنجہانی ہونے پر جمشید پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھے گئے تھے۔

☆......☆

جمشید کم عمری ہی میں کراچی بلدیہ کے صلاح کار بنائے گئے تھے۔ ہرچند رائے وشنداس نے جو اس وقت بلدیہ کے صدر تھے، جب جمشید سے کراچی بلدیہ کے پرانے ریکارڈ کے کاغذات جلانے کے کام کی نگرانی کرنے کو کہا تو جمشید نے اس کام کو اپنی نگرانی میں کرایا۔ وہ پانچ گھنٹے تک کارکنوں کے پاس کھڑے رہے۔ جب وشنداس نے انہیں کام کو اس طرح لگن سے کرتے دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ کوئی اعلا وارفع انسان بنے گا۔ چھ برس کے بعد جب غلام علی چھاگلہ (احمد چھاگلہ کے والد جنہوں نے پاکستان کے قومی ترانے کے لیے موسیقی ترتیب دی تھی) نے کراچی بلدیہ کے صدارتی منصوبے سے استعفا دیا تو صلاح کاروں کو جمشید سے قابل کوئی نظر نہیں آیا۔ ابتدا میں جمشید اتنی بڑی ذمے داری اور منصب سے قدرے ہچکچائے، لیکن بقول حاتم علوی کے سارے لوگوں کی دلی آرزو تھی کہ وہ صدر منتخب ہوں۔

اس طرح جمشید اور کراچی ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے گئے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شہر کی خدمت اس کے مکینوں سے ہوسکتی ہے۔ سیاسی اصلاح میں شاید انہیں پہلا شہری کہا جائے، لیکن وہ خود کو شہر کے لوگوں کا غلام کہتے تھے۔ ایک مبلغ کی طرح اپنا جسم، ذہن، روح، دولت، عقل و آرام سب کچھ دے کر اس پسماندہ شہر کو ایک ایسی جگہ بنانا چاہتے تھے جہاں لوگ پُرسکون زندگی گزار سکیں۔

کوئٹہ میں زلزلہ آگیا اور ہزاروں متاثرین روزانہ گاڑیوں میں لدکر کراچی آنے لگے۔ جمشید انہیں اسپتال پہنچاتے تھے اور ان کی خبرگیری کرتے تھے۔

جب گاندھی جی کی شہری نافرمانی کی مہم چلی تو پولیس لاٹھی چارج کرتی تھی۔ جمشید زخمی ہونے والوں کو اسپتال میں داخل کراتے اور ان افراد کا علاج کراتے تھے۔

جمشید بلاواسطہ 1922ء سے 1932ء تک کراچی بلدیہ کے منتخب صدر رہے۔ وہ روزانہ یہ دعا مانگتے تھے:

اے خدا مجھے کارآمد بنا
اے خدا مجھے بے ضرر بنا
اے خدا مجھے پاکیزہ بنا
اے خدا مجھے اپنا ذریعہ بنا

وہ آرام بھی کر رہے ہوں یا سو رہے ہوں تو ان کا ذہن شہر کے بارے میں سوچتا رہتا اور منصوبے بناتا رہتا۔ وہ صبح

پانچ بجے جاگ جاتے تھے، پھر چھ بجے سے شام چھ بجے تک کام کرتے تھے۔ انہیں کھدّی کا بنا ہوا کوٹ اور پاجامہ پہننے کا شوق تھا۔ جن کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ سر پر وہ کڑھی ہوئی ٹوپی پہنتے تھے اور ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔ ان کے پاؤں میں کینولیس کے جوتے ہوتے تھے۔ وہ لکڑی کی چوکی پر سوتے تھے اور اس پر گدا نہیں بچھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ انسان کو اتنا آرام پسند نہیں ہونا چاہیے۔

اپنی میز پر بیٹھ کر وہ ضروری کام کرتے اور ملاقاتیوں کے سوالات کے جوابات دیتے۔ پھر سول اسپتال میں مریضوں کی عیادت کے لیے جاتے۔ پھر وقت ضائع کیے بغیر میونسپلٹی کے آفس واپس آجاتے۔ دوسرے جو کام ہفتوں میں کرتے تھے وہ ایک دن میں کر لیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کبھی عجلت میں نہ ہوتے اور ہر وقت مسکراتے رہتے۔ انہیں کسی نے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ سماجی تقریبات میں بھی پابندی سے شریک ہوتے تھے چاہے وہ کسی کی شادی ہو یا میت۔ اس کے بعد کسی ضرورت مند کے کام نمٹا رہے ہوتے۔ وہ آئس کریم کھانے کے بھی شوقین تھے اور اتوار کی صبح خاص طور پر زیلین یا کیپٹل ٹی ہاؤس جاتے تھے۔ آئس کریم کے علاوہ انہیں دیگر ٹھنڈی چیزیں بھی پسند تھیں۔

☆......☆

سکھر بیراج کی تعمیر کا منصوبہ بمبئی حکومت نے بنایا تھا، لیکن اس کی فائل دب کر پیچھے چلی گئی۔ یہ منصوبہ 1922ء میں بنایا گیا تھا۔ اس وقت مسٹر لائڈ گورنر تھے۔ جمشید کو بھی اس میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔ انہوں نے یہ منصوبہ نہیں بنایا تھا، لیکن انہیں اس کے بارے میں معلوم تھا، لہٰذا جب گورنر کراچی آیا تو جمشید نے سکھر بیراج کی تعمیر کی فائل تلاش کر کے اس کے سامنے پیش کر دی۔ گورنر کو یہ منصوبہ پسند آیا اور اس نے تعمیر کی منظوری دے دی۔

بیراج کی تعمیر آٹھ برس میں مکمل ہوئی۔ اس سے بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں۔ یہ دنیا میں برطانوی حکومت کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ تھا۔ اس سے ساٹھ لاکھ ایکڑ بنجر زمین کاشت کے قابل ہوگئی۔

بلدیہ کی صدارت کے بارہ برسوں میں جمشید نے شہر کراچی کو ایک کوزہ گر کی طرح ہاتھ میں لے لیا تھا اور بقول عمر خیام کے بڑی محنت سے اسے اپنی آرزوؤں کے مطابق سانچے میں ڈھال دیا۔ انہوں نے میونسپل معاملات سے متعلق شہر کی ترقی پر اثر انداز ہونے والے ہر مسئلے پر ایک ایک کر کے مکمل توجہ دی اور اپنی ذہنی توانائی سے اسے حل کیا۔ وہ ایک ایسے میونسپل سربراہ تھے جس کا ہمسر برصغیر ہندو پاک نے کبھی نہیں دیکھا۔

جمشید کے بقول ان کے ایک مرحوم دوست مسٹر برج، جو حکومت کے عہدے دار تھے، کی بیوہ نے انہیں ایک کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ وہ جب اس کا مطالعہ کرنے لگے تو اس میں سے ایک دستاویز نکل کر گر پڑی۔ انہوں نے اسے اٹھایا تو معلوم ہوا کہ آرٹلری میدان کا علاقہ کراچی میونسپل کارپوریشن کی ملکیت ہے۔ جب کہ بمبئی حکومت اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ علاقہ حکومت کا ہے۔ چونکہ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں تھا، اس لیے جمشید نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اس دستاویز کے ہاتھ میں آنے کے بعد وہ پونا گئے اور گورنر سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران جمشید نے بتایا۔ ”آرٹلری میدان کا علاقہ میونسپل کارپوریشن کا ہے اور آپ کی حکومت اس سلسلے میں گھناؤنا کھیل کھیل رہی ہے۔ یہ انتہائی شرمناک حرکت ہے۔“

گورنر نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟“

جمشید نے وہ دستاویز ان کے ہاتھ میں تھما دی جو انہیں پُراسرار طور پر ملی تھی۔

اس دستاویز کو دیکھ کر گورنر حیران رہ گیا۔ وہ پشیمان تھا۔ اس نے حکومت کی طرف سے معذرت کی۔ پھر اس نے جمشید سے کہا کہ وہ انہیں ”نائٹ ہڈ“ کا خطاب دینا چاہتا ہے۔ جمشید نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”اس خطاب کو حاصل کرنے کے بعد میں اپنے دوستوں اور عام لوگوں سے دور ہو جاؤں گا۔ اس وقت جس کا جی چاہتا ہے۔ میری گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے یا میرے آفس میں آکر بات کر لیتا ہے۔ میرے نائٹ ہڈ بننے کے بعد سب مجھ سے دور ہو جائیں گے کیونکہ میرے اور ان کے درمیان ادب، تمیز اور لحاظ حائل ہو جائے گا۔“

گورنر نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ بمبئی ایگزیکٹیو کونسل میں ایک سیٹ دینا چاہتا ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک بڑا اعزاز تھا۔ مگر جمشید نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک بیوروکریٹک حکومت میں غلام بن کر نہیں رہنا چاہتے۔ جب وہ کراچی آگئے اور بات پھیل گئی تو ”ڈیلی گزٹ“ نے ان کے اقدامات کو بہت سراہا اور انہیں عوام کا سچا خادم قرار دیا۔

1932ء میں کراچی کے کئی علاقے ایسے تھے مثلاً گارڈن کوارٹر اور آرٹلری میدان جہاں زیرزمین پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ آرٹلری میدان جہاں آج سندھ چیف کورٹ اور اسمبلی کی عمارتیں اور سینٹرل سیکریٹریٹ کی بیرکیں واقع ہیں، اس وقت میونسپل کو منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ میونسپل کارپوریشن کو اس علاقے پر کوئی اختیار نہ تھا۔ گندگی اٹھانے کے لیے وہاں ایک بیل گاڑی آیا کرتی تھی۔ یہ صورت حال ایک جدید شہر سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ جمشید نے فوری اس مسئلے پر توجہ دی۔

جب آرٹلری میدان میں پانی کی فراہمی اور نکاسی کی لائنیں پڑ گئیں تو چیف کورٹ کی عمارت کو بھی ان سے منسلک کر دیا گیا۔ کارپوریشن نے تقریباً تیس لاکھ روپے اس پر خرچ کیے۔ حکومت کو اتنا بڑا بل ادا کرنے میں تامل تھا۔ اس کے علاوہ بیوروکریسی کے عہدے داروں کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اکثریت میں ہیں اس لیے جمشید ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

جمشید نے کافی مراسلت کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجبوراً انہوں نے دھمکی دی کہ وہ چیف کورٹ کی لائنیں کاٹ دیں گے۔ حکومت بمبئی کا ایک نمائندہ پونا سے دوڑتا ہوا آیا اور اس نے میونسپل کارپوریشن کے بل کی ادائیگی کرائی۔

کراچی میں صاف پانی کی فراہمی بھی ایک مسئلہ تھی۔ صاف پانی کا انحصار ڈملوٹی کے کنوؤں پر تھا۔ جب کہ بارش نہ ہونے کی صورت میں پانی کی قلت ہوجایا کرتی تھی۔ جمشید نے اس مسئلے کو بھی خوش اسلوبی سے حل کیا کہ کراچی کے شہری نلکا کھولتے تو پانی کی موٹی دھار گرنے لگتی ورنہ اس سے پیشتر ہوا کی سنسناہٹ ہی سنائی دیتی تھی۔

جب سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا گیا تو جمشید سندھ لجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور میونسپلٹی کے رکن نہ رہے لیکن اس کی پروا نہ کرتے ہوئے انہوں نے کراچی کو پانی کی فراہمی کا مسئلہ پوری شدت سے حکومت سندھ کے سامنے اٹھایا۔ کابینہ کے سارے ارکان جمشید کی عزت کرتے تھے اور ان کے سابقہ کاموں سے واقف تھے۔ انہوں نے لوکل گورنمنٹ کی ایک انکوائری کمیٹی قائم کی اور جمشید کو اس کا چیئرمین مقرر کر دیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ اعداد و شمار اکٹھا کریں اور مکمل رپورٹ پیش کریں۔

1939ء میں جنگ شروع ہوگئی لیکن جمشید نے نہایت مختصر عرصے میں اپنا سروے مکمل کیا اور رپورٹ پیش کر دی۔ جسے حکومت نے منظور کر لیا، لہٰذا ہالیجی واٹر ورکس کی اسکیم مکمل کی گئی اور شہریوں کو پانی فراہم ہوسکا۔

جمشید نے جب کراچی کی صدارت سنبھالی تو سڑکوں کی کل لمبائی 12 میل تھی۔ لیکن اس سڑک پر کولتار کی تہ نہیں تھی۔ ان کی سبک دوشی کے وقت کراچی میں سڑکوں کی لمبائی 72 میل ہوچکی تھی اور وہ سب کولتار سے چمک رہی تھیں۔ سڑکوں کے ساتھ انہوں نے فٹ پاتھ بھی بنوائے تھے۔ تقسیم کے وقت یہ سڑکیں چمکتی تھیں اور ان کے کنارے تک کٹے پھٹے نہ تھے۔ آج کل سڑکوں کا حال تو آپ جانتے ہی ہوں گے، لہٰذا ان کے بارے میں سمع خراشی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

1932ء میں کراچی میں صرف دو عوامی پارک تھے۔ ایک برنس گارڈن اور دوسرا گورنمنٹ گارڈن جس میں چڑیا گھر بھی تھا۔ جمشید نے منصوبہ بنایا کہ ہر علاقے میں ایک پارک بنایا جائے۔ ان کے ریٹائر ہونے تک کراچی میں بارہ پارک بن چکے تھے، جس میں خصوصیت سے ایک گوشہ بچوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس میں ہلکی ورزش کا سامان بھی تھا۔ بعد میں اس سامان کی مرمت کرنے والا بھی کوئی نہ رہا اور پارکوں میں خاک اڑنے لگی۔

گورنمنٹ گارڈن کا نام تبدیل کر کے گاندھی گارڈن رکھ دیا گیا۔ یہ پارک 1860 میں لگایا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس کی توسیع کی جائے گی لیکن حکومت نے دونوں سائڈ پر دکانیں بنالیں جس سے اس منصوبے پر پانی پھر گیا۔

جمشید نے کوآپریٹو کی بنیاد رکھی اور اس منصوبے کو یہاں تک پہنچا دیا کہ ہندوستان کا کوئی اور شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ 1922ء میں اب جہاں جمشید کوارٹر بنے ہیں ان دنوں وہاں ویران میدان ہوا کرتا تھا۔ دولت مند لوگ کلفٹن، فیئر اور گارڈن کوارٹر میں رہتے تھے۔ انہوں نے جمشید کوارٹر میں رہنا گوارا نہ کیا چنانچہ اس میں متوسط طبقے کے افراد آکر بس گئے۔ کم آمدنی والے لوگوں کے لیے پلاٹ خریدنا محال تھا۔ اس لیے جمشید نے فیصلہ کیا کہ زمین آپریٹو کو مفت فراہم کی جائے اور مکان بنانے کے لیے کوآپریٹو بینکوں سے قرضے دیے جائیں۔ ہرچند کہ جمشید کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے حکومت اور میونسپل کمیٹی سے اپنا منصوبہ منظور کرالیا۔ ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر میونسپل کمیٹی نے ان کوارٹرز کا نام ''جمشید کوارٹرز'' رکھ دیا۔

جمشید کئی برس تک میونسپل اسکول بورڈ کے چیئرمین

رہے۔ اس وقت شہر کی مسلمان آبادی مزدور طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ زیادہ تر مسلمان لیاری کے علاقے میں رہتے تھے اور ان کے بچے اسکول نہیں جاتے تھے۔ جمشید نے محسوس کیا کہ وہاں لازمی پرائمری تعلیم رائج کیے بغیر آبادی کو خواندہ نہیں بنایا جاسکتا۔ سخت محنت کے بعد انہوں نے دس اسکول کھلوائے اور لازمی پرائمری تعلیم کو رائج کیا۔

اس کے علاوہ انہوں نے بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) پر ماما پارسی گرلز اسکول کی تعمیر کے لیے ایک لاکھ پینتیس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ جب تعمیر شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دوستوں سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی عطیات دیں۔ ان کے ایک دوست اردشیر ہرمجی نے تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ جس سے اسکول پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ ماما پارسی کے علاوہ، این جے وی، میٹروپول ہوٹل سوبھراج اسپتال اور بہت سے میٹرنٹی ہوم بھی انہی کے قائم کیے ہوئے ہیں۔

جمشید کے صدر بنتے وقت کراچی میونسپل کارپوریشن کے دفاتر میکلوڈ روڈ پرسٹی اسٹیشن کے قریب کرائے کی عمارتوں میں واقع تھے۔ جمشید کی خواہش تھی کہ بندر روڈ پر میونسپل کارپوریشن کی عمارت بنے۔ جب عمارت کا نقشہ تیار ہوگیا تو انہوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ کارپوریشن کو قرضہ دیں۔ جیسے ہی پندرہ لاکھ روپے جمع ہوجائیں گے تعمیر شروع کر دی جائے گی۔ اگر معاملہ آج کے دور کا ہوتا تو صرف ایک ہی شخص اتنی مالیت کے چیک پر دستخط کر دیتا، لیکن چندہ جمع کرنے میں دیر لگی۔ بہرحال چندہ جمع ہوتے ہی کارپوریشن کی عمارت بن کر تیار ہوگئی۔

میونسپل کارپوریشن کی عمارت کے بعد انہوں نے میونسپل میوزیم کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کے لیے بھی فنڈ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے لوگوں سے چندہ لیا۔ جب عمارت تیار ہوگئی تو انجینئر جہانگیر سیٹھ نے انہیں معائنے کے لیے بلایا۔ انجینئر نے نقشے میں تبدیلی کر کے وسط میں ایک گنبد تعمیر کر دیا تھا۔ جمشید نے اسے ناپسند کیا اور کہا کہ اسے توڑ دیا جائے۔ انجینئر نے کہا۔ ''یہ گنبد عمارت کی دل کشی کو بڑھا رہا ہے۔ اگر اسے توڑ دیا گیا تو عمارت سپاٹ سی ہوجائے گی۔''

''مگر مجھے یہ گنبد پسند نہیں ہے۔ سرکاری عمارتوں میں گنبد نہیں ہونا چاہیے۔ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے۔''

جب عمارت بالکل تیار ہوگئی تو پتا چلا کہ گنبد میں ایک شگاف پڑ گیا ہے، اگر اسے توڑ کر ختم نہ کیا گیا تو پوری عمارت خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا اسے توڑنا بہتر ہے۔

☆......☆

انہیں اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ اس لیے انہوں نے کراچی کی ساری ماؤں کے لیے ایک میٹرنٹی ہوم جہانگیر باغ کے قریب بنوایا۔ اس کے بعد انہوں نے منصوبہ بنایا کہ کراچی کے ہر علاقے میں ایک میٹرنٹی ہوم بنایا جائے، مگر اس کے لیے پیسا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس تاک میں رہتے تھے کہ اس سال کس شخص نے زیادہ روپیا کمایا ہے۔ وہ اس کے پاس جا کر گزارش کرتے کہ وہ ایک میٹرنٹی ہوم بنوا دے۔ دولت مند حضرات اپنی دولت کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور اسے جدا نہیں کرتے۔ مگر جمشید اتنی محبت سے استدعا کرتے کہ سیٹھوں کو رقم دیتے ہی بنتی تھی۔

انہیں پتا چلا کہ کراچی کا ایک سیٹھ بے اولاد ہے اور اب مرنے کے قریب ہے۔ اس کی جائیداد رشتے داروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ وہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس سے درخواست کی۔ وہ مان گیا اور اس کے نتیجے میں اس نے عیدگاہ میدان کے قریب ایک میٹرنٹی ہوم بنوا دیا۔

گل حسن کلماتی اپنی کتاب ''سندھ جا لافانی کردار'' میں لکھتے ہیں کہ 1919ء میں کراچی میں انفلوئنزا پھیل گیا (انفلوئنزا طبی لحاظ سے مہلک بیماری ہے) جمشید ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے پاس دولت و ثروت کی کمی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو پُرآسائش زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن کراچی سے یہ مہلک بیماری ختم کرنے کے لیے انہوں نے دن رات کام کیا۔ حد یہ ہے کہ کراچی میں اچھے ڈاکٹروں کی کمی ہوگئی تو انہوں نے بمبئی سے ڈاکٹر بلوا لیے۔ اس خدمت کی بنا پر نوجوان طبقہ ان سے واقف ہوگیا اور انہیں پسند کرنے لگا۔

ماہی گیروں کا یہ گاؤں جو ''کلاچی جو کن'' کہلاتا تھا جمشید نسروانجی کی سعی سے کراچی شہر بن گیا۔ انہوں نے اس کا نقشہ ہی بدل دیا۔ یہاں تک کہ کراچی کو برصغیر کا سب سے منظم شہر قرار دیا جانے لگا۔ غیر متعصب، صاحب شعور سیاح، جمشید کے دنوں کے کراچی کو مشرق کا سب سے صاف ستھرا شہر کہتے تھے، اس لیے کہ یہاں کی سڑکوں کی دن میں دو بار دھلائی ہوتی تھی۔

جمشید نے ایک کتاب میں لکھا۔ ''اگر ہم یہ سمجھ لیں قدرت کے ہر کام، ہر قدم کا ایک مقصد ہے تو ہم سمجھ لیں گے کہ ایک مخصوص شہر میں آباد ہونے کا بھی کوئی مقصد ہے اور

یہی مقصد اس شہر کے لیے ہم پر فرض عائد کرتا ہے اور یہ فرض ہر اپنے اپنے مزاج کے مطابق بغیر کسی بوجھ کے ادا کرسکتا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر ایک صبح اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہے ”یہ شہر میرا ہے“ اور وہ اس قول پر قائم رہ کر ایمانداری سے کام کریں تو ہر چیز درست ہوسکتی ہے۔ لوگ ووٹ دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ذمے داری ختم ہوگئی اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر کونسل کے ارکان اور افسران پر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔“

جمشید کو لوگوں پر بہت اعتماد تھا۔ ان کے خیال میں کوئی بھی بے داغ نہ تھا لیکن ہر ایک میں خدا کی دی ہوئی کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور ہوتی ہے۔ وہ اکثر مذہبی اجتماعات میں اپنی روحانی ماں اینی بیسنٹ کی یہ دعا ضرور کرتے تھے:

اے پُراسرار زندگی تُو ہر ریزے اور ذرے میں متحرک ہے۔

اے پُراسرار نور تُو ہر جاندار میں ہویدا ہے۔

اے پُراسرار محبت تُو ہر ایک کو یکساں اپنی بانہوں میں لیے ہوئے ہے۔

معلوم ہو اسے جسے تجھ سے ہم آہنگی محسوس ہو کہ وہ ہر دوسرے کے ساتھ ہے۔

وہ ایک سادہ انسان تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن جب بھی لوگ ان سے مدد مانگتے تھے، وہ چاہے اسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، اس کی مدد کے لیے تیار ہوجاتے تھے اسی لیے سب ان سے محبت کرتے تھے۔ اجتماعات میں بچے بڑے سب انہیں اپنے حلقے میں لیے رہتے تھے۔

انہیں بلاشبہ قدم قدم پر اپنے بزرگوں کی رہنمائی حاصل تھی۔ ایک بار انہیں کارپوریشن جانے کے وقت ایک فائل کی تلاش تھی جو نہیں مل رہی تھی۔ وہ سخت اضطراب اور ہیجان میں مبتلا تھے۔ مگر فائل نہیں ملی۔ وہ بے نیل و مرام اپنی کار میں بیٹھنے جارہے تھے کہ اچانک ان کی ماں کا ہیولا نظر آیا جو اس جگہ کی نشاندہی کررہی تھیں جہاں فائل پڑی تھی۔ جمشید نے وہاں جا کر دیکھا تو فائل مل گئی۔ وہ شاداں و فرحاں اپنی کار میں جا بیٹھے۔ بعد میں یہ واقعہ کئی افراد کو گوش گزار کرایا۔

☆......☆

ان کے سیکریٹری ڈاکٹر کیول موٹوانی کہتے ہیں: ”جمشید سے میری ملاقات کچھ عجیب انداز سے ہوئی۔ وہ ایسے کہ محترمہ اینی بسنت جب 1919ء میں نیشنل کالج حیدر آباد تشریف لائیں تو میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے انہیں دیکھا۔ میں پہلے ہی سے ان سے متاثر تھا، اس لیے میں نے ان پر ایک نظم لکھی تھی۔ وہ نظم میں نے جمشید کے ذریعے اینی بسنت تک پہنچادی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھے بلالیا اور شکریہ ادا کیا۔ اس طرح جمشید میرے لیے ایک رابطہ بن گئے۔ اس کے بعد تین برس تک میری اور جمشید کی گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں نیشنل کالج کے پرنسپل کے

سیکریٹری کی حیثیت سے کام کررہا تھا جب کہ جمشید کالج کے بورڈ کے اعزازی خازن اور معتمد تھے۔ وہی اس کالج کے سب سے بڑے مالی اور انتظامی سرپرست تھے۔

ان کی زندگی بہت مصروف تھی۔ وہ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ممبر اور چیمبر آف کامرس کے صدر و بانی پارسی اسکول اور ماما پارسی اسکول کے ممبر، سینٹرل کوآپریٹو بینک کے ڈائرکٹر بھی تھے۔ یہ ساری مصروفیات کو تن تنہا نمٹاتے اور انہوں نے کوئی سیکرٹری تک نہ رکھا تھا۔ مگر جب وہ اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے تو ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی۔

اتنی مصروفیات کے باوجود وہ ہفتے میں ایک بار میرے ساتھ گاندھی گارڈن ضرور جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہم چاندنی رات میں کلفٹن چلے جاتے تھے جہاں قدرت کی صناعی اپنے جوبن پر ہوتی تھی۔ جب میں نے جمشید پر ایک مضمون لکھا اور اینی کے رسالے "ینگ سٹیزن" میں چھپوایا تو ان کا نام پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اینی اس سے بہت خوش ہوئیں جمشید نے بتایا کہ یہ میرا کارنامہ ہے۔

میں نے کئی ماہ تک جمشید کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا مگر میں نے ان سے کچھ نہیں مانگا اور نہ انہوں نے کچھ دیا۔ مگر حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ میں نے مجبوراً انہیں ایک خط لکھ ڈالا۔ دوسرے دن وہ دفتر آئے تو اپنے ساتھ چیک بک بھی لائے۔ انہوں نے چیک بک اپنی جیب سے نکالی اور چیک پر دستخط کرکے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ان کی توجہ رقم کے خانے کی طرف مبذول کرائی تو انہوں نے کہا۔ "جناب! جب میں نے اپنے والد کے کاروبار کو سنبھالا تھا تو انہوں نے بھی سادہ چیک میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اب کیا میں اپنی خاندانی روایت کو چھوڑ دوں؟"

میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ میں نے وہ چیک ان سے لے لیا۔

میرے لیے ان کی شفقت روز بہ روز بڑھتی چلی گئی۔ پھر اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مجھے چار برس کے لیے امریکا بھیج دیا تاکہ میں معاشرتی علوم میں اپنی تعلیم مکمل کرسکوں۔ وہاں مجھے ماہانہ خرچا ملتا رہا۔ 1937ء میں، میں نے جب ساجیات پر ایک کتاب لکھی تو اس کا انتساب کیا:

"میں یہ کتاب جمشید نسروانجی کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جو کراچی بلدیہ کے پہلے منسٹر اور آخری صدر ہیں۔ میرے راہبر، فلاسفر اور دوست ہیں، جن کی عنایتوں نے مجھے ساجیات کا علم بخشا، جن کی بے مثال تربیت نے مجھے زندگی کے معنی سمجھائے۔ میں ان کے پیار اور بلندی کردار سے متاثر ہوکر ایک معتبر تحفہ پیش کررہا ہوں۔"

وہ پارسی تھے مگر دنیا کے سب مذاہب سے محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ ہندو مندروں میں جانا، سکھوں کے گردواروں میں شرکت کرنا اور عیسائیوں کی تقریبات میں جانا اور چرچ میں جاکر بیٹھنا، مسلمانوں کی مساجد میں جانا اور روزے رکھنا ان کا وصف تھا۔

وہ اسپتالوں میں جاتے تھے تو اپنی ڈائری میں مریضوں کی حاجات نوٹ کرلیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہر ماہ کی پہلی کو ایسے افراد کے لیے رقم کے لفافے بنایا کرتے تھے اور انہیں کسی کے ذریعے سے کراچی میں رہنے والوں کے گھر پہنچا دیا کرتے تھے۔ جو افراد شہر سے باہر رہتے تھے انہیں چیک یا منی آرڈر کے ذریعے رقومات بھیجا کرتے تھے۔ اس فرد کا نام تو لفافے پر لکھا ہوتا جسے وہ جانا ہوتا تھا، لیکن بھیجنے والے کا نام ندارد۔ چنانچہ حاجت مند اس الجھن میں مبتلا ہوجاتا کہ اسے یہ کس نے بھیجا ہے۔ مالیات کا حساب چونکہ میں رکھا کرتا تھا، اس لیے میں جب 1946ء میں ان سے جدا ہوا تو میرا اندازہ ہے کہ وہ تقریباً ان وظائف کے ذریعے پچاس لاکھ روپے دے چکے تھے۔ بعد میں یقیناً اس میں اضافہ ہوا ہوگا۔

وہ کھلے دل کے تھے مگر جب قومی معاملہ ہوتا تھا تو کنجوسی بھی کرتے تھے۔ ایک بار ہم کراچی کا دورہ کررہے تھے پیاس لگنے لگی تو ایک نلکے سے ہاتھ لگا کر پانی پیا، مگر اس طرح سے کہ آدھا پانی گر گیا اور آدھا پیٹ میں گیا۔ چنانچہ نلکا دیر تک کھلا رہا۔ ہم جب پی چکے تو جمشید نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے نلکے سے نکلنے والی دھار نصف کردی۔ یوں پانی ضائع ہونے سے بچ گیا۔ وہ کہنے لگے۔ "دوستو! آپ نے جس طرح سے پانی پیا ہے اس سے مجھے تکلیف پہنچی ہے۔ آپ لوگوں نے بہت پانی ضائع کیا ہے۔ اگر اس انداز سے پیتے تو پانی بچ جاتا اور کسی اور کے کام آتا۔ کراچی میں پانی کی قلت ہے۔ ہمیں دوسروں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

انہیں پیٹ کے درد کی بھی شکایت تھی۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتے کہ اسپتال کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ میں نے مشورہ دیا کہ آپریشن کرالیں۔ لیکن وہ اس سے ڈرتے تھے۔ دوسرے مریضوں کو کرب میں مبتلا دیکھتے تو کہتے تھے۔ "اس بیچارے کے مقابلے میں تو میری تکلیف کچھ بھی نہیں ہے۔"

میرا خیال ہے کہ وہ اپنی تکلیف پر دوسروں کی دعاؤں

سے قابو پالیتے تھے۔
انہیں دوسروں کی تکالیف دیکھ کر بہت پریشانی اور الجھن ہوتی تھی۔ وہ خدا سے دعا مانگتے تھے جو پوری ہوجاتی تھی۔ ایک بار وہ اسپتال گئے تو ایک بچے کے سرہانے جا کر کھڑے ہوگئے۔ اس کے والدین سے ان کی سرسری سی شناسائی تھی۔ جمشید نے پوچھا کہ بچے کو کیا ہوا ہے تو اس کی ماں رونے لگی۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کے گردے فیل ہوچکے ہیں۔ جمشید نے انہیں تسلی دی اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر مناجات پڑھنے لگے۔
اس کے بعد چلے گئے۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور انہوں نے پہلے دن کی طرح دعائیں مانگیں اور بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تقریباً دس دن تک وہ اسپتال آتے رہے۔ خدا کی قدرت کہ بچہ صحت مند ہوگیا اور اس کے گردے صحیح طور پر کام کرنے لگے۔
اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔
ان کے پاس ایک پارسی خاتون لائی گئی۔ اس کی ہڈیاں بچپن سے گل رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اب یہ صحت یاب نہیں ہوسکتی۔ جمشید اس خاتون کے ڈاکٹر بن گئے اور انہوں نے پانچ برس تک اس کا ہومیو پیتھک علاج کیا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ خاتون صحت یاب ہوسکتی ہے۔ اس کے جسم پر زخم تھے، لیکن ان کے طویل علاج اور دعاؤں سے مریضہ تندرست ہوگئی۔

☆......☆

فرنی پٹیل نے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ 24 نومبر 1924ء کو میری دائیں ٹانگ میں درد ہونے لگا۔ میں نے ڈاکٹری علاج کرایا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتفاقاً جمشید نسروانجی کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بلایا اور طریق علاج تبدیل کرنے کو کہا۔ انہیں ہومیو پیتھی پر زیادہ یقین تھا۔ میں نے اسے آزمایا اور اس کے بعد آیورویدک لیکن درد ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد جمشید جی مجھے ہر بڑے ڈاکٹر حد یہ ہے کہ حکیم کے پاس لے گئے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں نے اپنا علاج شروع کیا۔ وہ پتا نہیں کیا کچھ ملا کر لاتے تھے اور میری ٹانگ پر مل دیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی دعائیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ٹانگ پر اکیس زخم تھے، لیکن جمشید نے ان کی پروا نہیں کی اور نو برس تک اپنا علاج جاری رکھا۔ اکیس میں سے بیس زخم مندمل ہوگئے۔ آخری زخم کچھ بدذات تھا، اس لیے اس نے ختم ہونے میں دو برس لگا دیے۔
مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جمشید کو طب سے لگاؤ تو تھا، لیکن انہوں نے طب پڑھی نہیں تھی اور نہ کسی ڈاکٹر، حکیم سے حکمت سیکھی تھی، اس کے باوجود وہ زخموں کو مندمل کردیا کرتے تھے۔ یقیناً خدا نے ان کے ہاتھوں میں شفا دے رکھی تھی۔ میرا گھر دو منزلہ تھا۔ جمشید جی 35، 25 بار اس کے زینوں پر چڑھے اور اترے، لیکن ہمت نہیں ہارے۔ ابتدا میں وہ دن میں تین بار آتے تھے، اس کے بعد ہفتے میں پانچ دن۔ اس کے بعد جیسے جیسے زخم مندمل ہوتے گئے، انہوں نے ہفتے میں ایک دن آنا شروع کردیا۔

☆......☆

وہ صرف روحانی طور پر سچے اور نیک ہی نہیں تھے، بلکہ خدا نے انہیں دماغی صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ اس سلسلے میں آرٹلری میدان کا واقعہ گوش گزار کرلیجیے۔ بمبئی حکومت نے اس کی فروخت کے لیے اخبارات میں اشتہار دیا تو دوسرے دن جمشید نے اشتہار دیا کہ آرٹلری میدان کی زمین خریدنے والے خود اس کے ذمے دار ہوں گے۔
جب گورنر سر ایمر وز لائیڈ کو پتا چلا تو وہ پہلی ٹرین سے کراچی پہنچا اور اس نے جمشید کو بلا کر دھمکی دی۔ وہ بھلا کب خاموش رہنے والے تھے۔ انہوں نے جواباً کہا کہ وہ اس معاملے کو پریوی کونسل برطانیہ میں لے جائیں گے اور کئی کروڑ کا دعوا کریں گے۔ کافی دیر تک جھک جھک بک بک ہوتی رہی۔ گورنر نے دیکھا کہ وہ کسی صورت مان ہی نہیں رہے ہیں تو اس نے جمشید سے مصالحت کرلی۔ اس طرح سے عوامی میدان فروخت ہونے سے بچ گیا اور گورنر صاحب کی جیب گرم نہ ہوسکی۔
معلوم نہیں کیسے انہیں آنے والے برے حالات کا علم ہوجاتا تھا۔ ان کے ایک واقف کار پروفیسر ایم۔ ایڈوانی نے اپنا ایک واقعہ سنایا تھا کہ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب نان کوآپریشن موومنٹ (شہری نافرمانی کی مہم) اپنے عروج پر تھی۔ حیدرآباد نیشنل کالج کے ایک پروفیسر معین حیدر نے بھی چھٹی کی درخواست دی تاکہ تحریک میں حصہ لیں۔ پرنسپل نے یہ کہہ کر درخواست نامنظور کردی کہ کسی بھی تحریک میں حصہ لینے سے قبل استعفا دینا ضروری ہے۔ چھٹی نہیں مل سکتی۔
معین حیدر نے پرنسپل کے کمرے سے نکلنے کے بعد چند طلبہ کو جمع کیا اور ایک جذباتی قسم کی تقریر کرڈالی۔ طلبہ نے مردہ باد کے نعرے لگانا شروع کردیے۔ بتدریج مجمع بڑھ گیا

اور سب نے معین حیدر کا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا۔ دوسرے دن سے کالج کے طلبہ نے ہڑتال کردی اور چند طلبہ نے پرنسپل کے گھر کا گھیراؤ کر لیا تاکہ وہ کالج تک نہ پہنچ سکیں۔

میں اس زمانے میں کراچی میں تھا۔ جمشید نے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا تو انہوں نے کہا کہ فوراً حیدرآباد جاؤ۔ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے خود حالات سے آگاہی نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم وہاں نہ پہنچے تو معاملہ خراب ہوجائے گا۔ میں اس زمانے میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ میں نے گاڑی پکڑی اور حیدرآباد روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سرکاری گاڑی حاصل کی اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا چل پڑا۔

میں چونکہ پرنسپل نعیم الانہ کو جانتا تھا، اس لیے سیدھا ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ہیرآباد مارکیٹ کے نزدیک طلبہ کا ایک گروہ نعرے لگاتا نظر آیا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ سب پرنسپل کے گھر کی طرف جارہے ہیں۔ میں ان سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور میں نے ان سے درخواست کی کہ ان کی جان کو خطرہ ہے، لہٰذا میرے ساتھ چلیں۔ میں سرکاری گاڑی میں انہیں بٹھا کر پانچ میل دور لے گیا۔ راستے میں انہوں نے حالات بتائے۔ میں نے کہا۔ ”مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔“

”وہ کیا؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”یہ کہ آپ پروفیسروں کی ایک میٹنگ بلائیں۔ اگر سب اس پر متفق ہوں کہ چھٹی دی جاسکتی ہے تو معین حیدر کو چھٹی دے دی جائے۔“

انہوں نے میری بات مان لی۔ سب کو فون کیا اور دوسرے دن کالج میں بلایا۔ سب نے جان بچانے کی خاطر معین کو چھٹی دینا منظور کرلی۔ یوں ایک بڑا قضیہ نمٹ گیا مگر مجھے کافی دنوں تک حیرت رہی کہ جمشید نے اتنی دور بیٹھے کیسے اندازہ لگالیا کہ الانہ صاحب کی جان خطرے میں ہے! وہ کوئی مذہبی یا روحانی پیشوا نہیں تھے، لیکن آنے والے خطرات کو کیسے محسوس کرلیتے تھے!

لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر وہ اپنی جان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ برطانوی راج کے خلاف ہندوستان میں عام ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ جس کا اثر کراچی پر بھی پڑا۔ یہاں بھی دکانیں اور کاروبار بند کردیا گیا۔ کہیں کوئی دکان اِکا دُکا کھلی رہ گئی تو پولیس اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے دکان داروں کو دھمکیاں دینے لگی۔ ایک دکان پر سے انہوں نے ایک نوجوان لڑکے کو گرفتار بھی کرلیا۔

لوگ وہاں جمع ہوگئے کہ دکان بند کردی جائے گی لیکن لڑکے کو چھوڑ دیا جائے۔ پولیس نے دھمکی دی کہ اگر مجمع نہ چھٹا تو گولی چلا دی جائے گی۔ جمشید وہاں سے اپنی کار میں گزر رہے تھے۔ انہوں نے کار رکوا کر پوچھ گچھ کی۔ پھر ڈرائیور کو کار ایک طرف کھڑی کرنے کا حکم دیا اور مجمع اور پولیس کے درمیان دیوار بن گئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ بچے نے ایسا کوئی بڑا جرم نہیں کیا، قانون کی کوئی خلاف ورزی بھی نہیں کی ہے۔ چنانچہ اسے رہا کردیا جائے۔ پولیس اگر گولی چلائے گی تو پہلی گولی وہ اپنے سینے پر کھانے کو تیار ہیں۔ مجمع جوش جذبات سے شور مچانے لگا کیونکہ وہ ان سے واقف تھے کہ وہ میونسپل کونسلر ہیں اور انہوں نے کراچی کی بہت خدمت کی ہے۔ پولیس ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس نے نوجوان کو رہا کردیا تو مجمع منتشر ہوگیا۔

☆......☆

1937ء میں سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے الیکشن ہونے لگے تو ہر ایک کی خواہش تھی کہ جمشید کو چنا جائے۔ جمشید اس میں حصہ لینے پر رضامند نہیں تھے۔ آخر کار لوگوں کے اصرار پر راضی ہوگئے لیکن اس شرط پر کہ ایمانداری سے کام لیا جائے گا اور حکومت نے جتنی رقم الیکشن کے لیے مختص کی ہے اس سے زیادہ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ غلط قسم کی کنویسنگ نہیں ہوگی۔ لوگوں نے انہیں ہی ووٹ ڈالے جب کہ ان کا پولنگ بوتھ دور تھا اور انہوں نے گاڑیوں کا انتظام بھی نہیں کیا تھا مگر لوگوں کی محبت کے سبب وہ الیکشن جیت گئے۔

الیکشن کے دوران وہ دادو گئے تو انہیں دیکھنے کے لیے عورتیں، مرد اور بچے ٹوٹے پڑ رہے تھے تاکہ اپنے خیرخواہ اور رہنما کے ہاتھ کا بوسہ لے سکیں۔ ان کے پیر تھام لیں مگر جمشید اس سے احتراز کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ انہیں اَن داتا یا اوتار سمجھیں۔

جمشید کے کردار کا سب سے مضبوط پہلو اُن کی مراقبے کی عادت تھی۔ ہر دن کا آغاز اور اختتام طویل عبادت اور مراقبے پر ہوتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ انہیں اپنے وجود سے باہر آنے اور روزمرہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ وہ یوگا بھی کرتے تھے۔

علم و ادب سے انہیں شغف تھا۔ شاید ہی کوئی اچھا میگزین ہوگا جس کا سالانہ چندہ وہ نہ بھیجتے ہوں۔ انہیں کتابیں خریدنے کا بھی شوق تھا۔ نفسیات، جنسیات، سماجیات، سائنس اور فلسفے کی کتابیں ان کی ذاتی

لائبریری میں موجود تھیں۔البتہ مذہبی کتابوں کی طرف ان کا رجحان زیادہ تھا۔وہ سارے مذاہب کا مطالعہ کرتے تھے۔وہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ قطعی نہیں تھے، مگر اشتراکی فلسفے سے متاثر ضرور تھے اس لیے کہ میں نے انہیں کئی بار کارل مارکس کا مطالعہ کرتے دیکھا تھا۔

انہیں مطالعے کا بہت شوق تھا،اس لیے وہ اپنی چوکی لائبریری میں بچھا کر لیٹتے تھے۔ان کی لائبریری کراچی کی چند بڑی اور اچھی لائبریریوں میں ایک تھی۔وہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید لیتے تھے۔جبکہ اس زمانے میں ایک یا دو روپے کی کتاب مل جایا کرتی تھی۔وہ راہ چلتے یا کار میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے تھے۔جو کتابیں انہیں پڑھنا ہوتی تھیں،وہ کار میں بھی رکھ لیا کرتے تھے۔بعض اوقات کار میں اتنی کتابیں ہو جایا کرتی تھیں کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں بن پاتی تھی۔

رابندر ناتھ ٹیگور اور مسز سروجنی نائڈو جب بھی کراچی آتے تھے تو ان کے گھر میں قیام کرتے تھے۔گاندھی جی کا خیال تھا کہ جمشید نسروانجی ایک متبرک ہستی ہیں جن کی زندگی سندھ کے لیے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔

میونسپل ایکٹ جس کے تحت کراچی میونسپلٹی قائم کی گئی تھی۔میونسپلٹی کے تمام اختیارات صدر کو سونپتا تھے۔بمبئی کی لجسلیٹو اسمبلی نے کراچی شہر کے لیے ایک خاص قانون منظور کیا،جس کے تحت میونسپل کارپوریشن قائم کی گئی۔یہ قانون 1933ء کے آخر میں نافذ کیا گیا تھا اور کارپوریشن قائم کیا گیا اور جمشید کراچی کے پہلے میئر بنے۔وہ نومبر 1933ء سے اگست 1934ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔اس کے بعد انہوں نے اس عہدے کو چھوڑ دیا۔

یکم اپریل 1936ء میں کراچی ،بمبئی سے علیحدہ ہوگیا۔اس علیحدگی کی خوشی میں کیماڑی پر ایک جشن منایا گیا۔اس جشن میں شرکت کے لیے میں اپنے جہاز سے وہاں آیا تھا۔جشن میں جمشید کے علاوہ شہر کے معزز عہدے دار اور افسران شریک تھے۔گورنر نے میونسپل کارپوریشن کو دلی مبارک باددی۔

چند ماہ بعد جمشید نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ”کراچی میونسپلٹی“ تھا۔اس میں بتایا گیا تھا کہ کراچی کی میونسپلٹی کن ناساعد حالات میں قائم کی گئی تھی اور اس نے کس درجے ترقی کی، انڈیا میں اس جیسی کوئی میونسپلٹی نہیں تھی۔(تقسیم سے پہلے) یہ 1853ء میں قائم ہوئی تھی، جبکہ اس کے سیکریٹری کو ماہانہ 50 روپے، انگریزی جاننے والے ایک کلرک کو 40 روپے ماہانہ، ایک منشی کو صرف 10 روپے ملا کرتے تھے۔جبکہ خدمت گار 5 روپے پر ملازم تھے۔میونسپلٹی کے بہت سے شعبے ہیں، جن میں انجینئرنگ، صحت، انتظامیہ، اکاؤنٹس، آڈٹ اور تعلیم شامل ہیں۔آج اس کا بجٹ بہت زیادہ ہے خرچ اور اخراجات بھی لاکھوں میں ہیں۔

1939ء میں جب کراچی میں صنعتی نمائش ہوئی تو مرکزی دروازے پر جمشید نسروانجی کی بڑی سی تصویر لگائی گئی جس کے نیچے لکھا تھا۔”جدید کراچی کے معمار۔“

☆......☆

جمشید نیک اصولوں پر کاربند رہتے تھے اور اس سلسلے میں کسی بات کی پروا نہیں کرتے تھے۔چاہے وہ بات ان کے خلاف ہی کیوں نہ کہی جارہی ہو۔

1939ء میں کانگریس حکومت بمبئی میں حکمراں تھی۔ڈاکٹر گلبرٹ جو بمبئی کی کیبنٹ میں صحت عامہ کے وزیر تھے،نے اس بل کے پاس کرنے پر زور دیا کہ بمبئی کی حدود میں شراب بندی کی جائے اور کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دی جائے کیونکہ شراب نوشی سے لوگوں کی صحت روز بہ روز گرتی جارہی ہے۔

حزب اختلاف نے اس پر شور مچادیا۔دل چسپ بات یہ کہ کیبنٹ میں شامل بہت سے ممبران نے بھی اس پر سخت اختلاف کیا۔دین سے شغف رکھنے والوں نے کہا کہ شراب بذات خود کوئی شیطانی چیز نہیں ہے۔البتہ اسے کثرت سے پینے کو منع کیا گیا ہے۔جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے،شراب بندی سے لوگوں کا اخلاقی معیار بلند نہیں ہوجائے گا۔یورپ اور امریکا میں لوگ اٹھتے بیٹھتے شراب پیتے ہیں، مگر انہیں آئے دن بیماریاں نہیں ہوتیں۔اس لیے کہ وہ اعتدال میں رہ کر پیتے ہیں۔

جمشید کا اس سلسلے میں کیا نظریہ تھا؟ ان کے والد کی تو خود شراب کی دکان تھی،جس پر وہ شرمندہ رہتے تھے۔انہوں نے شراب بندی کے حق میں آواز بلند کی۔ان کا کہنا تھا کہ انڈیا میں لوگوں کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہے،لہٰذا شراب پر پابندی عائد کردینا بہتر ہوگا۔

چند ہفتوں کے بعد جمشید نے ایک گجراتی ماہنامے ”شردا“ میں ایک مضمون لکھا کہ ان کے ایک ملازم نے جس کی شراب کی دکان بھی تھی۔شادی کی ایک تقریب میں شراب سپلائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ اب وہ

شراب فروخت نہیں کرے گا، اس لیے جمشید جی نے اس پر پابندی عائد کرنے کو کہا ہے۔ لوگوں نے اسے ڈرایا دھمکایا لیکن اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ جمشید لکھتے ہیں کہ اب وہ مجھے اپنا گرو لگتا ہے۔

چاہے غریب ہو یا امیر وہ لوگوں کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے، چاہے اس سلسلے میں انہیں خود کوئی پریشانی ہی اٹھانا پڑے۔ کارپوریشن کی مینجنگ کمیٹی کا اجلاس دفتر میں بلایا گیا تھا۔ اس روز موسم بہت واہیات تھا اور کسی کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس اجلاس میں صرف تین ممبران حاضر ہوئے تھے۔ ایک جمشید، دوسرا چیئرمین اور تیسرا ایک کلکٹر۔ اجلاس کے اختتام پر کلکٹر نے گزارش کی کہ جمشید اسے اپنی کار میں لفٹ دے دیں۔ وہ جمشید کوارٹرز میں رہتا تھا۔

جمشید نے اسے کار میں بیٹھنے کو کہا۔ سڑکوں پر پانی بھرا ہوا تھا اور کار کے پہیوں سے پانی اڑ رہا تھا۔ گڑھوں میں چھپاکے ہو رہے تھے۔ جب اس کلکٹر کا گھر آیا تو جمشید نے ڈرائیور سے کار روکنے کو کہا۔ کلکٹر نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہوا جا رہا تھا۔

جمشید نے کہا۔ ''ارے بھئی! میرا اتنا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر میں تمہاری جگہ اس مصیبت میں گرفتار ہوتا تو کیا تم مجھے لفٹ نہ دیتے؟''

☆......☆

لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔ وہ اس سوال کو ٹال جاتے تھے۔ آخر کار ایک روز میں نے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے مسکرا کر ٹالنے کی کوشش کی تو میں نے کہا کہ انہیں میرے اس سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔

انہوں نے بتایا کہ ان کی زندگی میں چند واقعات ایسے پیش آئے کہ ان کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی انہونی بات ہے کہ جب بھی بات طے ہونے لگی تو ان کی زندگی نے یوٹرن لے لیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک لڑکی معمولی شکل وصورت کی تھی اور جس کی تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بھی پسماندہ تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس لڑکی کی شادی ہونا ممکن نہیں ہے۔ جمشید کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھے۔ انہوں نے سوچا کہ معاشرہ اس لڑکی کو ٹھکرا رہا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اسے کیوں نہ اپنا لیں پھر اپنے قابل بنالیں۔

انہوں نے اپنی خالہ کے ذریعے پیغام اس کے گھر پہنچایا۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ جمشید کی ظاہری شکل و صورت اور اخلاقی بلندی کے سامنے وہ خود کو ہیچ تصور کرتی ہے، لہٰذا اس نے انکار کردیا۔ یوں جمشید ایک بار پھر کنوارے رہ گئے۔

ایک ماں اپنی لڑکی کو اپنے ساتھ لائی جو حاملہ تھی۔ یہ حمل ناجائز تھا۔ انہوں نے لڑکی سے اس لڑکے کا نام پوچھا، مگر اس نے لڑکے کا نام بتانے سے انکار کردیا۔ ماں نے کہا کہ اس کی مدد کی جائے۔ لڑکی کا حمل ساقط کرادیا جائے۔ جمشید کو ناجائز اور غیر قانونی کاموں سے نفرت تھی۔ وہ دیر تک اس کا حل تلاش کرتے رہے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے خود کو پیش کر دیا اور کہا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ وہ لڑکی اور بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

لڑکی کی ماں ان کی بہت شکرگزار ہوئی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہوگئے۔ اس نے دو روز کی مہلت مانگی۔ دو روز بعد جب جمشید اس کا انتظار کررہے تھے تو ماں نے بتایا کہ ایک ڈاکٹر نے ان کی مشکل حل کردی ہے۔ اب لڑکی کی حالت اطمینان بخش ہے اور آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ وہ آپ کو بھگوان کا اوتار کہتی ہے۔ لہٰذا جمشید ایک بار پھر کنوارے رہ گئے۔ غالباً ان کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں بنی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”تو کیا آپ کو زمانہ نوجوانی میں کسی دوشیزہ سے محبت بھی نہیں ہوئی تھی؟“

”ہوئی تھی۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”میں بھی عام نوجوانوں کی طرح تھا۔ سیارہ مریخ سے تو نہیں آیا تھا۔ مگر مجھے اظہار محبت کی ہمت نہ پڑی۔ کہیں برا نہ مان جائے اور میری بے عزتی نہ کردے اس لیے خاموش رہا اور اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی کہیں اور کردی۔ کافی وقت گزر گیا۔ میں اور وہ اچھے دوست بن گئے۔ ایک روز لڑکی کی ماں نے پوچھا کہ اگر میں نے کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے تو بتاؤ تاکہ وہ شادی طے کردیں۔ میں نے انہیں سارا قصہ سنا دیا اور پشیمان سا ہوگیا۔

پھر اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اس لڑکی کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اس کی ماں سے وجہ دریافت کی تو پتا چلا کہ وہ لڑکی مجھے چاہتی تھی، لیکن والدین کو ہمت نہ ہوئی کہ میرے خاندان والوں سے تذکرہ کرتے، اس لیے کہ ہم سماجی طور پر بلند مرتبے والے لوگ تھے۔ معاشرے میں ہمارا مقام بلند تھا۔ حالانکہ میں خود کو ایسا نہیں سمجھتا تھا اور نہ اب سمجھتا ہوں۔“

وہ مسکرا رہے تھے، لیکن ان کی مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ دل شکستہ اور دل گیر تھے، لیکن مسکرا کر مجھے اور خود کو دھوکا دینا چاہ رہے تھے۔

☆......☆

ان کی زندگی انوکھے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ایک یتیم بچی ان کے پاس لائی گئی، جس کے والدین ٹریفک کے حادثے میں ختم ہوگئے تھے۔ اس کے حالات سن کر انہیں بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس کی کفالت کی اور اپنے ایک دوست سے گزارش کی کہ وہ اسے اپنے ہاں رکھ لیں۔ ہر ماہ اخراجات وہ ادا کرتے رہیں گے۔ انہوں نے بچی سے کہا کہ وہ جب بھی مصیبت میں مبتلا ہو، خدا کو یاد کرلیا کرے۔ وہ ضرور اس کی مدد کے لیے آئے گا (پارسیوں کے عقیدے کے مطابق دو خدا ہوتے ہیں، نیکی کا خدا یزداں اور برائی کا خدا یا شیطان اہرمن ہے) بچی نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

کافی عرصے بعد جب جمشید اپنی کار میں ایک دوست کے گھر جارہے تھے تو ڈرائیور نے کار ایک مکان کے سامنے لے جاکر روک دی۔ جمشید ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کار رکنے پر اتر گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ اصل مکان سے کافی فاصلے پر اترے ہیں۔ ڈرائیور نے انہیں آگے بڑھ کر اتارا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں حضرات کے نام ایک جیسے تھے۔ جمشید نے سوچا جب وہاں تک آگئے ہیں تو ان صاحب سے ملاقات کرتے چلیں۔ وہ آگے بڑھے تو انہیں مکان کی ایک کھڑکی میں ایک دوشیزہ دکھائی دی جو بری طرح سے چیخ رہی تھی اور اس کے پیچھے ایک شخص تھا جو اس کی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”اے خدا! میری مدد کر۔ جمشید کا خدا کہاں گیا؟“

جمشید نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”خدا ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ میری بچی۔ گھبراؤ مت۔“ پھر انہوں نے دروازے کو اپنی واکنگ اسٹک سے کھٹکھٹایا اور اونچی آواز میں کہا۔ ”دروازہ کھولو۔ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔“ پولیس کا نام سن کر وہ شخص پچھلے دروازے سے بھاگ گیا۔ لڑکی نے دروازہ کھول دیا اور بتایا کہ اس کے والدین گئے ہوئے ہیں اور وہ گھر میں تنہا ہے۔ جمشید نے اس لڑکی کو پہچان لیا۔ یہ وہی یتیم بچی تھی جس کو انہوں نے اپنے دوست کے گھر میں پناہ دلوائی تھی۔ اس کے نقوش سو فیصد وہی تھے، جو بچپن میں تھے۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں بیٹی۔" جمشید نے کہا۔ "میں ہی جمشید ہوں جس نے تمہیں خدا کو یاد کرنے کی تلقین کی تھی۔ نورالدین کہاں ہے؟"

"وہ اپنے بڑے بھائی کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ مجھے انہوں نے تنہا چھوڑ دیا۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ نہ آتے تو میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔"

جمشید نے اسے تسلی دی۔ پھر وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے جب تک کہ نورالدین لوٹ کر گھر نہیں آگئے۔ نور الدین نے جمشید سے مصافحہ کیا اور کافی عرصے کے بعد آنے کا شکریہ ادا کیا۔ جب اسے لڑکی فاطمہ کے واقعہ کا علم ہوا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اس نے جمشید کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ کبھی فاطمہ کو گھر میں تنہا نہیں چھوڑ کر جائے گا۔

وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھتے تھے اور کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب وہ کم عمر تھے، ایک بار دوستوں کے ساتھ بازار گئے اور سودا سلف خریدنے لگے۔ واپسی پر سب دوست اچانک انہیں چھوڑ کر دوڑنے لگے اور کافی دور نکل گئے۔ انہوں نے چونک کر اطراف میں دیکھا تو ایک مجذوب کو اپنی طرف بڑھتے پایا۔ اسی مجذوب کو دیکھ کر وہ سب خوفزدہ ہو گئے مگر جمشید اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ انہیں اس سے کوئی خوف بھی نہ لگا۔ مجذوب نے قریب آ کر انہیں سینے سے لگا لیا اور چھوڑ دیا۔ جیسے وہ اپنے سینے کے سارے جذبے ان کی ذات میں جذب کر دینا چاہتا ہو۔

دوستوں کا کہنا ہے کہ جمشید میں جو مجذوبانہ وصف تھا، وہ اسی مجذوب کا عطا کردہ تھا۔ بہرحال انہیں مجذوبوں سے گہری دل چسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے ان کی فلاح کے لیے کام کیا۔ آخری وقت تک ان کا خلوص اور ہمدردی، شمع کی لو کی طرح ان کے دل میں تھرتھراتی رہی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام انہی لوگوں کے ساتھ گزاریں۔

وہ انسانوں سے ہی محبت نہیں کرتے تھے، بلکہ انہیں جانوروں سے بھی محبت تھی۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ "یہ 1930ء کی بات ہے کہ میں بندر روڈ پر جا رہا تھا کہ میں نے جمشید نسروانجی کو دیکھا کہ وہ ایک گدھے کو جانوروں کے اسپتال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ گدھا لنگڑا رہا تھا اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ میں زخم تھا۔ مالک اسے گھسیٹ رہا تھا۔ جمشید کا ڈرائیور گاڑی لے کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ جمشید یہ کیا کر رہے ہیں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک ڈاکٹر اس گدھے کا معائنہ کر رہا ہے۔ جمشید اسے ہدایت دے رہے ہیں کہ وہ اس کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ ڈاکٹر نے جب زخم کی مرہم پٹی کر دی تو جمشید نے گدھے کے مالک کو ہدایت دی کہ گدھے کی ٹانگ کے زخم کے مندمل ہونے تک اس سے کوئی کام نہیں لے گا۔ اس کے بعد مرہم پٹی کی اجرت ادا کی اور گدھے کے مالک کو بھی کچھ رقم دی کہ وہ اس دوران جب کہ گدھا بار برداری نہیں کرتا، وہ اپنا گزارا کر سکے۔

اے کے بروہی کہتے ہیں کہ میں نے انہیں کبھی مایوس نہیں دیکھا۔ وہ عزم و ہمت کا مجسمہ تھے۔ مگر ایک موقع پر ان کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھانے لگے۔ یہ واقعہ ان کی موت سے تین ہفتے پہلے کا ہے۔ انہوں نے مہاجروں کے مسئلے پر حکومت کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ کیا۔ وہ ان کی آبادکاری سے مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے کرب سے کہا۔ "بروہی! آنے والے چند برسوں میں ہمیں نہ صرف محتاج، ناخواندہ اور سماج دشمن افراد کی ایک بڑی تعداد کا مسئلہ درپیش ہوگا بلکہ اس سے بھی بدتر حالات کا۔ ہمارے سامنے بے شمار ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم احتیاط کے ساتھ اس زندگی کا مطالعہ کریں جو مہاجر بچے گزارنے پر مجبور ہیں کہ نہ ان کے جسم پر کپڑے ہیں اور نہ سر پہ چھت جو انہیں تیز دھوپ، ہوا اور بارش سے بچا سکے۔ ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ نسل جو آج نشوونما کی ابتدائی منزل میں ہے ہمیں مضبوط، صحت مند اور کارآمد شہری فراہم نہیں کر سکے گی۔ انہیں آنے والے سماجی نظام کا حصہ بنانا ایک ناممکن کام ہوگا۔" انہوں نے مزید کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے کہ یہ مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا ہو اور نہ اس کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ درکار ہے تو بس ذرا تخلیقی انداز فکر اور ہمدردانہ فہم۔ میں نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے ذریعے صرف ایک سال کے عرصے میں ان تمام مہاجروں کو ملک کی معاشی اور سماجی زندگی کا حصہ بنانا اور انہیں وہ اندرونی قوت اور بیرونی وسائل مہیا کرنا ممکن ہے جس سے یہ پُرمسرت زندگی گزارنے کے قابل ہو سکتے ہیں مگر میری کوئی بات ہی نہیں سنتا۔"

میں نے اس سے پہلے جمشید کو اتنے گمبھیر لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا، جیسا اس دن دیکھا۔ یہ لہجہ ان کے عام لہجے سے مختلف تھا۔ میں ان کے ملال کے بوجھ تلے دب گیا اور میری زبان گنگ ہو گئی۔ کاش کہ میں ان سے پوچھ لیتا کہ ان کا منصوبہ کیا تھا، تاکہ میں خود اس پر عمل کر سکتا۔

☆......☆

جمشید اپنی ہمشیرہ کے گھر میں رہتے تھے۔ بھانجی گلزارین کپاڈیہ پولیو میں مبتلا تھی۔ وہ دن بھر کام کرنے کے بعد تھک جاتے تھے، لیکن جب اس بچی کو نیند نہیں آتی تھی تو وہ اسے بہلاتے تھے۔ اس کے بعد انہیں مزید تھک جانا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے بتایا کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں اور میں گہری نیند سو جایا کرتا تھا۔

اپنی بھانجی کا علاج کرانے کے لیے وہ 1950ء میں امریکا گئے۔ وہاں جا کر خود ان کی طبیعت بگڑ گئی، لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ بھانجی کا علاج ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایک برس بعد وہ بھانجی کو لے کر یورپ کے بہت سے ملکوں میں گئے، لیکن اس کا مرض دور نہ ہوا۔ علاج کے سلسلے میں جب وہ مغربی جرمنی میں تھے تو بھانجی کے پاس دن میں تین بار جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق بھانجی کو بغیر نمک کا کھانا دیا جاتا تھا تو ناراض ہوتی تھی۔ جمشید اسے سمجھاتے بجھاتے تھے تو کھانا کھا لیا کرتی تھی۔

جرمنی میں اپنے قیام کے دوران جمشید کو یہ اطلاع ملی کہ پارسی مذہب کو درست رکھنے اور پارسیوں کو سیدھی راہ پر چلانے کے لیے ایک تحریک چلائی جا رہی ہے، جس میں پارسیوں کی بڑی انجمنیں شامل ہیں۔ جمشید نے فوراً ان لوگوں کے نام خط لکھا جو تحریک چلا رہے تھے کہ میں خود پارسی ہوں اور میں نے اپنے لوگوں کے لیے جتنا ہو سکا کیا ہے لیکن یہ وقت تحریکیں چلانے کا نہیں ہے، اس لیے کہ پاکستان کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ پارسیوں کو گوشت نہیں کھانا چاہیے لیکن میرے خاندان کے بہت سے افراد گوشت خور ہیں۔ حد یہ ہے کہ آتش کدے کے پادری صاحب بھی گوشت خور ہیں۔ ان کے اس عمل سے مجھے بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ گوشت خوروں کو سبزی خور کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے تحریک چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں مارنا پیٹنا نہیں چاہیے۔ ان کے دلوں کو محبت سے جیتنا چاہیے۔ وہ میری بات ضرور مانیں گے اس لیے کہ میں خود سبزی خور ہوں اور شراب بھی نہیں پیتا۔ میری ماں نے بچپن ہی سے مجھے تلقین کرنا شروع کر دی تھی کہ میں شراب سے دور رہوں۔

لوگوں نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور تحریک ختم ہو گئی۔

جرمنی میں ان کی بھانجی کا علاج ہوا، لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ لہٰذا وہ بے نیل و مرام واپس آ گئے اور شب و روز پہلے کی طرح اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بعد میں انہی کی دعاؤں سے بھانجی صحت یاب ہو گئی اور کافی عرصے تک زندہ رہی۔

☆......☆

1943ء میں آیورویدک کی پریکٹس کرنے والوں نے ایک کانفرنس کراچی میں منعقد کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی کہ سرطان میں مبتلا افراد کو آیورویدک ادویہ دی جائیں۔ اس لیے کہ اس طریق علاج میں اس مہلک مرض کا علاج ہے۔ مرض اگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا تو مریض کو کافی افاقہ ہو جاتا ہے۔ جمشید نے اس کانفرنس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کمیٹی کو ایک بھاری رقم بھی دی۔ کیونکہ ان کی والدہ اسی مرض میں ہلاک ہوئی تھیں۔ وہ سرطان میں مبتلا افراد سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔

☆......☆

جہاں تک ہمدردی کا تعلق ہے، وہ ہر کس و ناکس سے ہمدردی اور شفقت برتتے تھے۔ وہ اپنا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک بار میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک جگہ مجمع دیکھا۔ میں اپنی کار سے اتر آیا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ کسی خاتون کے ہاں ولادت ہوئی ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا پھر لوگوں سے پوچھا کہ اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے۔

پتا چلا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں اس خاتون کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اسے فرش پر پڑے دیکھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر سمٹنے لگی۔ نومولود اس کے پہلو میں پڑا تھا۔ وہ کوڑھ میں مبتلا تھی۔ میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اس نے بچہ میرے حوالے کر دیا۔ خاتون کے ہاتھوں پر کوڑھ کا اثر نہیں تھا، لہٰذا میں نے بچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

میں بچے کو باہر لے آیا۔ پھر میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس کا باپ کون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کوئی نہیں۔ چنانچہ میں اسے لے کر کراچی آ گیا اور میں نے اسے اسپتال میں داخل کر دیا اور اس کی خبر گیری کی تلقین کی۔ بچہ ناجائز تھا، لیکن اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا، لہٰذا اسے پالنے کی ذمے داری میں نے قبول کر لی۔ بغیر کسی ستائش اور صلے کی تمنا کے۔

☆......☆

7 جنوری 1946ء میں جمشید جب ساٹھ برس کے

ہوگئے تو ایک جشن منایا گیا۔ ان کے اعزاز میں جمشید جے آنتی کمیٹی کے چیئرمین حاتم علوی نے تقریر کی۔ اس موقع پر شریک ہونے والے سب اسکولوں کو ان کی بڑی سی تصویر دی گئی کہ وہ اسے اسکول میں لگائیں۔ ان کے دوستوں نے ان کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کی رونمائی کی تقریب بھی اسی جشن میں ہوئی۔

1946ء سے ان کی موت 1952ء تک جمشید ایک مختلف انسان دکھائی دیتے تھے۔ انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا کہ ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو اور دو علیحدہ ریاستیں نہ بنیں مگر جب مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے کا جوش و خروش بڑھتا ہوا دیکھا تو وہ خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دونوں حصوں میں استحکام اور سلامتی کی تحریک چلائیں گے، مگر ان کی ناگہانی موت نے ان کے خوابوں کی تعبیر مکمل نہ ہونے دی۔

ان کی موت پر ان کے ایک دوست نے کہا۔ ''جمشید کی موت پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح کا کوئی حصہ بھی کھو گیا ہے۔''

☆......☆

محکمہ ڈاک وتار نے ان کی یاد میں تین روپے کا ڈاک کا ٹکٹ 7 جنوری 1988ء کو جاری کیا۔ اس کے علاوہ کلفٹن پر ان کی یاد میں ایک عمارت قائم کی جا چکی ہے۔ جس کا نام نسروانجی بلڈنگ ہے۔ پہلے یہ یادگار کھارادر میں قائم تھی۔

ان کا انتقال 8 اگست 1952ء میں طویل علالت کے بعد صبح تین بجے ہوگیا۔ وہ آخری وقت تک کام کرتے رہے۔ ان کے ڈاکٹر بجور انکل سریا (ان کے نام پر ایک اسپتال بھی ہے) کا کہنا ہے کہ میں نے انہیں ہدایت دی کہ وہ ایک روز کام کریں اور دوسرے دن چھٹی کریں مگر وہ نہ مانے پھر یہ ہوا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوگئیں۔ وہ چلنے سے معذور ہوگئے تو بستر پکڑنا پڑا۔ ان کا دماغ آخری وقت میں بھی ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بستر علالت پر بھی فائلیں دیکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کے فون سنتے تھے اور ان کے بارے میں احکامات جاری کرتے تھے۔ دنیا میں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن ان جیسے بہت کم ہوتے ہیں، جنہیں دوسروں کی پرواہوتی ہے، لیکن اپنی نہیں۔

ان کا ملازم رتنا نے کہا کہ ایک رات تقریباً صبح چار بجے ان کی آنکھ کھلی تو درد سے کراہنے لگے۔ میری آنکھ کھل گئی میں ان کے سرہانے گیا اور پوچھا کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ انہوں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ''رتنا مرنے کے لیے کون سی گھڑی بہتر ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

وہ کہنے لگے۔ ''تم درست کہتے ہو۔ مگر یہ وقت بہترین ہے اس لیے کہ اس وقت بہت سکون اور شانتی ہوتی ہے۔'' (ان کی موت صبح چار بجے ہی ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں اپنی موت کا وقت کیسے معلوم ہوگیا تھا) جنوری میں جب ہم ان کی سال گرہ منا رہے تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''یہ میری زندگی کا آخری سال ہے۔ میں نے تین جوتشیوں سے حساب لگوایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں 66 برس تک زندہ رہوں گا (پتا نہیں کیسے ان کا حساب کتاب درست ثابت ہوا) اپنی موت سے تین ماہ قبل انہوں نے مجھ سے کاغذ قلم مانگا۔ میں نے دیا تو لکھا۔ ''سب سے بڑی سچائی کسی اور چیز میں نہیں مگر تھیوسوفی میں ہے۔ اسے زندہ رکھنا۔ اس کے پرچم کو بلند رکھنا، چاہے میں اپنے جسم میں رہوں یا نہ رہوں۔''

موت کے وقت ان کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا جسے ان کی بھانجی گلزارین کپاڈیا صاف کر رہی تھی۔ وہ آخری لمحوں میں بے ہوش ہوگئے۔ یہ بے ہوشی ان کی موت پر منتج ہوئی۔

ان کی موت کی خبر سن کر سیکڑوں افراد جمع ہوگئے۔ آخری دیدار کے لیے اتنے افراد آئے تھے کہ تقریباً ایک میل لمبی لائن لگ گئی۔

(پارسیوں کے پیغمبر زرتشت ہیں۔ ان کے دو خدا ہوتے ہیں۔ اچھائی کا خدا اہورا مزدا اور برائی کا اہرمن۔ مذہبی کتاب اوستا ہے، جو قدیم سنسکرت میں لکھی گئی ہے۔ زرتشتی اپنے عقیدے کے مطابق مردوں کو دفن نہیں کرتے، بلکہ لاش کو کنویں پر رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ چیل کوے آکر مردے کا گوشت کھالیں۔ جب ڈھانچا رہ جاتا ہے تو اسے کنویں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کنویں کو TOWER OF SILENCE کہتے ہیں، لہٰذا ان کی کوئی قبر نہیں ہے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی:

ا۔ سہ ماہی ''آج'' کراچی کی کہانی نمبر۔ 1995ء

۲۔ Jamshed Nusserwanji-A memorial

۳۔ Jamshed- a Karma Yogin
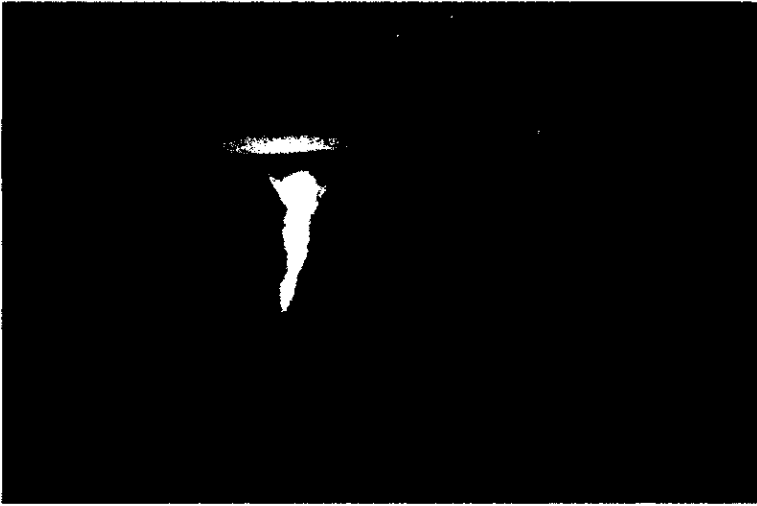
آتش فشاں

فرزانہ نکہت

انسان کی زندگی پانی کا بلبلہ ہے پھر بھی لوگ مہم جوئی کے نام پر خطروں سے کھیلتے ہیں۔ وہ دونوں بھی خطروں سے کھیلتے ہوئے اس سلسلۂ کوہ تک پہنچے تھے کہ ایک عجیب افتاد آن پڑی۔

اگر وہ حوصلے سے کام نہ لیتا تو دوست کی جان چلی جاتی

25 ستمبر 2009ء کی اس صبح ولیم پائیک، راپیہو (Ruapehu) کی برف پوش چوٹی پر کھڑا تھا۔ اس بائیس سالہ اسکول ٹیچر نے چند دن پہلے اپنی بیچلر آف ایجوکیشن کا مقالہ جمع کروایا تھا اور اب اپنے آپ کو حیرت ناک طور پر ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک بہترین ایتھلیٹ بھی تھا اور آؤٹ ڈور گیم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ دو دن قبل اپنے ہم پیشہ عزیز دوست اکیس سالہ جیمو کرسٹی کے ساتھ ٹونگاریرو نیشنل پارک میں چھ

دن کی پہاڑی مسافت پر واقع اس بلند مقام پر پہنچا تھا۔ اب وہ برفانی جوتوں کے نیچے لگائی جانے والی کیلوں والی فولادی پلیٹیں پہنے ٹرائی پوڈ اور کیمرا لیے آس پاس کے مسحور کن نظاروں کو مقید کررہا تھا۔

اس سے سو میٹر کی بلندی پر ایک کٹے پھٹے کنارے کے ساتھ ساتھ ماؤنٹ راپیئو کی ڈھائی ہزار میٹر بلند چوٹی کھڑی تھی۔ یہ زندہ آتش فشاں پہاڑ نیوزی لینڈ کا سب سے بلند پہاڑ شمار ہوتا تھا۔ اس سے چند سو میٹر نیچے سیدھ میں حسین و دلکش کریٹر لیک تھی۔ اس سے بھی نیچے اس کی نگاہ سے اوجھل اسکی اِنگ کے میدان تھے جن میں سے وہ اور کرسٹی گزشتہ دن گزر کر آئے تھے۔

''زندگی واقعی بڑی حسین ہے۔'' پائیک نے مسرور انداز میں سوچا اور قریبی ڈوم شیلٹر کی طرف اترنے لگا۔ یہ ایک لکڑی کی ہٹ تھی جسے سائنس دان کریٹر لیک کی نگرانی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہ اور کرسٹی اسی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

آٹھ بجے رات انہوں نے اپنے گھر والوں کو پیغام بھیجے اور انہیں اپنے بخیر و عافیت ہونے کی اطلاع دی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے سروں کی ٹارچیں بجھائیں۔ پھر ہٹ کے دروازے کے قریب پلائی ووڈ کے فرش پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے۔

کرسٹی تو فوراً ہی گہری نیند کی وادی میں اتر گیا جب کہ پائیک جاگتے ہوئے اگلے دن کے پروگرام کو اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا۔

چوبیس منٹ گزرنے کے بعد اس نے باہر عجیب گھوں گھوں گرر گرر کی آواز سنی۔ پھر ہٹ کا دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھل گیا۔ اس کی ٹانگیں اس سے ٹکرا گئیں۔ حیران و سراسیمہ سا وہ سلیپنگ بیگ میں ہی گھٹنوں کے بل اٹھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا شاید کوئی ان کے ساتھ عملاً مذاق کررہا تھا لیکن اس نے باہر جو کچھ دیکھا وہ راکھ، پتھروں اور ملبے کا ایک مہیب بادل تھا جو فضا پر مسلط تھا۔ اس کے چہرے پر ٹوٹی پھوٹی چٹانوں کے ذرات آآ کر ٹکرانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک زبردست پھنکار سی سنائی دی جیسے کسی مہیب والو سے پوری قوت سے بھاپ نکلی ہو۔

اس وقت کرسٹی بھی نیند سے بیدار ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ پائیک ہٹ کے کھلے ہوئے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا سمجھتا، کیچڑ، پتھروں اور برفیلے پانی کا ایک تیز و تند ریلا اندر داخل ہوگیا۔ اس کے تھپیڑے نے پائیک کو کسی بے جان کھلونے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جا کر پٹخ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر کیچڑ اور ملبے کی برسات ہونے لگی۔

پانی کی سطح خطرناک حد تک بڑھتی جارہی تھی۔ پائیک کو سانس لینے کے لیے اپنی گردن یخ برفیلے پانی کی سطح سے اوپر رکھنی پڑ رہی تھی۔ یہ خیال اسے لرزائے دے رہا تھا کہ اگر پانی کی سطح اسی طرح بلند ہوتی رہی تو وہ ضرور ڈوب کر مر جائے گا۔

پھر جس تیزی سے پانی چڑھا تھا اسی تیزی سے اتر گیا۔ پائیک گاڑھے کیچڑ، پتھروں اور ملبے میں گھٹنوں تک دھنسا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو آزاد کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کیچڑ اور ملبے کو ہٹانے کی کوشش شروع کردی۔ اس دوران کرسٹی دیوار سے گزرنے والے پائپ کو گرفت میں لیتے ہوئے سلیپنگ بیگ اور پانی سے باہر نکل آیا تھا۔ جب اس نے اپنے پاؤں پانی سے نکالے تو پانی کی سطح نیچی ہونے لگی اور کیچڑ اور ملبا آٹھ سینٹی گریڈ ٹمپریچر سے جم کر پتھر کی طرح سخت ہونے لگا۔ اس کا پہلا خیال تھا کہ شاید زلزلہ آیا تھا اور ہٹ کی چھت گر گئی تھی۔ اسے بہت بعد میں یہ خیال آیا کہ ماؤنٹ راپیئو کریٹر لیک کے مقام پر پھٹ گیا تھا اور یہ لاوے کا سیلاب تھا جو ڈوم شیلٹر تک آن پہنچا تھا۔ اگر وہ اپنے خیمے یا کسی غار میں سوئے ہوتے تو ضرور ہلاک ہوجاتے۔

خوش قسمتی سے کرسٹی نے سوتے وقت اپنے سر کی ٹارچ اپنے جمپر میں رکھ لی تھی۔ اس کی روشنی میں اس نے پائیک کو دیوار سے لگے بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کیچڑ لگا تھا اور گندھک اور جلتی راکھ سے جلنے کے نشانات پڑے ہوئے تھے۔

''مجھے نکالو جیمز، خدارا مجھے اس ملبے سے نکالو۔'' وہ چلّایا۔

کرسٹی نے بمشکل تمام اس پر سے سلیپنگ بیگ اتارا۔ اس کی بائیں ٹانگ آزاد کی جس کے گھٹنے کی ٹوپی ٹوٹ گئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ سے ہی اس ٹانگ کو سیدھا کر سکتا تھا۔ گھٹنے سے نیچے اس کی ٹانگ میں ایک بڑا سا گھاؤ لگا ہوا تھا جس میں کیچڑ اور راکھ بھری ہوئی تھی۔

پائیک کی دوسری ٹانگ کنکریٹ جیسے سخت کیچڑ میں پھنسی ہوئی تھی۔ کرسٹی باوجود کوشش کے اسے باہر نکالنے میں ناکام رہا۔ اس پر اس نے کلہاڑی سنبھالی اور پے در پے اس کنکریٹ جیسے سخت کیچڑ پر ضربیں لگانے لگا اور بالآخر اس میں اتنا شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس میں ہاتھ ڈال کر گھٹنے سے نیچے تک پائیک کی ٹانگ کو ٹٹول سکتا۔ اس نے جب اس کی ٹانگ ٹٹولی تو اسے گھٹنے سے نیچے اس کی ہڈی ٹوٹی ہوئی اور باہر نکلی ہوئی محسوس ہوئی۔ چونکہ وہ یخ بستہ اور ملبے میں دبی ہوئی تھی اس لیے پائیک کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

پائیک کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن پر برا اثر بھی ڈالا تھا اس لیے اس نے بے سروپا باتیں کرنی شروع کر دیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بری طرح سے زخمی تھا اگر کرسٹی اس کی ٹانگ کو آزاد کر لیتا تب بھی اس کے لیے اسے اپنے ساتھ پہاڑ سے نیچے لے جانا ممکن نہ ہوتا۔

''میں تمہیں اس ملبے سے نہیں نکال سکتا۔'' اس نے پائیک سے کہا۔ ''میں جاتا ہوں اور مدد لے کر آتا ہوں۔''

نیوزی لینڈ الپائن کلب کی ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہٹ پہاڑ سے کافی نیچائی پر اسکی انگ کے میدانوں کی چوٹی پر واقع تھی۔

کچھ گرم کپڑے اور بوٹ پہننے کے بعد کرسٹی نے برف توڑ کلہاڑی ہاتھ میں لی اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ پائیک کے چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ اس نے کرسٹی سے کہا۔ ''تم میرے والد اور والدہ کو بتا دینا کہ میں ہمیشہ ان سے محبت کرتا آیا ہوں۔''

''نہیں میرے دوست یہ تم خود انہیں بتاؤ گے۔'' کرسٹی نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دوست بری طرح سے زخمی تھا لیکن اس کے خیال میں وہ زندہ بچ سکتا ہے۔

ابتدائی طبی امداد کا ماہر اور برف میں پہاڑوں پر چڑھنے اترنے کا طویل تجربہ رکھنے والا پائیک بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ اس نے دل ہی دل میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کرسٹی کو ان لوگوں تک پہنچنے پھر ان کے اس کی مدد کو پہنچنے میں کتنا عرصہ لگ سکتا تھا۔ چھ گھنٹے؟ ہاں اتنا ہی وقت اگر انہیں اس تک پہنچنے میں لگے گا اگر دیر ہو جاتی تو وہ شاید ہی زندہ رہ سکتا۔

جب کرسٹی ڈوم شیلٹر سے روانہ ہوا تو اس وقت پائیک سردی سے بری طرح کپکپا رہا تھا لیکن ہپوتھرمیا کے مختلف درجات سے واقف وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کی کپکپاہٹ جلد ہی دور ہو جائے گی۔ پھر اس پر ایک عجیب سا سکون طاری ہو جائے گا اور اسے نیند آنے لگے گی۔ اسی سے اسے بچنا تھا کیونکہ اگر وہ سو جاتا تو اسے پھر کبھی جاگنا نصیب نہ ہوتا۔

شیلٹر سے نکلنے کے بعد کرسٹی نے دیکھا کہ باہر بڑی بڑی چٹانوں کے اڑنے سے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ جن میں راکھ اور برف بھری ہوئی تھی اور وہاں منجمد لاوے کا دریا سا بنا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے ڈھلوان اترتا ہوا نیچے جانے لگا۔ یہ ڈھلوان بہت پھسلوان تھی لیکن اس کے کیل لگے ہوئے جوتے نیچے اترنے میں بڑے مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ وہ اگر پھسل کر مر جاتا تو پیچھے سے پائیک کو بھی زندہ رہنا نصیب نہ ہوتا۔

اوپر ڈوم شیلٹر کی طرف جاتے ہوئے ان دونوں نے راپیئز کے پہلو میں ایک گلیشیر کے قریب برف پر اسکی انگ کرنے والے دیکھے تھے۔ کرسٹی نے گلیشیر کے راستے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا جو طویل مگر آسان راستہ تھا۔ اس گلیشیر پر پہنچ کر وہ چاندنی کی مدد سے گہری برف میں سے گزرتے ہوئے جلد ہی اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔

گلیشیر پر پہنچ کر وہ اس کے دائیں طرف مڑتے ہوئے اسکی انگ ٹریک پر آ گیا۔ وہاں اسے کچھ دوری پر اسپاٹ لائٹ دکھائی دی۔ وہ با آواز بلند مدد کے لیے پکارا اور فوراً ہی روشنیوں میں نہا گیا۔ راپیئو الپائن لفٹس کے ٹریلز مینیجر شین بنگھم نے اسے دیکھ لیا تھا جو ایک سنو کیٹ ٹرک چلا رہا تھا جس پر برف پر سفر کرنے کے لیے اور اسکی انگ کے شوقینوں کے لیے راستے بنانے کی مشنری نصب تھی۔

☆......☆

بنگھم نے ابھی اپنی نائٹ شفٹ شروع ہی کی تھی کہ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بمشکل تمام بہتے ہوئے لاوے کے سیلاب کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔ اس وقت وہ انفجار سے برفانی راستوں کو پہنچنے والے نقصان کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اسے مدد کی پکار سنائی دی تھی۔ ''مدد! میرا ساتھی ملبے میں دبا ہوا ہے۔''

''ہیلو! تم کہاں سے آ رہے ہو؟'' بنگھم جواباً پکارا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کرسٹی سنوکیٹ کے کیبن میں بیٹھا گرم ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے اپنے کچھ گیلے کپڑے اتار دیئے تھے اور بکنگھم نے ہیٹر آن کردیا تھا۔ سنوکیٹ کا ریڈیو آن تھا اور کرسٹی کو احساس تحفظ کے ساتھ یہ اطمینان بھی ہورہا تھا کہ اس کا دوست ضرور بچالیا جائے گا۔

بکنگھم نے اپنے بیس پر ریڈیو کے ذریعے کرسٹی اور پائیک کے بارے میں پیغام بھیجا۔ دس بجے پانچ نفوس پر مشتمل ایک امدادی پارٹی پہاڑ کی طرف روانہ ہوگئی۔ بارہ بجے آتش فشانی انفجار کے چار گھنٹے بعد سنوکیٹ کی روشنیاں ڈوم شیلٹر پر پڑنے لگیں۔

اس امدادی پارٹی نے پائیک کو اپنی جگہ پر ایک بے جان سے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے پایا۔ وہ زندہ تھا مگر اس کا سانس رک رک کر آرہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس تھوڑا ہی وقت موجود تھا اس لیے وہ فوراً ہی اس کی ٹانگ کو منجمد ملبے سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہتھوڑے کی مدد سے جلد ہی منجمد ملبے کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو توڑ دیا گیا۔ پائیک کی ٹانگ آزاد ہوگئی مگر وہ مڑی ہوئی تھی۔ اسے سیدھا کیا گیا اور پائیک کو اٹھا کر ایک اسٹریچر پر لٹا دیا گیا پھر اسے بھاری کمبلوں سے ڈھانپ دیا گیا.... اسے سنوکیٹ میں لے جایا گیا اس کے بعد گاڑی تیزی سے وہاں سے نیچے روانہ ہوگئی۔

گیارہ بجے صبح سنوکیٹ وہاکا پاپا اسکی فیلڈ بیس پر پہنچ گئی۔ جہاں ایک ایمبولینس ان کی منتظر تھی۔ اس وقت پائیک کا جسمانی ٹمپریچر دو سو پچاس سی کے آس پاس پہنچا ہوا تھا اور اس کی حالت ایسی تشویش ناک ہورہی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے مرسکتا تھا۔

اسی لمحے پولیس والوں نے فاریسٹ ہل میں آک لینڈ کے شمالی ساحل پر واقع ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔

''راپیہو کا آتش فشاں پھٹ گیا ہے اور آپ کا بیٹا وہاں پھنس گیا ہے۔'' ایک پولیس والے نے پائیک کے والدین بیری اور ٹریسی کو بتایا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ وہ زندہ نہ رہا ہوگا۔''

اس سے اگلے دن پائیک کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے اوپر کوئی سفید سفید سی چیز دیکھی۔ پہلے پہل تو وہ یہ سمجھا کہ شاید وہ اس وقت کسی برفانی غار میں موجود ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی نظروں کے سامنے سے دھند چھٹنے لگی۔ اس کا ذہن کام کرنے لگا۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ اس وقت وائی کاٹو اسپتال میں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لیٹا ہوا ہے۔

اسے آخری بات جو یاد رہ گئی وہ یہ تھی کہ جیمز کرسٹی اسے ڈوم شیلٹر میں چھوڑ کر مدد لینے گیا تھا اور اس کا خود اپنے بارے میں یقین تھا کہ مدد پہنچنے تک وہ ہرگز زندہ نہ رہ سکے گا لیکن وہ زندہ بچ نکلا تھا اور یہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

لیکن ابھی اسے ایک اور صدمے کے لیے تیار ہونا تھا۔ اس کے لیے اسپتال والوں نے اس کے والدین کو بلوا بھیجا۔

اس کے والدین نے اس سے مل کر اس کے بچ نکلنے پر اظہار مسرت کیا پھر اس کا باپ بیری اس کے چہرے پر جھک گیا اور بولا۔ ''تم اس ہولناک حادثے سے زندہ بچ نکلے، یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں کیسے بتاؤں لیکن تمہاری زندگی بچانے کے لیے تمہاری ٹانگ کاٹنا ضروری ہے۔ مجھے افسوس ہے۔''

جب کرسٹی نے سنا کہ اس کے دوست کی ٹانگ کاٹ دی گئی ہے تو وہ بے حد مغموم ہوا اور اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا لیکن بالآخر اس نے تسلیم کرہی لیا کہ اگر وہ ماؤنٹ راپیہو میں اس قیامت کی رات خود بھی اس بری طرح سے زخمی ہوگیا ہوتا تو اس کے لیے وہاں سے مدد لینے جانا ممکن نہ ہوسکتا تھا۔ وہ اور پائیک وہیں ہٹ میں مرجاتے۔ اس خیال نے اسے کچھ ڈھارس بندھائی۔

جہاں تک پائیک کا تعلق تھا تو وہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو دیکھنے کا عادی چلا آرہا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ کاٹے جانے کا کوئی منفی اثر نہ لیا۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگائی جاسکتی تھی جس کی مدد سے وہ دوبارہ چلنے پھرنے اور ماؤنٹ راپیہو پر چڑھنے کے قابل ہوسکتا تھا۔

''بات صرف اتنی ہے۔'' اس حادثے کے چند ہفتوں بعد اس نے اپنے دوست سے کہا۔ ''ہم غلط وقت پر غلط جگہ پر موجود تھے۔ اس لیے جو کچھ ہوا اس پر مجھے افسوس یا غصہ نہیں۔ میرا خیال تھا میں وہاں مرجاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بعد سے مجھے ہر دن ایک اچھا دن معلوم ہوتا ہے۔''

●◆●

اے آر راجپوت

وہ تمام لڑکیاں ہوائی حادثے کی وجہ سے برفیلے میدان میں پھنس گئی تھیں اور حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، برفیلے میدان میں نقطہ انجماد صفر سے بہت نیچے پہنچ چکا تھا اور ارد گرد دشمن فوجیوں کی چوکیاں تھیں، دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا پھر بھی وہ ہمت ہارنے کی بجائے چلتی رہیں۔ جبکہ ان کے پاس نہ تو کھانے کو کچھ تھا اور نہ کوئی سواری تھی۔ انہیں پاپیادہ یہ سفر طے کرنا تھا۔ عزم و حوصلے کی یہ پیکر، پھول جیسی نازک لڑکیاں پیدل چلتی رہیں، تقریباً دو ماہ چلنے کے بعد انہیں وہ مقام نظر آیا جہاں سے انہیں سواری ملتی۔

اس برفیلے میدان کو پار کرنے میں دو ماہ لگے تھے

طیارے کی آواز سنتے ہی گیون بری طرح چونکا تھا۔

وہ اس تیز وتند ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔ طیارے کی آواز سن کر گیون کو یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ دشمن کا جہاز ہے جو یونان کے ساحل سے دوسو میل دوران پہاڑوں میں اپنے کسی خفیہ اڈے پر اترنے کی کوشش کررہا تھا۔ گیون کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھرادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً جہاز بادلوں سے نکل کر سامنے آگیا۔ گیون نے بدحواس ہوکر ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں پناہ لے لی اور جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک ڈکوٹا طیارہ تھا جو تیزی سے نیچے آرہا تھا۔ اسے اس انداز میں نیچے آتے دیکھ کر گیون خوف زدہ سا ہوگیا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے پائلٹ طیارے کا کنٹرول کھوچکا ہے اور وہ پہاڑی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے گا، لیکن اس کا یہ خوف بے بنیاد نکلا اور ڈکوٹا ایک نوکیلی چٹان کو چھوتا ہوا غیر ہموار زمین پر اتر گیا۔

گیون کی کمین گاہ اور طیارے کے درمیان تقریباً چار سو گز کا فاصلہ تھا۔ طیارے کا ایک پہیا ایک گڑھے میں پھنس گیا تھا اور اس کا ایک بازو چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ چکا تھا۔

جلتی ہوئی دھات کی بو گیون کے نتھنوں سے ٹکرارہی تھی اور اسے توقع تھی کہ کسی بھی لمحہ شعلے بھڑک اٹھیں گے اور طیارہ جل کر راکھ ہوجائے گا۔

نہ جانے کیا سوچ کر وہ طیارے کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ طیارے سے پندرہ بیس قدم دور تھا کہ حیرت کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

طیارے کا دروازہ کھلا اور......نرسوں کی وردیوں میں ملفوف چار عورتیں سیڑھیوں پر نمودار ہوئیں پھر بڑی تیزی سے باہر نکل آئیں۔ نظریں جمائے گیون ایک چٹان کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ دوبارہ طیارے کے سامنے آیا تو طیارے سے آٹھ عورتیں برآمد ہوچکی تھیں اور چند دوسری عورتوں کو نیچے اترنے میں مدد دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں تیرہ عورتیں موجود تھیں۔ وہ سب کی سب جوان اور حسین تھیں۔

اس حادثے کے بعد ان کے چہروں پہ خوف کے لہراتے ہوئے سائے نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔

گیون فوراً اپنی کمین گاہ سے نکل کر ان کے پاس پہنچ گیا اور خالص آئرش لہجے میں چیخ کر ان کی خیریت دریافت کی۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر پہلے تو سہم گئیں لیکن پھر اسے اکیلا اور غیر مسلح دیکھ کر مطمئن ہوگئیں۔ اسی دوران طیارے کا پائلٹ بھی نیچے آگیا۔ گیون ان لڑکیوں کو کسی پناہ گاہ کی طرف لے جانے والا ہی تھا کہ پائلٹ کے ہاتھ میں دستی بم دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ وہ شاید طیارے کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔

"اے......ٹھہرو! یہ بے وقوفی مت کرو......" اس نے چلا کے پائلٹ کو ایسا کرنے سے روکا۔ "جرمن اور مقامی باشندے یہاں سے چند میل کے فاصلے پر موجود ہیں۔ وہ اس وقت بھی تمہارے طیارے کی تلاش میں ہوں گے اور بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ کر وہ آسانی سے یہاں پہنچ جائیں گے، طیارے کو تباہ کرکے انہیں اس طرف متوجہ کرنے کی بجائے

اسے اسی طرح چھوڑ دو۔"

پائلٹ اس کی بات ماننے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ اسے مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ اس کا طیارہ صحیح حالت میں دشمن کے ہاتھ لگے۔ اس لیے اسے تباہ کرنا ہی بہتر تھا تاکہ دشمن اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ گیون نے اسے تذبذب کی کیفیت میں دیکھ کر طیارے کو فوری طور پر تباہ کرنے کی بجائے ایک تجویز پیش کردی۔ "اسے تباہ کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بم اس طرح فٹ کردیا جائے کہ جیسے ہی کوئی دروازہ کھولے طیارہ تباہ ہوجائے۔"

"ہاں! یہ بہترین اسکیم ہے۔ آپ لڑکیوں کو کسی محفوظ مقام پر لے جایئے۔ میں بم فٹ کرنے کے بعد آپ سے آن ملوں گا۔"

گیون، البانیہ اور یونان کی سرحد پر واقع اس پہاڑی علاقہ میں برطانیہ کے سیکریٹ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ اسے برطانیہ کی رائل انجینئرز کور میں لیفٹیننٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ پائلٹ کی بات ختم ہوتے ہی وہ ان لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس طرح پرسکون انداز میں باتیں کررہی تھیں جیسے یہاں پکنک پر آئی ہوں۔ گیون نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا اور انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے ایک طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد پائلٹ بھی اپنا کام نمٹا کر ان سے آن ملا۔ اس کے آنے کے بعد ہی گیون نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ "مجھے یہاں ایک اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کو ویلونا تک پہنچادوں، کیونکہ یہی ایک قریب ترین مقام ہے جہاں سے آپ کسی بحری جہاز سے جاسکیں گے۔"

"ویلونا یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے لیفٹیننٹ؟" ایک نرس نے دریافت کیا۔

"ایک سو اکاون میل، جو ہے تو ایک خطرناک مگر مختصر ترین راستہ یہی ہے۔" اس نے جواب میں بتایا۔ "اگر محفوظ راستہ اختیار کیا جائے تو فاصلہ دو سو میل سے بھی زیادہ پڑ جائے گا لیکن پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ دشمن کے اس علاقے سے ان لڑکیوں کو کس طرح نکالا جائے؟" گیون نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بات پوری کی۔

ان لڑکیوں کا تعلق امریکا کے محکمۂ صحت سے تھا اور اٹلی کے فوجی اسپتالوں میں کام کرنے کے لیے جارہی تھیں۔ انہوں نے گیون کو بتایا کہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے طیارے کے انجن میں خرابی پیدا ہوگئی تھی جو انتہائی کوشش کے باوجود دور نہ ہوسکی۔ پائلٹ حوصلہ ہار بیٹھا تھا اور طیارہ اتارنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں تھا لیکن کوئی ایسی جگہ دکھائی نہ دی تھی جہاں طیارے کو بحفاظت اتارا جاسکتا مگر جب طیارہ بالکل ہی بے قابو ہوگیا تو خطرہ مول لیتے ہوئے اس خطرناک علاقے میں کریش لینڈنگ کرنا پڑی اور خدا کا شکر ہے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور ان سب کی زندگیاں محفوظ رہیں۔
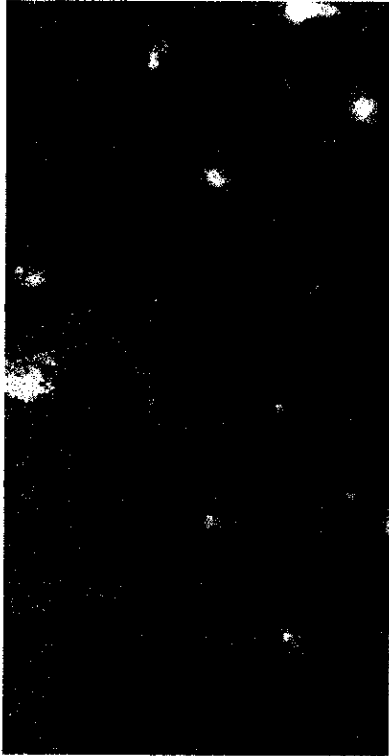
وہ لڑکیاں اب بھی اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھیں جیسے انہوں نے اس حادثے کا کوئی اثر قبول ہی نہیں کیا ہو۔ گیون ان کی بلند حوصلگی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا لیکن

وہ سوچ رہا تھا کہ اس برفانی علاقے میں جہاں قدم قدم پر دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ تھا، دو سو میل کا فاصلہ طے کر سکیں گی؟

گیون کی کمین گاہ ایک پہاڑی غار میں تھی جو ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ان کے لیے تیز کافی تیار کی تاکہ سردی کا کچھ اثر زائل ہو سکے۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر گیا تھا۔ کافی پینے کے دوران گیون نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس علاقے کی صورت حال کے بارے میں، میں آپ لوگوں کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، شمال، مغرب اور جنوب میں جرمن پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے دستے مسلسل گشت کرتے رہتے ہیں۔ گو کہ یہ غار ہمارے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ہے لیکن ہم چوبیس گھنٹے یہاں مقید تو نہیں رہ سکتے، باہر نکلے تو جرمن فوجیوں سے مڈبھیڑ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ مشرق میں البانیہ ہے جو جرمنوں کے ساتھ مصروف پیکار ہے لیکن ہم اس طرف جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے کیونکہ وہ اتحادیوں کو بھی اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اگر ہم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو ہمیں فوراً ختم کر دیا جائے گا۔''

اس خوفناک انکشاف پر دو لڑکیاں ہولے سے کھانس دیں۔ پائلٹ نے اپنی جیکٹ اتار کر ان کے کندھوں پر ڈال دی اور گیون سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تو پھر، ایسی صورت میں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

ایک لڑکی نے گیون کو سگریٹ پیش کیا۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حالات سے کس طرح نمٹا جائے، ہم ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے بھی کوئی مدد طلب نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں کسی طیارے کی لینڈنگ کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ یہاں سے سو میل دور دریائے ڈرنوسی کے کنارے ایک چھوٹے سے میدان میں کوئی طیارہ آسانی سے اتر سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس برفانی علاقے میں ان لڑکیوں کے لیے سو میل کا فاصلہ طے کرنا ممکن نہیں ہوگا۔''

''مسٹر گیون! ہمیں اتنا نازک اندام نہ سمجھو کہ مصائب کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ہمیں بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کی بھی تربیت دی گئی ہے اور ہم فوجیوں کی طرح لانگ مارچ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت نہ ہوتی تو ہمیں اس طرح باہر نہ بھیجا جاتا۔ ہم مارچ کے لیے تیار ہیں۔ روانگی کب ہوگی؟ ابھی یا صبح؟'' سنہرے بالوں والی مسز لوئیس نے کہا۔

گیون اس کے اس عزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف رخ کر کے پوچھا۔ ''اور آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

''لوئیس نے ہمارے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے لیکن یہ ذہن نشین کر لیں کہ ہم کسی پکنک ٹور پر نہیں قدم قدم پر موت کا سامنا ہوگا۔ کامیابی کا امکان ہزار میں سے ایک ہے۔ زیادہ امکانات اس بات کے ہیں کہ ہم ویلونا پہنچنے کی بجائے جرمنوں کے ہتھے چڑھ جائیں جس کا نتیجہ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ کیا ہوگا۔'' گیون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆......☆

اس ٹھٹرتی شام کی یہ سرد رات، یہاں نکلنے کے پروگرام طے کرتے ہوئے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو درجۂ حرارت اب بھی صفر سے نیچے ہی تھا۔ روانگی کی تیاری کرنے کے بعد گیون نے لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ تمام لڑکیوں نے سردی سے بچنے کے لیے کمبل کی پٹیاں پھاڑ پھاڑ کر اپنی ٹانگوں اور جسم کے دوسرے حصوں پر لپیٹ لی تھیں، صرف چہروں کا کچھ حصہ برہنہ نظر آ رہا تھا۔

گیون ایک مہم جو انسان تھا۔ اس نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر کسی خطرناک مہم کے لیے پیش کیا تھا جس پر اسے یونان اور البانیہ کی سرحد پر ان برف پوش پہاڑی علاقے میں دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس عرصے میں وہ کامیابی سے اپنے فرائض نبھا تا رہا تھا اور اب اس نے دوسری جنگِ عظیم کی سب سے انوکھی اور انتہائی خطرناک مہم کی کمان سنبھال لی تھی۔

ان تیرہ نوجوان اور حسین لڑکیوں کو بحفاظت منزلِ مقصود تک پہنچانا بھی اس نے اپنے فرائض میں شامل کر لیا تھا۔

تنگ پہاڑی راستے کے دائیں جانب ایک ہزار فٹ گہری ڈھلان تھی۔ گیون کے ایک ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور وہ تقریباً پچاس گز آگے تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ جرمنوں یا مقامی باشندوں سے مڈبھیڑ نہ ہونے پائے۔ لڑکیاں سکون اور اطمینان سے اس کے نقشِ قدم پر چل رہی تھیں۔ گو ان کے حوصلے بلند تھے لیکن ان کے نازک جسم اس خوفناک مہم کے

لیے قطعی نہیں بنائے گئے تھے۔ان کے لباس اور جوتے بھی موزوں نہیں تھے۔ تیز برفانی ہوا ان کے جسموں سے ٹکرا رہی تھی لیکن ان کے چہروں پر اعتماد کی جھلک نمایاں تھی۔

کئی گھنٹوں تک کہیں رکے بغیر ان کا سفر جاری رہا۔ دوپہر کے قریب گیون نے انہیں رکنے کا حکم دیا۔تمام لڑکیاں نڈھال سی ہو کر ایک چٹان پر بیٹھ گئیں۔طیارے کا پائلٹ بھی ایک جگہ ڈھیر ہو چکا تھا۔گیون انہیں وہیں چھوڑ کر جائزہ لینے کی غرض سے آگے نکل گیا کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان پہاڑیوں میں کسی جگہ اچانک ہی دشمن سے آمنا سامنا ہو جائے گا۔واپس آکر اس نے لڑکیوں کو روانگی کا حکم دیا اور وہ چلنے ہی والے تھے کہ گیون بری طرح چونک گیا۔اس نے تمام لڑکیوں کو پتھروں کے پیچھے آڑ لینے کی ہدایت کی اور اسٹین گن سنبھالے سامنے والی چٹان کی طرف دیکھنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ہی چٹان کی دوسری طرف سے دو آدمی نمودار ہوئے ۔ان میں ایک نوجوان یونانی تھا اور دوسرا برطانوی، جس نے کندھے پر کچھ لاد رکھا تھا۔وہ دونوں گیون ہی کے ساتھی تھے جو اس کی طرح فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ان پہاڑیوں میں موجود تھے۔یونانی کا نام نکولس اور برطانوی کا نام ہربرٹ بیل تھا جو سارجنٹ کے رینک کا ریڈیو آپریٹر تھا۔گیون نے اسٹین گن دوبارہ کندھے پر لٹکالی اور نکولس کو آواز دی۔

''اے لیفٹیننٹ، تم اپنی کمین گاہ سے اتنی دور کیسے آگئے؟''

نکولس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولا تھا۔''تم اتنی دور کیوں آگئے؟''

گیون نے جواب دینے کی بجائے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔نکولس اس برف زار میں ان حسین اور جوان لڑکیوں کو دیکھ کر چونک گیا۔

''یہ...... یہ اتنی ساری حسینائیں کہاں سے ٹپک پڑیں؟'' وہ ہکلا کر بولا۔

''ہم ویلونا جانا چاہتے ہیں اور ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' گیون نے اسے ساری بات سمجھاتے ہوئے کہا۔

نکولس فوراً ہی آمادہ ہو گیا۔ریڈیو آپریٹر سارجنٹ بیل بھی ویلونا جا رہا تھا اس لیے وہ بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔

انہیں سفر کرتے ہوئے آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے۔اچانک برف باری شروع ہو گئی اور ساتھ ہی تند ہوا چلنے لگی۔برف کے نرم گالے زمین پر گرتے ہی ٹھوس شکل اختیار کر لیتے جس سے ان کے پیر بار بار پھسل رہے تھے۔

نکولس ان سے تقریباً دو سو گز آگے جا رہا تھا۔اس کے عقب میں گیون اس قافلے کی رہنمائی کرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔شام ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔وہ لوگ کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے جہاں رک کر سردی سے بچنے کے علاوہ کچھ آرام بھی کر سکیں۔آخر ایک چٹان کی اوٹ میں انہیں مناسب جگہ مل گئی۔چار گھنٹے یہاں رکنے کے بعد رات دس بجے سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

لڑکیوں میں سے کسی نے نہ تو کوئی شکایت کی اور نہ ہی انہوں نے کم ہمتی کا مظاہرہ کیا لیکن انہیں اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ گیون رات کو بھی رکنے کی بجائے سفر جاری کیوں رکھے ہوئے تھا۔

رات کو ہر ایک گھنٹے کے بعد دس منٹ کے لیے رک کر آرام کیا جاتا اور پھر سفر شروع ہو جاتا۔صبح ہونے تک برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔اس کے ساتھ ہی گیون نے انہیں تیز سے تیز تر چلنے کی ہدایت کی اور پانچ منٹ آرام کا وقفہ ایک کی بجائے دو گھنٹے بعد کر دیا۔

موسم کی شدت اور مسلسل سفر کی اذیت ناقابلِ برداشت تھی مگر لڑکیاں حیرت انگیز حد تک قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھیں ۔گیون کو اس صورتِ حال کا اندازہ ہو رہا تھا لڑکیوں کے پیر پھسل رہے تھے، ہاتھ جم رہے تھے اور سردی ہڈیوں کے گودوں میں سرائیت کر رہی تھی۔اب تک انہوں نے صرف بارہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا،طیارے سے لیا جانے والا راشن ختم ہوتا جا رہا تھا۔

یونان اور البانیہ کی سرحد کی طرف بڑھتے ہوئے موسم اور بھی خراب ہو گیا۔ان کے راستے میں ایک بلند چٹان حائل ہو گئی تھی۔ جسے بڑی دقتوں کے بعد عبور کیا گیا۔ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے سات دن میں وہ صرف تیس میل کا فاصلہ طے کر سکے۔برفباری اور راستے کی مشکلات سے بچنے کے لیے نکولس اور گیون نے ایک اور راستہ اختیار کیا جو مختصر ہونے کے ساتھ خطرات سے بھی پُر تھا اور اس مہم کے دسویں روز انہیں ایک اندوہناک حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔

نکولس ان سے تقریباً سو قدم آگے تھا۔وہ تنگ سی پٹی پر برف کاٹ کاٹ کر پیچھے آنے والوں کے لیے راستہ بناتا ہوا

چل رہا تھا۔ اچانک اس کا پیر پھسلا اور وہ ایک ہزار فٹ گہری کھائی میں غائب ہوگیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے اس برف زار ویرانے میں بازگشت پیدا کردی تھی۔

ان سب کے دل دہل گئے۔ گیون اس جگہ پر پہنچ کر رک گیا اور جھک کر تاریک کھائی میں جھانکنے لگا جس نے نکولس کو نگل لیا تھا۔ اس نے نکولس کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے جس نے ان کی خاطر اپنے آپ کو موت کے حوالے کردیا تھا اور یہ سوچ کر آگے چل رہا تھا کہ کسی وقت ان میں سے کسی اور کے ساتھ بھی ایسا حادثہ پیش آسکتا ہے۔

اب گیون اس قافلے کی رہنمائی کررہا تھا۔ ان کی خوراک کا ذخیرہ خطرناک حد تک کم ہوگیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر خوراک کا یہ سہارا بھی ختم ہوگیا تو وہ برف کے اس جہنم سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔

بارہویں روز وہ ایک چٹان پر رک گیا۔ سامنے حدِ نگاہ تک ڈھلان وادی پھیلی ہوئی تھی جسے برف کی سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر وادی میں ایک چھوٹے سے مکان سے دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا۔

''بیل!'' گیون، ریڈیو آپریٹر سارجنٹ بیل سے مخاطب ہوا جو کندھے سے ریڈیو سیٹ اتار کر نیچے رکھ رہا تھا۔

''میں آگے جارہا ہوں۔ ان لڑکیوں کی حفاظت کے علاوہ تمہیں میرے اوپر بھی نگاہ رکھنی ہوگی۔ ہوسکتا ہے اس مکان سے ہمیں کوئی مدد مل جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں دشمن کے سپاہیوں کی صورت میں ہماری موت چھپی بیٹھی ہو۔''

بیل کو ہدایت دینے کے بعد گیون برف میں راستہ بناتا ہوا ڈھلان پر اترنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اسٹین گن اس طرح تھام رکھی تھی کہ کسی بھی لمحہ اسے استعمال کرسکتا تھا۔ جیسے جیسے وہ مکان کے قریب پہنچتا جارہا تھا، گن پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی لیکن مکان کے اندر کسی قسم کی نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔

ایک کھڑکی کے قریب رک کر اس نے اندر سے کسی قسم کی آوازیں سننے کی کوشش کی لیکن مکان پر مکمل سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ اس نے محتاط انداز میں مکان کے گرد ایک چکر لگایا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت مزید مضبوط ہوگئی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔

''میں برطانوی ہوں، جسے مدد کی ضرورت ہے۔'' گیون نے نرمی سے یونانی زبان میں کہا۔

''اندر آجاؤ۔'' کہتے ہوئے بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

گیون دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت اب بھی موجود تھی مگر اس کے خدشات بے بنیاد نکلے۔ کمرے میں آتشدان کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چولہے پر ایک برتن رکھا ہوا تھا اور اس سے اٹھتی ہوئی شوربے کی خوشبو سے گیون کے منہ میں پانی بھر آیا۔

ماحول کا جائزہ لینے کے بعد وہ بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوگیا اور ٹوٹی پھوٹی یونانی میں بولا۔ ''میرے ساتھ چند خستہ حال امریکن لڑکیاں بھی ہیں۔ کیا تم ہم لوگوں کی کچھ مدد کرسکتی ہو؟''

''اوہ..... کیوں نہیں۔ وہ کہاں ہیں؟ تم لوگوں کی مدد کرکے ہمیں خوشی ہوگی۔'' بوڑھی عورت کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ گیون اپنے پھٹے ہوئے جوتے اور دوسری تمام تکالیف کو بھول کر دوڑتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور انہیں مکان میں لے آیا۔ لڑکیاں آتشدان کے قریب بیٹھ گئیں۔ جبکہ بیل اور پائلٹ کھڑکیوں کے پاس جم گئے تاکہ غفلت کا شکار ہونے کی بجائے حالات پر بھی نظر رکھ سکیں۔

بوڑھی عورت نے بتایا کہ پہلے جرمن دستے اس طرف گشت کرتے رہتے تھے لیکن اب کئی روز سے نہ تو کوئی جرمن دکھائی دیا ہے اور نہ ہی کوئی مقامی باشندہ اس طرف آیا ہے اس لیے وہ اپنے آپ کو یہاں محفوظ سمجھیں اور اطمینان سے آرام کریں۔

اس رات اس مہم کے دوران پہلی مرتبہ وہ لڑکیاں پانچ گھنٹوں تک اطمینان و سکون سے سوتی رہیں۔ وہ نازک اندام لڑکیاں اس قسم کے مصائب کی عادی تو نہیں تھیں لیکن اب تک وہ عزم و استقلال اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتی رہی تھیں، جبکہ لوئیس تو مایوس کن حالات میں گیون کا بھی حوصلہ بڑھاتی رہی تھی۔

لڑکیاں سو رہی تھیں۔ بیل، پائلٹ اور گیون پہرہ دے رہے تھے۔ دس بجے بوڑھا شارٹ گن سنبھالے ان کے قریب پہنچ گیا۔

''تم لوگ بہت تھک چکے ہو، کچھ دیر آرام کرلو۔ اس وقت تک پہرے کی ذمہ داری میں سنبھال لیتا ہوں۔''

گیون اور اس کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا پھر بوڑھے پر نگاہ ڈالی۔اس کی آنکھوں میں پدرانہ محبت کی چمک تھی۔بوڑھے کی تجویز مانتے ہوئے وہ آتشدان کے قریب لیٹ گئے۔

رات دو بجے گیون نے اپنے تمام ساتھیوں کو جگادیا۔روانگی کی تیاری کرکے انہوں نے اس مہربان جوڑے کو خدا حافظ کہا اور مکان سے نکل کر اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

برف باری اب بھی جاری تھی۔روئی کی طرح نرم برف کے بڑے بڑے گالے ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ان کا رخ مشرق میں البانیہ کی سرحد کی طرف تھا۔بوڑھی عورت نے روانگی کے وقت کچھ روٹیاں اور خشک گوشت کے چند ٹکڑے دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کے مکان سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر حریت پسند چھاپہ ماروں کا ایک کیمپ ہے اگر وہ لوگ وہاں تک پہنچ جائیں تو چھاپہ ماران کی کافی مدد کرسکتے ہیں۔

سردی کی شدت اور تنگ جوتوں کی وجہ سے کچھ لڑکیوں کے پاؤں سوج گئے تھے جس سے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔گیون نے اپنے کمبل پھاڑ کر اس کی لمبی لمبی پٹیاں بنالیں اور ان لڑکیوں کو ہدایت کی کہ جوتے اتار کر یہ پٹیاں پیروں پر لپیٹ لیں تاکہ چلنے میں دشواری نہ ہو اور ان کو اپنا سفر جاری رکھنے میں رکاوٹ نہ ہو کیونکہ گیون ہر قیمت پر اس سفر کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔گو ان لڑکیوں کے حوصلے اب بھی برقرار تھے لیکن حقیقتاً ان کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔اس سفر کے دوران وہ زیادہ تر بھوکی رہی تھیں۔ سردی کی شدت اور خوراک کی کمی ان پر بری طرح اثر انداز ہو چکی تھی۔سب سے بڑھ کر یہ کہ نیند ان پر غلبہ پانے لگی تھی۔لیکن گیون جانتا تھا کہ اس برف میں نیند ان کے لیے موت کا دوسرا نام ثابت ہوگی لیکن نیند کے غلبے سے وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھیں۔ایسے موقع پر کسی لڑکی کو بیدار رکھنے کے لیے ایک آدھ تھپڑ بھی لگانا پڑتا۔

”تم لوگوں کو ہر قیمت پر بیدار رہنا اور چلتے رہنا چاہیے۔اگر کوئی لڑکی سوگئی تو کسی کے جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ اسے اٹھا کر لے جاسکے۔“ گیون نے ان سب کو سمجھایا۔

اس طرح گرتے پڑتے دوسرے روز وہ اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں اس بوڑھی عورت کے کہنے کے مطابق حریت پسندوں کا کیمپ تھا۔جب وہ ایک غار کے سامنے پہنچے تو اچانک ہی ایک لمبا تڑنگا شخص ان کے سامنے آگیا۔دونوں ایک لمحہ کے لیے مبہوت سا ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے

ایکس ریز

اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایٹم بم اور ایکس رے مشین بنیادی طور پر یکساں ماہیت رکھتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تابکاری بہت ہولناک اور تباہ کن ہوتی ہے جبکہ ایکس رے مشین میں ریڈیو آئسوٹوپس کے ذریعے حساس کنٹرول کی مدد سے ایسی ہلکی تابکار شعاعیں ایک مقررہ وقت کے لیے پیدا کی جاتی ہیں جو فوری طور پر کوئی ظاہری نقصان نہیں پہنچاتیں، ان کی مدد سے اندرونی ہڈیوں اور اعضاء کا عکس فلم پر منتقل ہوجاتا ہے۔یہ تابکار شعاعیں جسم میں ایک بار داخل ہوجائیں تو وہیں جم کر بیٹھ جاتی ہیں۔انہیں جسم سے نکالنے کا کوئی طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوسکا۔

آج کل ایکس رے اور اسی قسم کے دوسرے تابکار میڈیکل ٹیسٹ اور طریقے عام ہو گئے ہیں جو دنیا بھر میں مریضوں کے لیے ایک ہولناک خطرہ ہیں۔ طبی علاج اور ٹیسٹ کے سلسلے میں جو مریض بار بار تابکار شعاعوں سے گزرتے ہیں۔اپنے جسم میں ان مہلک اور موذی ریڈی ایشنز یعنی تابکاری کی ذخیرہ اندوزی کرتے رہتے ہیں اور ایک مرحلہ وہ آجاتا ہے کہ قسطوں میں جزو بدن بننے والی تابکاری کی سطح خطرناک حدوں کو چھونے لگتی ہے۔بلا ضرورت اور بار بار تابکاری سے گزرنا خطرناک ہے اور اس سے حتی الامکان گریز کرنا ضروری ہے۔ دنیا بھر میں جہاں بھی ایٹمی ہتھیار، بجلی گھر یا دوسری تنصیبات ہیں، وہاں ماہرین کی نگرانی میں عملے کو ایسے حفاظتی لباس فراہم کیے جاتے ہیں جن سے تابکار شعاعوں کا گزر بالکل ختم نہیں ہوتا مگر دھیما ضرور ہوجاتا ہے۔ وقفے وقفے سے عملے کی کڑی جانچ پڑتال کرکے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر فرد کے بدن میں تابکاری کی کتنی مقدار پہنچ چکی ہے۔ لیتھل ڈوز تابکاری کی وہ مقدار ہے جو کسی بھی جان دار کو دردناک موت سے ہم کنار کرسکتی ہے۔

مرسلہ: قرۃ العین۔اقرا سٹی، کراچی

رہے ہے۔ اسٹین گن پر گیون کی گرفت مضبوط تھی اور جیسے ہی اس شخص نے اپنی رائفل سیدھی کرنا چاہی تو گیون یونانی زبان میں چلایا۔

''برطانوی......ہم برطانوی ہیں......''

لمبے تڑنگے شخص نے ایک لمحہ کواس کی طرف دیکھا پھر رائفل نیچے کرلی اور ''دوست'' کہتے ہوئے سیلوٹ کے انداز میں ہاتھ اٹھایا اوراس طرح اس خوفناک مہم کے دوران دوسری مرتبہ گیون اوراس کے ساتھیوں کو پناہ مل گئی۔ وہ چھاپہ مارانہیں اپنی کمین گاہ میں لے گیا۔ جہاں تین اور حریت پسند موجود تھے۔ چھاپہ ماروں نے بتایا کہ ان کے ساتھی تقریباً ایک ہفتہ پہلے دشمن کا ایک ہوائی اڈا اڑانے گئے تھے اور اب تک نہیں لوٹے۔ غار میں ان چھاپہ ماروں کے پاس ایسے ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود تھے جن کے ذریعے وہ اپنے ہیڈکوارٹر کو اطلاعات فراہم کرتے تھے۔

یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے سارجنٹ بیل نے اپنا ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ کیا اور اتحادی فوج کے ڈیلوتا ہیڈکوارٹر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوسکا۔ رابطہ قائم ہونے پر خفیہ اشاروں کے تبادلہ کے بعد اس نے ہیڈکوارٹر کو وہ پیغام دیا جس نے اتحادی دنیا میں کھلبلی مچادی کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ طیارہ اور تمام نرسیں ختم ہوچکی ہیں۔

''اب تک زندگی سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔'' سارجنٹ بیل نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن انتہائی ابتر حالت کا شکار ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اگرچہ اب تک وہ بلند حوصلگی اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں لیکن ان کے جسموں اور چہروں پر اذیت نمایاں ہیں۔ ہمارا رخ مشرق کی طرف ہے جہاں ہم آرگسٹرو کے قصبہ میں پہنچیں گے۔ جہاں ایک ہوائی اڈا بھی موجود ہے۔ چھاپہ ماروں کے کہنے کے مطابق وہ علاقہ جرمنوں سے خالی کرالیا گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم اس قصبہ سے دوبارہ آپ کے ساتھ رابطہ قائم کریں گے۔ کیا آپ لوگ وہاں کوئی طیارہ بھیج سکتے ہیں۔''

ڈیلوتا ہیڈکوارٹر نے بتایا کہ اگر وہ لوگ بہ خیریت وہاں پہنچ گئے تو ان کے لیے ایک بمبار اور ایک لڑاکا طیارہ بھیج دیا جائے گا۔ بیل نے کہا کہ اگر ہوائی اڈا محفوظ ہوا تو وہ طیارے ایس او ایس (S.O.S) کا سگنل دیں گے۔

انھوں نے ایک بار پھر سفر شروع کردیا۔ ان کا رخ مشرق میں قصبہ آرگرو کسٹرو کی طرف تھا۔ ان سب کی حالت بہت ہی ناگفتنی تھی۔ موسم اور بھی خراب ہوگیا تھا۔ دن کے وقت بھی تھرمامیٹر کا پارہ صفر سے نیچے ہی رہتا۔ سرد برفانی ہوائیں ان کے جسموں کو چیرتی ہوئی اندر تک پہنچ رہی تھیں۔

ان کے اس بھیانک سفر کو شروع ہوئے پورے تیس دن ہوچکے تھے۔ خوراک کا ذخیرہ قریب الختم تھا۔ اب تک صرف اسّی میل کا فاصلہ طے کرسکے تھے۔ گیون کا وزن چالیس پاؤنڈ کم ہوگیا تھا اور وہ اپنے کھانے کا بیشتر حصہ بھی لڑکیوں کو دے دیتا کیونکہ ان کی بھوک اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ عورتیں دنیا کا ہر دکھ برداشت کرسکتی ہیں لیکن بھوک ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ مرد بھوک برداشت کرلیتا ہے مگر دوسرے دکھوں سے گھبرا جاتا ہے۔

سارجنٹ بیل رات موقع پا کر ڈیلوتا ہیڈکوارٹر سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کرکے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرچکا تھا۔ ہیڈکوارٹر کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ انہیں فوجی طیاروں کے ذریعے خوراک گرائی جائے؟ مگر گیون نے سختی سے منع کردیا کیونکہ خوراک کے تھیلے گرتے دیکھ کر جرمن یقیناً تحقیقات کریں گے اور اس طرح وہ ان کی نظروں میں آجائیں گے اور انہیں مزید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

راستہ انتہائی خطرناک اور ڈھلانی تھا۔ جس کے دونوں طرف ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کا کوئی غلط قدم اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتا تھا۔ گیون چونکہ اس راستے سے پوری طرح واقف تھا اس لیے وہ ان سب سے آگے تھا تاکہ دوسروں کی رہنمائی کرسکے۔ سینکڑوں دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرتے ہوئے آخرکار پینتالیسویں دن اس پہاڑی علاقہ کی مشرقی حد پر پہنچ گئے۔

اب ان کے سامنے برف سے ڈھکا ہوا وسیع و عریض میدان تھا اور شمال مشرق میں اس دریا کے آثار دکھائی دے رہے تھے جس کو نشانِ راہ بنا کر وہ اب تک یہ سفر کرتے رہے تھے۔

میدانی علاقہ ہونے کی وجہ سے اب انہیں چلنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی لیکن اب انہیں ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس علاقے پر دشمن کے طیارے اکثر گشتی پرواز کرتے رہتے تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں برف پر لیٹ کر اپنے آپ کو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا پڑتا۔ کئی دنوں تک طیاروں سے اس طرح کی ''آنکھ مچولی'' کھیلتے ہوئے وہ ایک مختصر سی وادی میں پہنچ گئے۔

یہاں تقریباً ایک فٹ تک برف بچھی ہوئی تھی۔ گیون کو یہاں دشمن کی سرگرمیوں کا شبہ ساہوا اور وہ اپنی پارٹی کے ساتھ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا ہوا چھ میل آگے ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کوئی طیارہ آسانی سے لینڈ کرسکتا تھا۔

یہاں پہنچ کر آس پاس دشمن کی موجودگی کے شبہات بے بنیاد ثابت ہوئے۔

گیون کی ہدایت پر سارجنٹ بیل نے ویلوتا ہیڈکوارٹر سے رابطہ قائم کرکے صورتِ حال کی رپورٹ دی تو انہیں بتایا گیا کہ طیارے کے انتظام میں بارہ گھنٹے لگ جائیں گے۔ وہ لوگ اس میدان کے آس پاس ہی انتظار کریں۔ گیون نے برفانی ہواؤں سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو ایک چٹان کی آڑ میں بٹھادیا۔ لڑکیوں پر غنودگی طاری ہورہی تھی۔ انہیں بیدار رکھنے کے لیے ان کے نازک سے رخساروں پر بار بار تھپڑ لگائے جارہے تھے۔

رات جیسے تیسے بیت گئی۔ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی ان کے حوصلے بھی بڑھ گئے۔ انہیں یقین تھا کہ آج کسی بھی وقت طیارے انہیں لینے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے اور ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ دن بھر انتظار کرتے رہے لیکن فضاء میں کسی طیارے کی گڑگڑاہٹ سنائی نہ دی۔ غروبِ آفتاب کے وقت پرسکوت فضاء میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ کا ارتعاش پیدا ہوا۔ انہوں نے جلدی سے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ چار طیارے تھے۔ دو ہلکے لڑاکا طیارے، ایک بمبار اور ایک ڈکوٹا۔ بیل نے اپنا ریڈیو سیٹ سنبھال لیا تاکہ ایس او ایس (S.O.S) کا سگنل دے سکے۔

لڑاکے طیارے پہاڑیوں کی طرف تھے، وہ شاید دشمن کے کسی امکانی خفیہ اڈے کی تلاش میں تھے۔ اچانک سارجنٹ بیل کی نظریں پہاڑ کی سمت اٹھ گئیں اور وہ بدحواسی کے عالم میں چیخ اٹھا۔

''ارے...... رے..... وہ دیکھو.........!''

ان سب کی نظریں بیک وقت اس طرف اٹھ گئیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر انہیں طیارہ شکن توپوں کی نالیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی گیون چلایا۔

''بیل! اپنے طیاروں سے کہو کہ فوراً یہاں سے نکل جائیں اور.....''

الفاظ ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک لڑاکا طیارے نے زمین کی طرف غوطہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑ کی چوٹی پر نصب طیارہ شکن توپوں کے دہانے کھل

بیدار کرنے والے الارم تو عام سی بات ہے لیکن اب ایک انوکھی الارم کلاک بنائی گئی ہے جو کہ سلانے میں مدد دیتی ہے۔ MELLA نامی یہ الارم کلاک رات کی دھیمی روشنی بھی خارج کرتی ہے جو بچوں کو سلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جب کہ اس سے دھیمے سُروں کی موسیقی خارج ہوتی رہتی ہے۔ یہ آوازیں ڈیلٹا ویوز کے ذریعے دماغ کو سکون دیتی ہیں اور بچے نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

☆☆☆

امریکا میں نارتھ کیرولائنا پولیس نے ایک کار چور سکھی الانتے لکی کو گرفتار کرکے اس کی تصاویر میڈیا پر جاری کیں لیکن خوب صورت اور غیر معمولی آنکھوں والے چور کی تصاویر اس قدر وائرل ہوئیں کہ اب یہ چور ایک سپر ماڈل بن چکا ہے۔ لکی ایک خاص طرح کی جینیاتی کیفیت میں مبتلا ہے جسے ہیٹروکرومیا کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھوں کی رنگت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر امریکا کی ایک معروف ماڈلنگ فرم نے اسے بطور سپر ماڈل سائن کرلیا ہے اور آج سکھی الانتے کا معاوضہ تیس ہزار ڈالر ہے۔

☆☆☆

دنیا کا کوئی بھی باشعور فرد جیل جانے کی خواہش نہیں رکھتا لیکن تھائی لینڈ میں ایک ایسی جیل ہے جس میں لوگ ایک رات گزارنے کے منہ مانگے دام دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ دراصل جیل کی تھیم پر بنایا گیا انوکھا ہوٹل ہے۔ سوک اسٹیشن نامی اس ہوٹل میں جیل کی طرح سلاخیں لگائی گئی ہیں جب کہ یہاں آنے والے مہمانوں کو قیدیوں کا مخصوص لباس اور قیدی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ لوگ اپنی مرضی سے قیدی بن کر آتے ہیں اور جیل میں سوتے اور مزیدار کھانوں کا مزہ بھی اٹھاتے ہیں۔ یہاں ایک رات گزارنے کا کم از کم کرایہ 790 بھات یعنی اڑھائی ہزار روپے رکھا گیا ہے۔

☆☆☆

برطانیہ سے تعلق رکھنے والی 13 سالہ لڑکی نے اپنی معذوری کے باوجود وہیل چیئر پر جمناسٹک کے کرتب دکھا کر سب کو حیران کردیا۔ للی رائس نامی یہ بچی وہیل چیئر پر قلابازی کھانے والی پہلی برطانوی فیمیل ایتھلیٹ بن گئی ہے۔ رائس ایک بیماری میں مبتلا ہے جس کے باعث وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے جب کہ اپنی اس معذوری کو مجبوری بتانے کی بجائے کچھ کر دکھانے کی ٹھان لی اور ایک ماہر پیرالمپک سوئمر بن گئی۔ جب کہ اگلے سال کیلی فورنیا میں ہونے والی وہیل چیئر موٹو کراس چیمپئن شپ میں بھی حصہ لے گی۔

مرسلہ: بنتِ محمد عزیز مے۔ لنڈن

گئے۔ دوسرا لڑاکا طیارہ ان کی طرف جھپٹا۔ بمبار نے پروں کے نیچے نصب دونوں بم دشمن کے ٹھکانے پر گرا دیئے۔ ڈکوٹا وہیں سے چکر کاٹ کر واپس مڑ گیا۔

''جلدی کرو، آگے بڑھو، ہمیں فوراً اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ دشمن یقیناً ہمارا پیغام سن رہا ہے اور ہم سے پہلے یہاں پہنچ کر یہ جال پھیلایا ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔''

گیون نے سب کو روانگی کا حکم دے دیا۔

لڑکیاں گھٹنے سہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور لڑکھڑاتے ہوئے گیون کے پیچھے چلنے لگیں۔ تقریباً ایک میل آگے جا کر انہوں نے ایک غار میں پناہ لے لی۔ ''رات کا اندھیرا پھیلنے تک ہم یہاں رکیں گے کیونکہ اس نئی صورت حال میں دن کی روشنی میں سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔'' گیون نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں اور کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔'' لوئیس نے پژمردہ سے لہجے میں پوچھا۔

''زیادہ نہیں۔'' گیون نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ ''یقین کرو کہ ہم منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں اور اب ہمارے راستے میں زیادہ مشکلیں بھی نہیں رہیں۔''

☆......☆

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ غار سے نکل کر چل پڑے۔ لڑکیاں اب ایک ایک کی بجائے دو دو ہو کر چل رہی تھیں۔ وہ سب خاموشی سے نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے تاکہ کسی قسم کی آواز سے دشمن آگاہ نہ ہو جائے۔ دفعتاً کچھ فاصلے پر کچھ آوازیں سن کر گیون نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد لڑکیوں کو برف پر لیٹ جانے کی ہدایت کر کے بنل کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ بنل جلد ہی اس کے ساتھ مل گیا اور وہ نہایت چوکس انداز میں آگے بڑھنے لگے۔

وہ ایک چٹان کی آڑ میں رک گئے۔ دوسری طرف ایک جگہ آگ روشن تھی اور تین آدمی وہاں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ وہ دونوں اسٹین گنیں سنبھالے ایک دم ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تینوں آدمی منجمد ہو کر رہ گئے لیکن وہ فوجی نہیں عام یونانی باشندے تھے۔ اپنے آپ کو برطانوی ظاہر کرنے پر وہ تینوں یونانی ان سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک یونانی نے بتایا کہ اس علاقہ میں انہیں قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ جرمن فوجی دستے بڑی سرگرمی سے گشت کر رہے ہیں البتہ جنوب مشرق کا راستہ ان کے لیے محفوظ رہے گا۔

وہ ایک بار پھر چل دیئے۔ انہیں اسی طرح چلتے ہوئے انچاس دن ہو چکے تھے اور لگتا تھا جیسے برف کے اس صحرا میں ان کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

گیون کا اندازہ تھا کہ انہیں کم سے کم چالیس میل اور برف سے ڈھکے ہوئے ان پہاڑی راستوں پر چلنا پڑے گا جو نہ صرف دشوار گزار تھے بلکہ قدم قدم پر جرمن فوجی اور مقامی باشندے پھیلے ہوئے تھے جو ان کے خون کے پیاسے تھے اس لیے انہیں ایک لمحہ کو بھی کہیں رکے بغیر یہ طویل فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔

سات دنوں میں انہوں نے تقریباً نصف فاصلہ طے کر لیا۔ انہیں برف کاٹ کاٹ کر راستہ بنانا پڑ رہا تھا جس کی وجہ سے رفتار اور بھی سست تھی۔ ان کی خوراک اس روٹی اور گوشت کے خشک ٹکڑوں پر مشتمل تھی جو انہیں اس بوڑھی عورت نے دیئے تھے اور کچھ چھاپہ ماروں سے ملے تھے۔

راتیں انتہا سے زیادہ سرد تھیں۔ گیون کو پارٹی کے ممبران کو متحرک رکھنے کے لیے بے حد جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ انچوں کے حساب سے فاصلہ طے کرتے ویلونا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک شام تو وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گئے۔ وہ بالکل اچانک ہی جرمن چوکی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اگر ٹیم کی ایک لڑکی دور ہی سے جرمن محافظ کو نہ دیکھ لیتی تو موت کے منہ میں جانے سے انہیں کوئی بھی نہ روک سکتا تھا۔ وہ محافظ ان کی طرف پشت کیے کھڑا تھا اس لیے وہ بھی انہیں نہ دیکھ سکا تھا۔ یوں وہ لوگ خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔

اس چوکی میں سات جرمن تھے۔ ایک مرتبہ گیون کا دل چاہا تھا کہ وہ فائر کا منہ کھول دے لیکن یہ سوچ کر اس نے بڑی مشکل سے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا کہ ممکن ہے ان جرمنوں کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس کہیں موجود ہوں اور کچھ اپنی لڑکیوں کی درماندہ حالت کے پیش نظر وہ اس قسم کی کسی جھڑپ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ ایک محفوظ جگہ پر رک گئے۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر اس وقت سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس بات کے امکانات موجود تھے کہ چوکی سے باہر پھیلے ہوئے جرمنوں سے مڈبھیڑ ہو جائے۔

صورت حال کا صحیح اندازہ دن کی روشنی میں ہی ہو سکتا تھا۔

چوکی پر موجود جرمن رات ہی کو گشت پر نکل گئے اور موقع پا کر رات دو بجے گیون اپنے قافلے کو لے کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

سارجنٹ بیل کی پشت پر وزنی ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ لدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اس کی پشت سے خون رسنے لگا تھا۔ سیٹ کی بیٹریاں ختم ہو چکی تھیں اور اب وہ اس پر ویلونا ہیڈ کوارٹر سے آنے والے پیغامات سن تو نہیں سکتے تھے اور نہ ہی خود کوئی پیغام نشر... کر سکتے تھے۔

وہ منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ویلونا ان سے صرف بیس میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا مگر راستے کی دشواریاں اور خطرات پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے تھے۔ ان کی اس سرد اور برفانی مہم کا یہ آخری مرحلہ تھا جو انہیں ہر صورت میں طے کرنا تھا۔

وہ بے حد نڈھال ہو چکے تھے۔ ہر ایک کا جی چاہتا تھا کہ قدم اٹھانے کی بجائے برف پر لیٹ جائیں اور سوتے میں ہی ٹھنڈی موت کی آغوش میں پہنچ جائیں۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ قدم قدم پر موت سے نبرد آزمائی کرتے چلے آرہے تھے لیکن انہوں نے موت کے سامنے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔

بے سروسامانی میں صرف ان کا عزم ان کے کام آرہا تھا اور اب وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی کھوپڑیاں بھی منجمد ہو چکی ہیں لیکن سفر ختم نہیں ہوا۔ نجانے برف کی قید سے رہائی کب ملے گی؟ رہائی ملے گی بھی یا نہیں؟

آٹھویں دن کا سورج طلوع ہوا لیکن اس کی کرنوں میں کوئی حدت نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ صبح پہلے سے کہیں زیادہ سرد تھی۔ وہ دریا کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ جس کی سطح منجمد تھی اور گیون سوچ رہا تھا کہ کس جگہ سے دریا عبور کیا جائے۔

اچانک اس کی نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں جہاں دوسرے کنارے پر ایک لمبا تڑنگا شخص ہاتھ ہلا ہلا کر اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ انہیں جنوبی سمت سے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

گیون اسٹین گن سنبھالے جنوبی سمت چل دیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر موجود شخص بھی اسی طرف بڑھنے لگا۔ گیون دریا پار کر کے اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس شخص نے دوڑ کر اسے گلے لگا لیا۔ ''میں امریکی فوج کا کیپٹن لائڈ اسمتھ ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی تلاش کے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔ لڑکیاں کہاں ہیں؟'' اس شخص نے تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔

''ان سب کی حالت بہت خراب ہے مگر زندگی سے ناطے قائم ہیں۔'' گیون نے پہلی مرتبہ کراہتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو ویلونا تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ جہاں ایک تیز رفتار بحری جہاز ہمارا منتظر ہے۔ وہ ہمیں اٹلی تک پہنچا دے گا۔ وہاں آپ کے لیے کچھ راشن بھی موجود ہے۔''

اسمتھ نے گیون کو مزید بتایا کہ اسے باری (اٹلی) سے بھیجا گیا ہے۔ اس دوران لڑکیاں بھی وہاں پہنچ گئیں اور اسمتھ نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے دوسری طرف سمندر ہے جہاں آپ کے آرام دہ سفر کا آغاز ہوگا۔''

اثنائے راہ ایک اور شخص راشن کے تھیلے اٹھائے ان سے آن ملا۔ وہ انتونی کول تھا۔ جنگ سے پہلے فلموں میں کام کرتا تھا اور اب پہاڑی علاقوں میں تنہا خطرناک مہمیں انجام دے رہا تھا۔ کول نے انہیں شاندار کھانا کھلایا اور پھر اپنی رہنمائی میں سمندر کی طرف لے گیا۔

ان سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ہٹ تھا، جس سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دوستانہ گرم جوشی کی فضا محسوس ہو رہی تھی۔ ہٹ میں موجود ریڈیو ٹرانسمیٹر سے فوری طور پر ہیڈ کوارٹر پیغام بھیجا گیا کہ پوری پارٹی سلامت ہے اور بحفاظت پہنچ گئی ہے۔

سمندر میں چھوٹا بحری جہاز ان کا منتظر تھا۔ انہیں سوار کراتے ہی جہاز حرکت میں آگیا اور اگلے چوبیس گھنٹے میں وہ سب اسپتال میں داخل تھے۔ جہاں ان کا علاج ہو رہا تھا۔ موسم کی سختیوں اور برفانی ہواؤں نے ان کے حلیے بگاڑ دیے تھے۔ خصوصاً لڑکیاں اس حالت کو محسوس کر رہی تھیں لیکن انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے تو برف کی قید سے رہائی پانے پر لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا اور یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں تھی کہ گیون کو لوئیس بہت پیاری لگی تھی اور لوئیس نے گیون کو پسند کر لیا تھا۔ گیون نے اسے داد دی۔

''تم بڑی حوصلہ مند اور بہادر لڑکی ہو.....''

''ہوسکتا ہے۔'' لوئیس نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ سب تمہاری رہنمائی میں ہوا۔''

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آئندہ زندگی کی شاہراہ پر تم ہمیشہ میری رہنمائی میں رہو؟''

لوئیس گیون کے ان الفاظ کا مطلب سمجھ گئی اور دوسرے ہی لمحہ اس نے گیون کے شانے پر سر رکھ دیا۔

منفرد نغمہ نگار

انور فرہاد

پاکستان کی فلمی دنیا کو لاتعداد ہنر مند نصیب ہوئے جن کی کاوش نے فلم صنعت کو ترقی کا اوج عطا کیا۔ ان ہنر مندوں میں فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار اور اداکار کے علاوہ نغمہ نگار بھی شامل ہیں۔ ایک نئے ملک کی تباہ حال فلمی صنعت کو اوپر لانے کے لیے ہر ایک نے اپنے تئیں بہترین حصہ ڈالا۔ انہی میں ایک نوجوان گیت کار بھی ہے جس نے کمسنی میں لاجواب نغمے تخلیق کیے۔ ایسے نغمے جو آج بھی پسندیدگی کی معراج پر ہیں۔ اس کے بے شمار نغموں کو بھارتی فلمی صنعت نے چرایا جو ثابت کرتا ہے کہ ہماری فلمی صنعت بہت آگے تھی۔

لازوال فلمی نغموں کے خالق کا تذکرہ

☆ ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے

☆ رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے

☆ کچھ لوگ محبت کا صلہ مانگ رہے ہیں۔ نادان ہیں بندوں سے خدا مانگ رہے ہیں

☆ سو برس کی زندگی میں ایک پل۔ تو اگر کرلے کوئی اچھا عمل

☆ مجھے کردے نہ دیوانہ۔ تیرے انداز مستانہ

☆ ایسے موسم میں چپ کیوں ہو کانوں میں رس گھولو۔ ہونٹ اگر خاموش ہیں تو آنکھوں ہی سے بولو

☆ اک بار چلے آؤ پھر آکے چلے جانا

☆ مل گئے تم تو بس یہی غم ہے۔ پیار زیادہ ہے زندگی

اللہ میرے ان چاہنے والوں کو سدا شاد و آباد رکھے جو میری تحریر پڑھ کر خوش ہوتے ہیں اور مجھے اپنے مشوروں اور خواہشوں سے باخبر کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بھائی نے گلہ کیا ہے کہ گلوکاروں اور موسیقاروں کے بارے میں تو آپ بہت لکھتے ہیں، کبھی شاعروں کے بارے میں بھی لکھیے کہ شاعر کا کلام گا کر اور بجا کر ہی گانے والے اور بجانے والے نامور سنگر اور میوزک ڈائریکٹر بنتے ہیں مگر اوروں کی طرح آپ بھی بے چارے شاعروں کو لفٹ نہیں کراتے۔ اہمیت نہیں دیتے۔

میرے پیارے بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں شاعروں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی موسیقاروں اور گانے والوں کو دیتا ہوں۔ میں نے شاعروں پر بھی لکھا ہے۔ شاید آپ نے بابا عالم سیاہ پوش اور شاعر صدیقی پر لکھے میرے تفصیلی مضامین نہیں پڑھے۔ جب کہ بشیر احمد پر بھی میں نے ان کی گلوکاری کے ساتھ ان کی نغمہ نگاری پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور رخسانہ نور پر بھی بطور نغمہ نگار اور کہانی و مکالمہ نگار لکھا ہے اور آج بھی ایک شاعر کے متعلق ہی لکھنے بیٹھا ہوں۔ آپ اسے اپنی فرمائش کی تکمیل بھی سمجھ سکتے ہیں جب کہ میں ان پر لکھنے کا ارادہ پچھلے کچھ دنوں سے کر رہا تھا۔ تسلیم فاضلی میرا پسندیدہ فلمی نغمہ نگار ہے۔ یوں تو اللہ کے فضل و کرم سے ہماری فلم انڈسٹری کو بہت بڑے بڑے اور میٹھے بول لکھنے والے شاعروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ قتیل شفائی، فیض احمد فیض، سیف الدین سیف، احمد راہی، فیاض ہاشمی، مسرور انور، حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی، حبیب جالب، تنویر نقوی، شیر کاظمی، اختر یوسف، صہبا اختر، نخشب جارچوی، دکھی پریم نگری اور کلیم عثمانی جیسے شاعروں کی نغمہ نگاری نے ہماری فلموں کی کامیابی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر تسلیم فاضلی مجھے اس لیے زیادہ پسند ہے کہ اس کے لکھے ہوئے گیتوں، غزلوں اور گانوں میں کچھ ایسی خوبی ہوتی ہے کہ سننے والا بولوں کے ریشمی بندھن میں بندھ کر اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ذرا ان گیتوں کے مکھڑوں کو تو دیکھیے۔

اس البیلے شاعر کے ڈی این اے میں چونکہ ایک کہنہ مشق شاعر دعا ڈبائیوی کے شاعرانہ اثرات موجود تھے اس لیے وہ بچپن اور لڑکپن سے ہی شاعری کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا اور پھر سن شعور کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد اپنے بڑے بھائیوں صبا فاضلی اور ندا فاضلی کی طرح نغمہ نگار بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ دونوں بھائی بھارتی فلموں میں گیت نگاری کرتے تھے۔ صبا فاضلی نے کچھ پاکستانی فلموں کی نغمہ نگاری بھی کی۔

ابھی ٹھیک سے وہ جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ قدرت نے اسے فلمی نغمہ نگاری کا موقع فراہم کردیا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ موسیقار ناشاد سے اس نوعمر شاعر کی ملاقات ہوگئی۔ ملاقات ہوئی تو بات بھی ہوئی۔ بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ صاحبزادے شاعری بھی فرماتے ہیں اور فلموں کے لیے گیت نگاری بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ناشاد نے اسے ناشاد نہیں کیا، یہ نہیں کہا۔ ''جاؤ میاں! یہ کام تمہارے کرنے کا نہیں۔ ابھی تم کھیلو کودو، لکھو پڑھو۔'' بلکہ بڑی شفقت سے اس کے کچھ اشعار سنے۔ جن سے انہیں اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس میں شاعروں کی خوبو موجود ہے۔ اسے موقع دے کر آزمانا چاہیے۔ ان دنوں وہ ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم ''تم ملے پیار ملا'' کی موسیقی ترتیب دے رہے تھے۔ کہنہ مشق موسیقار نے نوعمر شاعر سے کہا۔ ''میں تمہیں اپنی نئی فلم ''تم ملے پیار ملا'' کے لیے گیت نگاری کا موقع دینا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ۔''

''شکریہ تو میں تمہارا اس وقت ادا کروں گا جب تم اپنے امتحان میں کامیاب ہو گے۔ نہیں ہوئے تو میں معذرت کرلوں گا۔''

ناشاد نے اپنی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر تسلیم فاضلی سے گیت لکھوائے۔

☆ یہ حسیں وادیاں یہ سماں۔ دیکھ کر میرا دل گنگنانے لگا

☆ دلربا دلربا کیسا جادو کیا۔ پاگل مجھے کر دیا

کمپوز کی ہوئی دھنوں پر گیت لکھنا اور وہ بھی فلم کی سچویشن کے مطابق، آسان نہیں ہوتا۔ ناشاد نے اندازہ لگا لیا۔ اس لڑکے میں نغمہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ فلم ''تم ملے پیار ملا'' 1966ء میں شروع ہوئی تھی مگر بوجوہ اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے۔ ''تم ملے پیار ملا'' کے

کم ہے

☆ دل لے کے مکر گیا ہائے۔ سجن بے ایمان نکلا

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی

یہ اور ایسے بے شمار گیت ہیں جو احساسات اور جذبات میں رس گھولتے ہیں۔ ایسے رسیلے بولوں نے آپ کے بھی چلتے ہوئے قدم روک لیے ہوں گے۔ آپ بھی ایسے نغموں کی خوشبو میں نہا گئے ہوں گے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہوگا کہ آپ چونک پڑے ہوں گے کہ یہ گیت ہے یا محبت بھرے دل کی آواز۔ تسلیم فاضلی ایسا ہی نغمہ نگار تھا کہ اس کے نغمے سن کر، سننے والے اس کی شاعرانہ صلاحیت تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

ساتھ ہی ناشاد نے معروف فلمساز سید شوکت حسین رضوی کی فلم ''عاشق'' سائن کی تو اس فلم کے لیے بھی انہوں نے نوجوان نغمہ نگار تسلیم فاضلی کو ہی گیت لکھنے کا موقع دیا اور تسلیم فاضلی نے انہیں اس موقع پر بھی مایوس نہیں کیا۔ اس فلم کا یہ نغمہ جو خوشی اور غم کے تاثرات کی تکرار سے آراستہ تھا اسے سن کر فلمی حلقوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔

اے گل نو بہار جھوم جھوم جھوم

اے دل بے قرار رو رو رو

اس گیت کو میلوڈی کوئن رونا لیلیٰ اور شہنشاہ غزل مہدی حسن نے مشترکہ طور پر گایا تھا۔ یہ ان دونوں کا بھی پہلا ڈوئٹ تھا۔ ''عاشق''، ''تم ملے پیار ملا'' سے پہلے ریلیز ہوگئی۔ اس کی نمائش 1968ء میں ہوئی اس لیے ریلیز کے اعتبار سے تسلیم فاضلی کی پہلی فلم قرار پائی جب کہ ''تم ملے پیار ملا'' 1969ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ اس کے تمام گیت تسلیم فاضلی نے لکھے تھے جو ہٹ ہوئے اور فلم بھی ہٹ ہوگئی۔ اس فلم کے نام سے مطابقت کا یہ عجیب واقعہ بھی اس فلم کی تکمیل کے دوران رونما ہوا کہ اس کے ہیرو ہیروئن محمد علی اور زیبا ازدواجی بندھن میں بندھ کر حقیقی زندگی میں بھی ہیرو ہیروئن بن گئے۔

اگر اچھی صلاحیتوں کے حامل فنکار کو اچھا رہنما مل جائے تو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ تسلیم فاضلی اپنی کمسنی کے دور میں فلمی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ فلمی دنیا جو دور سے بہت حسین اور رنگین نظر آتی ہے حقیقتاً بڑی دشواری، بہت مشکل اور سنگین جگہ ہے۔ یہاں کسی بھی شعبے میں کسی نووارد کا قدم جمانا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں جو جیتا وہی سکندر کہلانے کا حق دار ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر تسلیم فاضلی زبردست شاعرانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ اس کی سرپرستی اور رہنمائی کے لیے ناشاد جیسا کامیاب موسیقار تھا اس لیے اپنی نوعمری کے باوجود اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی گئیں۔ اس کا ہر قدم آگے اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور وہ ستر کی دہائی کا مقبول ترین نغمہ نگار تسلیم کیا جانے لگا۔ مسرور انور کی طرح تسلیم فاضلی کی بھی یہ بہترین خوبی تھی کہ وہ فلمی سچویشن کے عین مطابق گیت تحریر کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اس قدر مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ فلمی کہانی میں نغمے کی سچویشن سنتے ہی گیت کا مکھڑا بنا دیتا تھا۔ اس کی اس خوبی کی بنا پر اسے بے حد فاسٹ گیت نگار تسلیم کرلیا گیا تھا۔

مختلف سچویشنز کی مطابقت سے تسلیم فاضلی کی کارکردگی کے مظہر مقبول نغمات کی کچھ مثالیں۔

☆ ہونٹوں پہ تیرا نام جو آیا، دنیا سمجھے گیت ہے۔ کیا جانے یہ دنیا والے یہ چاہت کی ریت ہے (آواز ناہید اختر فلم سنگم)

☆ ان کا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی (آواز نور جہاں، فلم سہرے کے پھول)

☆ تو میری زندگی ہے تو میری ہر خوشی ہے (آواز مہدی حسن، فلم محبت مر نہیں سکتی)

☆ پوچھ لو ان کلیوں سے ان نظاروں سے۔ مجھے تم سے محبت ہے (آواز مہناز، فلم صائمہ)

☆ ساتھی کوئی ایسا ملے جو عمر بھر ساتھ دے۔ کب سے اکیلی ہوں میں (آواز مہناز، فلم پرکھ)

☆ اک بار چلے آؤ پھر آکے چلے جانا۔ صورت تو دکھا جاؤ (آواز مہدی حسن فلم ایک رات)

☆ مرا دل نہ جانے کب سے۔ ترا پیار ڈھونڈتا ہے (آواز بشیر احمد فلم مل اسٹیشن)

☆ ڈھونڈ رہی تھیں جانے کب سے۔ تیری صورت میری آنکھیں (آواز احمد رشدی، مالا)

☆ اے کاش کہ آجائے نظر یار کی صورت (فلم محبت مر نہیں سکتی)

☆ پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔ کوئی جدا کرنے نہ پائے، میں بھولوں تو میں مر جاؤں، تو بھولے تو تو مر جائے (فلم آج اور کل)

☆ پیار کریں گے پل پل، کل سے زیادہ آج کریں گے، آج سے زیادہ کل (فلم جیو اور جینے دو)

☆ نیل گگن کو گواہ بنا کے آج یہ وعدہ کرنا ہوگا۔ سنگ جینا سنگ مرنا ہوگا (فلم دیوار)

☆ مجھے دل سے نہ بھلانا۔ چاہے روکے یہ زمانہ (آواز مہناز، عالمگیر، فلم آئینہ)

☆ ایسے ملیں کہ پھر نہ جدا ہوں۔ دنیا رہے نہ رہے (فلم گونج اٹھی شہنائی)

☆ دل توڑ کے مت جائیو برسات کا موسم ہے (آواز ناہید اختر فلم وقت)

☆ آئی ملن کی رات کہ بجنی پکی ہوگئی بات، تو ٹھمکا کیوں نہ لگے (آواز ناہید اختر، فلم تیرے میرے سپنے)

☆ جب ڈولی چڑھے گی میری بہنا۔ تیرا بھیا بجائے
کا باجا (آواز مہدی حسن فلم راجا جانی)
☆ میری سالگرہ ہے بولو، بولو نا۔ ہپی برتھ ڈے ٹو یو
بے بی (آواز مسرت سمیع، فلم طلاق)
☆ دادی اماں کو مبارک ہو پوتی۔ ایسی پیاری پوتی
(احمد رشدی، فلم مجھے گلے لگالو)

گیتوں کے ہر نمونے جن احساسات و جذبات کی عکاسی کرتے ہیں وہ شادی بیاہ، بچوں کی سالگرہ کے علاوہ محبوب کو اپنی محبت کا یقین دلانا، محبوب کو بلانا یا تلاش کرنا، موسم کی دلکشی سے متاثر ہوکر اپنے جذبات کا اظہار کرنا، ملن پر یا ملنے کی خوشی کی خبر سننے پر جھوم اٹھنا، محبوب کے تصور میں کھو جانا۔ دو پیار کرنے والوں کا عہد و پیاں کرنا ہے۔ ان سچویشنز پر تسلیم فاضلی کے بے شمار اشعار ہیں جن میں سے یہ چند ہی درج کیے جا سکے ہیں۔ تسلیم فاضلی کو اللہ رب العزت نے ایسی شاعرانہ خوبی اور مہارت بخشی تھی کہ موقع محل کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ عین اس کے مطابق وہ ایسے اشعار لکھ دیتا تھا جو بڑے سجیلے اور رسیلے ہوتے تھے اور کانوں کے راستے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ عام طور پر فلموں کی کامیابی میں اچھے اور مقبول گانوں کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے تسلیم فاضلی کا شمار مقبول گیتوں کے تخلیق کاروں میں ہوتا تھا۔ فلم ساز، ہدایت کار اور موسیقار اس اعتماد کے ساتھ اس سے اپنی فلموں کے گانے لکھواتے تھے کہ وہ مقبول ہوکر ان کی فلموں کی کامیابی کا ذریعہ بنیں گے۔

تسلیم فاضلی کو طربیہ، المیہ، مزاحیہ، عشقیہ، ہر انداز کے نغمات لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس نے اقبال یوسف کی فلم ہل اسٹیشن کی کہانی اور مکالمے بھی لکھے ہیں جس کے ہیرو وحید مراد تھے اور موسیقار ناشاد، نثر نگاری میں بھی وہ کامیاب ثابت ہوا تھا مگر موسیقاروں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ دیگر فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے۔ سب اس کی شاعری کے دیوانے تھے۔ نغمہ نگاری سے ہی اسے فرصت نہیں ملتی تھی اس لیے اس کی کہانی نویسی اور مکالمہ نگاری آگے نہ بڑھ سکی۔

ناشاد کے علاوہ دیگر موسیقار بھی تسلیم فاضلی سے گیت لکھوانا پسند کرتے تھے جن میں ایم اشرف کے ساتھ بھی اس کی ہم آہنگی تھی۔ جن موسیقاروں نے تسلیم فاضلی سے اپنی کمپوز کی ہوئی دھنوں میں گیت لکھوائے ان میں نثار بزمی، اے حمید، روبن گھوش، لال محمد اقبال، کمال احمد، ماسٹر

زندگی نامہ

اصلی نام: اظہار انور
فلمی نام: تسلیم فاضلی
پیدائش: دہلی (بھارت)
سنِ پیدائش: 1947ء
والد: دعا ڈبائیوی (معروف شاعر)
بھائی: صبا فاضلی۔ ندا فاضلی (دونوں نے بھارتی فلموں کے لیے نغمہ نگاری کی)
پہلی فلم: تم ملے پیار ملا لیکن ''عاشق'' نمائش کے اعتبار سے پہلی فلم۔
پہلی ہٹ فلم: تم ملے پیار ملا
بطور کہانی نویس و مکالمہ نگار: ''ہل اسٹیشن'' ہدایت کار، اقبال یوسف
انگریزی زبان کا نغمہ: ہدایت کار جان محمد کی فلم ''دیکھا جائے گا'' کے لیے ایم اشرف کی بنائی گئی سندھی دھن پر لکھا جو پسند کیا گیا۔
اعزازات: متعدد پرائیویٹ اداروں کی جانب سے ایوارڈز اور اعزازات ملے۔ جن میں تین نگار ایوارڈ بھی شامل ہیں جو شبانہ، آئینہ اور بندش پر ملے۔
آخری فلم: زلزلہ جو تسلیم فاضلی کی وفات کے بعد 1987ء میں ریلیز ہوئی۔
وفات: 17 اگست 1982ء کو دل کا دورہ پڑنے پر انتقال ہوا۔

منفرد اعزاز

تسلیم فاضلی کے بہت سے گیتوں پر بہت سے فلمی ستاروں نے لپ سنک کی۔ یعنی ان پر جو گانے پکچرائز ہوئے ان پر ریکارڈ شدہ بولوں پر لب ہلائے مگر تسلیم فاضلی کا ایک منفرد ریکارڈ یہ بھی ہے کہ فلم ''انسان اور گدھا'' کے لیے اس کا ایک گیت ایک گدھے پر بھی عکسبند کیا گیا جس کے بول تھے۔ ''ڈھنگ انسانیت کے سکھا دے مجھ کو اے خدا'' اس گیت کے صدا کار احمد رشدی تھے۔

ٹاپ 10

تسلیم فاضلی ایسا شاعر تھا جس کے بے شمار گیت اور گانے مقبول ہوئے۔ پسند کیے گئے اس لیے اس کے ٹاپ 20 یا ٹاپ 10 گانوں کا انتخاب بڑا دشوار ہے، بہر حال اپنے طور پر اس کے دس منتخب گیت پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

1۔ سو برس کی زندگی میں ایک پل تو اگر کر لے کوئی اچھا عمل۔

2۔ ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے۔

3۔ خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے۔ کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے۔

4۔ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔

5۔ اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم۔ زمانے بھر سے رشتہ توڑ دیں گے ہم۔

6۔ ہمارے دل سے مت کھیلو۔ کھلونا ٹوٹ جائے گا۔

7۔ تیرا میرا کوئی نہ کوئی تو ناطہ ہے۔ ورنہ کون کسی کے پیچھے آتا ہے۔

8۔ نینوں کا ہے کام سارا دو نینوں کا کام۔ نین شرارت کرتے ہیں دل ہوتا ہے بدنام۔

9۔ رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہوگئے۔

10۔ تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے۔ مجھے موت بھی جو آئے تیرے بازوؤں میں آئے۔

عنایت حسین، امجد بوبی، شمیم نازلی، واجد علی ناشاد، صفدر حسین، جوزی انجم، تصدق حسین، نذیر علی، ایم اے شاد، خلیل احمد کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ ناشاد اور ایم اشرف تو تسلیم فاضلی کے والا و شیدا تھے۔ متذکرہ موسیقاروں میں سے چند ایک کے چند نمونے۔

☆ ٹھہرا ہے سماں ہم تم ہیں جہاں (موسیقار روبن گھوش فلم امبر)

☆ آج تو غیر سہی پیار سے بیر سہی۔ تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں (موسیقار کمال احمد، فلم دہلیز)

☆ شربت کے بدلے پلا دی شراب۔ تیرا خانہ خراب، تیرا خانہ خراب (موسیقار نذیر علی، فلم عورت اک پہیلی)

☆ دل دیا بھول ہوئی دل کی دل ہی میں رہی، ہم نے بھی سوچ لیا (موسیقار اے حمید، فلم عزت)

☆ سو باتوں کی ایک بات، جینا مرنا تیرے ساتھ (موسیقار ماسٹر عنایت حسین فلم جوش)

☆ تو جو آیا دل کو قرار آگیا۔ من میرا جھوما تن لہرایا (موسیقار شمیم نازلی فلم بن بادل برسات)

☆ دل نہیں تو کوئی شیشہ کوئی پتھر ہی ملے۔ کوئی تو سامان ہو دل لگانے کے لیے (موسیقار امجد بوبی، فلم اک نگینہ)

یوں تو ایسی بہت سی فلمیں ہیں جن میں ایک دھن پر ایک جیسے بولوں کے ساتھ مختلف سنگرز نے الگ الگ گایا اور یہ عام طور پر فلم میں ایک بار ہوا لیکن تسلیم فاضلی کا ایک منفرد ریکارڈ یہ ہے کہ اس کے کریڈٹ پر ایسی دو فلمیں ہیں۔ پرچھائیں اور ''میرے حضور'' جن میں دو دو نغمات کو ایک ہی دھن پر دو مختلف سنگرز کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ جو کچھ یوں ہے۔

1974ء میں فلم ''پرچھائیں'' میں یہ نغمہ محمد علی اور زیبا پر الگ الگ فلمبند ہوا۔

☆ میرے دل کو یہ یقین ہے کبھی تم جدا نہ ہو گے (گلوکار احمد رشدی)

☆ میرے دل کو یہ یقین ہے کہ کبھی تم جدا نہ ہو گے (گلوکارہ مالا)

ہدایت کار لقمان کی فلم ''پرچھائیں'' میں تسلیم فاضلی کا یہ نغمہ محمد علی اور زیبا پر الگ الگ پکچرائز کیا تھا۔

☆ کتنے نادان ہیں آج کل کے حسیں (گلوکار احمد رشدی)

☆ کتنے نادان ہیں آج کل کے حسیں (گلوکارہ تصور خانم)

''پرچھائیں'' کے موسیقار ناشاد تھے۔

اس طرح کی دوسری مثال 1977ء کی فلم ''میرے حضور'' میں نظر آئی جس کے دو نغموں کو مہدی حسن اور نور جہاں نے الگ الگ گایا۔ اس فلم کے ہدایت کار ایس سلیمان اور موسیقار ایم اشرف تھے۔

☆ کبھی میری محبت کم نہ ہوگی۔ لٹانے سے یہ دولت

کم نہ ہوگی (شاہد پر فلمبند ہوا)
☆ کبھی میری محبت کم نہ ہوگی۔ لٹانے سے یہ دولت کم نہ ہوگی (شبنم پر عکسبند ہوا)
آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس گیت کی دھن مشہور غزل ''محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے۔''
سے اخذ کی گئی تھی۔
''میرے حضور'' کا یہ نغمہ آج بھی تسلیم فاضلی کے یادگار گیتوں میں شمار ہوتا ہے ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے۔ (شاہد پر فلمبند کیا گیا)
ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے (شبنم پر پکچرائز ہوا)
تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ نغمے فلم انڈسٹری کے تمام ہی فنکاروں پر عکس بند کیے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت سے آرٹسٹوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ انہیں تسلیم فاضلی کے گیتوں پر پرفارم کرنے کا موقع ملے۔ جن فنکاروں پر تسلیم فاضلی کے گیت فلمبند ہوئے ان میں دستیاب نام یہ ہیں۔ صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، شمیم آرا، نیلو، زمرد، زیبا، محمد علی، وحید مراد، حبیب، حسنہ، دیبا، کمال، اسد جعفری، اقبال یوسف، رحمان، شبنم، رانی، نشو، ندیم، شاہد، روزینہ، سنگیتا، کویتا، ممتاز، بابرہ شریف، آسیہ، عالیہ، عشرت چوہدری، طلعت صدیقی، طلعت حسین، غلام محی الدین، منصور، صاعقہ، نمی، آصف خان، مسرت شاہین، نادیہ، آصف رضا، جاوید، عمران، وسیم عباس، قاضی واجد، لہری، ننھا، رنگیلا، طارق میر، نوین تاجک، ڈائنا کرسٹن، بازغہ، نجمہ، ریشماں، شائستہ، قیصر، چکوری، ڈانسر فردوسی، پروین بوبی، نوروز، مزلہ، امروزیہ، نازلی، میناچوہدری، روحی بانو، راحت کاظمی، عثمان پیرزادہ، قوی خان، محبوب عالم، جمشید انصاری، مصطفیٰ قریشی، آغا طالش، تمنا۔ ان آرٹسٹوں پر پکچرائز ہونے والے گیتوں میں سے چند نمونے۔
☆ مصری کی ڈلی ہوں۔ نازوں کی پلی ہوں۔ منہ بند کلی ہوں سجناں (نازلی ہمراہ محمد علی فلم گمراہ)
☆ سن ری پون سن ری گھٹا۔ کیا دن یہ سہانے آئے (روحی بانو ہمراہ وحید مراد فلم ضمیر)
☆ کیوں شرابی شراب پیتا ہے۔ اور پھر بے حساب پیتا ہے (مصطفیٰ قریشی فلم سارجنٹ)
☆ آنکھ مچولی کھیل ہے ایسا۔ ایک چھپے اک ڈھونڈے (نوین تاجک ہمراہ محمد علی فلم منزل)
☆ تجھے دل سے لگالوں پلکوں میں چھپالوں (ڈائنا کرسٹنا فلم بندش)
☆ کوئی ہیرا تو نہ تھا اک شیشہ ہی تو تھا۔ ٹوٹ گیا تو کیسا شکوہ (قوی خان فلم بے مثال)
☆ ان متوالی آنکھوں میں۔ کجرا لگانا چھوڑ دو (محبوب عالم، فلم آنسو اور شعلے)
☆ ہم رہے پیاسے کے پیاسے۔ لاکھ ساون آگئے (صبیحہ خانم۔ فلم ایک رات)
☆ گھر کو جنت بنا کے دکھا دیں گے ہم (نیر سلطانہ فلم میری بھابی)
☆ کسی مہربان نے آ کے میری زندگی سجا دی (زیبا، فلم شمع)
☆ خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے۔ کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے (وحید مراد، فلم افشاں)
☆ ایسے وہ شرمائے، جیسے میگھا چھائے (رحمان، فلم دوساتھی)
☆ ساتھی ساتھ نبھانا رے۔ دل کو توڑ نہ جانا رے (شبنم، فلم من کی جیت)
☆ بھولا بھولا میرا نام۔ ہنستا گاتا میرا کام (ندیم، فلم نادان)
☆ بہت خوب صورت ہے میرا صنم۔ خدا ایسے مکھڑے بناتا ہے کم (شاہد، فلم آبشار)
☆ ہم تم دونوں ساتھ رہیں گے۔ جب تک دن اور رات رہیں گے (روزینہ، فلم اللہ میری توبہ)
☆ راج دلارے اکھیوں کے تارے۔ صدقے میں جاؤں تو سوجا (طلعت صدیقی، فلم آرپار)
☆ ہم نے تم سے پیار کیا ہے۔ الفت کا اقرار کیا ہے (طلعت حسین، فلم انسان اور آدمی)
☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی (غلام محی الدین، فلم میرا نام ہے محبت)
☆ آجا دشمن کریں دشمنی دوستی کا یہ زمانہ نہیں (آصف خان، فلم ہیرا پھیری)
☆ لائف ہے کچھ دنوں کی۔ لگے نہ دل کو روگ (نادیہ، فلم بلے بوائے)
☆ چاند تارے گھٹا پھول شبنم صبا۔ چاندنی شاخ کلیاں دھنک روشنی (آصف رضا، فلم ساتھی)

☆ کیا کہنے کتنی خوب ہے صورت جناب کی۔قدموں کو چومتی ہے کرن آفتاب کی (جاوید، فلم ناہید)
☆ گل دے چمن گل دے جاناں۔تو میری دیوانی میں تیرا دیوانہ (قاضی واجد، فلم آخری حملہ)
☆ بند آنکھوں میں سپنے تھے۔سپنوں میں تم اپنے تھے (رنگیلا، فلم گنوار)
☆ یارو میں بڑا پریشان۔میرے پیچھے آئے اک لڑکی جوان (منور ظریف فلم پردے میں رہنے دو)
☆ واہ ری بھوک تیرا بھی جواب نہیں (مرزا شاہی ہمراہ ندیم کو بتا، فلم محبت اور مہنگائی)
☆ حسن والے اگر مسکرا کر ہمیں۔اپنا جلوہ دکھائیں تو ہم کیا کریں (علی رضا، فلم بے مثال)
☆ کبھی کھڑکی میں آئے کبھی چھت پہ بلائے۔مجھے کر کے اشارے گھڑی گھڑی (صوفیہ بانو۔فلم پردے میں رہنے دو)
☆ میرے منے میرے لال۔تو جیے ہزاروں سال (طارق عزیز ہمراہ دیبا فلم ایماندار)

تسلیم فاضلی کے کریڈٹ میں یہ بات بھی ہے کہ اس کے تحریر کردہ کچھ نغمے بیک وقت کئی فنکاروں پر عکسبند کیے گئے۔ایسے نغموں میں

☆ اللہ کے نام پر جھولی بھر دے (رنگیلا، قوی اور نرالا پر فلمایا گیا، فلم بے ایمان)
☆ بندہ تو گناہ گار ہے رحمان ہے مولا (فلم صورت اور سیرت کے اس حمد یہ کلام کو بھی کئی فنکاروں پر پکچرائز کیا گیا تھا)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تسلیم فاضلی نے کسی پنجابی فلم کے گیت نہیں لکھے تھے مگر اس نے اردو فلموں میں کچھ ایسے گانے تحریر کیے ہیں جن کے بول پنجابی میں ہیں۔مثال کے طور پر

☆ اے گل نہ بھلا دیں چند میریئے (آواز شوکت علی، فلم مٹھی بھر چاول)
☆ تیرے کھو پہ ملائیاں نی کچا دودھ پین والیے (آواز ناہید اختر۔فلم عشق عشق)

تسلیم فاضلی نے کچھ فلموں میں پیروڈی سانگز بھی لکھے جو کافی پسند کیے گئے۔ایسی فلموں میں "فیشن، نوکر، پردے میں رہنے دو، دیکھا جائے گا، مہندی لگی میرے ہاتھ" کے نام قابل ذکر ہیں۔

تسلیم فاضلی کے نغمات کو اس کے دور کے تقریباً سبھی معروف پلے بیک سنگرز نے گایا ہے، خاص طور پر مہناز، ناہید اختر، چوہان اور مہدی حسن نے اس کے زیادہ نغمات گائے ہیں۔متذکرہ گانے والوں کے علاوہ احمد رشدی، مسعود رانا، مالا، رونا لیلیٰ، بشیر احمد، مجیب عالم، منیر حسین، نور جہاں، تسلیم بیگم، آئرن پروین، نجم نیازی، ناہید نیازی، ریحانہ یاسمین، آئیون رفیع، رجب علی، طاہرہ سید، نیرہ نور، غلام عباس، اے نیر، اخلاق احمد، سلیم شہزاد، نسیمہ شاہین، نکہت سیما، روبینہ بدر، بلقیس خانم، افشاں، ناصر جہاں، شوکت علی، محمد افراہیم، عالمگیر، مسرت سمیع، تصور خانم، ثمر اقبال، حمیدہ اختر، شازیہ، دینا لیلیٰ، ترنم ناز، رنگیلا، ندیم، نذیر علی، عارف لوہار، اسد امانت علی، عمران علی ناشاد نے بھی تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ نغمات کی گائیکی کا اعزاز حاصل کیا۔ان میں سے چند سنگرز کے گیت نموناً ملاحظہ کیجیے۔

☆ احمد رشدی: گلاب جیسی ہے تیری صورت۔فرشتوں جیسی تیری حیا ہے (فلم ایک پھول ایک پتھر)
☆ رونا لیلیٰ: او میرا بابو چھیل چھبیلا میں تو ناچوں گی۔او میرا البیلا رنگ رنگیلا میں تو ناچوں گی (فلم من کی جیت)
☆ نور جہاں: تیرے قدموں میں بکھر جانے کو جی چاہتا ہے۔آج تو پیار میں مرجانے کو جی چاہتا ہے (فلم سوسائٹی گرل)
☆ طاہرہ سید: رات نشیلی ہے اکیلا دل۔لگی ہے آگ سینے میں درد ہے منزل (فلم آرپار)
☆ ناہید اختر: ایسی چلو نہ چال کہ دل میرا آجائے۔چہرے پر بکھیرو نہ بال کہ دل میرا آجائے (فلم: اُف یہ بیویاں)
☆ روبینہ بدر: کوئی کہے دلبر کوئی کہے جانی۔ہائے اللہ میں کیوں جوان ہوگئی (فلم تیرے میرے سپنے)
☆ ناصر جہاں: کسی کے گھر کا یہ بھی چراغ تھا (فلم زینت)
☆ ثمر اقبال: ہزار بار منع کیا میری گلی نہ سیاں آنا۔ہزار بار منع کیا (فلم عزت)
☆ زاہدہ سلطانہ: پیار ہے پھول زمانہ پتھر۔مل نہیں سکتے یہ دونوں اکثر (فلم پھول اور پتھر)
☆ رنگیلا: اس دنیا میں پیار نہ کرنا۔جیتے جی مرجاؤ گے (فلم پردے میں رہنے دو)

☆ ندیم بیگ: محبتوں کے قدر داں نہ شہر میں نہ گاؤں میں (فلم جلے نہ کیوں پروانہ)
☆ اسد امانت علی: کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے۔تم آئے ہو گلشن میں نئی بات بنی ہے (فلم ابھی تو میں جوان ہوں)

تسلیم فاضلی ، اچھا نغمہ نگار ہی نہیں تھا بہت اچھا انسان بھی تھا۔ فلمی دنیا جہاں دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں وہاں تسلیم فاضلی سراپا محبت کا پیکر تھا۔ اس نے کبھی کسی فلم والے کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ فلم ساز چھوٹا ہو یا بڑا سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیا، سب کے لیے اپنی بہترین پشاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ناکام فلموں کے بھی بہت سے گیت کامیاب ہوئے۔

تسلیم فاضلی کی فنی صلاحیتوں کو دیکھ کر اکثر موسیقار اور فلم ساز و ہدایت کار اس سے عام روش سے ہٹ کر کام لیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں مشہور فلم ساز و ہدایت کار جان محمد نے بھی ایک انوکھا تجربہ کیا۔ انہوں نے اپنی اردو فلم ''دیکھا جائے گا'' کے لیے ایم اشرف سے سندھی دھن بنوائی اور تسلیم فاضلی کو اس دھن پر انگریزی زبان میں گیت لکھنے کو کہا۔ تسلیم فاضلی نے طرز سن کر انگلش میں مکمل نغمہ تحریر کردیا جس کے بول یوں تھے۔

Whats to day
What will be tomorrow
Dont think sing with me
Joy with me

ایم اشرف نے تسلیم فاضلی کا یہ انگریزی نغمہ احمد رشدی کی آواز میں ریکارڈ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ جان محمد کا تجربہ بھی کامیاب رہا اور تسلیم فاضلی کی انگلش گیت نگاری بھی پسند کی گئی اور اس کی اس خوبی پر بھی اہلِ فن نے دل کھول کر داد دی۔

تسلیم فاضلی کے ایک بھائی صبا فاضلی جنہوں نے کچھ پاکستانی فلموں ضمیر، سیاست اور مستی خان میں نغمہ نگاری کی تھی انہوں نے ایک اردو فلم ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' کے نام سے پروڈیوس بھی کی تھی جس کے ہدایت کار اقبال یوسف، موسیقار ناشاد اور نمایاں فنکار وحید مراد اور شمیم آراء تھے مگر افسوس کہ یہ فلم مکمل ہونے کے باوجود بوجوہ ریلیز نہ ہوسکی۔

تسلیم فاضلی کی بھی کچھ فلمیں جو مختلف فلم سازوں اور

اس کی شاعری میں اس کی زندگی کی عکاسی

جس طرح ایک فلم ڈھائی یا تین گھنٹے دورانیے کی ہوتی ہے مگر اس میں سارا تماشا دکھانا پڑتا ہے۔ اسی طرح تسلیم فاضلی کی عمر بھی بہت مختصر تھی صرف 35 برس، اسی عمر میں اس نے بے شمار فلموں کے گیت لکھے اور اپنے ہم عصر نغمہ نگاروں سے بڑھ چڑھ کر شہرت حاصل کی۔ محبت کی شادی کی اور ایک بچی کا باپ بن گیا۔ اس نے فلموں کے لیے جو گیت لکھے، ایسا لگتا ہے جیسے یہ اس کے ذاتی احساسات وجذبات ہیں۔

☆ جو درد ملا اپنوں سے ملا۔ غیروں کی شکایت کون کرے
☆ مل گئے تم تو بس یہی غم ہے۔ پیار زیادہ ہے زندگی کم ہے
☆ تمہارے بنا زندگی کچھ نہیں تھی۔ تمہاری محبت نے جینا سکھایا
☆ جیت اپنی محبت کی ہوگی۔ ہار جائے گا سارا زمانہ
☆ اب کس کو سنائیں گے یہ درد کا افسانہ۔ سمجھتے تھے جسے اپنا نکلا وہی بے گانہ
☆ تیرے بغیر میری زندگی ادھوری ہے
☆ اپنا جیون صبح کا تارا۔ ڈوب گئے تو ملا کنارا

ہدایت کاروں کی تھیں نامکمل رہیں۔ ایسی فلموں میں انداز، مٹھی، پیاس، جنگلی اور دھوپ چھاؤں شامل ہیں۔ تاہم ان فلموں کے لیے تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ یہ گیت پاپولر ہوئے۔

☆ دل تو ہے اک شیشے کا کھلونا۔ ٹوٹ گیا تو کیسا رونا (آواز مہدی حسن، نیرہ نور، فلم پیاس)
☆ ہم سلامت ہیں تو آپ پریشان کیوں ہیں (فلم مٹھی)
☆ چلیے رک رک کے ذرا پیار نہ ہو جائے کہیں (فلم انداز)

تسلیم فاضلی کو اس کی بہترین نغمہ نگاری پر متعدد ایوارڈز اور اعزازات ملے جن میں تین نگار ایوارڈز بھی شامل ہیں جو فلم شبانہ، آئینہ اور بندش میں بہترین نغمہ نگار کے

ایوارڈز تھے۔

فلم والوں کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن والوں نے بھی تسلیم فاضلی سے گیت اور غزلیں لکھوا کر نشر اور ٹیلی کاسٹ کیے۔ پی ٹی وی نے تسلیم فاضلی سے ایک گیت لکھوا کر فریدہ خانم کی آواز میں ریکارڈ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔

میں نے پیروں میں پائل تو باندھی نہیں
کیوں صدا آرہی ہے چھنن چھنن چھنن

تسلیم فاضلی، مسرور انور سے بہت جونیر نغمہ نگار تھا مگر دونوں میں کچھ باتیں قدر مشترک تھیں۔ مثال کے طور پر تسلیم فاضلی بھی مسرور انور کی طرح تاش کھیلنے کے شوقین تھے۔ جب کہ مسرور انور ہی کی طرح کسی بھی چویشن کے لیے جھٹ پٹ گیت لکھ دیا کرتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تسلیم فاضلی اپنے سینئرز کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس کے پورے فنی کیریئر میں کبھی کسی نے بھی اس کی شکایت نہیں کی۔ سب اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے مداح تو تھے ہی اس کے اخلاق کی بھی تعریف کرتے تھے۔

فلمی گیتوں کی طرح غزلیں بھی تسلیم فاضلی بڑی نفیس تحریر کیا کرتا تھا۔ اس نے فلموں کے لیے بھی عمدہ غزلیں لکھیں، فلم ''زینت'' کے لیے اس نے ایک بڑی پیاری غزل تحریر کی جسے مہدی حسن نے ناشاد کی کمپوز کی ہوئی دھن میں ریکارڈ کروایا جب کہ یہ غزل شاہد پر پکچرائز ہوئی۔ یہ غزل آج بھی روز اوّل کی طرح مقبول ہے غزل کے بول ہیں۔

رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے

تسلیم فاضلی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کے گیت، گانے اور غزلیں عام فہم ہوتے تھے اس لیے بڑی آسانی سے زبان زد عام ہو جاتے تھے۔ مقبول ہو جاتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ تسلیم فاضلی نے اپنے مختصر فنی کیریئر میں ہر طرح کی شاعری کی اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیابی حاصل کی مگر اس نے فلم ''انصاف اور قانون'' کے لیے جو ایک سبق آموز نغمہ تحریر کیا وہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے اس کی تمام فلمی نغمہ نگاری پر بھاری ہے۔ اس کی دھن موسیقار ایم اشرف نے بنائی اور مہدی حسن اور نور جہاں کی آوازوں میں الگ الگ صدا بند ہوئی۔ یہ نغمہ شائقین نے بارہا سنے ہوں گے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ اس کا تخلیق کار اس کا تحریر کرنے والا شاعر تسلیم فاضلی ہے۔

سو برس کی زندگی میں ایک پل
تو اگر کر لے کوئی اچھا عمل
تجھ کو دنیا میں ملے گا اس کا پھل
آج جو بوئے گا وہ کاٹے گا کل

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے خود بھی پہلی بار جب یہ نغمہ سنا تھا، اس وقت سے یہ میرے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا مگر مجھے علم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کس شاعر کی فکر کجیل ہے۔ بہت بعد میں پتا چلا تو حیران رہ گیا کہ ایک نوجوان شاعر اس کا تخلیق کار ہے۔

تسلیم فاضلی میں عام فلم والوں جیسی بری عادتیں نہیں تھیں۔ بس شغل میلے کے طور پر وہ تاش کی بازی کا شائق تھا۔ تاش کھیلنا فلم والوں کا ایک پرانا مشغلہ ہے جس میں مرد اور خواتین دونوں شریک ہوتے تھے۔ تسلیم فاضلی بھی فرصت کے اوقات میں تاش کی ایک محفل میں شریک ہوا کرتا تھا جس میں دیگر فلم والوں کے علاوہ اداکارہ نشو بھی شریک ہوتی تھی۔ نشو اپنے وقت کی بڑی طرح دار اداکارہ تھی۔ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خوش ذوق اور خوش ادا بھی۔ شعر و شاعری سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتی تھی۔ تسلیم فاضلی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اسے بخوبی علم تھا۔ اس کے لکھے ہوئے گیتوں پر پرفارم کر کے اسے ہمیشہ لطف آتا تھا۔ تاش کی محفل میں دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہوئے تو نینوں کی الجھ گئی ڈور۔ تسلیم فاضلی نشو کی زلف گرہ گیر کا ایسا شکار ہوا کہ ایک دن وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے پر مجبور ہو گیا۔

''نشو! وہ جو میری ایک غزل کا مصرعہ ہے نا...... رفتہ رفتہ وہ مری ہستی کا ساماں ہو گئے۔''

''ہاں! بڑی اچھی غزل ہے وہ۔''

''کچھ...... یہی کیفیت میری ہو گئی ہے۔''

''یعنی...... کوئی تمہاری ہستی کا ہے؟''

''ہاں!''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کون ہے بھئی! وہ خوش نصیب؟''

''تم...... صرف اور صرف تم۔''

نشو ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ذرا دیر تک خاموش رہی پھر اداس لہجے میں بولی۔ ''تم یہ بات جانتے ہو نا کہ میں طلاق یافتہ ہوں اور ایک بچی کی ماں بھی ہوں۔''

''ہاں...... جانتا ہوں مجھے معلوم ہے۔ میں کوئی اجنبی

نہیں۔اس دنیا کا، فلمی دنیا کا باسی ہوں۔''

''تم ابھی ینگ ہو۔ تمہارے سامنے تمہارا بہترین مستقبل ہے۔ تمہیں تو مجھ سے بہتر شریکِ حیات مل سکتی ہے۔ مجھ میں کیا رکھا ہے اب؟''

''اگر تم مجھے اپنی زندگی کا ساتھی نہیں بنانا چاہتیں تو کھل کر کہہ دو۔ میں اس صدمے کو اپنے سینے سے لگا کر......''

اس کے آگے اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

نشو نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔''ایسا نہ سوچو۔ میرے البیلے شاعر، تمہیں بہت دنوں تک جینا ہے۔ فلم انڈسٹری کی بہت خدمت کرنی ہے۔''

''مگر...... مگر اب میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''اچھا...... یہیں ٹھہری جو شرطِ وصل لیلیٰ......''

تسلیم فاضلی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا اور پھر چند دنوں بعد ان کے سہرے کے پھول بھی مسکرانے لگے۔

تسلیم فاضلی کے لیے یہ شب و روز بہت قیمتی تھے۔ بہت انمول اور نشاط و انبساط سے بھرپور تھے جس کو اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ وہ اسے مل گئی تھی اور اس نے بھی اپنی ساری محبت، ساری چاہت اس پر نچھاور کر دی تھی۔ تسلیم فاضلی کے بہت سے گیت ہیں جو اس کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

☆ مل گئی مل گئی ہم کو پیار کی یہ منزل

☆ آئی ملن کی رات کہ سجن پکی ہوگئی بات

☆ ٹھہرا ہے سماں ہم تم ہیں جہاں

☆ بند آنکھوں میں سپنے تھے۔ سپنوں میں تم اپنے تھے

☆ بن ترے رات تو کیا ہم سے کٹیں دن بھی نہیں

☆ دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ صورت تمہی تو ہو

☆ ہم تم دونوں ساتھ رہیں گے۔ جب تک دن اور رات رہیں گے

☆ مل گئے تم تو بس یہی غم ہے۔ پیار زیادہ ہے زندگی کم ہے

اگرچہ یہ اور ایسے بے شمار گیت فلمی سچویشنز کے تحت لکھے گئے تھے مگر تسلیم فاضلی کی محبت بھری زندگی پر بھی ان کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ نشو کو اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا جو بالآخر اسے مل گئی۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی، سب سے اہم، سب سے قیمتی خوشی تھی جو اسے مل گئی تھی

مگر یہ دنیا بھی بڑی عجیب جگہ ہے اس کی اس خوشی سے کئی لوگ خوش نہیں تھے اور یہ لوگ غیر نہیں تھے، اس کے اپنے بہت قریبی عزیز اور رشتے دار تھے۔ وہ اس بات پر ناخوش تھے کہ ان کے خاندان کے ایک فرد نے ایک نوجوان نے ایک فلمی اداکارہ کو اپنا شریکِ حیات بنایا، خاندان کا فرد بنانے کی بھول کی۔ زبردست بھول جسے وہ ہرگز قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ نہ صرف انہوں نے اپنی بھرپور ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ تسلیم فاضلی پر دباؤ ڈالنے لگے کہ اسے چھوڑ دو، طلاق دے دو۔ ہم تمہاری شادی کسی شریف خاندان کی شہزادی سے کرا دیں گے۔

ہمارے معاشرے میں پسند کی شادی کرنا لڑکی ہی کے لیے مصیبت نہیں بنتی بلکہ لڑکوں کو بھی بہت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تسلیم فاضلی کے لیے بھی اس کے خاندان کا یہ دباؤ بہت صبر آزما تھا۔ وہ بھلا ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ نشو سے بے وفائی کیونکر کر سکتا تھا؟ نشو نے تو اسے اس ملاپ پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس کے اصرار پر رضامند ہوئی تھی پھر وہ اسے یہ سزا کیوں دے؟ اسے اپنے ہی لکھے ہوئے کچھ نغمات یاد آگئے۔

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی

☆ ہنس کے سہہ لیں گے اگر تم میں برائی ہوگی۔ پر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی

☆ چاند کی نگری تاروں کا انگنا۔ جیون اپنا ایسا ہو سجناں

☆ آگے آگے محترمہ پیچھے محترم۔ ساتھ نہیں چھوڑیں گے اللہ قسم

☆ تمہارے بنا زندگی کچھ نہیں تھی۔ تمہاری محبت نے جینا سکھایا

☆ رات سنسان ہے راہ ویران ہے۔ راستہ پُرخطر اور انجان ہے

☆ پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں کوئی جدا کرنے نہ پائے۔ میں بھولوں تو میں مرجاؤں تو بھولے تو تو مرجائے

اسے کیا پتا تھا کہ جن کی سچویشنز پر اس نے کبھی یہ گیت لکھے تھے۔ کبھی اسے بھی اسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وہ جس ذہنی کرب سے گزر رہا تھا اس سے نشو بے خبر نہیں تھی۔ پڑھی لکھی اور باشعور خاتون تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کی شخصیت متنازعہ ہوگئی ہے۔ اس کی سسرال

والے اس کی وجہ سے تسلیم فاضلی کو ٹارچر کر رہے ہیں۔ اس سے وہ کام کروانا چاہتے ہیں جو اس کے بس کی بات نہیں۔

ایک دن اس نے تسلیم فاضلی سے کہا۔ ''یار! تم بھی بڑے عجیب آدمی ہو، اتنے بڑے شاعر ہو مگر اتنی سی بات پر اس قدر پریشان ہو۔''

تسلیم فاضلی نے نشو کو غور سے دیکھا اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ اتنی سی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے۔ میرے لیے ناممکن بات ہے۔''

''ارے یار!'' نشو نے مسکراتے ہوئے لائٹ موڈ میں کہا۔ ''میں نے تو سنا تھا محبت کا The end شادی کے بعد ہو جاتا ہے اور جب محبوبہ منکوحہ بن جاتی تو جسم و جان کی مطلوبہ تسکین کا سبب اور سامان کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ پیار کے قابل نہیں رہتی۔ مجھ میں اب کیا رکھا ہے؟ میرے لیے اپنے عزیزوں کو چاہنے والوں کو کیوں دکھ دے رہے ہوں؟ ان کی مان لو۔ یہ جان لو کہ وہ تمہارے خیرخواہ ہیں۔ ویل و یشر ہیں تمہیں تمہارے خاندان کے اسٹیٹس کے مطابق عزت دینا چاہتے......''

''بند کرو، بند کرو اپنی تقریر......'' تسلیم فاضلی نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں اپنے ہاتھوں اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔'' ذرا رک کر اس نے اپنے بے قابو جذبات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھر بولا۔ ''مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اپنے بھلے برے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو......'' نشو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پریشان کیوں ہو۔ کیوں اپنے آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کرتے ہو؟''

تسلیم فاضلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب بھی کیا دیتا۔ اتنا سنگین مسئلہ درپیش ہو تو بندہ کیسے پریشان نہ ہو؟ اس کی پریشانی اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ ایک طرف اس میں یہ ہمت نہیں تھی، حوصلہ نہیں تھا کہ وہ مخالفین کے سامنے ڈٹ جاتا اور کہتا۔ ''میں نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا نشو کو۔ وہ میری محبت ہے۔ میری چاہت ہے۔ میری زندگی کی راحت ہے۔''

دوسری طرف وہ اپنے عزیزوں کی پریشانیوں سے بھی پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان کو اور اپنے آپ کو بیک وقت کیسے مطمئن رکھ سکتا ہے؟ خوش رکھ سکتا ہے؟ دونوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکتا ہے۔

اس کشمکش میں اس کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ ڈپریشن میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ شاعر تھا۔ ایک حساس دل رکھنے والا شاعر۔ فکروں اور پریشانیوں نے اس کے دل کو متاثر کرنا شروع کردیا اور ایک دن اس متاثرہ دل نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی دھڑکنیں خاموش ہوگئیں۔ اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ لیکن بے وفائی کا داغ اپنے اوپر لگنے نہیں دیا۔ 17 اگست 1982ء کو تسلیم فاضلی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فلمی دنیا کو ایک بہت بڑا صدمہ دے گیا۔ اس جوان فکر شاعر کی عمر اس وقت صرف 35 برس تھی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس عمر میں تو بہت سے تخلیق کار آرٹ کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں مگر یہ کیسا انوکھا اور عجوبہ شاعر تھا کہ اس عمر میں اتنی انمول شاعری کر کے ایک تاریخ رقم کردی۔ اس نے 1966ء میں فلمی شاعری کی ابتداء کی۔ اس وقت اس کی عمر 19 سال کے قریب تھی۔ وفات کے وقت اس کی عمر 35 سال تھی۔ اس حساب سے اس نے صرف 16 سال تک پاکستانی فلموں کے لیے نغمہ نگاری کی اور کسی شک و شبہ کے بغیر بہت سے سینئر شعراء سے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ شاید یہ قدرت کا نظام ہے کہ کم عمری میں انتقال کرنے والی شخصیتیں اپنی قلیل عمر میں ہی وہ کام کر جاتی ہیں یا وہ مقام حاصل کر لیتی ہیں جو زیادہ عمر پانے والے اکثر لوگوں کو اپنی طویل عمر تک خدمات انجام دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

تسلیم فاضلی کو کھو کر نشو ایک بار پھر بے آسرا ہوگئی تھی۔ اس کا پہلا شوہر انعام درانی اس کی طالب علمی کے دور کا محبوب تھا جس سے اس نے لوگوں کی مخالفت کے باوجود شادی کی تھی مگر اس شخص نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی اور تھوڑے ہی عرصے بعد اسے چھوڑ دیا۔ پیار کا ناطہ توڑ دیا۔ اس کے مقابلے میں تسلیم فاضلی نے اسے بے پناہ محبت دی اور اپنے قریبی عزیزوں کے زبردست پریشر کے باوجود اسے نہیں چھوڑا۔ دنیا چھوڑ دی مگر اس سے پیار کا رشتہ نہیں توڑا۔ ایسے چاہنے والے کے غم کو وہ بہت دنوں تک سینے سے لگائے رہی۔ وہ اکثر تنہائیوں میں روتی اور تسلیم فاضلی کے گیتوں کو یاد کرتی جو اس نے بھی فلموں کے لیے لکھے تھے۔

☆ سن لے قریب آ کے میرے دل کا فیصلہ۔ تم میری زندگی ہو تم میری بندگی

☆ تو ہے میری جان میرے صنم۔ ساتھ ہوں میں

تیرے تیری قسم
☆ایسے ملیں گے پھر نہ جدا ہوں۔ دنیا رہے نہ رہے
اب نشو کے پاس تسلیم فاضلی کی یادیں رہ گئی تھیں اور اس کی نشانی ایک بیٹی۔ جس کا نام تسلیم فاضلی نے بڑے چاؤ سے خود رکھا تھا عائشہ۔
یادش بخیر۔ یہ بچی۔ اب بچی نہیں رہی ہے۔ نشو نے اس کی شادی اپنی دوست اداکارہ فردوس کے بیٹے سے کردی ہے۔ دونوں شاد اور آباد ہیں اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔
تسلیم فاضلی کے انتقال پُر ملال کو اب 36 برس بیت گئے ہیں لیکن اس کے بعد اس جیسا کوئی دوسرا نغمہ نگار پاکستانی فلمی صنعت کو نصیب نہیں ہوا۔
اس نے محض 19 سال کی عمر میں فلموں کی نغمہ نگاری شروع کی۔ اس عمر میں تو لڑکے صحیح مصرعے بھی نہیں لکھ سکتے۔ کورس کی کتابوں میں اساتذہ کا جو کلام ہوتا ہے ان کی تشریح بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتے۔ واضح رہے کہ جس دور میں تسلیم فاضلی نے نغمہ نگاری کی فیلڈ میں قدم رکھا تھا۔ بڑے بڑے اور جید گیت نگاروں کا راج تھا۔ ایسے میں کسی نو عمر اور نو آموز کا ورود اور ان کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو منوانا، یہ کوئی کھیل نہیں تھا۔ کوئی آسان کام نہیں تھا مگر اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر مہربان تھا۔ اس کمسن لڑکے نے ایسی شاعری کی فلموں کے لیے ایسے تر و تازہ اور سماعت کے راستے دلوں میں اتر جانے والے گیت لکھے کہ موسیقار ہدایت کار اور فلم ساز اس کے گرویدہ ہو گئے۔ انہوں نے اس کی عمر پر دھیان نہیں دیا۔ اس کے کام کو دیکھا، اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کو تسلیم کیا اور اس کی خدمات حاصل کرنے لگے۔ واضح رہے کہ فلم والے سب سے پہلے اپنے فائدے کو دیکھتے ہیں۔ جس سے انہیں فائدہ نہیں ہوتا، وہ کیسا ہی طرم خان کیوں نہ ہو۔ اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ تسلیم فاضلی اپنی نو عمری، نو آموزی اور ناتجربہ کاری کے باوجود ایسے گیت لکھتا تھا جو پسند کیے جاتے تھے، جن سے فلموں کی کامیابی کو سہارا ملتا تھا پھر اس میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ گیت نگاری میں زیادہ وقت نہیں لیتا تھا۔ ادھر اسے سچویشن بتائی جاتی، اُدھر وہ گیت، گانا یا غزل لکھ کر موسیقار کے حوالے کر دیتا۔ جیسے بٹن پر انگلی رکھتے ہی مطلوبہ چیز سامنے آجائے۔ اس کی یہی پھرتی، یہی تیزی اور بسیار نویسی تھی جس نے بہت تھوڑے عرصے میں اس سے ڈھیروں گیت لکھوائے۔ ایسے گیت جو کل بھی مقبول تھے آج بھی ان کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ اپنی بھری جوانی میں دنیا چھوڑ گیا مگر اس کے سدا زندہ رہنے والے نغمے اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اس کے تحریر کردہ ہر گیت بھلا کیسے فراموش کیے جاسکتے ہیں۔

☆میرا دل نہ جانے کب سے تیرا پیار ڈھونڈتا ہے
☆ڈھونڈ رہی تھیں جانے کب سے۔ تیری صورت میری آنکھیں
☆ہمارے دل سے مت کھیلو کھلونا ٹوٹ جائے گا
☆نینوں کا ہے کام سارا دو نینوں کا کام۔ نین شرارت کرتے ہیں دل ہوتا ہے بدنام
☆جو درد ملا اپنوں سے ملا۔ غیروں سے شکایت کون کرے
☆جیت اپنی محبت کی ہوگی۔ ہار جائے گا سارا زمانہ
☆اب کس کو سنائیں گے اس درد کا افسانہ۔ سمجھے تھے جسے اپنا نکلا وہی بے گانہ
☆ہنستی ہوئی آنکھوں کا کاجل۔ اڑتی ہوئی زلفوں کا بادل
☆میں تو نہ بولی میرے بول اٹھے کنگنا۔ نینوں نے تیرے مجھے کیا کہا سجناں
☆کبھی اپنا بنائے کبھی اکھیاں چرائے۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے
☆عمریا بیتی جائے کوئی رشتہ نہ آئے
☆عشق سچا ہے تو پھر وعدہ نبھانا ہوگا۔ تجھ کو آنا ہوگا تجھ کو آنا ہوگا
☆ہوں ہاں کرتے کرتے آہیں بھرتے بھرتے۔ کٹے کئی سال
☆روز کہتا ہوں بھول جاؤں تمہیں۔ روز یہ بات بھول جاتا ہوں
☆اپنا جیون صبح کا تارا۔ ڈوب گئے تو ملا کنارا
خاموش نظر خاموش ادا۔ یہ رنگِ طبیعت ٹھیک نہیں

یہ اور ایسے بہت سے گیت ہیں جو جب بھی سنے جاتے ہیں تسلیم فاضلی کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کی شاعرانہ عظمت کے دیپ روشن کر دیتے ہیں۔ ایسے شاعر کو موت بھلا کیسے مار سکتی ہے؟ وہ اپنی ہمیشہ زندہ رہنے والی فلمی نغمہ نگاری کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

زاهد شیخ

وہ دونوں ایک عام سے مجرم تھے۔ انہوں نے بڑی خوب صورتی سے ڈاکے کا پلان بنایا تھا،ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ ان پر کسی کو شبہ بھی نہ ہو، پولیس اندھیرے میں بھٹکتی رہ جائے۔ اسی وجہ سے کامیابی نے قدم چومے مگر تفتیش کاروں نے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرلی اور قانون کے لمبے ہاتھ ان تک پہنچ ہی گئے۔

جرم وسزا کی روداد پڑھنے والوں کے لیے

گرمی کی اندھیری رات تھی۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ایسے میں دو افراد جن میں سے ایک طویل قامت اور دوسرا کوتاہ قامت تھا، آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھلانگ کر اندر اترے۔ یہ کسی کا بنگلا نہیں ایک فوجی قبرستان تھا۔ان دونوں نے نیچے اترتے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی بندہ بشر نہیں تھا۔خاموشی سے قبروں کی قطاروں کے درمیان سے آگے بڑھنے لگے۔ لمبے شخص نے ایک پھولا ہوا بنڈل اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔اس کی چال سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ وہ بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ایک پرانی قبر پر پہنچ کر رک گئے۔ قبر پر سفید پتھر کا ایک کتبہ نصب تھا۔ انہوں نے پھاوڑا اٹھایا اور کتبے کے پیچھے کی نرم زمین کھودنے لگے۔ جب چار فٹ گہرا ایک گڑھا کھود چکے تو اس بنڈل کو گڑھے میں دفن کردیا اور زمین برابر کردی۔

"اگر انہوں نے مجھے مار بھی ڈالا تو میں نہیں بتاؤں گا کہ مال کہاں چھپایا ہے۔" کوتاہ قامت نے سرگوشی کی۔

"میں بھی نہیں بتاؤں گا۔" دوسرے نے یقین دلایا۔

پھر وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھلانگ کر رات کی تاریکی میں غائب ہوگئے۔

☆......☆

اس دن ریاست کیلی فورنیا کے شہر ہالی ووڈ میں صبح کے سات بجے چاندی کے سکوں کے چھ بیگ اور کارڈ بورڈ کا ایک کارٹن جس میں ایک لاکھ گیارہ ہزار تین سو ڈالر کے نوٹ تھے ایک کیش وین کی پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ رقم لاکھیڈ ایئر کرافٹ کے ملازموں کی ہفتہ وار تنخواہ تھی جو پہنچائی جانی تھی۔ ہالی ووڈ اسٹیٹ بینک کے دو مینیجر پیٹرسن اور وکٹر وین کے اگلے حصے میں تھے۔ پیٹرسن نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال رکھا تھا جب کہ وکٹر اس کے عقب میں نگرانی پر مامور تھا۔ ان دونوں کے درمیان اعشاریہ تین آٹھ کے بھرے ہوئے ریوالور تھے۔ وین اپنی منزل کی سمت رواں دواں تھی۔

جیسے ہی وہ عقبی سڑک کے نکڑ پر پہنچے ایک ایم پی کی وردی والے نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک لیا۔ پیٹرسن نے فل بریک لگا کر وین روک دی اور یہ دیکھ کر وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئے کہ اس ایم پی کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں اعشاریہ پینتالیس کا ایک ریوالور تھا جس کی نال ان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ اس طویل قامت کے جسم پر جو وردی تھی اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ منہ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور وہ گھبراہٹ کے عالم میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

"باہر نکلو۔" وہ چیخا۔

اس وقت ایک دوسرا مسلح شخص جو کوتاہ قامت تھا، ایک درخت کے پیچھے سے نمودار ہوا اور صبح کی دھوپ سے چمکتی ہوئی

سڑک پر اپنے ساتھی سے آملا۔ دونوں ڈاکوؤں نے وین کی کھڑکیوں سے انہیں اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ لاچار پیٹرسن اور وکٹر کوان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

”پچھلی سیٹ پر جاؤ۔ اپنے سر نیچے کرلو۔ فرش کی طرف دیکھو اپنے ہاتھ سر کے پیچھے کرلو۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

ان دونوں کے پچھلی سیٹ پر جاتے کوتاہ قامت نے اسٹیئرنگ سنبھال لی اور پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ جب کہ اس کے ساتھی نے دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے تھے اور آنکھوں پر سیاہ ٹیپ لگا دیا تھا۔ وین بیس منٹ تک گرد آلود ناہموار کچے راستوں پر اچھلتی کودتی دوڑتی رہی اور پھر ایک جگہ رک گئی۔ یہ ایک ویران اور سنسان گھاٹی کا کنارہ تھا۔ انہیں ڈھلوان کی طرف سے نیچے اتارا گیا۔ وہاں جھاڑیاں تھیں۔ انہیں سر نیچے کر کے ان جھاڑیوں سے باندھ کر بٹھا دیا گیا اور پھر وہ دونوں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر کیش وین لے کر فرار ہو گئے۔

دونوں ڈاکو جیسے ہی کیش وین لے کر فرار ہوئے، پیٹرسن اپنے چہرے کے دائیں حصے کو درخت کی کھردری چھال سے رگڑنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا گال لہولہان ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ہار نہیں مانی اور اپنی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ اس کی ایک آنکھ سے ٹیپ اتر گیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر سمت بتائی، جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کھڑے ہو جاؤ اور میرے قریب آؤ۔“ وہ بولا۔ ”اور گھوم جاؤ میں تمہاری پچھلی جیب سے چاقو نکال سکتا ہوں۔“

اس طرح تھوڑی سی جدوجہد سے وہ ایک دوسرے کی بندشیں کاٹ کر آزاد ہو گئے اور پھر دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے گھاٹی سے اوپر چڑھ کر ہائی وے پر پہنچے۔

☆......☆

ڈکیتی کی یہ واردات ایف بی آئی کے لیے ایک چیلنج تھی کیونکہ ڈاکوؤں نے ایک نہایت سنگین قومی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

ایف بی آئی کے پاس ایک سراغ تھا۔ جب وکٹر کی آنکھوں پر ٹیپ چڑھایا جا رہا تھا تو اسے چھوٹے قد والے ڈاکو کی قمیص پر لاکھ ہیڈ کے ملازم کے بیج کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ اس ڈاکو نے دھوکا دینے کے لیے وہ قمیص پہنی تھی کہ وہ لاکھ ہیڈ کی پلانٹ پر کام کرتا ہے۔ پھر بھی وہ وہاں سے اپنی تفتیش کا آغاز کر سکتے تھے۔

لاس اینجلس پولیس ڈیپارٹمنٹ شیرف کا آفس اور ایف بی آئی کے ایجنٹ سیکڑوں لوگوں سے پوچھ گچھ کر چکے تھے اور اب وہ اس کار کو تلاش کر رہے تھے جس میں وہ دونوں فرار ہوئے تھے۔ شہر کے آخری حصے میں بنے۔ ایک پارکنگ لاٹ میں کھڑی ایک مشتبہ کار نظر آئی جس پر جعلی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی، اس میں ایک گتے کا ڈبہ تھا جس پر ایک نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ ایجنٹ اس پتے پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک خاتون مسز اپٹلر نے جو وہاں قریب ہی رہتی تھی اس نے پولیس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”آؤ! دیکھو ہمارے ہاں کیسی چیزیں ملی ہیں۔“

اس کے گھر کے عقب میں ایک اور گیراج تھا جو پچھلے چند ہفتوں سے دو نوجوانوں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ ڈکیتی کی اس واردات کی شام ایک بچے کی گیند لڑھکتی ہوئی گیراج کے دروازے کے نیچے سے اندر چلی گئی تھی۔ اپٹلر کے بچوں کو معلوم تھا کہ گیراج کی عقبی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ

اس طرف تک پہنچے اور وہاں لگی گھاس پھاس ہٹائی اور اندر داخل ہو گئے۔ وہاں انہیں چاندی کے سکوں کے چھ بیگ ملے۔ اس کے ساتھ ہی ایک فوجی قمیص بھی ملی جس کی آستین پر MP کڑھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اعشاریہ 45 کا اور اعشاریہ 38 کا ایک آٹومیٹک پستول ملا جو بینک کے مینیجر پیٹرسن اور وکٹر کے تھے۔ ایک اسپورٹ جیکٹ بھی ملا تھا جس سے لاک ہیڈ کا شناختی بیج ایک پن کی مدد سے منسلک تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بیج نمبر جعلی تھا۔ اصلی نمبر کو پھاڑ کر وہ جعلی نمبر سیاہ پینسل سے لکھ کر لگا دیا گیا تھا۔ بہرحال واشنگٹن میں ایف بی آئی کے سائنس دانوں کے پاس وہ بیج بھیج دیئے گئے لیکن اس سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ پھر جب اسے ایک الٹراوائلڈ لیمپ کے نیچے رکھ کر باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا تو سب کچھ واضح ہو گیا اور لاس اینجلس کے ایجنٹ، پلانٹ کا ریکارڈ چیک کرنے پہنچ گئے۔ ملازمین کی فائلوں سے ثابت ہوا کہ وہ نمبر کسی زمانے میں ایک لمبے قد کے ملازم جان جوزف کو دیئے گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ لاک ہیڈ کا ایک ملازم اشٹیلے جان جوزف کا سب سے گہرا دوست تھا۔

یہ جوڑی بہت عرصہ پہلے لاک ہیڈ چھوڑ چکی تھی۔ مگر بہت آسانی سے ان کا سراغ لگا لیا گیا۔ وہ لاس اینجلس میں کیلی فورنیا یونیورسٹی میں جعلی دستاویزات کے ذریعے داخل ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو موسم گرما کے طلباء ظاہر کر رہے تھے۔ ان کے ہاسٹل کے کمروں کی تلاشی لی گئی تو واردات میں استعمال ہونے والے متعدد اوزار کے ساتھ ہی ایبلر کے گیراج کی چابیاں بھی برآمد ہوئیں مگر وہ دونوں نہیں ملے۔

اب ان کی تلاش کا مسئلہ سامنے تھا۔ انہیں کہاں تلاش کیا جاتا؟ اس کے لیے انہیں ان کے انداز سے سوچنے کی ضرورت تھی۔ غالباً ان دونوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک بے داغ واردات کا ارتکاب کیا تھا جس میں کسی قسم کی کوئی خامی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد جائے واردات پر لوٹتے۔ اس لیے ایف بی آئی والوں نے سوچا کہ ان کی تلاش میں دور دراز مقامات پر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ ریکارڈ سے انہیں ان کی تصویریں بھی مل گئی تھیں۔ چنانچہ وہ انہیں لاس اینجلس کے شراب خانوں کے اطراف میں ڈھونڈنے لگے۔

بالآخر ہمارے دو ایجنٹوں نے اسے ایک شراب خانے میں دیکھ لیا جان جوزف ایک اونچے اسٹول پر بیٹھا شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی شراب کا ایک گھونٹ لینے کے لیے سر نیچے کیا ہمارے ایجنٹوں نے اسے دبوچ لیا۔ اسے بازوؤں سے اٹھا کر دروازے کے باہر لایا گیا اور پھر اس کا اعشاریہ 45 کا ریوالور قبضے میں لے لیا گیا جو بھرا ہوا تھا۔

باہر سڑک پر آ کر وہ چیخنے چلانے اور اپنی مدد کے لیے پکارنے لگا۔ وہ سخت مزاحمت کرنے کے ساتھ ہی اپنے آپ کو پاگل بھی ظاہر کر رہا تھا۔

''اشٹین کہاں ہے؟'' ایک ایجنٹ نے اس سے پوچھا۔

''بہت عرصے سے اسے نہیں دیکھا ہے۔'' اس نے برملا جواب دیا اور اپنے ہی جواب پر ہکا بکا رہ گیا۔

یہ احساس ہونے کے بعد کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

اس کے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم نے اشٹیلے کو بھی دبوچ لیا جو اس بار کے آس پاس منڈلا رہا تھا اور مسلح تھا، اگر ہم مستعدی نہ دکھاتے تو وہ یقیناً گولیاں برسانے لگتا۔

ایف بی آئی کے آفس میں ان دونوں نے سارا ملبا ایک فرضی کردار ''نِک'' پر ڈال دیا جو انہوں نے گھڑا تھا۔ بقول ان کے وہ نِک ہی تھا جس نے انہیں بلیک میل کر کے یہ واردات کرنے پر مجبور کیا تھا اور لوٹ کا سارا مال اسی کے پاس ہے۔ وہ ہمیں گمراہ کرنے کے لیے آدھی رات کو نِک کا نام لے کر چیخنے لگا۔ پھر اگلے دن عدالت میں بھی وہ جج کے سامنے نِک کا نام لے کر چیختا ہوا، وہیں ڈھیر ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ یہ ایک پرانی چال تھی۔ اس نے صابن کی چھوٹی سی ٹکیہ نگل لی تھی۔

☆......☆

مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہم کئی مہینے تک انہیں بہلا پھسلا کر ان سے یہ راز اگلوانے کی کوشش کرتے رہے کہ انہوں نے لوٹ کی رقم کہاں چھپائی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کا یہی موقف تھا کہ صرف نِک ہی کو معلوم ہے کہ رقم کہاں ہے پھر ایک دن جب اس کی کوٹھڑی کی تلاشی لی گئی تو اس کے بیڈ کے نیچے سے پانی سے بھرے ہوئے ایک ڈبے میں ایک ڈالر کا ایک بہت ہی گیلا نوٹ پانی میں تیرتا ہوا پایا گیا۔ دراصل جان جوزف ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا اور اس بچکانہ اور احمقانہ تجربے کا مطلب بالکل سیدھا سادا تھا۔ لوٹ کی رقم کسی ایسی زمین میں دفن کی گئی تھی جو گیلی تھی اور جان جوزف یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایک گیلے نوٹ کو سڑنے میں کتنا وقت درکار ہوگا۔

اس کے بعد اشٹیلے نے اپنی کوٹھڑی سے جس میں وہ قید تنہائی بھگت رہا تھا، اپنے شریک جرم جان جوزف کو پیغام بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ پیغام جان جوزف تک پہنچ تو جاتے تھے لیکن

اس سے پہلے سیدھے ایف بی آئی والوں کے ہاتھ لگتے۔ وہ نک کی حیثیت سے یہ پیغامات اپنے مخبروں کے ذریعے جان جوزف تک پہنچاتا تھا لیکن اس کے مخبر وہ پیغام کسی نہ کسی طرح پہلے ایف بی آئی والوں تک نہیں پہنچا دیتے۔ اس طرح انہیں نِک کی اصلیت کا پتا چل گیا۔ انہیں پیغامات کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خود کو پاگل ظاہر کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور یہ بھی کہ اگر انہیں طبی سزا ہوئی تو وہ فرار ہونے کا منصوبہ تشکیل دیں گے۔

انہی پیغامات میں انہیں وہ چیز مل گئی جس کی تلاش تھی۔ یعنی رقم کے معاملے پر تبادلۂ خیال۔ بعض پیغامات میں 18 اور پھر کاغذ کا حوالہ دیا گیا تھا اور یہ لکھا گیا تھا اگر ہمیں وفاق کے کسی جیل میں بھیج دیا گیا تو جاڑے کی بارش کاغذ کو سڑانے میں دیر نہیں لگائیں گی۔" ایک اور پیغام میں تحریر تھا۔ "ایک فائدہ یہ ہے کہ میری بہن صرف سترہ سال کی ہے اور یہ لوگ اس پر مقدمہ نہیں چلا سکتے لیکن آخر وہ کس طرح وہاں جائے۔" اسٹینلے نے چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جگہ کا نام تحریر کرنے سے گریز کیا تھا لیکن اس کے پیغام سے یہ معلوم ہو گیا کہ لوٹ کی رقم کسی گیلی زمین میں دفن کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ کسی سترہ سالہ نوجوان لڑکی تک پہنچنا ہوگا۔

انہوں نے اپنی تلاش کا آغاز کر دیا اور آغاز سانتا مونیکا کے پہاڑوں کے دامن میں واقع یونیورسٹی کے کیمپس سے کیا جہاں یہ جوڑی رہتی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جو مغربی لاس اینجلس کو لاک ہیڈ پلانٹ سے جدا کرتا تھا۔ چونکہ ان مجرموں نے یہاں داخلہ لیا تھا، لہٰذا انہوں نے کیمپس میں کھدائی کی اور انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ پھولوں کی کیاری کی کھدائی کے نتیجے میں انہیں پانچ ہزار ڈالر ملے جو ایک ایک ڈالر کے نوٹ کی شکل میں تھے۔ اس رقم کے بارے میں ان دونوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ باقی رقم نِک لے گیا۔ ایف بی آئی والوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جان جوزف اور اسٹینلے اکثر گھاٹی سے ہو کر چہل قدمی کے لیے جاتے تھے۔ ایک نقشے سے ان راستوں کی نشاندہی ہو گئی جو پہاڑ کے درختوں کے درمیان سے ہو کر چکر کھاتے ہوئے جاتے تھے۔ ان راستوں پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ ایک پر نمبر 18 لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک الگ تھلگ اور سنسان روٹ تھا جو کیمپس کے نزدیک سے گھاٹی کی طرف چلا گیا تھا جہاں بینک کے مینیجروں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر مجرمان فرار ہو گئے تھے۔ یہ جان کران کے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی کہ وہ منزل کے کتنے قریب پہنچ گئے تھے لیکن

اس کے بعد؟

ایف بی آئی والوں نے ایک بلند مقام سے جو کالج کے ہاسٹل کا مغربی حصہ تھا، معلوم واقعات کو ذہن میں ازسرِنو ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہوئے، پگڈنڈیوں کا سروے کیا اور باقی کام تصور پر چھوڑ دیا۔ ان مجرموں نے یقیناً گھاٹی کے روٹ 18 پر سفر کیا تھا اور لوٹ کی رقم اس گیراج میں رکھنے کے بعد اس پرانی کار کو تقریباً ایک میل دور چھوڑ دیا ہوگا۔ پھر رات میں وہ رقم کسی گیلی زمین میں دفن کر دی ہوگی۔ ایجنٹوں نے مضافات کا معائنہ کر کے یہ دیکھا کہ صرف ایک راستہ فوجی قبرستان تک جاتا تھا جس کے گرد آٹھ فٹ اونچی باڑ تھی۔ حالیہ رپورٹ ان کے اس تصور سے بالکل ہم آہنگ تھی۔ کسی قبر کا کتبہ یاد رکھنا آسان ہوتا ہے لیکن ایک لڑکی کے لیے آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھلانگنا ناممکن ہوتا۔

فوجی قبرستان پہنچ کر ایف بی آئی والوں نے لاتعداد قبروں کی لامتناہی قطاروں کے درمیان اس جگہ کو ڈھونڈنے لگے جہاں لوٹ کی رقم دفن کیے جانے کا امکان تھا۔ یہ ایک انتہائی محنت طلب کام تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایک قبر کے عقب سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک ایسی قبر کے کتبے کے پیچھے پہنچے جس کے مطابق اس فوجی کی وفات 1922ء میں ہوئی تھی۔ کتبے کے عقب میں پتوں کا ایک ڈھیر تھا جس کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی تھی۔

ایف بی آئی والوں نے کھدائی شروع کر دی اور جلد ہی ایک چرمی تھیلی اور ایک بیگ برآمد کر لیے۔ جب انہیں کھولا گیا تو ایک لاکھ ڈالر کی ہری ہری گڈیاں برآمد ہوئیں۔ بعد میں جان جوزف کو یہ بات بتائی گئی کہ فوجی قبرستان سے لوٹ کی ساری رقم بازیافت کر لی گئی ہے تو اس نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی گئی۔ بالآخر اس نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے سب کچھ اگل دیا۔ اس کے اقبالِ جرم کی وجہ سے اس کی سزا پینتیس سال سے کم کر کے بیس سال کر دی گئی۔ اس کا شریکِ جرم اسٹینلے شروع میں اپنی بے گناہی کے موقف پر ڈٹا رہا لیکن آخر میں اس نے بھی اقبالِ جرم کر لیا، لہٰذا اس کی سزا میں بھی تخفیف کی گئی اور اسے اکیس سال قید کی سزا سنائی گئی۔

1945ء میں ہونے والی اس بینک ڈکیتی کا کیس شاید کبھی نہ حل ہو پاتا لیکن ایک الٹراوائلٹ لیمپ کی روشنی نے اسے حل کرنے میں مدد کی اس کے ساتھ ہی محنتی اور فرض شناس آفیسروں کی استقامت رنگ لائی۔

سید احتشام

عالمی پیمانے پر جنگجو ملکہ قلوپطرہ کو کہا جاتا ہے لیکن یہ ملکہ بھی کسی طور کم نہ تھی۔ تاریخ داں اسے "آتشِ ابریشم" کہتے ہیں۔ خوب صورتی میں سب سے آگے تھی لیکن میدانِ جنگ میں وہ خونخوار درندے کی طرح اپنے دشمنوں پر جھپٹتی اور گردن اڑا دیتی۔ اس نے بڑی سے بڑی سلطنت کو للکارہ کیونکہ اسے کٹے ہوئے نرخرے سے ابلتا خون دیکھ کر سکون ملتا تھا۔

ایک حسین شیرنی صفت ملکہ کا ذکر

دریائے فرات دو دریاؤں کے مغرب میں واقع ہے جو میسوپوٹامیا (قدیم عراق) کی حد بندی کرتے ہیں۔ دوسرا دریا دجلہ ہے جو دریائے فرات سے مل کر شط العرب، تشکیل دیتا ہوا، خلیج فارس میں جا گرتا ہے۔ "میسوپوٹامیا" ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی دو دریاؤں کے درمیان ہیں۔ یہ بحیرۂ روم کے مشرق میں واقع ایک قدیم خطہ تھا جو شمال مشرق میں جبل زاغروس اور جنوب مشرق میں عرب کے سطح مرتفع سے گھرا ہوا تھا۔ اس خطے میں موجودہ عراق کا بیشتر علاقہ اور موجودہ ایران، شام اور ترکی کے کچھ علاقے شامل تھے۔ عرب کے لوگ دجلہ و فرات نیز اس کے درمیان واقع خشکی کو الجزیرہ کہتے تھے جسے بعد میں زرخیز ہلال کہا جانے لگا جہاں میسوپوٹامیا کی تہذیب پروان چڑھی۔

ملک شام کے وسط میں عرب کا ایک قدیم شہر پامائرہ ہوا کرتا تھا۔ یہ دمشق کے شمال مشرق میں 215 کلومیٹر (134 میل) اور دریائے فرات کے جنوب مشرق میں 180 کلومیٹر (110 میل) کے فاصلے پر واقع ایک نخلستان ہے۔ یہ قدیم زمانے میں ایک اہم شہر ہوا کرتا تھا جو عرصہ دراز سے شام کے صحرا کو عبور کرنے والوں کا آخری پڑاؤ تھا۔ اس شہر کی بنیاد دو صدی ق م کے دوران رکھی گئی تھی۔ یہ شہر 1929ء کے آس پاس غیر آباد ہو گیا اور 1980ء میں یونیسکو نے اسے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے دیا۔ یہ آج بھی اپنے عالیشان محلوں کے کھنڈر کے سبب مشہور ہے۔

شہر پامائرہ کو عربی میں Tadmor کہتے ہیں جس کا مطلب ہے، وہ شہر جسے شکست نہیں دیا جا سکتا۔ پامائرہ کے لوگ میسوپوٹامیا، شام، عرب اور یونان کے بے شمار دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سی عبادت گاہیں اور یادگاریں تعمیر کیں جو مُردوں کو دفنانے یا مُردوں کی نمائندگی کرنے کے فن سے تعلق رکھتی ہیں۔ پامائرہ کے لوگ آرامی زبان بولتے تھے لیکن بعد میں یونانی زبان بولنے لگے۔

یہ خطہ ارضی بعد میں رومن امپائر کا ایک حصہ یا صوبہ بن گیا۔ 260 تا 273 ق م کے دوران اوڈنیاتھس اور اس کی بیوی زینوبیہ نے پامائرہ کو سلطنت پامائرہ کے دارالخلافہ کے طور پر استعمال کیا۔ روم کی تاریخ میں اس دور کو تیسری صدی کا بحران کہتے ہیں۔ اسلامی فتوحات کے زمانے میں خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے پامائرہ فتح کر لیا تھا جس کے بعد سے اس کی اہمیت ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے ہونے لگی۔ اس زمانے میں کئی عربی قبائل پامائرہ میں بستے تھے لیکن سولہویں صدی کے بعد اس شہر نے اپنی اہمیت کھو دی اور سلطنت عثمانیہ کے دور میں 1929ء تک یہ شہر مکمل طور پر ویران ہو گیا، آج پامائرہ کے کھنڈر کے قریب ہی جنوب میں اسی نام کا ایک نیا شہر آباد ہے۔

آخری بطلیموسی ملکہ قلوپطرہ سن 30 ق م میں فوت ہوئی تھی۔ بعض تاریخی حوالوں کے مطابق قلوپطرہ نے خود کو ایک زہریلے سانپ سے ڈسوا کر اپنی جان لے لی تھی تا کہ فاتح رومن شہنشاہ آکٹیویس، جو 27 ق م کے بعد آگسٹس کہلایا جانے لگا تھا، اپنی عظیم الشان فتح کا جشن منانے کے لیے اسے پابہ جولاں روم کی سڑکوں پر نہ گھمائے، قلوپطرہ کی موت کے تین سو سال بعد مشرق کی ایک اور ملکہ کے نصیب میں شاید یہی لکھا تھا کہ فاتح رومن اسے پابہ سلاسل روم کی سڑکوں پر گھمائیں اس کا جلوس نکالیں، اپنی فتح کا جشن منائیں اور سرعام اس کی تذلیل کریں۔ تاریخ آگسٹس کے مطابق فاتح رومن شہنشاہ آریلین نے پامائرہ کی ملکہ زینوبیہ کو گرفتار کر کے اسے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر روم کی سڑکوں اور گلیوں میں گھمایا اور اپنی فتح کا جشن منایا تھا۔ یہ

زینوبیہ کون تھی اور رومنوں نے اس کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک کیوں کیا تھا۔اس بارے میں تاریخ سے معلوم کرتے ہیں۔

☆......☆

زینوبیہ 240 میں پالمائرہ (ملک شام) میں پیدا ہوئی تھی جو اس زمانے میں روم کا ایک صوبہ ہوا کرتا تھا، زینوبیہ کا پورا نام جولیا آریلین زینوبیہ تھا، لہٰذا اس اعتبار سے وہ ایک رومن شہری تھی۔ یہ رومن شہریت اس کے باپ کے خاندان کو شاید دوسری صدی کے اواخر میں مارکس اور یلیس کے دور میں دی گئی تھی۔ اس کا باپ اپنا سلسلۂ نسب شہنشاہ سپٹمیس کی بیوی جولیا ڈونا سے جوڑتا تھا۔ زینوبیہ کو یونانی اور لاطینی میں تعلیم دی گئی تھی۔ اگرچہ اسے ان میں دشواری پیش آتی تھی لیکن وہ مصری اور آرامی زبان روانی سے بولتی تھی اور مصر کی ملکہ قلوپطرہ سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتی تھی، مشہور عربی مؤرخ طبری کے مطابق اس کی پرورش لڑکوں کی طرح ہوئی تھی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ کشتی لڑا کرتی تھی۔ جب وہ ایک نوجوان لڑکی تھی تو اسے اپنی فیملی کے ریوڑوں اور گلہ بانوں کا انچارج مقرر کردیا گیا تھا لہٰذا وہ مردوں پر حکمرانی کرنے کی عادی ہوگئی تھی۔ طبری کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ شہ سواری میں طاق ہوگئی تھی اور اس میں زبردست ذہنی وجسمانی صلاحیت اور قوت برداشت پیدا ہوگئی تھی جس کے لیے وہ بعد میں مشہور ہوئی۔ یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ نہ صرف میلوں پیدل مارچ کرسکتی تھی بلکہ کسی بھی مرد کے مقابلے میں شکار کرنے کی اہل تھی۔ معروف مؤرخ رچرڈ گبن اپنی مشہور زمانہ کتاب میں رقم طراز ہے۔

''زینوبیہ شاید تاریخ کی وہ واحد عورت تھی جس کی اعلیٰ ذہانت نے اس غلامانہ خدمت گزاری اور تساہل سے سمجھوتا نہیں کیا جو ایشیا کی آب و ہوا اور وہاں کے طرز معاشرت نے عورتوں پر مسلط کر رکھی تھی۔ اپنا سلسلۂ نسب مصر کی ملکہ قلوپطرہ سے جوڑنے والی زینوبیہ جسے تاریخ میں قلوپطرہ ثانی کہا جاتا ہے حسن میں قلوپطرہ کے ہم پلہ اور پاکدامنی اور شجاعت میں اس سے بہت بڑھ کر تھی۔ ایک عرب شیخ کے گھر میں پیدا ہونے والی یہ غیر معمولی لڑکی انتہائی پُرکشش اور خوش جمال ہونے کے علاوہ نہایت دلیر واقع ہوئی تھی۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور اس کے دانت اتنے سفید اور چمکدار تھے کہ ان پر سچے موتیوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی آواز دبنگ اور شیریں تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک بہت ہی ہمدرد اور شفیق خاتون تھی۔ وہ لاطینی زبان سے ناواقف نہیں تھی بلکہ اس میں اتنی ہی طاق تھی جتنا یونانی، مصری اور شامی زبانوں میں۔ اس نے تیسری صدی کے مشہور و معروف فلسفی لانجینس کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا جس نے اسے اعلیٰ وارفع زبان دانی کے ساتھ ہی ہومر اور افلاطون کے فلسفے کی تعلیم دی تھی۔ وہ مشرق کی تاریخ سے کما حقہ واقفیت

رکھتی تھی۔"
عربی ذرائع بھی جو تعصب کی بنیاد پر اس کی شجاعت اور دلیری کا ذکر کم اور چالاکی اور منصوبہ سازی کا ذکر زیادہ کرتے ہیں، اسے ایک قابلِ ذکر ملکہ ضرور گردانتے ہیں۔ دوسری طرف روس کی ملکہ کیتھرائن، زینوبیہ کی شجاعت اور ذہانت کی معترف تھی اور اس خواہش کا اظہار کرتی تھی کہ کاش وہ زینوبیہ ہوتی۔ قدیم تاریخ میں جہاں اس کی دیگر خصوصیات بار بار دہرائی گئی ہیں وہیں اس کے پاک دامن اور باعصمت ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

☆......☆

زینوبیہ کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں 258ء میں ملک شام کے رومن گورنر ٹوکیتی سیپٹمیس اوڈیناتھس سے ہوئی تھی جس سے اس کا بیٹا وبلاتھس تھا۔ زینوبیہ اوڈیناتھس کی دوسری بیوی تھی، پہلی بیوی سے اس کا ایک بیٹا اور وارث ہیروڈس تھا اوڈیناتھس ایک نہایت خوش حال، معاشی اعتبار سے مستحکم اور پھلتے پھولتے ہوئے خطے بالخصوص پالمائرہ پر حکومت کرتا تھا جو مشرق اور مغرب کے درمیان واقع شاہراہِ ریشم پر واقع ایک اہم تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا۔ روم جانے والے یا وہاں سے آنے والے سوداگروں کو ٹیکس ادا کرنے یا محض آرام کرنے کے لیے پالمائرہ میں رکنا پڑتا تھا لیکن 227ء کے آس پاس ملک فارس کے ساسانی ٹیکس لگانے کے بہانے آئے دن اس روٹ کو بلاک کر دیا کرتے تھے۔ ریشم روم میں بے حد مقبول تھا، جو ملک چین سے وہاں پہنچتا تھا، لہٰذا روم کے لوگ اور سوداگران بھی تجارت میں آئے دن کی اس رکاوٹ سے سخت نالاں تھے۔ اسی دوران ساسانی بادشاہ شاپور اوّل نے موجودہ ترکی کے شہر اینٹیوک پر قبضہ کر لیا جو اس زمانے میں صوبہ شام کا پایۂ تخت ہوا کرتا تھا۔ یہ روم کا ایک انتہائی اہم تجارتی مرکز تھا اور شاپور کی یہ حرکت روم کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

260ء میں رومن شہنشاہ ویلیرین نے ساسانیوں پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہوئی اور ساسانیوں نے اسے قید کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاپور اس کی پیٹ پر پیر رکھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا کرتا تھا۔ اسی قید و بند کے دوران ویلیرین کی موت واقع ہوگئی اور شاپور نے اس کی لاش میں بھس بھروا کر چوک پر نمائش کے لیے رکھ دیا۔ ویلیرین کا بیٹا گیلینس اس صورت حال سے نمٹنے سے قاصر تھا چنانچہ اوڈیناتھس نے ساسانیوں کو مزہ چکھانے کے لیے اپنی فوج کو حرکت دی۔ اس کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ شاپور کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اوڈیناتھس نے اسے شکست فاش دی اور دریائے فرات عبور کر کے اس کی فوج کو کھدیڑتا ہوا ملک شام سے بھی اکھاڑ پھینکا۔ اگرچہ اوڈیناتھس نے اپنے آپ کو روم کا وفادار ظاہر کرنے کے لیے روم کے مفاد میں ویلیرین کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن مورخین کے خیال میں اس کے دیگر محرکات تھے۔ درحقیقت اس نے شاپور کے ساتھ اتحاد تشکیل دینے کی کوشش کی تھی جسے شاپور نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور اسی وجہ سے اوڈیناتھس اس کا دشمن ہو گیا تھا لیکن جب ہم شاپور کی شر انگیزی کو دیکھتے ہیں تو اوڈیناتھس اپنے حملے میں حق بجانب نظر آتا ہے۔

اوڈیناتھس نے روم کی جو خدمات انجام دی تھیں اس کے عوض اسے سلطنتِ روم کے مشرقی حصے کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ 261ء میں جب غاصب کرائٹس نے گیلینس کی حکمرانی کو چیلنج کیا تو اوڈیناتھس نے اسے شکست دی اور ہلاک کر دیا۔ اس واقعے کے بعد اسے اتنی عزت اور طاقت حاصل ہوگئی کہ وہ روم سے تقریباً آزاد اپنی مملکت پر موثر طریقے سے حکومت کر سکتا تھا۔ 266/67ء میں ایک شکار کے دورے کے بعد ایک تنازعہ میں اس کے بھتیجے نے اسے اور اس کے بیٹے ہیروڈیز کو ہلاک کر دیا۔ بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ انہیں زینوبیہ نے قتل کروایا تھا تاکہ اس کا بیٹا وبلاتھس بادشاہ بن جائے لیکن بعد کے مورخین نے اس دعوے کو مسترد کر دیا۔ ان کے مطابق خود شہنشاہ گیلینس اوڈیناتھس کے قتل کا ذمے دار تھا۔

زینوبیہ کا بیٹا وبلاتھس چونکہ ابھی چھوٹا تھا، لہٰذا زینوبیہ سلطنت کی والی بن گئی اور اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس نے اپنے دربار میں فلسفیوں اور دانش وروں کو اکٹھا کر لیا جن میں اس کا استاد لانگینس بھی شامل تھا جس پر بعد میں یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے زینوبیہ کو روم سے ناطہ توڑنے پر اکسایا تھا۔ اب تک پالمائرہ اور روم کے درمیان تعلقات کمزور ہو چکے تھے کیونکہ اوڈیناتھس کی فوج کشی جتنا روم کے حق میں تھی اتنا ہی خود اس کے حق میں بھی تھی۔

زینوبیہ نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے شوہر کی پالیسیاں جاری رکھیں۔ روم میں پھیلی ہوئی بدامنی اور انتشار کے دوران جس نے تیسری صدی کے بحران کے خدوخال نمایاں کیے، چھبیس شہنشاہ آئے تھے اور یکے بعد دیگرے قتل کر دیے گئے تھے۔ اوڈیناتھس نے بھی شاید یہ سوچا ہوگا کہ وہ ساسانیوں کے شہروں میں لوٹ مار کر کے اپنے لیے دولت کے انبار لگا کر اور گیلینس پر اپنی اہلیت اور قدر و قیمت ثابت کر کے اگلا شہنشاہ بن سکتا تھا۔ زینوبیہ نے بھی شاید اس کی موت کے بعد یہی سوچا

ہوگا کہ اس کا بیٹا یا وہ خود روم پر حکمرانی کرسکتی ہے چنانچہ وہ اپنے شوہر کی مملکت کو اسی طرح چلانے لگی جس طرح وہ چلایا کرتا تھا۔

268ء میں گیلینیس کا قتل ہوگیا اور کلاڈیکس روم تخت نشین ہوا لیکن وہ کچھ ہی عرصے کے بعد بخار میں مبتلا ہوکر چل بسا اور 270ء میں کوئن ٹیلس سریر آرا ہوا۔ اس دوران زینوبیہ نے یہ دیکھ کر کہ روم اپنے گوناگوں مسائل میں اسی قدر الجھا ہوا تھا کہ اسے اس کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی، اس نے جنرل ذبڈا اس کو فوج کا سربراہ بنا کر رومن مصر بھیج دیا تاکہ وہ اس پر اپنا ہونے کا دعویٰ کرسکے۔ تاہم وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھی۔ وہ روم کے ساتھ محاذ آرائی نہیں چاہتی تھی۔ اسی دوران ایک شامی مصری تیاجنیس نے رومن امپائر کے خلاف ایک ایسے وقت میں بغاوت کردی جب روم کا گورنر کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں زینوبیہ کی مصر کی جانب پیش قدمی کو روم کے مفاد میں تصور کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ تیاجنیکس، زینوبیہ کا آلہ کار تھا جسے اس نے وقت سے پہلے فوج کشی کا ایک بہانہ بنا کر بھیجا تھا۔ شامی پہلے پہل تو اپنی بغاوت میں کامیاب رہے لیکن جلد ہی روم کی فوج نے جو اپنی مہم سے واپس آرہی تھی، انہیں مصر سے باہر نکال دیا لیکن وہ اس پر بھی مطمئن نہ تھی، لہٰذا اس نے سرحد کے پار اور شام کے شمالی حدود تک ان باغیوں کا پیچھا کیا جہاں شامی باغیوں نے اچانک پلٹ کر ان پر جوابی حملہ کردیا، رومن فوج کے لیے یہ جوابی حملہ قطعی غیر متوقع تھا لہٰذا وہ اپنا دفاع نہ کرسکی۔ شامی باغیوں نے رومن فوجیوں کو بڑی تعداد میں قتل کردیا۔

269ء میں زینوبیہ نے مصر کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد اس نے یونان سے لے کر مصر تک کے ساحلی علاقوں کو جن میں ترکی، شام، لبنان شامل تھے اور ایشیائے کوچک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ روم میں بدامنی، بھوک و افلاس، بدحالی اور طوائف الملوکی بدستور عروج پر تھی، لہٰذا خوش حال اور دولت مند پالمائرین امپائر کا انتخاب ان علاقوں کے صوبائی حکمرانوں کے لیے بہت پُرکشش ہوگیا تھا اور چونکہ روم اپنے اندرونی خلفشار اور اختلافات نیز بیرونی حملہ آوروں سے نمٹنے میں بری طرح الجھا ہوا تھا، لہٰذا اسے زینوبیہ کی پھیلتی ہوئی سلطنت پر توجہ دینے کی یا تو فرصت نہیں تھی یا پھر ہمت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ بالکل واضح تھا کہ زینوبیہ روم کے مقابلے میں اپنی سلطنت قائم کررہی تھی تاہم اس نے رومن امپائر کے سامنے کھل کر آنے سے گریز کیا اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے اپنی سلطنت کو رومن امپائر سے الگ کرنے کی راہ پر گامزن ہوگئی۔

☆......☆

اس وقت تک آریلین روم کا شہنشاہ بن چکا تھا۔ زینوبیہ نے ایسے سکے بنوائے جن پر ایک طرف وبلاتھس اور دوسری طرف آریلین کی شبیہہ کندہ تھی جس سے ان دونوں کی مصر پر مشترکہ حکمرانی کو ظاہر کرنا مقصود تھا۔ اس نے پالمائرہ وہی آریلین کے نقش کندہ کرکے رکھوائے نیز سرکاری خط وکتابت میں اس کا نام شامل کیا تاہم ایسے ہی وقت میں اس وبلاتھس کے لیے آگسٹس اور اپنے لیے آگسٹا کے شاہی القاب اپنائے جس کا استحقاق صرف روم کے شاہی خاندان کو حاصل تھا۔ اس نے ساسانی فارسیوں (ایرانیوں) سے گفت وشنید کرکے تجارتی معاہدے کیے اور روم سے صلاح ومشورہ حتیٰ کہ روم کے مفاد کا خیال رکھے بغیر مزید علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ 271ء تک وہ ایک وسیع وعریض سلطنت پر حکمرانی کرنے لگی تھی جو دور حاضر کے پورے عراق اور شام سے لے کر ترکی، مصر اور یونان تک پھیلی ہوئی تھی، گویا روم کے بعد روئے زمین پر دوسری سب سے بڑی فوجی طاقت بن چکی تھی۔

اگرچہ دوسرے رومن شہنشاہ اس طرف توجہ دینے سے قاصر تھے کہ زینوبیہ کیا کررہی ہے یا پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اس معاملے میں کوئی قدم اٹھاتے لیکن آریلین ایک بہت ہی مختلف قسم کا حکمراں تھا۔ وہ ایک معمولی سپاہی سے جنرل کے عہدے تک پہنچا تھا اور اب وہ روم کا شہنشاہ تھا جسے فوج نے منتخب کرکے تخت پر نہیں بٹھایا تھا جیسا کہ اس دور میں ہوتا رہا تھا۔ وہ پہلے ایک سپاہی اور بعد میں سیاست داں تھا۔ جب اس نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی تو پہلے اسے وحشی اور جنگجو جرمن قبائل وینڈیں، المانی اور گوتھس سے جنگ کرکے انہیں شکست دینی پڑی تھی۔ 272ء تک وہ ان سے نمٹ کر زینوبیہ سے مشرقی صوبوں کو واپس لینے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے کسی ایلچی یا نمائندے کو خط کے ساتھ زینوبیہ کے پاس بھیجا اور نہ ہی اس سے کوئی وضاحت طلب کی نہ ہی اس نے زینوبیہ کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا بلکہ اپنی پوری فوج کے ساتھ پالمائرین امپائر کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔

اس نے ایشیائے کوچک پہنچ کر ان تمام قصبوں اور شہروں کو تخت وتاراج کردیا جو زینوبیہ کے حامی اور وفادار سمجھے جاتے تھے۔ اس پیش قدمی کے دوران وہ جگہ جگہ ڈاکوؤں کے حملوں کو پسپا کرتا ہوا تیانا پہنچ گیا جو مشہور فلسفی اپولونیس کا آبائی

ہیٹ اسٹروک: علامات و احتیاطی تدابیر

تحریر: ہومیوڈاکٹر و حکیم محمد عمر فاروق گوندل

ہیٹ اسٹروک/لولگنا کیا ہے: زیادہ دیر تک گرمی کے سامنے رہنا، براہ راست دھوپ میں کام کرنا اور حبس والی جگہ پر رہنے سے جسم کا قدرتی درجہ حرارت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ انسانی جسم کا ایسی صورتِ حال کو برداشت نہ کر پانا ہیٹ اسٹروک یعنی لولگ جانے کا باعث بنتا ہے۔ انسانی جلد شدید گرم اور خشکی کا شکار ہو جاتی ہے۔

لولگنا/ہیٹ اسٹروک کی علامات: بہت زیادہ پیاس لگنا، وقفے وقفے سے بے ہوشی طاری ہونا، سر درد کرنا، چکرآنا، جسم میں کمزوری اور نقاہت کا شدید احساس، اعصاب میں کھنچاؤ کی کیفیت کا پیدا ہونا، جلد کا گرم اور سرخ ہونے کے ساتھ خشک ہو جانا، الٹی اور متلی کی شکایت ہونا، شدید صورتِ حال میں سانس کا متاثر ہونا۔

لولگنا/ہیٹ اسٹروک سے محفوظ رہنے کی احتیاطی تدابیر: گھر سے باہر کم سے کم جائیں۔ سایہ دار جگہوں پر رہیں۔ چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس کا استعمال نہ کریں۔ دل کو طاقت اور ٹھنڈک پہنچانے والی جڑی بوٹیاں جیسے صندل، گلاب وغیرہ کے عرقیات سے تیار کردہ شربت کا استعمال معمول بنائیں۔ گھر سے باہر نکلیں تو سر کو ڈھانپ کر رکھیں۔ شارٹس پہننے سے گریز کریں اور کپڑے لمبی آستینوں والے پہنیں۔ متاثرہ شخص کو فوری طور پر ٹھنڈی اور ہوادار جگہ پر منتقل کریں۔ ہلکے رنگوں والے اور ڈھیلے ڈھالے لباس زیب تن کریں۔ گرمی سے فوراً ٹھنڈ کی طرف اور ٹھنڈ سے فوراً گرمی کی طرف نہ جائیں۔ چھوٹے بچوں کا خاص طور سے خیال رکھیں اور وقفے وقفے سے پانی پلاتے رہیں۔ طلبہ و

مقام تھا اور زینوبیہ جس کی عقیدت مند تھی۔ تیانا پہنچنے پر اس نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ اپولونیئس اس کے پاس آیا اور اس نے آریلین کو مشورہ دیا کہ اگر وہ فتح حاصل کرنا چاہتا ہے تو زینوبیہ سے رحم دلی سے پیش آئے۔ چنانچہ کاریلین تیانا کو جوں کا توں چھوڑ کر وہاں سے کوچ کر گیا۔ یہ رحم دلی بہت ہی عمدہ پالیسی ثابت ہوئی کیونکہ وہ دوسرے شہروں میں جہاں بھی گیا وہاں کے لوگوں نے یہ سوچ کر کوئی مزاحمت نہیں کی کہ شہنشاہ کے غیض وغضب کو دعوت دینے اور اس کا شکار ہونے سے بہتر ہے کہ بے چوں و چرا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے جائیں کیونکہ وہ ایک رحم دل انسان ہے۔ چنانچہ کسی بھی شہر نے اس کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے بلکہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی خیر سگالی اور تابعداری کے پیغام بھیجنے لگے اور اس طرح آریلین کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر جلد ہی ملک شام پہنچ گیا۔

☆......☆

آیا زینوبیہ نے آریلین سے اس سے پہلے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں، اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ آریلین کے پامائرہ پہنچنے پر ایسے خطوط کے بارے میں رپورٹس ملتی ہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خطوط بعد میں لکھے گئے تھے۔ آریلین کی اس مہم کے آغاز میں زینوبیہ کو تحریر کیے جانے والے خطوط بھی من گھڑت اور جعلی تصور کیے جاتے ہیں جن میں آریلین نے اس سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا تھا اور زینوبیہ نے نہایت نخوت سے اس کا جواب دیا تھا۔ ان خطوط سے آریلین کی رحم دلی اور زینوبیہ کی رعونت کو اجاگر کرنا مقصود تھا۔ ایسے میں کہ جب آریلین کی پیش قدمی جاری تھی، زینوبیہ اطلاع پا کر اپنی فوج کو اکٹھا کر چکی تھی۔ 272ء میں یہ دونوں فوجیں شہر ڈیفنی کے باہر ایک مقام ایمائے میں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئیں۔ یہ تاریخ میں جنگ ایمائے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام دورِ حاضر کے ترکی کے شہر انطیوک کے نزدیک واقع تھا جو جنگ کے لیے آئیڈیل مانا جاتا تھا۔ زینوبیہ اس وقت انطیوک میں تھی۔ ادھر میدان جنگ میں اس کے سپہ سالار زبڈاس کو اپنے بھاری بھرکم زرہ بکتر پوش گھوڑوں اور گھڑ سواروں اور پیادہ فوج پر مکمل بھروسا تھا۔ اس نے اپنے گھڑ سوار دستوں کو میمنہ اور میسرا میں کچھ اس طرح صف آرا کیا تھا کہ وہ حملہ کرنے کی بہترین پوزیشن میں تھے جب کہ پیادہ فوج وسط میں تھی۔ جب آریلین اپنی فوج لے کر وہاں پہنچا تو صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ وہ دفاعی پوزیشن اختیار

طالبات اسکول سے واپسی پر سر پر گیلا کپڑا رکھیں اور چھتری کا استعمال لازمی کریں۔

قرشی جام شیریں ٹھنڈک پہنچائے گرمی بھگائے: جیسا کہ مضمون میں درج ہے کہ ہیٹ اسٹروک کی صورت میں لیکوئڈ (پانی والی چیزوں) کا استعمال کریں اور ایسے قدرتی جڑی بوٹیوں کے عرقیات سے تیار کردہ مشروبات کا استعمال کریں جو نہ صرف گرمی میں ٹھنڈک کا احساس دیں بلکہ بے چینی، گھبراہٹ کو دور کر کے فرحت، تسکین اور تر و تازگی کا بھی باعث بنیں۔ قرشی نے آپ کے ان تمام مسائل کو فوری طور پر حل کر دیا ہے۔ جام شیریں قرشی کا ہر دلعزیز مشروب نہ صرف پاکستان میں بلکہ پاکستان سے باہر بھی ہر کسی کا پسندیدہ ہے۔ جام شیریں صندل، گلاب، اُشنہ اور خس کے عرقیات سے تیار کیا جاتا ہے۔ جو انسانی جسم اور صحت پر فرحت بخش اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جام شیریں کو اعلیٰ ترین مشینری پر جدید ترین طبی اصولوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے نیز اس کی تیاری میں 265 کوالٹی ٹیسٹ کیے جاتے ہیں تاکہ اس کے معیار میں کسی بھی طرح کی کمی واقع نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دس میں سے چھ فروخت ہونے والی بوتلیں قرشی جام شیریں کی ہوتی ہیں۔

قرشی جام شیریں کے استعمالات: قرشی جام شیریں جو سارا سال استعمال ہوتا ہے اسے ضرورت اور موقع کی مناسبت سے مختلف طریقوں سے پیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں اس کے استعمال کے چند طریقے درج ہیں۔

☆ ٹھنڈا جام شیریں شربت دودھ کے ساتھ ☆ ٹھنڈا جام شیریں لیموں کے ساتھ۔

☆ ایسے بچے جو دودھ پینے سے منہ چراتے ہیں ان کے لیے قرشی کا جام شیریں انتہائی اہم انتخاب ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو دودھ میں جام شیریں ڈال کر پلائیں بچے اسے بڑے شوق اور مزے سے پیتے ہیں۔

کرنے پر مجبور ہو گیا۔ زیڈاس کو رومنوں پر دو طرح سے برتری حاصل تھی۔ ایک تو اس کے گھڑ سوار اور گھوڑے بھاری بھرکم زرہ بکتر پوش تھے جب کہ آریلین کی فوج کے جسم پر ہلکا پھلکا زرہ تھا۔ دوسرے یہ کہ سورج آگ برسا رہا تھا اور زیڈاس اچھی طرح جانتا تھا کہ رومن اس شدید گرمی کے عادی نہیں تھے۔ یہ تپش اور حدت ان کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ آریلین کو اپنی کمزوریوں کا بخوبی علم تھا، لہٰذا وہ پہلے ہی اپنی کمزوریوں کو طاقت اور زیڈاس کی برتری کو اس کی کمزوری میں بدلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

روایتی جنگ کے مطابق پہلے تو چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں کو لڑنے کا موقع دیا گیا۔ پھر زیڈاس نے اپنے شہ سواروں کو رومن فوج پر حملے کا حکم دیا تاکہ آریلین اپنے شہ سواروں کے ساتھ اپنا دفاع کر سکے، دونوں طرف سے فوجیں گویا ہوا کے دوش پر سوار ایک دوسرے کی طرف لپکیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کی صفوں میں داخل ہوتیں اور گھمسان کا رن پڑتا، اچانک ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ رومنوں نے اپنے گھوڑوں کو تیزی سے موڑ لیا۔ انہوں نے پسپائی اختیار کر لی تھی اور میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے

لیکن یہ دراصل آریلین کی ایک زبردست جنگی چال تھی۔ رومنوں کی صفوں میں بے ترتیبی پھیل گئی تھی اور وہ بگٹٹ بھاگ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر زیڈاس جوش و جذبے سے بھر گیا۔ اسے اپنی فتح اور کامرانی کا یقین ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ پامائرین فوج رومنوں کا پیچھا کرنے لگی۔ یہ تعاقب خاصا طویل ہوتا چلا گیا لیکن زیڈاس کی فوج کو اپنے وزنی زرہ بکتر پر فخر تھا اور فخر کا یہ تقاضا تھا کہ دشمنوں کا تعاقب جاری رکھا جائے۔ اس طویل تعاقب کے دوران گرمی کی شدت سے ان کا وزنی زرہ بکتر ان کے لیے وبال جان بن گیا۔ وہ رومن فوج کا تعاقب کر رہے تھے اور آگ برساتا ہوا سورج ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کی تپش نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔ وہ تھکن سے چور تھے پھر بھی تعاقب جاری رکھنے پر مجبور تھے۔

آریلین کی فوج پیشگی منصوبہ بندی کے تحت ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی اور جب پامائرین فوج وہاں پہنچی تو رومن فوج اچانک پلٹ کر پوری قوت سے ان پر ٹوٹ پڑی۔ زیڈاس کی تھکی ہاری اور گرمی سے بے حال فوج اس اچانک جوابی حملے سے ہکا بکا رہ گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال پاتی۔ آریلین کی یہ جنگی چال ان کے لیے انتہائی

تباہ کن ثابت ہوئی۔ رومن انہیں بے دریغ قتل کرنے لگے۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ صرف چند شہ سوار ہی اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوسکے۔

اپنے شہ سواروں کی تباہی و بربادی کی خبر جب زیڈا اس تک پہنچی تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی پیادہ فوج کا ان سخت کوش اور جری رومنوں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو انطوک تک پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔ ملکہ زینوبیہ اور زیڈا اس نے یہ دیکھ کر کہ اب انطوک کا سقوط ہو کر رہے گا، اپنی فوج کو کمک پہنچائی اور رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سب کو انطوک سے نکال کر ایمیسا (حمص) پہنچا دیا جو دمشق سے ایک سو ایک میل کے فاصلے پر واقع مغربی شام کا ایک شہر تھا (اور ہے)۔

آریلین پامائرین فوج کا قتل عام کرنے کے بعد حمص پر حملہ آور ہوا جہاں ملکہ زینوبیہ اور زیڈا اس اپنی فوج کے ساتھ اکٹھا ہوئے تھے۔ یہاں بھی آریلین نے وہی جنگی چال چلی جو وہ پہلے بھی چل چکا تھا لیکن اس دفعہ ایک اضافے کے ساتھ اس نے اپنی پیادہ فوج کو دشمنوں سے لڑنے کے لیے لکڑی کے موٹے موٹے مضبوط ڈنڈے دے دیے تھے۔ پامائرین فوج کو ان ڈنڈوں سے لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا، لہٰذا وہ اپنا دفاع کرنے میں سخت ناکام رہی اور اسے عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ آریلین نے ان سب کو قتل کردیا۔ زیڈا اس کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اس حملے میں مارا گیا تھا کیونکہ اس واقعے کے بعد تاریخ میں کہیں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے لیکن زینوبیہ وہاں سے پامائرہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ آریلین نے حمص میں ملکہ زینوبیہ کا خزانہ لوٹنے کے بعد اس کا تعاقب کیا لیکن جب وہ پامائرہ پہنچا تو زینوبیہ اپنے بیٹے کے ساتھ شہر سے پھر فرار ہو چکی تھی۔ اس نے آریلین کو ایک بار پھر نچہ دے دیا تھا۔

☆......☆

زینوبیہ ساسانیوں (ایرانیوں) کی طرف سے مدد کی اُمید کررہی تھی لیکن جب کوئی مدد نہیں پہنچی تو ملکہ زینوبیہ اور اس کا بیٹا ایک انتہائی تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر ساسان فرار ہو گئے جب کہ مؤرخین نے اس بات کو مسترد کردیا ہے کہ زینوبیہ ساسانیوں سے مدد کی اُمید کررہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ پروپیگنڈا آریلین نے کیا تھا تاکہ عوام کو زینوبیہ کی طرف سے بدگمان کیا جاسکے کہ وہ روم کے سب سے بڑے دشمن سے مدد مانگ رہی تھی۔ بہرحال جب ملکہ زینوبیہ اور اس کا بیٹا دریائے فراط عبور کرنے کی کوشش کررہے تھے تو آریلین وہاں پہنچ گیا اور اس نے انہیں گرفتار کرلیا۔ اس واقعے کے بعد زینوبیہ کے ساتھ کیا پیش آیا یہ ایک سربستہ راز ہے جس پر سے آج تک پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔

☆......☆

یہ حیرت کا مقام ہے کہ تاریخ ایک عظیم الشان ملکہ کے انجام سے بے خبر ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ بہت سے مؤرخین نے اس واقعہ پر اپنے اپنے طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ زینوبیہ اور وبلاتھس کو جب روم واپس لایا جارہا تھا تو وہ دریائے باسفورس (ترکی) میں ڈوب گئے جب کہ دیگر ذرائع کے مطابق زینوبیہ کو روم واپس لایا گیا اور آریلین نے اسے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر روم کی سڑکوں پر گھمایا اور یوں اپنی فتح کا جشن منایا۔ اس کے بعد اسے روم میں دریائے ٹائبر کے قریب رہنے کے لیے ایک حویلی دے دی گئی تھی لیکن کچھ ذرائع کے مطابق زینوبیہ کو بے شک روم واپس لایا گیا تھا لیکن جلوس کی شکل میں اسے روم کی سڑکوں پر ہرگز نہیں گھمایا گیا تھا بلکہ اس نے ایک دولت مند رومن شہری سے شادی کرلی تھی۔ زینوبیہ کے انجام سے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن جو قدیم تاریخی حقائق اکٹھا کیے گئے ہیں ان کے مطابق زینوبیہ کو بالآخر گرفتار کرلیا گیا تھا، اسے آریلین کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور واپس روم لایا گیا تھا۔ جہاں تک اسے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر روم کی سڑکوں پر گھمانے کا تعلق ہے یہ سراسر لغو اور من گھڑت ہے۔ یہ داستانیں بعد میں گھڑی گئی تھیں۔ آریلین، زینوبیہ کی کم سے کم تشہیر چاہتا تھا کیونکہ یہ امر خود اس کے لیے بڑی سبکی اور شرمندگی کا باعث تھا کہ اسے ایک عورت کو زیر کرنے کے لیے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑی تھی۔ تاہم تمام ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی گرفتاری اور اسے واپس روم لائے جانے کی تفصیلات کچھ بھی رہی ہوں، اس نے ایک دولت مند رومن شہری یا سینیٹر سے شادی کرلی تھی اور بقیہ زندگی اپنے بچوں کے ساتھ دریائے ٹائبر کے کنارے اپنی حویلی میں گزار دی تھی جب کہ بیشتر مورخین اور جدید اسکالرز کا اس بات پر اتفاق ہے کہ 274ء میں آریلین کے جشنِ فتح کے موقع پر زینوبیہ کا جلوس نکالا گیا تھا لیکن مورخ زوسیمس واحد ذریعہ تھا جس کے مطابق ملکہ زینوبیہ روم پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ وہ اس سفر کے دوران بیمار پڑ گئی تھی کیونکہ وہ فاقے کرنے لگی تھی اور اسی حالت میں وہ موت کی بانہوں میں چلی گئی۔ بعض ذرائع کے مطابق اس نے

روم واپسی کے سفر کے دوران زہر کھالیا تھا۔ صرف ایک مؤرخ ملالاس کا بیان ہے کہ آریلین نے زینوبیہ کا سر قلم کردیا تھا جب کہ دیگر مؤرخین کا کہنا ہے کہ آریلین نے اسے بخش دیا تھا۔ تاریخ کے مطابق ملکہ زینوبیہ 274ء کے بعد اپنی حویلی میں وفات پا گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف چونتیس سال تھی لیکن اس کی موت کا کوئی سبب بیان نہیں کیا گیا ہے۔

☆......☆

الم ناک انجام سے قطع نظر زینوبیہ کی زندگی قدیم تاریخ میں بلاشبہ نہایت اہمیت کی حامل اور رنگا رنگ ہے۔ چودھویں صدی کے آغاز سے اب تک اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، نظمیں لکھی گئی ہیں اور ہالی ووڈ میں فلمیں بنائی گئی ہیں۔ وہ ایک نہایت دبنگ ملکہ تھی۔ شکار میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ تیر کمان سے شیروں کا شکار کیا کرتی تھی۔ وہ نہ صرف بلا کی شہ سوار تھی بلکہ امن میں ملک چلانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہ اس کی ذہانت اور دلیری کا بین ثبوت ہے کہ اس نے 267ء میں پالمائرہ کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، 269ء میں وہ مصر پر حملہ آور ہوئی اور اس نے اسے فتح کرلیا۔ اس کے بعد وہ اپنی سلطنت کو پھیلاتی چلی گئی۔ اس نے مصر کے علاوہ یونان سے لے کر ترکی، شام، عراق، لبنان گویا پورے ایشیائے کوچک پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس کی فتوحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ اس میں انتظامی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے اتنی وسیع سلطنت پر پانچ سال تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ اس کا نظم و نسق نہایت عمدہ تھا جس کی وجہ سے اس کے دور حکومت میں ہر طرف امن و سکون تھا اور خوش حالی تھی۔ اس کے برعکس روم انتہا درجہ کی بدحالی، بدامنی، خلفشار اور انتشار سے گزر رہا تھا۔ آریلین کے تخت نشیں ہونے تک آئے دن شہنشاہوں کو قتل کیا جاتا رہا تھا، روم کا سب سے بڑا دشمن خود روم تھا۔ آریلین بھی کچھ عرصے کے بعد اپنے جرنیلوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ زینوبیہ اپنی رعایا سے بہت ہمدردی سے پیش آتی تھی اور مذہبی اقلیتوں کا تحفظ کرتی تھی۔ وہ اپنے مثالی نظم و نسق کی بدولت ایک ایسے وسیع خطہ ارضی پر حکومت کرتی رہی جہاں بھانت بھانت کی تہذیبیں پنپ رہی تھیں، مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے رہتے تھے اور جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے لیے سب کو ساتھ لے کر چلنا ایک مشکل کام ہوسکتا تھا لیکن چونکہ زینوبیہ ملک شام میں پیدا ہوئی تھی اور اسی ماحول کی پروردہ تھی، لہٰذا اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ فلسفیوں اور دانشوروں کی شیدائی تھی اور ان سے رہنمائی حاصل کرتی تھی۔ اس کے دربار کا ماحول فلسفیانہ تھا۔ وہ رنگ و نسل اور مذہب میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اپنا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں جوڑا تھا۔ بہت سے مؤرخین نے اس کے مذہب کے حوالے سے خیال آرائی کی ہے۔ بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ یہودی تھی دیگر کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہودیت اختیار کرلی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مؤرخین کا اس بات پر بھی مکمل اتفاق ہے کہ زینوبیہ ایک مہذب ملکہ تھی۔ وہ فلسفیوں اور دانش وروں میں گھری رہتی تھی۔ اس کا دربار ان کے لیے کھلا رہتا تھا۔ وہ ان کا بے حد احترام کرتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اسے حکمرانی کا مزید موقع مل جاتا تو اس خطے کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ بعض مؤرخین نے اسے ایک باغی ملکہ قرار دیا ہے لیکن بیشتر مؤرخین نے اس الزام کو مسترد کردیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ زینوبیہ نے کبھی علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے رومن امپائر سے الگ اپنی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔ ملک شام میں آج بھی اسے ایک ہیرو کا مقام حاصل ہے۔ شام نے 1997ء میں اپنی اس ہیرو کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کرنسی نوٹ پر اس کی شبیہہ چھاپی تھی۔

پالمائرہ کے عظیم الشان محلوں کے کھنڈر پوری دنیا کی توجہ کا مرکز ہیں۔ یونیسکو نے ان کھنڈر کو عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا ہے۔ ملک شام کے ریگستان میں واقع یہ نخلستان ایک عظیم الشان شہر کے کھنڈر پر مشتمل ہے جو قدیم تاریخ کا ایک سب سے اہم ثقافتی مرکز ہوا کرتا تھا۔ بیس ہزار مربع میٹر کے رقبے پر دور دور تک پھیلے ہوئے محلات کے بلند و بالا ستون اور شہتیر ایک ایسا پُر جلال منظر پیش کرتے ہیں جس کی پوری دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے 2015ء میں ملکہ زینوبیہ کے اس فقید المثال آبائی شہر اور اس کے عظیم الشان محلات پر داعش نے دھماکے کرکے ان کے بہت سے حصوں کو تباہ کردیا جس پر مغربی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ 2017ء میں شام نے اس پر اپنا قبضہ بحال کرکے وہاں ملکہ زینوبیہ کا ایک مجسمہ نصب کردیا جو اس کے عہد رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔

●◆●

ستائیسواں حصہ

ندیم اقبال

یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ سفر نامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو خشک تھے۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفرنامہ

اسکالش گرلز کے جھرمٹ میں گھرے سر جی، شہباز، مطیع اللہ اور مفتی آگے بڑھ رہے تھے کہ سامنے سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر بازار میں افراتفری سی پھیل گئی۔ ہلکی سی بھگدڑ مچی لیکن فوراً ہی سب کچھ نارمل ہوگیا۔ بات یہ تھی کہ سیاحوں کا ایک گروپ جو کالوں پر مشتمل تھا۔ اس میں سے کسی نے کوئی ایسی حرکت کردی تھی جو چینی نژاد لڑکی کو بری لگی اور اس کی حمایت میں کچھ چینی آگئے۔ کالے جان بچا کر بھاگے تو بھگدڑ مچ گئی لیکن قانون کے ایک محافظ نے سب کچھ نارمل کرادیا۔ اس لیے کہ عوام قانون کا احترام جانتے ہیں اور قانون کے محافظ قانون پر چلتے ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہم بھی گھبرا اٹھے تھے لیکن پُرسکون تھے۔ بازار سے باہر جانے والے راستے پر چلتے ہوئے میں نے جولین سے کہا۔ ''غلامی کے بارے میں کچھ سنا ہے؟''

بولی۔ ''ہاں سناؤ۔''

''پہلے یہ بتاؤ کہ غلامی میں کتنے کردار ہوتے ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔''

''دو کردار ہوتے ہیں۔ ایک ماسٹر اور ایک غلام۔ ان کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایک کی نگاہیں اٹھی ہوتیں اور دوسرے کی اپنے قدموں میں۔ کہنے کو تو دونوں انسان ہیں مگر حسن اتفاق سے ایک افریقا میں پیدا ہوا اور دوسرا کہیں اور۔ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں جب آبادکار یورپ سے امریکا اور کینیڈا آئے تو وہ مقامی لوگوں سے پہلے لڑے۔ ریڈ انڈینز کے مختلف قبائل یہاں کروڑوں کی تعداد میں آباد تھے۔ وہ جنگ سے اور یورپین کی لائی ہوئی بیماریوں سے کروڑوں ہی کی تعداد میں مر گئے۔ ان کو بہت زیادہ غلام چاہیے تھے۔ ان کے پاس بحری بیڑے تو تھے ہی تو یورپین پھر بندوقیں اور توپیں لے کر افریقا میں جا گھسے۔ رات کو کسی افریقن بستی پر حملہ کرتے۔ بوڑھوں کو قتل کردیتے۔ جواں عورتوں اور مردوں کو پکڑ لیتے۔ بچوں کو وہیں چھوڑ دیتے۔ جوان لوگوں کو گرفتار کرکے نارتھ امریکا لے آتے۔ جیتے جاگتے انسانوں کے گلوں میں غلامی کا طوق پہنا دیا جاتا۔ غلاموں کے سوداگر انہیں نارتھ امریکا میں جانوروں کی طرح لیے پھرتے۔

جہاں اب لارنس مارکیٹ ہے، یہاں جانوروں کے علاوہ غلاموں کی بھی منڈی لگتی تھی۔'' یہ بتاتے ہوئے میری آواز بھرّا گئی۔ جولین بھی آزردہ ہو کر پتھرائی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے لیکن بات جاری رکھی۔ ''میں نے دو اشتہار دیکھے ہیں جو ان دنوں غلام منڈی کے باہر لگے ہوتے تھے۔ اشتہار میں ایک سیاہ فام اونچے اسٹیپ پر کھڑا ہوتا تھا۔ Winning step نہیں بلکہ Looser step پر، کندھے جھکے ہوئے، آنکھوں میں موت جیسی ویرانی، لٹکتے جھومتے بازو اور تصویر کے نیچے لکھا ہوتا کہ بولی سو ڈالر سے یا پانچ سو ڈالر سے اسٹارٹ ہوگی جو جسامت

میں قدرے مضبوط ہوتا، اس کی قیمت زیادہ ہوتی، اس طرح جس طرح ہم بکرے کو خریدتے ہیں، زیادہ تر یہ غلام مسلمان تھے۔ اب بھی سیہ فام لوگوں کے نام میں آمنہ، فاطمہ، عبداللہ اور زبیر آتا ہے مگر غلامی کی تیز دھار تلوار نے اس سے سب کچھ کھرچ ڈالا نہ ان کا مذہب رہا اور نہ شخصیت۔''

جولین کچھ اداس تھی، بولی۔ ''میں نے پڑھا تھا کہ غلامی زیادہ تر رومن دور اور یونان میں ہوتی تھی۔ مسلمانوں میں بہت کم تھی اور دوسرا ان کے مذہب نے آہستہ آہستہ غلامی کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں میں جب غلامی ختم ہو رہی تھی تو یورپ میں شروع ہو رہی تھی۔''

وہ صحیح تجزیہ کر رہی تھی۔ مجھے اس میں منافقت یا تعصب نہیں دکھائی دیا۔ میں نے اس کی تائید کی اور کہا۔ ''یہی اصل تاریخ ہے۔ جب مسلمانوں نے تہذیب و تمدن حاصل کر لیا تھا تو اس وقت بھی یہ سب سیکھنے کے مراحل میں تھے۔'' میں نے اسے بتایا۔''افریقا میں مقامی طاقت ور گروہوں نے اپنے ہی لوگ پکڑ پکڑ کر یورپین کو بیچنے شروع کر دیے۔ پچاس لاکھ افریقی تو صرف امریکا میں پکڑ کر لائے گئے۔ کینیڈا اور یورپ میں بھی بے تحاشا لائے گئے تھے۔ یہ لوگ صبح سے شام تک گنے، کافی، تمباکو اور کاٹن کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ سونے اور کوئلے کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ رات میں لکڑی کے ایک کیبن میں انہیں رکھا جاتا۔ بارہ بارہ مرد اور عورتیں ایک ہی کیبن میں ہوتے۔ ان کو شادی کرنے کی اجازت نہ تھی اس لیے انہوں نے بغیر شادی کے اپنی ضرورتیں پورا کرنی شروع کر دیں اور بے تحاشا بچے پیدا ہونے لگے۔ خاندانی نظام تہہ و بالا ہو گیا۔ آج ایک عورت کسی ایک سے آنکھ لڑاتی تو کل کسی اور سے اور یہی رسم چل نکلی تو آج تک ختم نہ ہوئی۔ وہ کمرے میں سردیوں کی برف زدہ راتوں میں صرف ایک کمبل میں سوتے، لکڑی کی دیواروں کے درزوں سے سردی اندر آتی تو یہ پوری رات کپکپاتے رہتے۔ یہ شادی کر سکتے نہ جایداد خرید سکتے تھے۔ ان کی عدالت میں گواہی بھی نہیں تھی۔ یہ ان علاقوں میں بھی نہیں جا سکتے تھے جہاں گورے ہوتے تھے۔ پچھلی صدی کی ساٹھ کی دہائی تک ان کی بستیوں میں سنیما گھر اور اسٹیڈیم میں سیٹیں بھی علیحدہ ہوتی تھیں۔ انہیں سال میں دو لباس ملتے اور ایک جوتا، یہ ان کی کل جایداد تھی۔''

''اور پھر ابراہم لنکن نے 1861ء میں غلامی کو غیر قانونی قرار دیا۔ ساؤتھ کی ریاستوں میں غلام زیادہ تھے تو

پھر شمالی اور جنوبی ریاستوں میں اسی غلامی کے مسئلے پر سول وار ہوئی۔ نارتھ کی اباسین جیت گئیں جن کو ابراہم لنکن لیڈ کررہا تھا۔" جولین نے یہ بات بتائی۔

"ہاں تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے اور آج انہی غلاموں کی نسلوں نے وہی غلامی کا زہر اپنے اندر رکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

ہم اسی دوران ایٹن سینٹر پہنچ چکے تھے۔ ہمارے ساتھی پیچھے تھے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام نوجوان جس کے گلے میں سفید لاکٹ تھا، چرمی جیکٹ اور سر پر ٹوپی، مجھے دھکیلتا ہوا ایٹن سینٹر کے دروازے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔

میرا اندازہ یقین میں بدل گیا کہ ان کے اندر غم، غصہ اور انتقام ابھی تک بھرا ہوا ہے۔

"واقعی یہ نارتھ امریکا کی تاریخ کا ایک بڑا انسانی المیہ تھا مگر اس پر بہت کم بات ہوتی ہے۔" جولین بولی۔

میں نے کہا۔ "اور نہ کبھی ہوگی یہاں کروڑوں ریڈ انڈینز جانوروں کی طرح مار دیئے گئے۔ سب بھول گئے۔"

جولین چونک کر بولی۔ "ہم نے تو لارنس ہال دیکھنا تھا؟"

"باتوں میں یاد ہی نہ رہا، حالانکہ راستے میں آیا تھا اگر کہو تو واپس جا کر دیکھ لیں۔" میں بولا۔

جولین نے کہا۔ "سیاحت کا بڑا اصول یہ ہے کہ ہمیشہ آگے بڑھتے رہیں۔"

"اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ ایک بار پیچھے مڑے تو واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔

اتنے میں ہمارے ساتھی بھی باتیں کرتے آپہنچے۔ ایک لڑکی سرجی سے کہہ رہی تھی۔ "آپ میرا ہاتھ کب دیکھیں گے؟"

وہ بولے۔ "سب کا ہاتھ دیکھوں گا۔ پر کہیں ٹک کر بیٹھیں تو سہی۔"

میں نے شہباز سے پوچھا۔ "یہ ہاتھ دیکھنے والی کیا کہانی ہے؟"

وہ بولا۔ "مطیع اللہ نے جو کہہ دیا تھا کہ انہیں پامسٹری آتی ہے تب سے یہ سب ان کے پیچھے پڑی ہیں اور روحانی علم کے بارے میں بھی جاننا چاہتی ہیں۔"

جولین میرے کان میں بولی۔ "یہ واقعی پامسٹری جانتے ہیں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "بالکل بھی نہیں جانتے، مجھے خدشہ ہے کہ اپنا پول خود ہی نہ کھول دیں۔"

وہ بھی ہنس پڑی اور بولی۔ "تب تو مزہ نہیں آئے گا۔ جھوٹی سہی مگر اچھی یادیں لے کر تو واپس جائیں گے۔"

ہم ایٹن سینٹر میں داخل ہوئے۔ بڑا دروازہ جس پر رش تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ بھی سیاح تھے اور بھی اتنے خوش تھے۔ ہر دکھتا چہرہ پُرمسرت تھا۔ لڑکیوں نے طرح طرح کے فیشن کیے ہوئے تھے۔ ہمارے دائیں جانب زنانہ کپڑوں کا ایک بڑا اسٹور تھا۔ سب لڑکیوں نے ادھر ہی کا رخ کیا۔

میں نے سب کو روکا اور کہا۔ "ہم یہاں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے گزار سکتے ہیں۔ ابھی شام کے چھ بجے ہیں اور آٹھ بجے ہم نے ییتھن فلپس اسکوائر جانا ہوگا۔ اگر آپ ہر شاپ میں جائیں گی تو ہم وہاں وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔"

لڑکیوں نے آپس میں بات کی اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ باقاعدہ شاپنگ بعد میں کریں گی اور آج صرف جائزہ لیا جائے گا۔

اگر میں یہ نہ کہتا تو لڑکیوں نے سارا وقت مال میں گزار دینا تھا اور خریداری بھی شاید نہیں کرنی تھی۔

ہم مال میں داخل ہوئے تو سب لڑکیوں سمیت ہمارے منہ سے واؤ نکلا۔

ابھی تک میں ایک دو مال دیکھ چکا تھا مگر یہ تو مال نہیں پورا شہر آباد تھا۔ میں شروع میں آیا تو مفتی مجھے اسکاربرو ٹاؤن سینٹر لے گیا تھا مگر ایٹن سینٹر میں اس جیسے کئی مال سما سکتے تھے۔

ہم سے زیادہ اسکاش لڑکیاں محوحیرت تھیں کہ اتنا بڑا شاپنگ مال بھی ہوسکتا ہے۔ دراصل یورپ کے مال نارتھ امریکا کے شاپنگ مالوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہاں مالوں سے زیادہ روڈ یا اسٹریٹ پر دکانوں کا زیادہ رواج ہے۔ یہ مال تو ڈاؤن ٹاؤن میں ہے اور لوگ سب وے سے باآسانی یہاں پہنچ سکتے ہیں ورنہ ایسا مال کہیں ڈاؤن ٹاؤن کے باہر ہوتا تو مال سے تین گنا زیادہ پارکنگ کا ایریا مختص کرنا پڑتا۔ اس مال کی وسعت دیکھ کر میں خود دم بخود تھا۔

آٹھ منزلہ شاپنگ مال میں نیچے کے چار فلور ریٹیل شاپس کے لیے مخصوص تھے اور اوپر دفاتر تھے۔

ہم ایک بڑے اور طویل صحن میں تھے جہاں بہت

اوپر شیشے کی گول چھت تھی۔ رنگ برنگے فرش اور در و دیوار جن میں اپنا عکس بھی نظر آتا تھا۔ دو جانب فلور در فلور اور ایک لائن میں شیشوں کے پیچھے سجی سجائی دکانیں تھیں جن کے اندر اور باہر بھی رش تھا۔ چھت سے کرسٹل کی بڑی بڑی مچھلیاں اور پرندے لٹک رہے تھے۔ روشنی ایسی کہ اگر رات ہو تو دن کا سماں نظر آئے۔ قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ جگہ جگہ خوش نما پودے اور چھوٹے درخت بڑے بڑے گملوں میں ایستادہ تھے۔ جا بجا فوارے چل رہے تھے اور شفاف تالاب جن کی تہہ میں بے تحاشا سکے پڑے تھے۔

اس کاریڈور میں جہاں ہم کھڑے تھے اس کے سائیڈوں پر بینچ رکھے تھے۔ بیچ میں اسٹال لگے تھے جہاں فائن جیولری، پرفیوم اور چھوٹا چھوٹا سامان بک رہا تھا۔ بڑے بڑے ستونوں نے مال کی شان میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں کسی بھی شاپ کو ڈھونڈنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے اسی لیے جگہ جگہ کسٹمر سروس تھی۔ مال کے نقشے بنے تھے، جہاں نمبروں کے نیچے دکان کا نام لکھا تھا۔ آپ نقشے کی مدد سے باآسانی اپنے مطلوبہ اسٹور میں پہنچ سکتے ہیں۔

مال میں سبزی گوشت اور گروسری کے علاوہ ہر شے کی دکان تھی۔ میں دکان کہتا تو مفتی مجھے کہتا کہ شاپ کہو۔ دکان سے شاپ کا تاثر خراب ہوتا ہے۔

ہم فرسٹ فلور پر تھے اور نیچے بیسمنٹ میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ زیادہ تر دکانیں یعنی شاپس برانڈڈ چیزوں کی تھیں۔ ملبوسات، الیکٹرونک، جیولری، جوتے، ڈیکوریشن، گفٹ، کھلونوں وغیرہ کی شاپس کی بھرمار تھی۔ فوڈ کورٹس بھی بنے تھے جہاں لوگ رنگین میز کرسیوں پر صاف ستھرے ماحول میں کچھ کھاتے پیتے نظر آرہے تھے۔

ہم سب تو کچھ دیر کے لیے اسی ماحول میں کھو گئے۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر کسی کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ بھڑ کیلے اور نام نہاد لباس پہنے لڑکیاں خوشبوئیں بکھیرتی پاس سے گزر جاتی تھیں۔ اسکاٹ لینڈ کی لڑکیاں بھی حیرت سے یہ چہل پہل دیکھ رہی تھیں۔

ہم تذبذب میں تھے کہ دائیں جانب سے شروع کریں یا دوسری طرف سے۔ ہم تو صرف گھومنے آئے تھے اس لیے کہیں سے بھی ونڈو شاپنگ شروع کرتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کچھ کہتے اِدھر سے اور کچھ کہتے اُدھر سے۔ آخر سرجی اور میکی بائیں جانب برآمدے میں بڑھے تو ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔

جا بجا برقی زینے اور لفٹیں سیاحوں کو اوپر نیچے متواتر لاتی جارہی تھیں۔

سرجی بولے۔ ''اوپر چلیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

وہ بولے۔ ''سیر ہو جائے گی۔''

خان بولا۔ ''سرجی! بھٹکیں نہیں۔ اب آپ لیڈ نہ کریں بلکہ لڑکیوں کو فالو کریں۔''

خان کا مشورہ مفید تھا اور پھر ہم نے لڑکیوں سے کہا۔ ''آپ لوگ جہاں جانا چاہیں، ہم سب آپ کے پیچھے پیچھے ہیں۔''

جتنے بھی اسٹور تھے ان کے نام مشکل سے تھے پھر سینکڑوں نام یاد رکھنا بھی مشکل تھا۔

لارنس مارکیٹ میں ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا کو کھانے پینے کا شوق ہے اور یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ ساری دنیا نت نئے فیشن پر ٹوٹی پڑی تھی۔

وہاں گھومتی پھرتی عورتوں اور لڑکیوں نے فیشن میں اپنے آپ کو رنگا ہوا تھا۔ کوئی اسکرٹ میں ہے تو کوئی شارٹس میں اور کچھ نے پینٹس پہنی ہیں۔ اوپر فیشن کے لیے بنیان پر کوئی دیدہ زیب جیکٹ ڈالی ہے۔ بال کھلے ہوں یا بند، دونوں میں دلکش نظر آتی تھیں۔ میک اپ تھیں، خوشبوؤں میں رچی بسی اور اداؤں میں بجلیاں گراتی چلی آتی تھیں۔ شہباز نے کہا کہ اتنی حسین لڑکیاں ہیں کہ آتے بھی اچھی لگتی ہیں اور جاتے بھی۔

مطیع نے شہباز سے کہا۔ ''شرم کرو، آنکھوں کا بھی روزہ ہوتا ہے۔''

مفتی بولا۔ ''روزے تو سات ماہ بعد ہیں۔''

مطیع بولا۔ ''حیا اور شرم کی عادت ابھی سے ڈالیں گے تو روزوں میں پچھلی بار کی طرح مشکل نہیں ہوگی۔''

معلوم نہیں پچھلی بار اسے کون سی مشکل درپیش آئی تھی مگر اب سرجی میکی سے نظریں بچا کر ارد گرد زیادہ دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''سرجی، اپنا تاثر خراب نہ کریں ورنہ یہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔''

سرجی بے بسی سے بولے۔ ''اسی لیے تو میں خواتین کے ہمراہ شاپنگ پر نہیں جاتا۔ دیکھنے کا لطف بھی ختم ہو جاتا ہے۔''

اب ہم برآمدے میں گھوم رہے تھے۔ ہر فلور کی

ریلنگ سے لوگ جھکے نیچے چلتے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور نیچے والے اوپر والوں پر خوش ہو رہے تھے۔

ہمارے ساتھ لڑکیاں کسی دکان میں داخل ہوتیں، اشیاء دیکھتیں، قیمتیں جانچتیں اور تبصرے کرتی نکل آتیں تو ہم بھی ان کے ساتھ دکان سے باہر آجاتے۔ وہ بتا رہی تھیں کہ یورپ میں چیزوں کا معیار بہتر ہوتا ہے اور قیمت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

جولین نے مجھ سے کہا۔ ''جیولری شاپ سے میں نے کچھ خریدنا ہے، اجازت ہے؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''شوق سے خریدو، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

ہم ایک جیولری شاپ کے سامنے کھڑے تھے۔ سرجی بھی میگی کے پیچھے اس جیولری شاپ میں لڑکیوں کے ساتھ گھس گئے تھے۔

جولین بولی۔ ''آپ نے کسی کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا؟''

میرے ذہن سے یہ خیال چپکا تھا کہ نسرین ہر بار میرے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے، میرے کپڑے، شیونگ کا سامان، علیحدہ تولیہ اور روزانہ ضرورت کی چیزیں وہ خرید کر لاتی ہے تاکہ جب میں اس کے گھر جاؤں تو مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ یہ نہیں کہ میں بدلے میں کچھ دینا چاہتا تھا۔ میں اس لیے کچھ دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کا حق رکھتی تھی۔

جولین سے میں نے کہا۔ ''اگر کچھ پسند آیا تو لے لوں گا۔''

اس نے مجھے جیولری شاپ میں چلنے کا اشارہ کیا اور میں نے اس کی تقلید کی۔

بے تحاشا روشنیوں میں شوکیسوں اور الماریوں میں رکھے چاندی کے زیورات اور نگینے جگمگا رہے تھے۔ ان پر نظر بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔ جگمگ کرتے نیکلس، کانوں کے ٹاپس اور دوسرے زیورات بھرے پڑے تھے۔

سرجی کے علاوہ تمام لڑکیاں وہاں موجود تھیں۔ وہ بڑے شوق اور جوش سے جیولری دیکھ رہی تھیں۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی بھی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ بڑھ بڑھ کر نیکلس، انگوٹھیاں وغیرہ نکال نکال کر انہیں دکھا رہی تھی۔

اب میگی کوئی نیکلس اٹھا کر گردن کے نیچے لگاتی اور سرجی کی ''ماہرانہ رائے'' طلب کرتی۔ سرجی نیکلس کے سامنے اسے بغور دیکھتے رہے اور ہونٹ بھینچ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تو میگی کوئی دوسرا نیکلس اٹھا لیتی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں سرجی ادائیگی کرنے پر اصرار نہ کرنے لگ جائیں۔

سیل گرل بھی اتنے سارے گاہک دیکھ کر کسی کو خالی نہیں لوٹانا چاہتی تھی۔ وہ ہر سیٹ پر پچاس فیصد کی رعایت بھی دے رہی تھی۔ بقول جولین قیمت بھی بہت مناسب تھی۔

ادھر سرجی راضی ہی نہیں ہو رہے تھے۔ سیل گرل میگی کے بجائے اب انہیں قائل کرتی نظر آرہی تھی۔ وہ مسکرا کر ایک ادا سے سرجی کو سیٹ دکھاتی اور سرجی مسرور ہو کر اسے مسکراہٹ واپس کرتے اور پھر ہار نکال کر خود ہی میگی کے گلے سے لگا کر جائزہ لینے لگتے۔ تادیر میگی کے گلے سے لٹکے رہتے اور پھر نفی میں سر ہلا کر کوئی دوسرا ہار اٹھا لیتے۔

میں نے سرجی سے کہا۔ ''اپنی اصل محبت کے ساتھ بھی اسی طرح وصال کی لذتوں سے مخمور رہا کرتے تھے؟''

ان کے چہرے پر محبت کا ایک رنگ ابھر آیا اور پُرسوز لہجے میں بولے۔ ''اس کا آہنی دل میرے جذبہ سوز دروں سے پگھل گیا ہے۔ لگتا نہیں کہ یہ حسینہ مہ جبین مجھے اتنا چاہے گی۔''

میں نے کہا۔ ''سرجی! ہوش میں آئیں اور وہاں اگر آپ نے ادائیگی کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

انہوں نے میری سنی ان سنی کر دی اور ایک نیا ہار لے کر دوبارہ اس کے گلے سے جھول گئے۔ میں نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

مجھے گہرے سبز موتیوں سے چمکتا چاندی کا ایک ہار اور ٹاپس پسند آئے اور میں نے وہ سیٹ سائیڈ پر رکھ دیا۔

میگی نے آخر کار فیصلہ سناتے ہوئے سرجی کو ایک سیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ بہت پسند ہے۔''

سرجی۔۔۔ آخری بار اس کے گلے سے تادیر لگے رہے اور پھر میگی کی تائید میں سر ہلا دیا۔

اب لڑکیوں نے سیل گرل سے قیمتیں اور زیادہ کم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ کہتی تھیں کہ پانچ سیٹ خرید رہے ہیں تو کم از کم ساٹھ فیصد رعایت ہونی چاہیے۔ مجھے یقین کی حد تک امید تھی کہ وہ ساٹھ کیا ستر فی صد رعایت پر بھی دے دی گئی اور یہی ہوا کہ وہ ساٹھ پر فوراً مان گئی۔ ہم سب نے اپنی اپنی ادائیگی کی اور صرف سرجی نے میگی کے
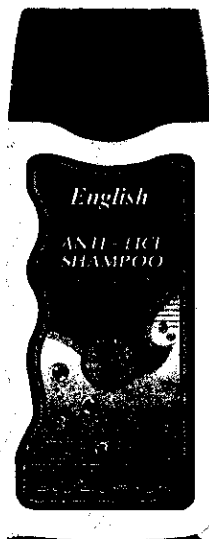
پارک ادائیگی مجھ سے نظریں چرا کر کی۔ میں گھورتا رہ گیا اور وہ سولی چڑھ گئے۔

لڑکیاں سرجی کی سخاوت پر بہت مرعوب نظر آرہی تھیں اور میگی پھولے نہیں سمارہی تھی۔

میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے میگی سرجی کو اچھی لگنے لگی ہو اور میگی کو بھی سرجی کی کوئی ادا بھا گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو کوئی تحفہ دینا کیوں کر برا ہوگا مگر مجھے وہ واقعہ بھی یاد آجاتا جب سرجی نے کینن سینٹر میں ایک چینی لڑکی کو خوامخواہ میں مہنگا پرفیوم تھما دیا تھا اور خود اس سے چاکلیٹ لے آئے تھے۔

یہ نارتھ امریکا کا سب سے بڑا مال اس طرح بھی ہے کہ سالانہ کروڑوں لوگ اسے دیکھنے اور شاپنگ کرنے آتے ہیں۔ اس تعداد سے زیادہ اس کا وزٹ کرتے ہیں جتنے ڈزنی ورلڈ (فلوریڈا) اور ڈزنی لینڈ (لاس اینجلس) دونوں کو ملا کر دیکھنے آتے ہیں۔ میں ڈزنی ورلڈ اور ڈزنی لینڈ دونوں کو دیکھ چکا ہوں۔ اپنے قارئین کو یہ اندازہ دینا چاہتا ہوں کہ ڈزنی ورلڈ کے چار پارکس ہیں۔ چاروں ایک دوسرے سے جڑے ہیں اور ایک سے دوسرے پارک جانے کے لیے ٹرین چلتی ہے۔ ڈزنی ورلڈ کا صرف ایک پارک جو ایپکاٹ کے نام سے مشہور ہے اس کی پارکنگ ہر وقت بھری رہتی ہے۔ اس کی پارکنگ اتنی بڑی ہے کہ مجھے پارکنگ شاید درمیان میں ملی تھی اور مین گیٹ تک جانے کے لیے ہم نے بس لی تھی۔ اب پڑھنے والے خود اندازہ لگالیں کہ ہر روز ایٹن سینٹر کو کتنے لوگ وزٹ کرنے آتے ہوں گے۔

ہم برآمدوں میں چلتے روشن چمکتی ہوئی شاپس کے اندر جھانک رہے تھے۔ ہر شاپ کے اندر ایک ہجوم تھا۔ لڑکیاں کسی شاپ میں بھی جاتیں اور واپس تبصرے کرتی برآمد ہوتی تھیں۔ میں نے شہباز اور مطیع سے کہہ دیا تھا کہ جب بھی لڑکیاں کسی شاپ میں جائیں تو سرجی کو آپ لوگ زبردستی روکے رکھیں۔

خان قیصر نے سرجی سے ایک دفعہ پوچھا جب لڑکیاں کسی ملبوسات کے شوروم میں گئی تھیں۔ ”میگی میں کیا ملتا ہے آپ کو جو اس کے ساتھ نتھی ہوگئے ہیں۔“

مطیع بولا۔ ”ان دونوں کو شاید پہلی بار کسی نے لفٹ کرایا ہے۔“

سرجی بولے۔ ”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ محبت کے دشت میں ہمارے بھی گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”وہ پھر گھنٹوں بعد آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی۔ پھر کیا اس کے پیچھے اسکاٹ لینڈ جائیں گے۔“

”جب آپ لوگ اس کی جدائی کی بات کرتے ہیں تو میرا کلیجہ کٹ جاتا ہے۔ اس کی جدائی کا سوچ کر۔ میرا قلب ضعیف لرزنے لگتا ہے۔“ سرجی روہانسے ہوگئے تھے۔

مطیع پھڑک کر بولا۔ ”یہ پھر سے محاورے بولتی ہے۔ اس خانہ خراب کو بولا بھی تھا کہ بازاری اردو بولو مگر یہ ہم سے بھی کتابی اردو بولتی ہے۔“

سرجی بولے۔ ”اس نشاط کی کیفیت میں میری دماغی حالت دگرگوں کرنے پر آپ لوگ تلے ہیں۔ آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ جب اس کے دریائے محبت کی کوئی موج میرے اندر کے شعلوں پر پڑتی ہے تو بے قرار دل کو چین ملتا ہے۔“

شہباز جلا کر بولا۔ ”تیرا بیڑا ترے سرجی۔ یہ سیاپا پہلے تو نہیں دیکھا میں نے اور یہ کیا دگرگوں دگرگوں لگا رکھی ہے اور کس دنیا کی بات کررہے ہیں جہاں نہانے سے چین ملتا ہے۔“

”جس طرح پتھر میں جونک نہیں لگتی اسی طرح شہباز کا سنگِ دل موم نہیں ہوگا۔“ سرجی کو غصہ آرہا تھا۔

اس سے پہلے بات بڑھتی کہ لڑکیاں اسٹور سے نکل آئیں اور سرجی کی نظریں میگی کے صحت مند چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

سب خالی ہاتھ تھیں مگر بے حد خوش دکھائی دیتی نظر آتی تھیں۔ میں بھی کسی نہ کسی اسٹور میں چلا جاتا مگر اتنے بڑے اسٹوروں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایسی چیز نہ ملتی جو اپنے مطلب کی ہو۔

آگے ایک بڑا فوارہ آیا۔ بیچ میں اونچائی پر پانی پھینکتا فاؤنٹین اور اردگرد اس کے چھوٹے چھوٹے فوارے تھے۔ شفاف پانی کے تالاب میں ان گنت سکے پڑے تھے۔ وہیں بہت سے ٹورسٹ بیٹھے کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ کوئی سکے ڈال رہا تھا اور کوئی ان کو دیکھے جارہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ جوڑا قریب بیٹھا اوپر کے فلور سے ریلنگ سے ٹیک لگائے لڑکیوں سے بات کررہا تھا۔ غالباً وہ ایک ساتھ آئے تھے اور خود تھک کر اشاروں سے بات کررہے تھے۔ ایک چھوٹی

خوب صورت بچی تالاب میں سے سکے اٹھانے کی کوشش کرتی تھی اور ماں اسے پیچھے سے جکڑی ہوئی ہنس رہی تھی۔ ایک لڑکا لڑکی بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش مگر گاہے بگاہے ایک دوسرے کو چوم لیتے تھے۔ چاروں طرف سے قہقہے تھے، خوب صورت اور بے فکر چہرے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر چل رہے تھے۔ سرجی نے درخواست کی کہ میکی تھک گئی ہو گی ذرا دیر کو ستالیں۔

پھر جس کے ہاتھ جو بھی آئی اس کے ہمراہ اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ سرجی میکی کے ہمراہ اسی کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مجھے غصہ آیا کہ سرجی اتنے کھل گئے ہیں کہ ہمارے سامنے ہی ہاتھ تھامے بیٹھ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں ہتھیلی پر تلاش کر رہے ہیں۔ میکی کا پھیلا ہاتھ ایسے تھا کہ کسی نوزائیدہ بچے کا چھوٹا سا سفید اجلا تکیہ ہو۔ سرجی کو میکی کا ہاتھ پکڑے جب دیکھا تو سب کے ہمراہ بیٹھی لڑکیاں پھڑ پھڑا کر اڑیں اور سرجی کے گھونسلے پر جا بیٹھیں۔ اب سب کے ہاتھ سرجی کے سامنے کھلے تھے مگر جولین ٹس سے مس نہ ہوئی کیونکہ اسے سرجی کی اصلیت کے بارے میں معلوم تھا۔

اب بہت سی عریاں ٹانگیں اور لشکارے مارتے چہرے سرجی کو گھیرے ہوئے تھے اور بیچ میں سے ان کی آواز آئی تھی۔ ”ایک ایک کر کے ایک کر کے۔“

مفتی کہنے لگا۔ ”جسے ہم سادہ اور قناعت پسند سمجھتے تھے۔ سارا میلہ تو اسی نے ہماری آنکھوں کے سامنے لوٹ لیا۔“

”شہباز مطیع اللہ سے کہنے لگا۔ ”تم ہی نے ایسی کہانی سنائی کہ سب تتلیاں سرجی کے گرد منڈلانے لگیں۔“ پھر کہنے لگا۔ ”کس نے کہا تھا کہ تم سے کہ انہیں بھوت اور انسان کے بیچ کوئی مخلوق بنا کر پیش کرو۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”کھوتو بازی پلٹ بھی سکتی ہے مگر آج سرجی کی خاطر صبر کے چند گھونٹ بھر لو۔“

ادھر سرجی کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لڑکیوں میں گھرے تھے اس لیے شکل تو نظر نہیں آرہی تھی مگر فقرے کچھ یوں تھے۔

سرجی۔ ”بچپن میں ایک بار بیمار ہوئی، اور ماں بہت پریشان ہو گئی تھی۔“

میکی۔ ”ہاں جب میں گریڈ تھری میں تھی۔ میں نے شاید بہت کھالیا تھا اور پیٹ میں ورم آگیا تھا۔“

سرجی۔ ”سوچتی بہت ہیں آپ۔“

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم پاکستان میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور ہماری مادری زبان اردو کہلاتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنی اس اردو زبان سے نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں اور دن بدن ہم کو یہ احساس مارے ڈال رہا ہے کہ ہم کو ابھی اردو زبان سیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ نیز یہ انکشاف بھی ہوتا جا رہا ہے کہ ہم اپنی زبان میں اگر بالکل نہیں تو بھی کافی حد تک کورے واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ بعض الفاظ کا الٹ پھیر ہماری باتوں کو نہ صرف مضحکہ خیز بنا دیتا ہے بلکہ بعض اوقات نوبت لڑائی جھگڑے تک بھی جا پہنچتی ہے اور ہم اپنی اس ٹوٹی پھوٹی اردو میں نادانی کے باعث کئی دفعہ ایسی سنگین غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ سامنے والا شخص ہمارے جملے سن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس آج کل کی اردو سے ہم کو کما حقہ واقفیت کا ہونا لازمی عنصر بن چکا ہے، مثلاً حال ہی میں ایک صاحب نے دوران ملاقات کچھ اس طرح کی گفتگو کی جو نہ صرف ہمارے چھوٹے سے ذہن کے اوپر سے گزر گئی بلکہ ہم کو سچ مچ اپنی زبان دانی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یار آج کل میں نے بڑی کھٹ راکیں پال رکھی ہیں اور پھر اوپر سے لوگ مجھے الگ مفت کی پھکیں بھی بلاوجہ دے جاتے ہیں۔ تو ہم کو اپنی اس اردو دانی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔

مرسلہ: قرۃ العین حیدر۔ اقراء سٹی، کراچی

میکی۔ ”ہاں لیکن اتنا بھی نہیں۔“

سرجی۔ ”نہیں میں دوسری لڑکی کو کہہ رہا ہوں۔“

دوسری لڑکی۔ ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں نکل جاتی ہوں۔“

سرجی۔ ”دو لڑکے زندگی میں آئے تھے مگر دونوں دھوکے باز نکلے۔“

میکی۔ ”ایک تھا دو نہیں، وہ بھی گھبرا گیا تھا۔“

سرجی۔ ”نہیں، میں دوسری سے کہہ رہا ہوں۔“

دوسری لڑکی۔ ”بالکل دو تھے۔ ایک دھوکے باز تھا اور دوسرے کو میں نے خود چھوڑ دیا تھا۔“

سرجی۔ ”زندگی بہت حسین ہے۔ جب بھی یہ موقع دے فائدہ اٹھالیں۔“

میکی۔ ''موقع تو میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔''
سرجی۔ ''یہ میں خود سے کہہ رہا ہوں۔''
میکی۔ ''اوہ اچھا۔''
سرجی۔ ''آپ اتنا پریشان کیوں رہتی ہیں؟''
''میکی۔ ''مجھ سے کہہ رہے ہیں۔''
سرجی۔ ''ہاں آپ سے۔''
میکی۔ ''میرا وزن بڑھتا جارہا ہے۔ صرف یہی پریشانی ہے۔''
سرجی۔ ''آہستہ آہستہ گھٹ جائے گا۔''
پہلی لڑکی۔ ''ہاتھ دیکھیں، نصیحتیں نہ کریں۔''
سرجی۔ ''آ بہت جلد آپ کی زندگی میں بہت بڑی خوشی آنے والی ہے۔''
میکی۔ ''میری زندگی میں؟''
سرجی۔ ''آپ کی زندگی میں تو آچکی ہے۔ میں دوسری سے کہہ رہا ہوں۔''
پھر ایک اور لڑکی نے پہلی لڑکی کو سائیڈ پر کیا اور سرجی کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ تھما دیا۔
کچھ دیر بعد سرجی بولے۔ ''آپ تو بہت خوش نصیب ہیں۔''
میکی۔ ''مجھے کہہ رہے ہیں؟''
سرجی۔ ''آپ کے علاوہ کوئی اور بھی تو خوش نصیب ہوسکتا ہے۔''
دوسری لڑکی۔ ''آپ یہ بتائیں کہ میری ڈگری وقت پر مکمل ہوجائے گی۔''
'' سرجی شاید اس کے ہاتھ زور سے مسل رہے تھے اسی لیے کہہ رہی تھی ذرا آہستہ......''
سرجی بولے۔ ''کرتوت ٹھیک رہے تو ہوجائے گی۔''
دوسرلڑکی۔ ''کیا مطلب!''
سرجی۔ ''یعنی پوری توجہ پڑھائی کی طرف رکھو۔''
دوسری لڑکی۔ ''یہ تو میرے ڈیڈ بھی مجھے کہتے ہیں۔''
سرجی نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر پہلی کا دوبارہ تھام لیا۔
میں پوری توجہ سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی شاپنگ مال کی خوب صورتی پر بات کررہے تھے۔

سرجی کا یہ ڈراما تب ختم ہوا جب ایک لڑکی سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ان کے سر پر آکھڑی ہوئی۔ میں ڈر گیا کہ کوئی پولیس کا انڈر کور ہے اور ابھی سرجی دھوکا دہی کے الزام میں دھر لیے جائیں گے۔
ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی۔ ''آپ لوگ تورست (ٹورسٹ) ہیں؟'' یہ بول کر جلترنگ بجاتی ہنسی ہنستی گئی۔
میں اتنی خوب صورت ہنسی سن کر متوجہ ہوا۔ ایک نہایت حسین لڑکی، کھلے سیاہ بال، سیاہ چمکتی آنکھیں اور اجلی رنگت والی سرجی یا لڑکیوں سے پوچھ رہی تھی۔ سیاہ اسکرٹ پر سیاہ قمیص پہنے نہایت جاذب نظر رکھتی تھی۔ میرے ساتھ جولین بھی ادھر متوجہ ہوگئی۔
اس کے کندھے سے لٹکتا ایک سیاہ چرمی بیگ اور گلے میں کیمرا لٹکا تھا۔
سرجی گھبرائے تھے ایسے کہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔ لڑکیوں کے چہرے پر سوالات تھے۔
میں نے کہا۔ ''آدھے کینیڈین اور آدھے اسکاٹ لینڈ کے ٹورسٹ ہیں۔''
وہ متواتر مسکرائے جاتی تھی۔ کچھ لوگوں میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ چہرے سے نظریں نہیں ہٹتیں۔ ہم سب کی یہی حالت تھی۔
وہ بولی۔ ''میرا نام جاناں ہے۔''
نام سن کر میں چونک گیا۔ سادہ اور جانا پہچانا نام تھا۔ جان، جاناں، جانو، جانی وغیرہ تو ہر پاکستانی نے ضرور سنا ہو گا۔

خان بولا۔ ''بہت ہی خوب صورت نام ہے۔''
جواب میں وہی مختصر مگر دل لبھاتی ہنسی سنائی دی۔ وہ بولی۔ ''میں یوکرائن سے آئی ہوں۔ ٹورسٹ ہوں اور رائٹر بھی ہوں۔ سفر کرتی ہوں اور کتاب لکھتی ہوں۔ مختلف سیاحوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی ہوں اور پھر کتاب میں لکھتی ہوں۔''
یہ کہہ کر اس نے ایک کتاب بیگ سے نکالی۔ ان کی اپنی زبان میں تھی تو اسی لیے سب نے ایک نظر دیکھ کر اسے لوٹا دی۔ ایک لڑکی نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ ہمارے درمیان ہی بیٹھ گئی اور پھر ایسا لگا کہ محفل میں شمع روشن ہوگئی ہو۔
اس کے حسن کو اس کی انگریزی نے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ ٹورسٹ کو تورست کہتی تھی۔ بلڈ کو بلاد اور ٹورنٹو کو تورنتو۔
وہ بولی۔ ''میں اپنے قمرا (کیمرا) سے آپ لوگوں کی ایک تصویر اتار لوں۔''
میں نے لڑکیوں سے پوچھا تو انہیں بھی ہماری طرح کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں نے جاناں سے کہا کہ تم بیٹھو۔ میں

تصویر لیتا ہوں۔

وہ پھر سے ہنسی اور کیمرا مجھے پکڑا دیا۔ تھوڑا سا سمجھایا اور میں نے تصویر کھینچ لی۔

دوبارہ ہنس کر بولی۔ ''لوٹ آف تھینکس۔ لوٹ آف تھینکس۔''

پھر بولی۔ ''کینیڈین کون ہیں اور اسکاٹش کون کون ہیں۔''

مطیع مزے لیتے ہوئے بولا۔ ''تاڑتے ہوئے کینیڈین ہیں اور بے پروا بیٹھیں اسکاٹش ہیں۔''

وہ بھی چسکارے لیتی بولی۔ ''میں سمجھی نہیں (آئی دونت انڈر سٹینڈ)''

پھر خان نے اپنے گروپ کی کہانی سنائی کہ کس طرح سے ہم سیاحوں کا روپ بدل کر ڈاؤن ٹاؤن پہلی بار دیکھنے آئے تھے اور کس طرح سے ان لڑکیوں سے ملاقات ہوئی اور پھر یہ بھی بتایا کہ سرجی کس طرح سے اپنے کھوئے عشق کو میگی کے روپ میں دیکھنے لگے اور آخر میں مطیع کی بھوت والی کہانی سنائی اور کہا۔ ''اس طرح سے ہماری دوستی لڑکیوں سے ہوگئی اور سرجی بے حد خوش ہیں۔''

بیچ میں لڑکیوں نے اپنے تاثرات بتائے کہ کس طرح سے ہمیں مشرق کی پُراسرار کہانی سننے کو ملی اور یہ بھی کہا کہ ہماری دوست میگی بھی بے حد خوش وخرم ہے۔

جاناں بیٹھی یہ سب حیرت سے سنتی رہی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت دلچسپی سے سن رہی ہے۔ اسی دوران جولین مجھے کہنیاں مارتی رہی اور سرجی شرما کے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ سب سن کر جاناں سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی اور پھر آہستگی سے بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''یقین تو نہ آتے ہوئے بھی ہم نے کرلیا اور اب تم بھی کرلو۔ دیکھو دونوں کس طرح سے جڑے بیٹھے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے اچانک سرجی کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھا اور منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ دونوں کی اکٹھے ایک تصویر لے لوں۔''

سرجی تو جاناں کے لمس ہی سے کپکپانے لگے اور فقرے منہ ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ میں نے کہا۔ ''سرجی کو ہم تصویر کے لیے راضی کرلیں گے۔ تم میگی سے پوچھ لو۔''

اس نے میگی کی جانب طلب کرتی نظروں سے دیکھا تو میگی نے اوکے کہہ کر ہاں کردی۔

پھر دونوں کی تصویر ایسے کھینچی گئی کہ میگی نے اپنا بازو سرجی کی گردن کے گرد حمائل کیا ہوا ہے اور سرجی کا انگ انگ مسکرا رہا ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ جاناں کی کتاب کا ایک خوب صورت باب تو ان کی کہانی سے ہی سج جائے گا۔

میں نے جاناں سے پوچھا۔ ''وہ یوکرائن سے سیدھا ٹورنٹو آرہی ہے۔''

وہ کہیں کھوئی تھی۔ ہڑبڑا کر بولی۔ ''نہیں میں اوتاوا (اوٹاوا) سے آرہی ہوں۔'' جواب دے کر پھر سے اس کے گلابی چہرے پر سوچ کے سائے لہرانے لگے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی بھوت کی کہانی میں پھنسی ہوئی ہے پوچھا کہ کیا سوچ رہی ہو تو جواب دیا۔ ''سرجی کے کینیڈا آنے کے بعد بھوت نے ان کی میگی کو نقصان نہ پہنچایا ہو؟''

مطیع بولا۔ ''معلوم نہیں کہ نقصان پہنچایا یا فائدہ مگر ایک سال پہلے وہ سرجی کو اپنے تین بچوں سمیت بیکری پر ملی تھی۔''

جاناں مطمئن ہو کر اپنا سر ہلانے لگی۔ مطیع پھر سے بولا۔ ''بھوت زبان کے پکے ہوتے ہیں۔ وہ سرجی کو جب ٹورنٹو کی فلائٹ میں چھوڑنے آیا تو یہی کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا مگر تم جیسے انسانوں کو مرد کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اپنا پیار کسی اور کو سونپ کر اب مستقبل بنانے کینیڈا جارہے ہو۔ شرم بھی نہیں آتی تم کو۔''

سرجی یہ سن کر بوکھلا گئے اور اسی بوکھلاہٹ میں بولے۔ ''بھوت نے یہ تو نہیں کہا تھا بلکہ اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ رہا تھا۔''

میں نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ اب چلنا چاہیے۔ اپنے آخری سپاٹ کی جانب اور مال بھی ایک گھنٹے میں بند ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جاناں نے پوچھا۔ ''آپ لوگ کہاں جارہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ینگ ڈنڈاس اسکوائر۔''

شہباز نے پوچھا۔ ''وہاں کیا سیاپا ہوگا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ابھی سب سیاح اسی مقام پر اکٹھے ہوں گے اور کیا ہوگا۔''

جاناں پہلے کھلکھلائی اور پھر بولی۔ ''میں آپ لوگوں کے ہمراہ چل سکتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اس ہنسی کے بدلے سرجی کی جان

ماتگتی تو سب مل کر وہ بھی نکال کر دے دیتے۔'' اور پھر وہ تادیر ہنستی رہی۔

ہم باہر نکلے تو رات اتر آئی تھی مگر ایک عجیب سماں ہمارا منتظر تھا۔

گو رات کی سیاہی پھیل چکی تھی مگر روشنیوں نے دن کا سماں باندھ دیا تھا۔ عمارتیں ایسے جگمگا رہی تھیں کہ جیسے روشنیوں سے بھرے بڑے بڑے ڈبے ایک دوسرے پر احتیاط سے رکھ دیئے گئے ہوں۔ اونچی اونچی عمارتیں سر سے پیر تک اسی ڈبوں سے روشن مگر خاموش کھڑی تھیں۔ سو سو فٹ سے بڑی اسکرینیں جن پر صرف اشتہارات چلتے تھے۔ وسیع و عریض بل بورڈز ایک کے بعد ایک کمرشل آتا جاتا تھا۔ عمارتوں، اسکرینوں اور بل بورڈز کی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں۔ ہم اسکائی اسکریپر بلڈنگز میں گھرے کھڑے تھے۔ ایک بار تو سب ہی یہ منظر دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ ہم اپنی حیرت اور خوشی کا اظہار کھلے عام بھی نہ کر سکتے تھے کہ نہ جانے لڑکیوں پر کیا تاثر پڑے گا۔ ان کی جانب دیکھا تو وہ بھی حیرت سے منہ کھولے روشنیوں کی آبشاریں دیکھ رہی تھیں۔ نیلی، پیلی، گلابی، سرخ اور سفید روشنیاں اپنے گرد و نواح کو نور میں ڈبو رہی تھیں، جاناں نے اپنا کیمرا نکال کر تصویریں لینا شروع کر دیں۔ ایسا منظر تو ہم پہلے نیویارک میں بھی دیکھ چکے تھے یہاں عمارتیں نئی اور شیشوں سے بنی تھیں۔ نیویارک کا ڈاؤن ٹاؤن سو سو سالہ پرانی عمارتوں سے آباد ہے۔

ہم اپنے حواس میں واپس آئے۔ دور دور تک یہی روشنیاں اور جگ مگ کرتی دنیا تھی۔ انسانی ترقی دیکھ کر انسان اش اش کر اٹھتا ہے۔

ہم میگ اسٹریٹ پر جنوبی سمت آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ میں ارد گرد دیکھتا، سب مناظر اپنے ذہن میں سموتا چلا جا رہا تھا۔ ان عمارتوں کے بڑے بڑے ستون زمین پر گڑے تھے اور وہاں قدرے اندھیرا تھا۔ میری نظر پڑی تو ایک بے گھر عورت فٹ پاتھ پر ستون کی آڑ لے کر لیٹی تھی۔ آس پاس ایک پرانا کمبل اور ایک پھٹا پرانا بیگ تھا جو اس نے سر تلے رکھا تھا۔ آدھا کمبل عمارت کے چمکیلے فرش پر اور آدھا اس کے اوپر تھا۔ میں سب سے آگے تھا تو مجھے ایک دم بریک لگ گئے۔ بڑے بڑے بل بورڈز اور عمارتوں کی رنگین روشنیاں اس پر پڑ رہی تھیں اور وہ واضح نظر آ رہی تھی۔ میں رکا تو سبھی میرے پاس آ تھمے۔ شہباز بولا۔ ''یہ تو بوڑھی عورت سو رہی ہے۔ ہم نے سمجھا معلوم نہیں کیا دیکھ کر سکتے میں آ گئے ہو؟''

جاناں میرے ساتھ کھڑی تھی۔ کیمرا نکال کر تصویر لے لی۔ ہمارا گروپ ذرا آگے کھڑا خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ہم دونوں وہیں کھڑے تھے۔ لگتا تھا کہ جاناں کو بھی بری طرح کوئی ٹھیس لگی ہے۔ خلاف معمول وہ اب کی بار نہیں ہنسی تھی۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی۔ ''ایک لمحے کے لیے اگر یہ سوچیں کہ وہاں میں اسی طرح لیٹی ہوں یا تم۔ ذرا یہ سوچو کہ ہم اس حالت میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟''

میں نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد بولا۔ ''اگر میں ہوں تو میرے گرد روشنیاں نہیں، اندھیرا ہوگا۔ میرے اندر کچھ یادیں ہوں گی مگر وہ بھی دب چکی ہوں گی۔ کوئی کسک ہو گی مگر اس کا تو میں عادی ہو گیا ہوں گا۔ یہاں محبت، گھر سب سے بیگانہ ہو چکا ہوں گا۔ آنسو خشک اور جذبات دفن ہو چکے ہوں گے۔ بس یہ سوچتا ہوں گا کہ رات تو کسی طرح کٹ جائے گی مگر اگلا دن کیسے کٹے گا۔''

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''تم بتاؤ کیا سوچتی اگر اسی طرح لیٹی ہوتی۔''

وہ بولی۔ ''جو تم نے محسوس کیا ہے اس سے زیادہ نہیں تو میں بھی محسوس نہ کروں گی اور جو تم نے کہا ہے وہ میں دہرانا نہیں چاہتی مگر میرے بھی یہی جذبات ہیں جو تم نے بڑے عمدہ طریقے سے بیان کر دیئے۔''

یہ سن کر میں نے قدم بڑھائے تو وہ بھی میرے ہمراہ تھی۔ میں خاموش تھا تو بولی۔ ''ایسے مناظر میں نے بہت سے ملکوں میں دیکھے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ زیادہ سوچو نہیں بلکہ آس پاس چلتی پھرتی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دو۔''

میں اس کو کیا بتاتا کہ یہ چلتی پھرتی زندگی بھی تو موت کی جانب بڑھ رہی ہے۔ پھر روز محشر ہوگا اور مجھ سے یہ سوال پوچھا جائے گا کہ وہاں کھڑے چند ڈائیلاگ تو بول آئے تھے مگر عملی طور پر کیا کیا تھا؟ حالانکہ ہم نے تم کو استطاعت بھی دی تھی۔ اس کو کچھ دے بھی دیتے تا کہ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ رات تو کٹ جائے گی اور اگلا دن بھی۔ پھر میں نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کے

قریب رکھ دیئے۔

ہم چلتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے پاس سے گزرے تو جولین بھی ہم دونوں کے ہمراہ ہولی۔ کوئین اسٹریٹ پر دائیں جانب مڑے تو کچھ آگے انسانی ہجوم، ہنگامہ اور شور شرابہ برپا تھا۔ لوگ اسی جانب کھینچے چلے جا رہے تھے۔ زیبرا کراسنگ پر سیاحوں کے ہجوم سڑک پار کرنے کے انتظار میں تھے۔

ذرا دور بلند روشن عمارتوں کے پیچھے سی این ٹاور کی آسمان میں چھید کرتی چونچ کھڑی تھی۔ اس پر روشنی جل بجھ رہی تھی۔ پھر ایک ہنسی گونجی جس نے کسلمندی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ جاناں تھی جو کہہ رہی تھی۔ ''اوہ مائی گوود (گاڈ) کیا خوب صورت نظارہ ہے۔''

ہمارے بائیں جانب اونچی اونچی خوب صورت عمارتیں تھیں اور دائیں جانب اولڈ سٹی ہال تھا اور اس کے سامنے ایک بڑا چوک تھا جہاں سیاحوں کا رش تھا۔ چوک کے پیچھے نیو سٹی ہال کی بلند اور Curve بناتیں بلند عمارتیں روشنیوں میں نہائی کھڑی تھیں۔ ان دونوں بلڈنگز کے ارد گرد بھی بلند عمارتوں کے ٹاور تھے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بلبوں سے روشن تھے۔

زندہ اور پُر جوش لوگوں سے چوک بھرا تھا اور اولڈ سٹی ہال سمیت چوک پر زرد اور پیلی روشنیوں نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ زرد روشنیوں سے سکون اور اطمینان کا احساس جاگتا ہے اسی لیے وہاں اس کے علاوہ کوئی اور رنگ نہ تھا۔

اور یہی تھا نیتھن فلپس اسکوائر تھا۔

ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن میں آج کے دن کے بعد بہت مرتبہ گیا ہوں۔ پتھر اور شیشوں والی یہ بلندی عمارتیں، صاف و شفاف سڑکیں۔ فٹ پاتھ یا چمکتی دمکتی دکانیں مجھے کبھی متاثر نہیں کرتیں۔ مگر ڈاؤن ٹاؤن میں جا بجا سڑک اور فٹ پاتھوں کے بیچ ایسے گم شدہ ٹکڑے ملتے ہیں جہاں آپ چند لمحے آسودگی سے با آسانی گزار سکتے ہیں۔ یہ ٹکڑے بہت چوڑے اور لمبے ہوتے ہیں۔ درخت لگے ہیں، خوب صورت اینٹوں کے پختہ فرش ہیں، بینچ پڑے ہیں اور ساتھ پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ آس پاس بے خوف کبوتر زمین پر دانہ چگتے نظر آ رہے ہیں۔ کبھی کبھار کبوتر کسی کے کندھے پر آ بیٹھتے ہیں۔ وہ گوشہ دن میں درخت کے سایوں اور سورج کی کرنوں سے سجا ہوتا ہے۔ رات میں یہاں زرد لائٹ اسے روشن رکھتی ہے۔ ارد گرد کی رواں دنیا میں یہ گوشہ باہر کے شور کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ ایسی جگہوں پر میں بیٹھا اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہوں۔ پاس کی بینچ پر کوئی اور اپنی دنیا سجائے بیٹھا ہے۔ شوریدہ ماحول میں بسے ایسے آسودہ مقامات آپ کو سکون بخشتے ہیں۔ فلپس اسکوائر ایسا کوئی تنہا گوشہ تو نہ تھا مگر بلند روشن عمارتوں کے بیچ مشینی لوگوں کا نہیں بلکہ زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے انسانوں کا ایک عارضی پڑاؤ تھا۔

فلپس اسکوائر کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے پاس اولڈ سٹی ہال کی پرانی خوب صورت عمارت سنہری روشنیوں میں ڈوبی کھڑی ہے۔ اس چوک میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس پر تین محرابیں اپنے ستونوں پر کھڑی ہیں۔ پانی کے ارد گرد بینچ پڑے ہیں اور پھر ایک وسیع احاطہ ہے جہاں کا فرش، بڑے اور خوب صورت پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ احاطے کے ایک جانب مختلف شاپس ہیں، ٹوائلٹس ہیں اور شاید کچھ دفاتر ہیں۔ دوسری جانب ایک سبزہ زار ہے۔ خوب صورت تراشے ہوئے درخت میں بیٹھنے کے لیے بینچ ہیں پتھروں سے بنے پھولوں بھری کیاریوں کے احاطے ہیں۔

اس وقت وہاں انسانوں کا ہجوم تھا۔ ہر رنگ اور قومیت کا سیاح اور مقامی افراد وہاں جمع تھے۔

ارد گرد روشن اور بلند عمارتوں کا انبوہ تھا اور ان عمارتوں کا عکس تالاب کے پانیوں میں اتر رہا تھا۔ اسکوائر کے دوسری جانب بلند اور روشن نیو سٹی ہال کی عمارتیں تھیں۔ ہر ایک عمارت Curve میں تعمیر کی گئی تھی۔

ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتوں کے علاوہ یہاں سب سے خوب صورت نظارہ اولڈ سٹی ہال کا تھا اور وہ ہر قومیت کے انسانوں کے مشاہدے کا تھا۔

کچھ لوگ کھڑے تھے۔ بہت سے جوتے اتار کر فرش پر بیٹھے تھے۔ بہت سوں نے چادریں بچھا رکھی تھیں۔ بینچ سارے بھرے پڑے تھے۔ کوئی تصویر بنا کھڑا ہے اور کوئی تصویر اتار رہا ہے۔ سب لوگ پورا دن چل چل کر یہاں آرام بھی کرتے تھے اور ماحول سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔

فرش اتنا صاف و شفاف تھا کہ مٹی کا ایک ذرہ بھی نظر نہ آتا تھا جس میں ایسے فرش پر بیٹھنے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی۔ ہمارے ساتھ لڑکیاں بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ میرے ساتھی اپنے کھلے چہروں کے ساتھ قہقہے لگا رہے

تھے۔ وہ سب ایک ہی سمت میں اپنے چہرے کیے بیٹھے تھے۔ چند نیم دراز ہو گئے اور چند ایسے ہی بیٹھ گئے۔ جاناں کو اسکرٹ کی وجہ سے بیٹھنے میں دشواری پیش آرہی تھی اور آخر کار وہ ٹانگیں لپیٹ کر ہنستی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کی ہنسی کو سن کر آس پاس کے سیاح اسی کی جانب متوجہ ہوئے اور پھر بار بار اسے دیکھنے لگے۔

سرجی اور خان قیصر نے پہلے ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کی اور پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہاتھوں میں شوارمے، کولڈ ڈرنکس، پلاسٹک کی شیٹیں اور تاش اٹھالائے۔ شیٹس بچھا کر سب کو دوبارہ بٹھایا اور سرجی نے شوارمے بانٹے۔ معلوم نہیں مکی کے لیے دو کیوں لائے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کے لیے دو کیوں لائے ہیں۔''

بولے۔ ''وہ جس نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اسے بھوک لگی ہے۔'' معلوم نہیں وہ سرجی کو کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سرجی جب اسے کولڈ ڈرنک پیش کررہے تھے تو میں نے پوچھا۔ ''وہ کیا پیاسی نظروں سے بھی دیکھ رہی تھی؟''

اور سرجی نے ذرا شرما کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب میرے ساتھیوں کی کئی لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ کسی بات پر ہنستے تو ایک دوسرے کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ بھی مارتے تھے۔ ان کے پُرمسرت اور پُرجوش چہرے دیکھ کر مجھے خوشی ہورہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔

اب کچھ تاش پر کوئی گیم کھیل رہے تھے اور کچھ انہیں کھیلتے دیکھ رہے تھے۔ سب نے جوتے اتارے تھے اور آرام سے شیٹوں پر بیٹھے تھے۔ جاناں فوٹو گرافی کرنے لگی تھی۔ وہ ہم لوگوں کی تصویریں بھی اتار رہی تھی۔ موسم خشک تھا اور مجھے ٹھنڈ لگنے لگی۔ اس خنکی میں لڑکیاں نیکروں میں بھی بے حد آرام سے بیٹھی تھیں۔ تین لڑکیاں اور خان تاش کھیل رہے تھے۔ میرے دوست خان سے ذرا دور اور لڑکیوں کے قریب بیٹھے تاش کی بیگم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

سرجی اور مکی الگ بیٹھے بھوتوں اور جنوں کی کہانیاں ایک دوسرے سے سن رہے تھے۔ مطیع اللہ ہمیشہ کی طرح چنگاری لگا کر اب تاش کھیل رہا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اس کی لگائی چنگاری اب شعلہ جوالا بن چکی ہے۔

میں ایک سائیڈ پر بیٹھا سیاحوں کو دیکھنے لگا تھا۔ ہر ایک اپنے آپ میں مست تھا۔ میں پانی کے وسیع تالاب میں فواروں کو پانی اوپر پھینکتے دیکھ رہا تھا جن پر رنگا رنگ کی روشنیاں منعکس ہورہی تھیں۔ مختلف رنگوں سے مزین بلند فواروں نے ایک عجیب سماں باندھا ہوا تھا۔ تالاب کے ایک جانب بڑے بڑے سفید حروف میں لفظ TORONTO۔ میرے خیال میں یہ بڑے حروف اس سارے ماحول میں کوئی خاص رنگ نہیں بھر رہے تھے بلکہ ماحول سے مطابقت ہی نہیں رکھتے تھے۔ کچھ سرسبز میدان تھے جہاں درخت لگے تھے۔ مشرقی سمت میں نیو سٹی ہال کی Curve لیتی دو عمارتیں تھیں۔ دونوں آمنے سامنے تھیں۔ ایک 27 منزلہ اور دوسری 20 منزلہ تھی۔ نیو سٹی ہال 1965ء میں مکمل ہوا تھا۔ یہاں شہر کے میئر کا دفتر اور کونسل ہال ہے۔ اس وقت شہر کا میئر نیتھن فلپس ہوتا تھا۔ اسی نے نیو سٹی ہال بنوایا تھا۔ اس سے پہلے 1895ء سے میئر آفس اولڈ سٹی ہال میں ہوا کرتا تھا جو اب کورٹ ہاؤس ہے۔

نیو سٹی ہال میں کئی فلموں کی شوٹنگ بھی ہو چکی ہے اور اسی نیتھن فلپس اسکوائر میں بھی کئی ایک فلمیں بن چکی ہیں۔ ایک فلم میں تو نیو سٹی ہال کو نیوٹرن بم سے تباہ ہوتے بھی دکھا دیا گیا ہے۔ نیو سٹی ہال کا ڈیزائن جس آرکیٹیکٹ نے بنایا تھا وہ نیو سٹی ہال کے افتتاح سے ایک سال پہلے یعنی 1964ء میں مر گیا تھا۔ نیو سٹی ہال کو آسمان یعنی اوپر سے دیکھیں تو دو عمارتیں انسانی آنکھ کی طرح دکھتی ہیں۔ اسی لیے ان عمارتوں کو Eye of Government بھی کہا جاتا ہے۔

نیو سٹی ہال اور اولڈ سٹی ہال کے بیچ اسکوائر پبلک کے لیے بنایا گیا۔ یہ ایک وسیع احاطہ ہے جہاں سردیوں میں اسکیٹنگ ہوتی ہے۔ گرمیوں میں فیسٹیول، کنسرٹ ہوتے ہیں۔ لیزر شو تو عموماً ہوتے رہتے ہیں۔ نیو ایئر کو یہاں شدید آتش بازی ہوتی ہے۔ یہ اسکوائر روشنیوں اور کرسمس ٹری کے بلبوں کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ روشن رہتا ہے۔

میں ان سیاحوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے اپنے مسائل بھول کر خوش خرم بیٹھے کھڑے یا گھومتے پھر رہے تھے۔

کوئی فرش پر بیٹھا مزے سے برگر کھا رہا ہے اور کوئی سائیکل سنبھالے تھکا ہوا کھڑا ہے۔ ایک گروپ ہے جس میں خواتین و حضرات ہیں وہ جوتے اتارے آرام سے بیٹھے ہیں۔ لڑکیوں کی تعداد زیادہ نظر آرہی تھی شاید اس لیے کہ سب کی نظریں لڑکیوں پر مرکوز تھیں۔ بچوں کی بھی اچھی

خاصی تعداد تھی اور جہاں جہاں فیملیز بیٹھی تھیں وہاں بچوں کے اسٹرالر بھی پارک تھے۔ دیسی اور چائنیز تو دور سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کے علاوہ ہمارے لیے تمام گورے تھے۔

ایک دیسی فیملی بچوں کے ہمراہ چادر بچھائے بیٹھی ہے۔ عمر رسیدہ خواتین نے اپنے جسم چادروں سے لپیٹ رکھے ہیں۔ ان میں جواں عورتیں اور مرد بھی ہیں ۔ یہ پاکستانی لگتے تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا تو والدین کو ڈاؤن ٹاؤن دکھلانے اپنے ساتھ لے آئے مگر وہ بوڑھے مرد اور خاتون بے زار اور بجھے بجھے بیٹھے ہیں۔ سکھ بھی پگڑیاں باندھے گھوم پھر رہے ہیں۔ ہمیں اردو پنجابی اور چائنیز زبان زیادہ سنائی دے رہی تھی۔

سنا ہے کہ تقریباً پندرہ لاکھ سیاح ہر سال فلپس اسکوائر میں آبیٹھتے ہیں۔ مجھے مطیع کی منطق سمجھ نہ آئی جو یہ کہتا تھا کہ اگر پندرہ لاکھ آتے ہیں تو پندرہ لاکھ چلے بھی تو جاتے ہیں۔ پھرق (فرق) کیا پڑا۔

جاناں بھی واپس آگئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہاری فوٹو گرافی کیسی رہی؟''

وہ بولی۔ ''ویری گد (گڈ)۔''

پھر ہنسی تو میں نے کہا۔ ''ایک بار پھر ہنسو۔''

وہ پھر ہنسی اور بولی۔ ''دوبارہ کیوں ہنسوں؟''

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی تو میں بھی ہنسنے لگا اور بولا۔ ''تمہیں ہنسنے کی فرمائش کرنا بھی ٹائم کا زیاں ہے... کیونکہ یہ ہنسنا تو تمہاری عادت ہے اور ہنستے ہوئے دیکھ کر دل کرتا ہے کہ ہنستی رہو۔'' پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ جولین بھی پاس آبیٹھی۔

پوچھا۔ ''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

جاناں بولی۔ ''یہ مجھ سے کہتا ہے کہ تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔''

جولین بے تاثر چہرے سے بولی۔ ''اس کی ہنسی اچھی لگتی ہے یا یہ خود۔''

میں جاناں سے یہ پوچھتے پوچھتے رک گیا کہ اس ہنسی کی وجہ سے تمہیں کتنے لوگوں نے کہا ہوگا کہ تم اچھی لگتی ہو مگر یہ پوچھ کر شاید جولین دکھی ہو جاتی۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ کسی ایک لڑکی کے سامنے دوسری کی بے تحاشا تعریف پہلی کے دل پر گراں گزرتی ہے۔

جاناں بولی۔ ''اس وقت کسی چورچ (چرچ) کی فوٹو لی جائے تو بہت اچھی تصویر آتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''باقی تو سب تاش میں غرق ہیں، کیوں نہ ہم تینوں اکٹھے کوئی فوٹو اسپاٹ ڈھونڈنے جائیں۔''

وہ دونوں تیار ہوگئیں۔ جاناں نے کہا کہ پہلے پارک کا ایک چکر لگائیں گے اور پھر آس پاس کا علاقہ دیکھتے ہیں۔ ہم کھڑے ہوئے تو ایک لڑکی سے جڑا بیٹھا مطیع بولا۔ ''تم لوگ اتنی رات کو کدھر جا رہی ہو؟''

''بچیوں کو سیر کرانے لے جارہا ہوں کوئی اعتراض؟'' میں نے جواب دیا۔

''ہمیں کیا اعتراض ہوگا۔ انگریزوں کا بے حیا ملک ہے۔ کھلے عام لڑکیوں کو گھمانے پر یہاں کیا پابندی ہے۔'' یہ کہہ کر دوبارہ سے اسی لڑکی سے چپک کر بیٹھ گیا۔

ہم تینوں ہجوم میں سے گزرتے ہوئے پارک کی طرف چل دیئے۔

ادھر قدرے خاموشی ہوئی تھی۔ درختوں سے ٹکرا کر آتی اور ہم سے لپٹ جاتی۔ آس پاس کا سارا جہان زمین سے آسمان تک روشنیوں میں ڈوبا تھا۔ شاید بلند روشن عمارتیں بھی اپنے پہلو میں تنہائی اور تاریکی کو حیرت سے دیکھتی تھیں۔ اونٹاریو لیک سے آتی ہواؤں سے درختوں کی ٹہنیاں جھومتی تھیں۔ میرا جی کرتا تھا کہ پورے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد کسی درخت کے تنے کے نیچے آنکھیں بند کر کے اکیلا بیٹھ جاؤں۔ یہ بے تحاشا روشنیاں کسی کو کیا خوشی دے سکتی ہیں جوان معطر ہواؤں کا لمس دے رہا تھا۔ انسان نے اپنا دماغ استعمال کیا اور ایسے اسکائی اسکریپر کھڑے کر دیئے۔ ان میں روشنیوں کی بھرمار ایسے کر دی کہ سو سال پہلے کا انسان یہ نظارہ دیکھ لے تو ہارٹ اٹیک سے مر جائے۔ مگر اللہ کی نعمتیں دیکھیں کہ سورج پورے کرۂ عرض کو حرارت اور روشنی پہنچاتا ہے، ہواؤں نے سب کو یکساں حصہ دے رکھا ہے۔ سورج سرد پڑ جائے اور ہوائیں راستہ بدل کر کوئی اور رخ اختیار کر لیں تو اس کائنات کا کیا بنے گا۔ ہوائیں رکیں تو بادل نہیں آئیں گے، بادل نہ اٹھے تو برسات نہ ہو گی، برسات نہ ہوئی تو دریا خشک ہو جائیں گے، دریا خشک ہوئے تو بجلی نہیں بنے گی اور بجلی نہ بنی تو یہ عمارتیں اندھیرے میں ڈوب جائیں گی۔ پھر بھی انسان اتراتا ہے کہ دیکھو یہ سب میرے کمالات ہیں۔ کچھ بدنصیب اور ناسمجھ سائنس اور مذہب کا موازنہ کرتے ہیں۔ ان دونوں کا کیا موازنہ؟ سائنس تو مذہب کا حصہ ہے۔ مذہب کا تو یہ موضوع ہی نہیں کہ سائنس سچی ہے یا جھوٹی۔ وہ تو اللہ پاک نے اپنی پاک

کتاب میں فرما دیا ہے کہ کائنات تمہارے سامنے ہے، جتنا اسے کھول سکتے ہو، اس کے بھید پالو، غورد اور تفکر کرو، جھٹلانے والے کچھ لوگ بار بار سائنس کو بیچ میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں فزکس کے ایک پروفیسر صاحب اکثر فزکس کے علاوہ ہر چیز پر بات کرنے ٹی وی پر آ بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے شاید جس موضوع پر ڈاکٹریٹ کی تھی اس کو فزکس خود جھٹلا چکی ہوگی۔ ایک بار ٹی وی پر کسی نے کہا کہ دنیا میں جو بھی کام ہو رہا ہے تو اس کے پیچھے اللہ ہے۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ پانی میں سیاہی گھولیں تو سیاہی اور پانی کے مالیکول ایک دوسرے سے مل کر بانڈ بناتے ہیں تو محلول بن جاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی اللہ ہے؟ اس پروگرام کا میزبان وہ شخص تھا جس نے حکمرانوں کے حق میں کالمز لکھ کر شریعت کورٹ میں جگہ بنائی ہوئی ہے۔ وہ بھی تائیدی انداز سے سر ہلا رہا تھا۔ ان لوگوں نے سیاست کرنی ہے تو شوق سے کریں مگر اللہ کی پاور کو چیلنج نہ کریں۔ اس پروفیسر صاحب کے سامنے میں ہوتا تو ضرور پوچھتا کہ اگر پانی میں ایک آکسیجن اور دو ہائیڈروجن کا تناسب نہ ہوتا تو آپ سیاہی کیا، نمک کو بھی حل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خاصیت تو اللہ ہی نے رکھی ہے کہ پانی میں عناصر کا کیا تناسب ہوگا۔ یہی تو قانون قدرت ہے کہ سارا نظام ایک تسلسل عمل سے ایک خوب صورتی سے چل رہا ہے۔ ایک بھی چیز اِدھر سے اُدھر ہو جائے تو چاند زمین سے آ ٹکرائے۔

مجھے حیرت کا جھٹکا تب لگا جب دیکھا کہ پارک میں ایک درخت کی سرگوشیاں کرتی ٹہنیوں تلے اللہ کو معبود جاننے والے ایک انسان نے ابد سے رہتی دنیا تک قائم رہنے والا نعرہ اللہ اکبر بلند کیا اور نماز کے لیے قبلہ رو ہو کر ہاتھ باندھ لیے۔

میں ٹھٹک گیا۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور میں غافل بھٹک رہا تھا۔ وہ گھومنے پھرنے آیا مگر مالک کو نہیں بھولا۔ وقت دیکھا اور مقام پایا تو چپکے سے خاموش جگہ پر آ کر درخت تلے بندگی کا حق ادا کرنے لگا۔ میلے سے ہٹ کر ذرا سے ویرانے میں نماز ادا کی جا رہی تھی۔ یہ وہی نماز ہے جو میدان کارزار میں پڑھی گئی، گھوڑوں کی پشت پر پڑھی گئی، خندقوں کے اندر اور دریاؤں کے کنارے پڑھی گئی۔ بلند پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں پر اور میدانوں میں پڑھی گئی۔ دشت میں پڑھی گئی اور صحراؤں میں پڑھی گئی۔ چھپ کر پڑھی گئی اور کھلے عام پڑھی گئی۔ جسم بیکار ہو گیا تو اشاروں سے پڑھی گئی، یہاں تک کہ کربلا میں زیر شمشیر پڑھی گئی۔

میں کوئی واعظ نہیں جس نے کتابوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھایا ہو۔ نہ نیکیاں گنتا ہوں اور نہ ان کا حساب رکھتا ہوں مگر مشکل میں گھرتا ہوں تو عبداپنے معبود کے سامنے جھک جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وعدہ تو دینے کا تو نے کیا تھا۔ میری ضرورت آ پڑی ہے تو اچھا نہیں لگتا کہ تیرے علاوہ کسی اور سے مانگوں۔ باقی تو خود جانتا ہے کہ تیرے بندے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ یقین رکھنے کے علاوہ میں دل کی گہرائیوں سے اقرار کرتا ہوں کہ جو لطف سجدے میں ہے وہ دنیا کی کسی آسائش میں نہیں۔

ہم کوئین اسٹریٹ پر آئے۔ سامنے شیرٹن ہوٹل کی بلند عمارت تھی۔ ہم مشرقی سمت میں ینگ اسٹریٹ پر مڑ گئے۔ ہم حیران تھے کہ اتنی کم جگہ پر اتنی بلند عمارت کیسے کھڑی کی گئی ہوگی۔ یہاں پر کوئی بلند عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو اس زمین کے اردگرد پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ زمین سے عمارت بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ نہ سڑک بلاک ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی گرد اٹھتی نظر آتی ہے۔ رات کی تاریکی میں تعمیراتی سامان آتا ہے اور رات ہی کو فالتو سامان نکالا جاتا ہے مگر یہاں تو ایک نہیں درجنوں ایسی عمارتیں سر بلند کیے کھڑی تھیں۔

جاناں میرا اور جولین کا فوٹو کھینچ کر بولی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہاں کوئی چورچ (چرچ) ہے؟“

میں بولا۔ ”یقین تو نہیں صرف اُمید ہے۔“

وہ ہنس پڑی اس سے پہلے کہ میں اس سے ہنسنے کی فرمائش کرتا۔

میں نے جولین سے پوچھا۔ ”تھک تو نہیں گئی ہو؟“

وہ بولی۔ ”تم بتاؤ تھکی ہوں یا نہیں۔“

میں نے آسمان کی جانب دیکھ کر کچھ حساب کتاب لگایا اور کچھ دیر سوچا اور سوچ کر بولا۔ ”تھوڑی تھوڑی تھکی ہو۔“

وہ اور جاناں ایک دوسرے کا... ہاتھ پکڑ کر ہنسنے لگیں اور جولین بولی۔ ”ہاں تھوڑی تھوڑی بس۔“

اتنے میں زیبرا کراسنگ پر اشارہ سبز ہوا اور ہم بہت سے دوسرے سیاحوں کے ہمراہ سڑک کراس کرنے لگے۔ ہم اس سڑک پر چل رہے تھے جو ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کو ایک حسن بخشتی ہے۔ ہم جدید خوب صورت اور روشن بلند عمارتوں کے سائے میں چل رہے تھے۔

میں نے جاناں سے پوچھا کہ وہ ٹورنٹو کے بعد کہاں جائے گی۔ وہ ہنس کر بولی۔ ''برٹس کولمبیا (برٹش کولمبیا)۔''

''اکیلے گھومتے ڈر یا تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔'' جولین نے پوچھا۔

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''نہیں کبھی نہیں، میں آپ لوگوں کی طرح کے دوست بنالیتی ہوں۔''

میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''یہ خطرناک بھی تو ثابت ہو سکتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں پبلک مقامات سے دور نہیں جاتی۔ اکثر وہاں جاتی ہوں جہاں سیاحوں کا رش ہو۔''

''پیسے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں۔ وہ کون دیتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں بلاگ لکھتی ہوں۔ کتابیں تحریر کرتی ہوں اور آرٹیکل لکھتی ہوں۔ میرا خرچ اس سے نکل آتا ہے۔''

''مجھے بھی لکھنا سکھادو تاکہ میری بھی آمدن شروع ہو سکے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔ ''جو دیکھو وہی لکھ دو۔ جو محسوس کرو اس کو الفاظ دے دو۔''

اس نے دو فقروں میں مجھے بہت بڑا سبق دے دیا۔

آگے ایک اور کراسنگ آیا اور اس کے بعد سڑک کے پار، ایک بڑے احاطے میں کسی قدیم گرجا گھر کی ہلکی روشنیوں میں لپٹی خوب صورت عمارت تھی۔ اس کی برجیوں کے اوپر بہت بلندی پر صلیب کا نشان آویزاں تھا۔ مکمل طور پر قیمتی مگر سادہ پتھروں سے بنا چرچ بہت پروقار اور شاندار نظر آرہا تھا۔ اس کے گرد گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعے تھے وہاں لوہے کے بینچ بھی پڑے تھے۔

جولین نے میرا بازو پکڑا اور بولی۔ ''وہ رہا جاناں کا چرچ۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''میں چرچ ڈھونڈنے نہیں نکلا تھا۔ میرا اتنے زیادہ شور میں دم گھٹ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

میں اس کے لہجے میں چھپی تلخی کو سمجھ رہا تھا۔ جاناں سے پہلے اس کے ساتھ باتیں چل رہی تھیں۔ جاناں آئی تو اس نے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ یہ ایک طرح کی بے رخی تھی جو عورت کیا مرد بھی محسوس کرے گا۔

میں نے جولین کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''وہاں بینچوں پر بیٹھتے ہیں۔'' اور وہ مسکرا کر چل پڑی۔

جاناں کہہ رہی تھی کہ فوٹو گرافی کے لیے اس چرچ کی لوکیشن بہت خوب صورت ہے، آس پاس کوئی بلند عمارت ہے۔ اس کی روشنیاں جو اس چرچ کے رعب و دبدبے کو نگل جائیں۔

بات اس کی صحیح تھی کہ وہ جگہ مکمل خاموش اور تنہائی میں گھری تھی۔ چرچ کی مدھم سنہری روشنیاں کئی خفیہ مقامات سے نکل کر آس پاس کی فضا میں تیر رہی تھیں۔ درختوں پر پتوں کی سرسراہٹ ہواؤں سے تھی اور ان درختوں تلے رکھے بینچ کسی کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے۔

ہم دونوں بینچ پر بیٹھ گئے جہاں اندھیرے اور اجالے کا ملاپ ہو رہا تھا۔ جاناں چرچ کو فریم میں رکھ کر فوٹو گرافی کرنے لگی۔ میں نے جولین سے پوچھا۔ ''تم لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

وہ بولی۔ ''زیادہ دور نہیں۔ اپر ٹاؤن کے ایک ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم چار تو ڈاؤن ٹاؤن کو آگئے مگر تین لڑکیاں تھکی ہوئی تھیں اسی لیے واپس ہوٹل چلی گئیں۔''

''واپس اسکاٹ لینڈ جارہی ہیں؟''

''ایک ہفتے بعد ہماری ٹورنٹو سے فلائٹ ہے۔ ہم پرسوں اوٹاوہ اور کیوبک جارہے ہیں۔'' وہ بولی۔

مجھے یہ جگہ بہت پسند آرہی تھی جو احساس نیویارک میں سینٹرل پارک جانے میں آپ کے اندر آتا ہے، ویسا ہی یہاں تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن یعنی ایک ہنگامے کے بیچ پُرسکون گوشے۔

جولین کہنے لگی۔ ''گو ہم سات لڑکیاں ہیں مگر پھر بھی ہر چیز ایک ہی طرح سے ہو رہی تھی۔ آج بریک لگی ہے اور ہمارے لیے مختلف ہوا ہے۔ آپ لوگوں کی اچھی کمپنی ہمیں ملی۔ خوب باتیں ہوئیں، اچھے کھانے کھائے۔'' پھر ہنس کر کہنے لگی۔ ''سرجی اور میگی کا مختصر اور دلچسپ رومانس بھی دیکھ لیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ میگی کیا سچ مچ سرجی سے پیار کرنے لگی ہے؟ یقین نہیں آتا۔''

وہ بولی۔ ''یہ تو معلوم نہیں کہ پیار کرنے لگی ہے یا نہیں مگر یقین کیوں نہیں آتا؟''

''اس لیے کہ مغرب والے پہلے ساتھ ہو کر وقت گزارتے ہیں۔ اگر طبیعت یکساں ہو تو پیار بھی کرتے ہیں

اور شادی بھی۔''
''آپ ہمارے بارے میں ہم سے بڑھ کر کیسے جانتے ہیں؟''
''مگر یہ بھی تو عجیب لگتا ہے اور ایک گھنٹے بعد ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔''
''پیار ہونے کے لیے ایک گھنٹا تو پھر بھی بہت ہے۔'' وہ بولی۔
میں نے کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ دونوں اداکاری کر رہے ہیں۔''
''شاید میگی بہت کھاگ لڑکی ہے۔ وہ میرے خیال میں سفر کی کوئی دلچسپ کہانی بنا رہی ہے۔'' جولین بولی۔
مجھے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ سرجی اور میگی دونوں جانتے بوجھتے ایک دوسرے سے کھیل رہے ہیں۔
اتنے میں قریب ہی دلفریب ہنسی کی آواز آئی۔ وہ جاناں تھی کہہ رہی تھی۔ وٹ اے بیوٹی فل (What a beautiful)۔
جولین نے پوچھا۔ ''چرچ خوب صورت ہے یا پھر یہ ماحول؟''
وہ بولی۔ ''یہ فضا اور مقام چرچ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔'' پھر کیمرا سیدھا کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ دونوں کی ایک ایک تصویر بناؤں؟'' ہم دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور اس نے کیمرے کا بٹن کلک کر کے تصویر کھینچ لی۔
وہ پھر بینچ پر ساتھ آبیٹھی۔ میں نے پوچھا۔ ''ہماری تصویروں کا کیا کرو گی؟''
وہ بولی۔ ''آپ کو میل کروں گی۔ اپنا ایڈریس دے دینا۔''
میں بولا۔ ''اچھا؟''
جواب دیا۔ ''خط بھی لکھوں گی۔ آخر دوستی ہوگئی ہے جواب دو گے؟''
میں خاموش ہوگیا۔ جولین بھی مجھے دیکھنے لگی۔
میں نے جاناں سے پوچھا۔ ''تم کئی ملکوں کے کئی شہروں میں جا چکی ہو۔ ہر شہر میں ہر مقام پر کوئی نہ کوئی دوست بھی بنالیتی ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ تم سب کو تصویریں بھیجو اور سب سے خط و کتابت رکھ سکو؟''
پہلی بار وہ نہیں ہنسی بلکہ خاموش ہوگئی۔
میں نے پوچھا۔ ''کیا برا لگا؟''

وہ بولی۔ ''برا نہیں لگا، میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب بھی میں نے تصویریں بھیجنے کی بات کسی سے کی تو دوسرے نے فوراً ایڈریس دے دیا لیکن میں نے کبھی نہیں بھیجیں اور آج تم نے ایک طرح سے مجھے بتا دیا کہ تم اپنا ایڈریس نہیں دے رہے۔''
میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ کر مسکرانے لگی اور بولی۔ ''یقین کرو کہ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی نے مجھے انکار کیا ہو، ورنہ ہر کوئی اپنا ایڈریس دے کر میرا ایڈریس بھی مانگتا ہے۔ میں نے تو کسی کو اپنا ای میل بھی نہیں دیا۔''
''میں نے انکار نہیں کیا بلکہ سوال پوچھا ہے۔'' میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔
''ایک ہی بات ہے۔ بات سمجھنے کی ہو تو سمجھ آجاتی ہے مگر ہم خود انجان بن جاتے ہیں۔'' وہ اب کی بار یہ کہہ کر ہنسی تھی۔
میں نے کہا۔ ''ہم راستے کے چلتے مسافر ہیں۔ اگلے موڑ پر اپنی اپنی راہ لیں گے۔ جتنا سفر اکٹھے تھا جو بہتر طریقے سے طے کرلیں تو یہ بھی بہت ہے۔ میں یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ کل ہماری تصویریں ایک بار دیکھ کر ہمیں یاد بھی نہیں کرو گی بلکہ ذرا سا سوچ لو گی اور پھر شاید ہی ان تصویروں کو دوبارہ دیکھو۔ اس کے بعد ان کی جگہ نئی تصویریں آجائیں گی اور اس کے بعد نئی اور پھر نئی اور ہماری تصویریں سب سے نیچے ہمیشہ کے لیے دب جائیں گی اور پھر سب بھول جائے گا۔'' میں بولا۔
میں دل میں سوچ رہا تھا کہ سب بھول بھی گیا تو میرا ایڈریس دینے سے انکار تو یاد رہے گا اور اس نے یہی بات کی۔ ''سب بھول جاؤں گی مگر تمہاری یہ سچی بات ہمیشہ یاد رہے گی۔''
میں نے کہا۔ ''اگر تم وعدہ بھی کرتی کہ میں خط لکھوں گی تو اردو میں اپنے یہ دو اشعار سناتا۔''
وہ بولی۔ ''ہاں سناؤ۔''

مجھ کو یاد رکھنا تھا، نہ تم نے یاد آنا تھا
یہ مطلب تو تسلیاں تھیں، یہ ساتھ کہاں پرانا تھا؟

میں نے ترجمہ کیا اور وہ دونوں مسکرانے لگیں۔
جاناں بولی۔ ''بہت ڈیپ (Deep) بات کی ہے۔'' مسکرائی پھر بولی۔ ''اب کسی سے ایڈریس نہیں لوں گی۔ صرف اسی سے لوں گی جس سے رابطہ رکھنا ہوگا۔''
جولین بولی۔ ''یقیناً تم شادی شدہ ہو۔''

''ہاں دو بچے بھی ہیں۔ میری جان ان میں پھنسی ہے۔ اپنی بیوی کو بے پناہ چاہتا ہوں۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

''تو زندگی میں اور کوئی نہیں آیا؟'' جاناں کریدنے لگی۔

میں بولا۔ ''آتے جاتے رہے مگر اب جو آئی وہ جانے کے لیے نہیں دل میں گھر کر بیٹھی ہے۔''

حیرت سے بولی۔ ''میں کچھ نہیں؟''

''تم واقعی نہیں سمجھو گی کیونکہ مشرق بہت پُراسرار ہے۔ وہاں انہونی باتیں ہوتی ہیں۔'' میں کہہ کر ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''واپس چلتے ہیں۔ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

ہم واپس پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ معلوم نہیں سب کہاں بھٹک رہے تھے۔

کہاں جاسکتے تھے۔ ادھر آس پاس ہی ہوں گے۔ یہ سوچتے ہوئے ہم فرش پر بیٹھ گئے۔ میٹس بھی لے گئے تھے۔

جولین کو ٹھنڈ لگ رہی تھی تو میں نے اپنی جیکٹ اسے دے دی۔ اس نے بھی انکار نہ کیا اور اپنے کندھوں پر ڈال لی۔ ہمارے اردگرد بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ تھک کر بھی سب خوش نظر آرہے تھے۔ سب کی نظریں رنگ بدلتے فواروں پر تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھر شو شروع ہوا، فواروں کے اوپر آسمان پر چلتی پھرتی تصویریں تھیں۔ ساؤنڈ افیکٹ سے ان کے ڈائیلاگ ہم سن رہے تھے۔ یہ تصویریں یا متحرک کردار کبھی ہمارے اوپر آجاتے اور کبھی دور چلے جاتے۔ کوئی کہانی تھی جو دکھائی جارہی تھی۔ ہماری کہانیوں میں ہمیشہ شہزادہ گلفام کسی شہزادی کو چھڑوانے دیو کے دیار میں جا نکلتا ہے اور ان کے ہاں شہزادہ اپنی سینڈریلا کا ایک جوتا اٹھائے اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ گلفام کو اپنی شہزادی جہاں آرا مل جاتی ہے اور یہاں سنڈریلا اپنے شہزادے کے ہمراہ آخر میں رقص کر رہی ہوتی ہے۔ تہذیبیں مختلف ہیں مگر دونوں کی خوشی ملاپ میں ہے۔ ظالم کو شکست دینے پر دونوں تہذیبیں تالیاں بجاتی ہیں کیونکہ خصلتیں ایک ہیں مگر ظلم و ناانصافی بھی دونوں کرتے ہیں کیونکہ طاقت کا نشہ سب کی فطرت میں ہے۔

رنگین کردار فضا میں تھرکتے تھے اور ہم دلچسپی سے اسے دیکھتے تھے۔

اولڈ سٹی ہال کی محرابیں، مخروطی چھتیں، مینارے، ایک

پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور، ایک منفرد اور قدیم بھولا بسرا اشاعتی ادارہ ہے۔ اس ادارے کے مالک عبدالرؤف ملک اپنی زندگی کی نو دہائیاں گزار کے دسویں دہائی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ وہ یکم اکتوبر 1926ء کو لاہور ہی کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جو اہل حدیث مسلک سے منسلک تھا۔ اس زمانے میں جمعیت اہلحدیث کے سربراہ مولانا داؤد غزنویؒ تھے۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے ابوبکر غزنوی مرحوم عبدالرؤف ملک کے ہم عمر تھے اور دونوں پہلی جماعت سے بی اے تک اکٹھے پڑھتے رہے۔

ملک صاحب زمانۂ طالب علمی سے مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں طلبہ کی مختلف ترقی پسند تنظیموں سے وابستہ رہے۔ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سیکریٹری بھی منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ تین بار ملاقات اور باہمی گفتگو کے مواقع بھی نصیب ہوئے اور ان کے ساتھ چند تصاویر آج بھی ''نظریۂ پاکستان'' کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ عبدالرؤف ملک کو ان کے مذہبی اور سیاسی پس منظر نے اجتہادی اور جہادی غور و فکر کی طرف مائل کیا جو بتدریج انہیں ریڈیکل اور مارکسی نظریات کا مطالعہ کرنے کی طرف لے گیا۔ اس طرح ان کا رابطہ اس دور کے معروف کمیونسٹ رہنماؤں اور انقلابیوں سے ہوا اور وہ دسمبر 1945ء میں متحدہ ہندوستان کی بڑی فعال کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن بن گئے۔ آزادی کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی پاکستان کے کل وقتی رکن بنے۔ پارٹی کے سیکریٹری جنرل کامریڈ سجاد ظہیر نے انہیں پارٹی کے اشاعتی ادارہ پیپلز پبلشنگ ہاؤس کا انچارج مقرر کیا تھا۔

مرسلہ: انیس الرحمن۔ لاہور

سو تین میٹر بلند گھنٹا گھر، گول کھڑکیاں۔ سب روشنی میں نہائیں ہمارے سامنے تھیں۔ اس کے گرے براؤن پتھر چمک رہے تھے۔ وہ پانچ منزلہ عمارت پورے ماحول پر حاوی تھی۔ نظریں کہیں بھی بھٹکتی رہتیں مگر آخر ٹھہرتیں اسی پر تھیں۔ گو وہ صرف سو سال پرانی تھی مگر ارد گرد کی جدید عمارتوں نے اسے بے حد قدیم بنا رکھا تھا۔

جولین نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ اولڈ سٹی ہال کتنا اولڈ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جاناں بتائے گی کیونکہ اسے مجھ سے زیادہ معلوم ہوگا۔''

''یہ اولڈ سٹی ہال ہے۔ پہلے ٹورنٹو سٹی گورنمنٹ کے دفاتر یہاں پر تھے مگر اب یہ کورٹ ہاؤس ہے اور صوبائی حکومت نے سٹی گورنمنٹ سے کرائے پر لی ہوئی ہے۔'' جاناں نے معلومات بہم پہنچائیں۔

جولین بولی۔ ''اور ہاں؟''

جاناں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور کیا اتنی معلومات میرے لیے بہت ہے۔''

میری جانب مڑ کر جولین بولی۔ ''آپ بتائیں۔''

''یہ 1899ء کو سٹی کونسل کے حوالے کی گئی اور اس میں دس سال کام ہوتا رہا۔ اس وقت اس پر پچیس ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ 1966ء میں سٹی کونسل نے سامنے دو عمارتیں تعمیر کیں تو یہ صوبائی حکومت کو کرائے پر دے دی گئی اور اس نے یہاں کورٹ ہاؤس بنایا۔ پہلے کورٹ ہاؤس لارنس مارکیٹ میں ہوا کرتا تھا۔'' میں نے بتایا۔

جولین ہنستے ہوئے بولی۔ ''اور؟''

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور ایک براؤن بالوں اور سبز آنکھوں والی پیاری سی لڑکی شاید تھک چکی ہے۔ وہ سونا چاہتی ہے اور وہ کسی سے بار بار کہتی ہے کہ مجھے بیڈ ٹائم اسٹوری سنائیں تو تب سوؤں گی مگر مجھے معلوم ہے کہ رات بھر اسے فیری ٹیل کہانیاں بھی سناتے رہو تو یہ پھر بھی کہے گی اور......اور......''

ان دونوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ جاناں بولی۔ ''انٹرسٹنگ۔''

میں نے جولین سے کہا۔ ''پیاری سی لڑکی کافی تو پلا دو۔ معلوم نہیں وہ سب کب آتے ہیں۔''

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلو سامنے سے لے آتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جاناں کو لے جاؤ۔ یہ نہیں تھکی کیونکہ ابھی تک ہنس رہی ہے۔''

وہ دونوں ہنستے ہوئے کافی لینے چلے گئے۔

ہماری مختصر رفاقت ایک بے ضرر دوستی میں بدل گئی تھی۔ مجھے آج بھی وہ لڑکیاں یاد آتی ہیں کیونکہ ہم چند گھنٹوں کے لیے ہنستے ہوئے ملے تھے اور ہنستے ہوئے جدا ہو گئے تھے مگر جاناں سے ایک بار اور اسکاٹ لینڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔

میں دس سال کا ہوں گا تو لاہور گیا تھا۔ ہمارے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ میں ایک خاندان رہتا تھا۔ وہاں دو بھائی میری عمروں کے تھے۔ ہماری دوستی ہوگئی تھی۔ ہم شاہ عالمی میں گھوما کرتے تھے۔ پتنگ اڑایا کرتے، ٹی وی ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھتے۔ میرے بڑے بھائی لاہور میں تھے اور جیب خرچ کے لیے اچھے خاصے نوٹ مجھے تھما دیتے تھے۔ میں انہیں اپنے دوستوں کے ہمراہ خرچ کرتا اور وہ مجھے فضول خرچی سے باز رہنے کی نصیحتیں کرتے۔ وہ مجھے معلوم نہیں کیوں بہادر سمجھتے تھے۔ ایک لڑکے کے ساتھ مجھے لڑانے لے گئے۔ اس سے کہنے لگے کہ ہم کو تو تم نے مارا تھا مگر ہمارے اس دوست سے لڑ کر دکھاؤ جو سرحد سے آیا ہے۔ سامنے والا لڑکا پانی کے ایک حوض کے قریب لنگوٹ باندھ کر کھڑا نہانے جا رہا تھا۔ وہ حقارت سے میری جانب بڑھا اور میں نے خوف کے عالم میں اسے اٹھا کر حوض میں پھینک دیا۔ وہ گیلا ہو کر غصے میں باہر نکلا تو میں نے سوچا کہ یہ تو اب مجھے خوب مارے گا۔ میں نے اس سے دور رہنے کے لیے دوبارہ سے اسے حوض میں پھینک دیا اور دوبارہ وہ نہ نکلا بلکہ اندر ہی کھڑا گالیاں دینے لگا۔ گالی سن کر میں بپھر گیا اور ساتھ پڑی اینٹ اٹھالی۔ وہ تو پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہو گیا اور مجھے میرے دونوں دوستوں نے پکڑ لیا۔ باعزت و احترام واپس لائے۔ راستے میں پان کھلایا اور ہماری دوستی اور زیادہ پکی ہوگئی۔ سالوں گزر گئے مگر میں ان کے نام بھولا اور نہ چہرہ۔ اب بھی یاد آتے ہیں اور بہت یاد آتے ہیں۔ مختصر دوستیاں بھی کبھی بہت گہری ہوتی ہیں۔

لاہور سے واپس ڈیرہ آنے پر میں کافی عرصہ پیپل کے پتوں پر چٹنی ڈالے پان کی طرح چباتا رہتا تھا۔ وہ تو تب چھوڑا جب ایک بار پکڑا گیا اور ماں سے خوب مار کھائی تھی۔

وہ دونوں کافی کے گلاس پکڑے واپس آئیں اور

ساتھ بیٹھ گئیں۔ گو کافی مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگی مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ ماحول کافی سے ہی بنتے ہیں۔
میں نے گرم کافی کا تلخ گھونٹ بھر کر کڑواہٹ سے جولین سے پوچھا۔ ''کچھ اسکاٹ لینڈ کے بارے میں بتاؤ۔ شاید کبھی آنے کا موقع ملے۔''
''کیا بتاؤں؟'' جولین سوچتے ہوئے بولی۔
''اچھا یہ بتاؤ ہم اسکاٹ لینڈ (اسکاٹ لینڈ) کیوں آئیں؟'' جاناں نے پوچھا۔
''اس لیے کہ میں وہاں ہوں۔'' جولین نے سادہ سا جواب دیا۔
میں نے کہا۔ ''اور؟''
''اور یہ کہ اسکاٹ لینڈ کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا اس کے آگے ختم ہو جاتی ہے۔ آگے سمندر اور پھر آگے نارتھ پول۔''
جاناں نے پوچھا۔ ''اور؟''
''اسکاٹ لینڈ کا ایک تہائی ہائی لینڈ ہے۔ پہاڑ ایسے ہیں کہ جیسے گرے، گرین اور براؤن قالین ان پر بچھے ہوں۔ وادیاں سرسبز ہیں اور جھیلیں اگر دیکھنی ہیں تو آپ لوگ اسکاٹ لینڈ ضرور آئیں۔''
میں نے کہا۔ ''یہ تو ہم جانتے ہیں کہ گلاسکو اور ایڈنبرا اس کے بڑے شہر ہیں، ان شہروں میں دیکھنے کو کیا کیا خاص مقامات ملتے ہیں؟''
''ہمارا ملک بہت پُرامن ہے۔ دو سال سے ہم نے کوئی جنگ نہیں لڑی، لوگ جلدی دوست بن جاتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ یورپ کا واحد علاقہ ہے جہاں ابھی تک گھروں میں فیملی سسٹم برقرار ہے۔ پورا گھرانا مل جل کر ایک ہی گھر میں رہتا ہے۔ ایڈنبرا بہت پرانا شہر ہے۔ تمام تعمیرات قدیم اور دلکش ہیں۔ پرانے چرچ، گھنٹا گھر ابھی تک اصل حالت میں موجود ہیں۔ بیشتر عمارتیں تین چار چھ منزلہ اور پرانی ہیں۔ فوٹوگرافی کے لیے اسکاٹ لینڈ یورپ کا خوب صورت ترین مقام ہے۔'' جولین نے تفصیل سے بتایا۔
میں نے پوچھا۔ ''سنا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی طرح وہاں کی معیشت میں بھی دودھ، مکھن، مویشی، بھیڑیں، گندم کا بہت عمل دخل ہے۔''
کہنے لگی۔ ''ہاں، بہت زیادہ۔ گو کہ زیادہ لوگ میدانی علاقوں میں رہتے ہیں مگر آپ ہائی لینڈ جائیں تو وہاں سرسبز اور لہلہاتے کھیت، جانوروں کی غذا سے اٹی چراگاہیں اور ان میں چرتے جانور۔ یہ سب ہر دیکھنے والے کو حیران رکھتے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''فشنگ کا تو مجھے تم بتا چکی ہو۔ سمندر، جھیلیں اور دریا قسم قسم کی مچھلی سے بھرے پڑے ہیں۔''
جاناں نے پوچھا۔ ''گھر بڑے بڑے ہیں یا چھوٹے؟''
''گھر چھوٹے مگر آرام دہ اور بہت دلکش نظر آتے ہیں جب آپ انہیں قطار در قطار کھڑا دیکھیں۔''
''چالیس سال پہلے یہاں کے لوگ اپنا ملک چھوڑ گئے تھے کیونکہ نوکریاں نہیں تھیں مگر اب صورتِ حال قابو میں ہے۔''
میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اور؟''
وہ بولی۔ ''اور بھی بہت کچھ ہے مگر اب نہیں بتاؤں گی۔ جب آپ لوگ آئیں گے تو خود دکھانے لے جاؤں گی۔''
جاناں نے اس سے ایڈریس لے لیا۔ ای میل اور فون نمبر سب ڈائری میں ڈال دیے۔
''نیلی اور گہری جھیلیں ہیں جن میں چھوٹے سرسبز جزیرے ہیں۔ ان جزیروں پر لارڈز کے محلات تھے۔ اب یہ محلات ہوٹل بن چکے ہیں۔''
پڑھی ہوئی معلومات کو خیالوں میں لاتے ہوئے میں نے کہا۔ جولین بولی۔ ''میں تو ان محلات میں کبھی نہیں رہی مگر ان میں کچھ وقت، کچھ شامیں اور راتیں گزارنا کسی کے لیے بھی ایک خواب اور فینٹسی سے کم نہیں ہوگا۔ وہ جزیرے جن پر بے شمار درخت، پھول اور لش گرین گھاس ہے۔ جزیروں پر جھیل کنارے بے شمار درخت اور ایسے قلعے ہیں جہاں آپ ساری دنیا سے کٹ کر صرف جھیل کے روبرو ہوتے ہیں۔ بوٹس ہر وقت موجود ہوتی ہیں اور جب بھی جی چاہے آپ جھیل کے بیچوں بیچ بوٹ بند کر کے بیٹھ جائیں۔ تم آنا ضرور۔ میں تمہیں لے چلوں گی۔''
اس نے اپنا فون نمبر اور ای میل ایڈریس جاناں سے کاغذ لے کر اس پر لکھ کر دے دیا۔ اس سے میں نے کہا کہ اسکاٹ لینڈ جب بھی آیا تو رابطہ کروں گا۔
میں انہیں پاکستان کے بارے میں بتاتا رہا اور وہ مجھے اپنے اپنے ملکوں کی سیر کراتی رہیں۔ خاص کر جولین کے ساتھ آج زیادہ وقت گزرا تھا۔ اس لیے اس کی بے شمار خوبیاں بھی مجھ پر کھلی تھیں۔ سنجیدہ، بردبار اور کم گو۔ ہر بات

میں معنی پنہاں تھی اور زبان سے کوئی بات اِدھر اُدھر کی ادا نہیں ہوئی تھی۔ جاناں شوخ وشنگ تھی۔ اپنی خوب صورت ہنسی اور شکل کا اسے بھی ادراک تھا اور استعمال بھی خوب کرتی تھی۔

جاناں سے ٹائم پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ آخری سب وے ٹرین ایک بجے جاتی تھی۔ ان لوگوں کی کوئی خبر نہ تھی کہ کہاں گھوم پھر رہے ہیں۔ فلیس اسکوائر پر بھیڑ کم پڑ چکی تھی مگر پھر بھی بہت سے لوگ ہمارے قرب وجوار میں بیٹھے تھے۔ جوتے سامنے رکھے ہیں اور چادروں پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہیں۔ یہ سب ٹورسٹ ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے لگ کر اپنی اپنی سوچوں میں گم ہیں جو اکیلے بھی بیٹھے ہیں وہ بھی کچھ سوچ کر مسکرا رہے ہیں جو بانہوں میں بانہیں ڈالے بیٹھے ہیں، وہ بھی مسکرا رہے ہیں۔ یہ وہ ٹورنٹو ہے جس کے بارے میں پاکستان میں بیٹھ کر پہروں سوچتا تھا اور یہی وہ ٹورنٹو ہے جہاں آج بیٹھا پاکستان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس کے لوگوں سے، اس کی زمین اور ہوا سے مجھے اتنی محبت ہوگی اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔ اپنے دیس کے لوگوں کو کیا بتاؤں کہ جب بھی اس کا سوچتا ہوں آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، سدا آباد رہے میرا وطن، سدا خوش رہیں میرے ہم وطن۔

کچھ دیر بعد پیچھے سے خان قیصر کی لاہوری پنجابی میں آواز آئی۔ ''تم کڑیوں کو لے کر یہاں بیٹھے ہو۔ ہم تمہیں پورے ڈاؤن ٹاؤن میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔''

مڑ کر دیکھا تو سب موجود ہیں مگر سرجی اور میکی نظر نہیں آ رہے۔ میں نے تشویش سے ان کے بارے میں پوچھا تو خان ہی نے جواب دیا۔

''وہ تو ہمارے ساتھ گئے ہی نہیں تھے۔ وہ تو آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہی کہیں منہ کر گئے۔''

''اور سرجی اپنا بڑا اسفری بیگ بھی ساتھ لے گئے؟'' میں نے پوچھا۔

شہباز نے جواب دیا۔ ''ہاں وہ سرجی کے ساتھ بڑا بڑا لگ رہا تھا تو میکی نے اٹھا لیا تھا۔'' وہ لوگ پلاسٹک کی شیٹیں بچھا کر قریب ہی بیٹھ گئے۔

جاناں بولی۔ ''مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ میرا ہوٹل قریب ہی ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ہنسی تو جیسے کوئل بول اٹھی۔ پھر بولی۔ ''بہت اچھا وقت آپ لوگوں کے ساتھ گزرا۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

مفتی جو ایک لڑکی کے سائیڈ میں کھڑا معلوم نہیں کہاں پہنچا ہوا تھا وہ بولا۔ ''آپ بہت خوب صورت ہیں۔ ہمیں بھی یاد رہیں گی۔''

پھر باری باری وہ شہباز اور خان کے علاوہ سب سے گلے ملی۔ مجھ سے ملی تو پتا چلا کہ وہ گالوں سے گال بھی ملا رہی ہے مجھ سے ملائے، ہنسی اور پھر چلی گئی۔

ہم دوبارہ بیٹھ گئے۔ جولین نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھا تو کہا۔ ''اس کو اپنا فون نمبر اور ای میل کیوں نہیں دیا جب کہ وہ مانگ بھی رہی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ اس کا پروفیشن ہے اور پروفیشنل لوگ ہماری طرح جذباتی نہیں ہوتے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہمیں یہاں سے جاتے ہی بھول جائے گی۔''

لڑکیاں بتا رہی تھیں کہ ہم اِدھر اُدھر آوارہ گھومتے رہے۔ پھر ایک پارک میں جا بیٹھے اور وہاں مطیع نے ہمیں پاکستان کے لطیفے سنائے۔ وہاں ایک بینڈ کا کنسرٹ ہو رہا تھا، ہم نے وہ سنا اور ڈانس کر کے خوب ہنگامہ کیا۔

میں نے مطیع سے پوچھا۔ ''کیسا ہنگامہ کیا؟''

اردو میں بولا۔ ''یہی کہ شہباز بہانے کر کے لڑکی کو اٹھا لیتی، اس کو پھر چھوڑتی تو وہ بھاگ جاتا تو یہ پھر اٹھا لیتی۔''

''اور مفتی نے کیا ہنگامہ کیا؟''

''میتی (مفتی) اٹھا نہیں سکتی تھی تو لڑکی کو گدگدیاں کرتی تھیں۔''

''اور خان؟''

''لڑکیوں نے خان سے شروع میں کہہ دیا ہے۔ ہمارے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔''

''اور تم؟''

''سوات کا پٹھان ان کافروں کو کہاں گھاس ڈالتی ہے۔ بس کبھی کبھار غلطی سے جوش میں آ کر گلے لگ گئی تھی۔''

ہم گپ شپ کر رہے تھے کہ سامنے سے سرجی اور میکی آتے دکھائی دیے۔ میکی نے سرجی کا بیگ اٹھا رکھا تھا اور دونوں بہت خوش وخرم دکھائی دیتے تھے۔

وہ قریب آئے تو میں نے سرجی سے کہا۔ ''وقت دیکھا ہے؟ لفنگے بھی گھروں کو سدھار گئے اور ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں؟''

خان مسکرا کر بولا۔ ''کہاں سے آرہے ہیں؟''
میگی بولی۔ ''یہ مجھے ڈاؤن ٹاؤن کی ویران گلیاں دکھانے لے گئے تھے۔ کہتے تھے کہ یہاں اکثر ٹی وی ڈراموں کی شوٹنگ ہوتی ہے مگر پھر یہ راستہ بھول گئے۔''
''ڈراموں کی شوٹنگ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
سرجی سٹپٹا کر بولے۔ ''ہاں پچھلے دنوں بھی ایک ڈراما میں نے دیکھا تھا۔ ساری شوٹنگ یہیں آس پاس ہی ہوئی تھی۔''
میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔
مطیع بولا۔ ''سرجی تو لوکیشن بھی دیکھ آئے؟''
مفتی بولا۔ ''اب چلنے کا کیا پروگرام ہے؟''
''سانس تو لینے دو۔ آتے ہی ہمیں نشانے پر رکھ لیا ہے۔'' سرجی بولے اور پھر میگی کو لے کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہجوم آہستہ آہستہ اسکوائر سے چھٹ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ زمین پر کوئی لفافہ، کوئی گند بلکہ ایک تنکا بھی نہیں ہے۔ سیاح خود ہی وہاں کی صفائی کر رہے تھے۔ سوچتا تھا کہ یہ تربیت انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہوگی۔ جواب بھی میرے پاس تھا کہ مغرب کے اسکولوں میں بچے جب پری اسکول میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں اپنی جسمانی صفائی اور پھر جگہ کی صفائی کی تربیت کلاس ہی میں دے دی جاتی ہے۔ کلاس میں چیزیں فرش پر بکھیر دی جاتی ہیں اور بچہ ہر چیز کو اپنی جگہ قرینے سے رکھتا جاتا ہے اور کاغذ کے ٹکڑے وغیرہ ڈسٹ بن کی نذر کر دیتا ہے۔ ان بچوں کے پاس کوئی کاپی پینسل نہیں ہوتی بلکہ کلاس روم میں تعلیمی کھلونے وغیرہ ہوتے ہیں۔
ایک لڑکی نے کہا۔ ''جانے سے پہلے اگر کوئی کچھ کہنا چاہیے؟''
سب سوچ میں پڑ گئے۔ اس بات پر ایک خاموشی سی چھا گئی۔ بلاشبہ ہمارے ساتھ لڑکیوں نے بھی ایک دوسرے کی کمپنی کو بہت انجوائے کیا تھا۔ اتنے بھرپور ساتھ کے بعد اچانک ہمیشہ کے لیے بچھڑنا بھی اداس کر دیتا ہے۔ دونوں باتیں یقینی تھیں کہ جدا بھی ہونا تھا اور افسردہ بھی۔ لڑکیاں ہمارے ساتھ ایسے گھل مل گئی تھیں کہ نہ جانے کب سے ہمارا آپس کا ساتھ ہے۔ سرجی کچھ سوچ کر بولے۔ ''یہ سچ ہے کہ میں ایک لڑکی کو چاہتا تھا جو میگی کی طرح دکھتی تھی۔ میں نے میگی کو سچ بتا دیا ہے کہ مطیع کی بھوت والی کہانی صرف گپ تھی۔ دوستی یا کسی بھی رشتے میں جھوٹ نہیں ہونا چاہیے، کوئی بھی رشتہ یا تعلق جھوٹ پر بنتا ہے تو وہ پائیدار نہیں ہوتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میگی نے بھی میرے سچ کو سراہا اور بھوت کہانی پر بہت ہنسی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم دوبارہ کبھی ملتے ہیں یا نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ جب بھی ہم ایک دوسرے کو یاد کریں گے تو عزت و تکریم سے یاد کریں گے۔''
سرجی کا اعتراف سن کر پہلے تو میں حیران رہ گیا مگر بعد میں ان کے لیے عزت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ تمام لڑکیاں اور ہم سب دوست بھی سرجی کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''اتنے اچھے دن کا اتنا خوب صورت اختتام ہوگا، اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ آج کا دن بہت خوب صورت اور یادگار تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔''
میگی بولی۔ ''سرجی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور تین بچوں کے باپ ہیں۔ یہ سچے انسان ہیں۔ بہت مخلص اور خیال رکھنے والے۔ عام مردوں کی طرح فلرٹ نہیں ہیں۔ میں سرجی سے رابطہ رکھوں گی اور یہ بھی رکھیں گے۔ ہماری دوستی ایک مضبوط دوستی ہوگی۔''
ایک لڑکی کہنے لگی۔ ''اتنا ڈرامائی اختتام بھی آج کے دن کا ہوگا؟ میں صرف یہ کہہ پاؤں گی کہ آج کا دن بہت اچھا تھا۔ اچھے لوگ تھے اور اچھا وقت گزرا۔''
پھر سب نے کچھ نہ کچھ کہا۔ آخر میں جولین بولی۔ ''میں ایک اداس دل کے ساتھ آپ سب سے جدا ہو رہی ہوں۔ ابھی کچھ اور دن ہم کینیڈا میں ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سارے دن میں آپ لوگوں کو مس کروں گی۔ آپ اگر اسکاٹ لینڈ آئیں تو ضرور رابطہ کریں۔ دوبارہ ملنے کا انتظار کروں گی۔''
گپ شپ اور مذاق میں بنا ایک تعلق سنجیدگی اختیار کر گیا اور آخری لمحوں میں دوستی میں بدل گیا پھر ہم ایک دوسرے سے ملے۔ سب اداس تھے۔ مغموم تھے اور ایک دوسرے کی جانب زیادہ دیکھتے بھی نہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ رخصت ہوتے وقت سرجی کوئی ڈراما کریں گے مگر وہ مسکراتے رہے۔ لڑکیاں چلی گئیں اور جب ہم واپس اپارٹمنٹ پہنچے تو سب خاموش اور تھکے ہوئے تھے اور رات کا ایک بج رہا تھا۔

(جاری ہے)

جہانِ دیگر

شیراز خان

یہ دنیا، پیاری سی دنیا اپنے اندر کیسے کیسے عجائبات رکھتی ہے جو سامنے آئے تو ہم دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتے ہیں۔ ایسے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہی میں سے چند انوکھی، حیران کردینے والی باتیں۔

ان مقامات کا تذکرہ جو عقل کو دنگ کردے

یہ دنیا بہت عجیب ہے، بہت دلچسپ بھی ہے۔

ہم اگر پوری دنیا کو گھوم پھر کر دیکھنے کا موقع حاصل کرلیں تو بقول میر ”سرسری تم جہان سے گزرے۔ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا۔“

ہماری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں۔ ہم پر ایسے ایسے بھید آشکار ہوں کہ ہم گنگ ہوکر رہ جائیں۔

نہ صرف مناظر ہمیں متوجہ اور حیرت زدہ کرتے ہیں۔ بلکہ واقعات بھی پریشان کر کے رکھ دیتے ہیں۔

کیوں ہوا ایسا؟ کیوں کر ہوا؟ ہم اس جہان سے اگر سرسری گزر جائیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ نارمل ہے لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو بہت کچھ ہے۔

چلیں کچھ واقعات کی ابتداء کرتے ہیں۔

یہ زمانہ 1587ء کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مختلف ممالک کے لوگ اپنے اپنے وطن سے ہجرت کر کے کہیں اور قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ کسی کو سونے کی تلاش تھی۔ کوئی نئی کالونی آباد کرنا چاہتا تھا۔ اسی کھوج میں بہت سے لوگ جان وہائٹ کے ساتھ شامل ہوگئے، وہ ایک مہم جو تھا۔ اس کا کام یہی تھا کہ وہ انجانی زمینوں کی سیر کرتا رہے اور نت نئے مواقع تلاش کرے۔

لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ ایک باہمت انسان ہے اور جس بات کا ارادہ کرلیتا ہے اس کو مکمل کر کے رہتا ہے۔

اس بار اس نے اعلان کیا کہ وہ رون کے آئی لینڈ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہاں امکانات بہت زیادہ ہیں۔

جان انگلینڈ کا باشندہ تھا۔ لوگوں نے اس کے اعلان کو سنا اور اس کا ساتھ دینے کو تیار ہوگئے۔

رون کے آئی لینڈ موجودہ کیرولینا میں تھا۔

اب سامانِ سفر کی فکری ہوئی۔ طے پایا کہ اس پہلے سفر میں عورتوں اور بچوں کو نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ صرف مرد حضرات چلیں گے اور وہاں امکانات دیکھ کر واپس آکر اپنے گھر والوں کو لے جائیں گے۔

یہ قافلہ پچاس افراد پر مشتمل تھا جس کا لیڈر خود جان تھا، کیوں کہ یہ تحریک اسی کی تھی۔

یہ سفر ایک پرانے بحری جہاز سے شروع ہوا تھا۔ اس کی حالت اگرچہ زیادہ بہتر نہیں تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ جہاز منزل تک پہنچا سکتا تھا۔

سفر شروع ہوا۔ سمندر میں اگرچہ طغیانی بھی تھی اس کے باوجود یہ جہاز خیر وخوبی کے ساتھ کیرولینا کے ساحل پر پہنچ گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں ویرانی ہوگی کون رہتا ہوگا؟ لیکن جب انہوں نے ساحل پر کچھ لوگوں کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔

ساحل والوں نے بھی جہاز کو لنگرانداز ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے جہاز والوں کے پاس آگئے۔

جان اور اس کے ساتھیوں نے اس قسم کے ویران علاقوں میں رہنے والوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ اس طرح کے لوگ وحشی ہوتے ہیں۔ وہ کسی اجنبی کو برداشت نہیں کرتے۔

لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ لوگ بہت مددگار اور دوست مزاج ثابت ہوئے تھے۔

وہ جان اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ اپنے مہمان کے طور پر لے گئے۔ جان اور اس کے ساتھی ان کی زبان سے ناآشنا تھے وہ لوگ جو زبان بول رہے تھے۔ وہ یورپ میں اس وقت بولی جانے والی کسی زبان سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ انہیں اپنے ساتھ ایک بستی میں لے آئے۔ جان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ

وہ ایک منظم قسم کی بستی تھی جس میں دکانیں بھی تھیں۔ پختہ گھر بھی بنے ہوئے تھے۔ شجر کاری بھی بہت سلیقے سے کی گئی تھی۔

جان اور اس کے ساتھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اس بستی کی لڑکیاں بہت خوب صورت تھیں۔ شوخ و چنچل جوگیوں میں رنگین تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں۔ ان اجنبی لوگوں کو دیکھ کر وہ لڑکیاں ان کے ارد گرد جمع ہوگئی تھیں۔

ان میں سے ایک لڑکی ایسی تھی جس کی نگاہیں جان پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک جوان اور بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ خود جان بھی اس وقت بہت ہینڈسم تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے گھنگریالے بال ایک خاص انداز سے اس کی پیشانی پر پڑے رہتے تھے۔

جان نے ان خوب صورت نگاہوں کی پسندیدگی محسوس کرلی تھی۔

اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اسی بستی میں قیام کرے گا اور پھر یہیں سے زندگی کے نئے سفر کی ابتداء کرے گا۔

اس نے رات کے وقت اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ سب کے سب اسی مقصد سے تو اپنے وطن سے نکلے تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ وہ یہیں اپنا مستقل ٹھکانا کرلیں گے۔

اس رات جان کو بہت دیر تک نیند نہیں آسکی تھی۔ اس لڑکی کا خیال آتا رہا تھا۔

صبح وہی لڑکی اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ان لوگوں کو دو مختلف جھونپڑیوں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ دونوں جھونپڑیاں بہت بڑی بڑی تھیں۔ جان جب صبح صبح اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا تو وہی لڑکی دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے جان کو دیکھ کر کہا۔ ''اجنبی صبح بخیر۔''

''تم انگریزی جانتی ہو۔'' جان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یہاں بہت سے لوگ انگریزی جانتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''لیکن کیسے؟''

''یہاں تم جیسے مسافر آتے رہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم نے ان ہی سے تمہاری زبان سیکھی ہے۔''

جان کے لیے یہ ایک خوشگوار بات تھی۔ اس نے لڑکی کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام سلویا بتایا تھا۔ یہ بھی ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اس دن وہ بہت دیر تک اس لڑکی

سچ کی تلاش

حبیب اللہ کلکانی کابل کے نزدیک شمالی کے رہنے والے تھے۔ وہ تاجک برادری سے تعلق تھے۔ اس وقت (1929ء) میں افغانستان پر امان اللہ کی بادشاہت تھی۔ امان اللہ مغربی ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ترکی میں اتاترک مغربی اصلاحات و ثقافت نافذ کر چکے تھے۔ امان اللہ نے بھی انہیں نافذ کرنا چاہا۔ ترک عوام نے چار و ناچار حکومتی اقدام کو قبول کرلیے لیکن افغان عوام اپنی اسلامی اقدار کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ کابل میں افغانی ردِعمل کی لہر اٹھی اور آناً فاناً تمام ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔ امان اللہ کی فوج کا ایک بڑا حصہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جلد ہی یہ طوفان شمالی تک پہنچ گیا۔ افغانی ہمیشہ سے قبائل اور گروہوں کی صورت میں رہے ہیں اور اپنے سردار یا جرگہ کا فیصلہ مانتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اب تک برقرار ہے۔ شمالی میں حبیب کلکانی اپنے قبیلے کا ایک مضبوط اور بہادر سردار تھا۔ تمام متحارب گروپ اپنے سرداروں کی سرکردگی میں بادشاہ امان اللہ کے خلاف متحد ہو گئے۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو امان اللہ اپنا تخت اپنے بھائی عنایت اللہ کے سپرد کر کے کابل سے فرار ہوگیا۔ کچھ روایات کے مطابق ان متحارب گروہوں کے سرداروں کی طرف سے نئے بادشاہ عنایت اللہ کو خط بھیجا گیا کہ یا تو وہ امان اللہ کی نافذ کردہ نام نہاد اصلاحات واپس لے لے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ خط کے جواب میں تخت ہی سے دست بردار ہوگیا۔ ان متحارب گروپوں میں سب سے مضبوط سردار حبیب اللہ تھے لہٰذا متفقہ طور پر انہیں حکومت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حبیب اللہ بادشاہت کے نظام کے خلاف تھا اس لیے اس نے خادم دین رسول اللہ غازی حبیب اللہ کہلوانا پسند کیا۔ بعدازاں نادر شاہ نے طاقت اکٹھی کر کے حبیب اللہ اور ان کے ساتھیوں سے حکومت چھین لی۔ ان پر بغاوت اور لوٹ مار کے الزامات لگا کر پھانسی دے دی اور تمام ساتھیوں سمیت ایک گڑھے میں پھنکوا دیا۔

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی، کراچی

کے ساتھ رہا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے جان سے پوچھا۔ ''اب (تم واپس تو نہیں جاؤ گے نا؟''
''نہیں، میں جلد سے جلد واپس جاؤں گا۔'' جان نے بتایا۔ ''تاکہ میں اسی طرح جلد سے جلد وہاں کے معاملات نمٹا کر تمہارے پاس آسکوں۔''
جان کے ساتھ آنے والوں کا بھی یہی ارادہ تھا۔ ان سبھوں کو یہ علاقہ بہت پسند آیا تھا۔ وہ سب اسی جہاز سے واپس آگئے۔ اب انہیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس بستی میں انگریزی جاننے والے اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔
وطن واپس پہنچ کر ان سبھوں نے اپنی دریافت کے بارے میں بتادیا۔ ایک نیا امکان دنیا کے سامنے آگیا تھا۔ ایک بڑی نوآبادی وجود میں آنے والی تھی۔ انہیں واپسی کی جلدی تھی۔ کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کسی سے پیانِ وفا باندھ کر آیا تھا۔
ایک مہینے کے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ اس بار ان کے ساتھ تیس چالیس نئے افراد بھی تھے۔
یہ سب بہت بے تابی سے ساحل پر اترے تھے لیکن اس بار انہیں ساحل پر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایک سناٹا تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ بڑھتے چلے گئے لیکن کچھ بھی نہیں۔ حیرت انگیز طور پر اس بستی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔
ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس سے یہ پتا چل سکے کہ یہاں کوئی بستی بھی ہوا کرتی تھی۔ بستی کے گھر وہاں کے لوگ سب کے سب نہ جانے کہاں غائب ہو چکے تھے۔ زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ کوئی آثار نہیں۔
ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ دیکھ کر گئے تھے وہ خواب تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔
یہ دنیا کی چند بڑی مسٹری میں سے ایک ہے۔

☆......☆

ماضی بعید میں ایسا ہوا کرتا تھا کہ جب کسی کو موت کی سزا دینی ہوتو اس کی کمر میں ایک بڑا سا پتھر باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا۔
وہ بے چارہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار پاتا تھا اور سمندر کی تہ میں ڈوبتا چلا جاتا تھا۔
لیکن جب کوئی پتھر ہی تیرنا شروع کردیتا تو پھر کیا ہوتا۔
جی ہاں! دنیا میں ایسے بھی کچھ علاقے ہیں جہاں بڑے بڑے پتھر اپنی جگہ سے چلنا شروع کردیتے ہیں۔ پانی میں بھی تیرتے ہیں۔ یہ کوئی عام پتھر نہیں ہوتے بلکہ سینکڑوں پاؤنڈوزنی ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی طوفان بھی اپنی جگہ سے گردش نہیں دے سکتا۔ پھر بھی وہ سیکڑوں فٹ تو کھسکتے چلے جاتے ہیں۔
ایسے پتھر نواداوغیرہ کے ساحل پر پائے جاتے ہیں۔
اس اسرار کا آغاز اس وقت ہوا جب ساحل کے پاس رہنے والے ایک قبیلہ کے افراد نے ساحل پر ایک بہت بڑا پتھر دیکھا۔
اس ساحل کے آس پاس غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ وہ ہفتے میں ایک دن سمندر کی پوجا کرنے اور اسے بھینٹ چڑھانے کے لیے ساحل پر آیا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو سمندر ان کے گھروں میں گھس آئے گا۔ ان کی بستیاں برباد کردے گا۔ اسی لیے وہ ہفتے میں ایک بار ساحل کی طرف آیا کرتے۔
اس بار انہوں نے ایک بڑی چٹان ساحل پر دیکھی۔ یہ چٹان وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ دکھائی نہیں دی تھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق سمندر دیوتا ان کے لیے وہ چٹان چھوڑ گیا تھا۔
اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک ہفتے کے بعد وہ چٹان اپنی جگہ سے بہت دور دکھائی دی۔ وہ سمجھ گئے کہ سمندر دیوتا کے بچے اس چٹان کو کھیلتے کھیلتے ادھر سے ادھر لے جارہے ہیں۔ اس چٹان کے علاوہ دوسری چٹانیں بھی اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتی پائی گئیں۔
اب کیا تھا۔ ان لوگوں کو ایک اور دیوتا مل گیا تھا۔ وہ دیوتا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا ہے۔
موجودہ دور میں بھی ان چٹانوں کی ستم ظریفیاں برقرار ہیں۔ ان کا سفر جاری رہتا ہے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک چلتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد درجنوں میں ہے۔
اس صورتِ حال پر ریسرچ ہو چکی ہے۔ سائنس دان گروپ کی شکل میں آتے اور تحقیق کرتے ہیں۔
طرح طرح کے مفروضے قائم کیے جاتے ہیں کہ یہ دیوہیکل پتھر خود بخود کیسے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ بہرحال یہ سب اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک بھید بھری دنیا ہے۔

☆......☆

یہ بھی ایک عجیب اسرار ہے۔ اس کا مرکز پہلے تو تاؤس تھا لیکن اب یہ پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسی بھنبھناہٹ ہے جیسے ڈیزل کے انجن سے نکلتی ہے۔

یہ پُراسرار آواز دنیا کے بہت سے علاقوں میں سنی جاتی ہے۔ ایک طرف کینیڈا میں تو انتہائی جانب یورپ کے کچھ علاقوں میں۔ ایک جانب برطانیہ میں تو دوسری طرف امریکا اور میکسیکو میں۔

یہ ایسی آواز ہے جیسے ہزاروں افراد کچھ گا رہے ہوں۔ کوئی انجانا سا گیت۔ جس میں ایک طرح کا تقدس اور جوش پایا جاتا ہے۔

یہ کیا ہے۔ ہزاروں افراد ایک ساتھ مل کر کیوں ایسی بھنبھناہٹ پیدا کر رہے ہیں۔ یہ کون ہیں جو کسی انجانے دیوتا یا دیوی کے حضور اس کی تعریف کے گیت گا رہے ہیں۔ کبھی کبھی آوازیں صاف بھی ہو جاتی ہیں اور کچھ بول بھی سنائی دیتے ہیں لیکن وہ بول ایسی زبان میں ہوتے ہیں جو موجودہ دور کی کسی زبان سے نہیں ملتی۔

ان آوازوں کے بارے میں طرح طرح کے مفروضے قائم کیے گئے لیکن وہ صرف مفروضے ہی ہیں۔ ان پُراسرار آوازوں کی حقیقت ابھی تک سامنے نہیں آسکی ہے۔

☆......☆

یہ دنیا بہت عجیب ہے۔

یہ طرح طرح کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ پُراسرار واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو دنیا کے ہر ملک میں ہے۔

یہ واقعات سائنس دانوں کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کی سچائی کا سراغ لگانے میں اپنی زندگی کھپا دیتے ہیں۔ ان ہی کی کوششیں ہیں کہ آج ہم دنیا کے بے شمار اسرار سے واقف ہو چکے ہیں۔

ان بے شمار اسرار میں گمشدہ براعظموں کا معاملہ بھی ہے۔ نہ جانے کتنی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔

ان میں سب سے مشہور اٹلانٹس ہے جو کسی زمانے میں یونان کے ارد گرد تھا۔ پھر کسی حادثے نے اسے سمندر کی آغوش میں اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت تہذیب یافتہ لوگ تھے جو سمندر میں چلے گئے۔ اس جزیرے کے آثار دریافت کر لیے گئے ہیں۔

اسی طرح ہمارے یہاں وادی سندھ کی قدیم تہذیب تھی جس کا شاہکار موہنجوڈرو ہے۔

جس کی گلیاں نکاسی کا نظام آج بھی دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا ہے لیکن آج بھی یہ ایک مسٹری ہے کہ اس شہر کے لوگ ایک دم سے کہاں غائب ہو گئے، کہاں چلے گئے؟ اگر یہ کسی قسم کی ہجرت تھی تو کیسی ہجرت تھی۔

یہ سب تو مشہور خطے ہیں۔ اب کچھ ایسے خطوں کو بھی دیکھیں جن کے بارے میں لوگ کم واقف ہیں۔

☆......☆

تیس ہزار قبل مسیح سے سولہ ہزار سال قبل مسیح تک یہ ملک بھارت کے جنوبی سرے پر بیان کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ملک یا جزیرہ کسی انجانے حادثے کی وجہ سے غائب ہو گیا یا ڈوب گیا تھا۔

اس شہر کو بحرِ ہند کا اٹلانٹس کہا جاتا ہے۔

دیکھا کیسی حیرت انگیز دنیا ہے۔

☆......☆

آدم کا پل۔ جی ہاں! یہ اسی نام سے اب تک جانا جاتا ہے۔

یہ پایاب چونا پتھر کا ایک سلسلہ ہے جو بھارت کی ریاست تامل ناڈو کے جزیرہ یامنان سے سری لنکا کے جزیرہ منار تک جاتا ہے۔

ماہرین کے خیال میں یہ پل کسی زمانے میں بھارت اور سری لنکا تک زمینی راستے کا کام دیا کرتا تھا۔

ہندو عقیدہ کے مطابق رام نے جب سیتا کو سری لنکا کے راجا راون کے چنگل سے چھڑانے کے لیے سری لنکا پر حملہ کیا تو فوج کو وہاں تک لے جانے کے لیے ہنومان نے وہ پل بنایا تھا جب کہ دیگر مذاہب والوں کا کہنا ہے کہ جزیرہ سے باہر آنے کے لیے آدمؑ نے یہ پل بنایا تھا۔

یہ پل اب ڈوب چکا ہے لیکن اس کے آثار باقی ہیں۔

ایک اور علاقہ بھی ہے، جس کو سنڈ الینڈ کا نام دیا گیا ہے۔

یہ بھی غائب ہو چکا ہے اس کے ارد گرد انڈونیشیا اور سماٹرا وغیرہ تھے جو آج بھی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے۔ نہ جانے کتنی تہذیبیں جنم لے کر فنا ہو چکی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے ترقی یافتہ لوگ یہاں ہوں گے لیکن اب ان کا نشان تک باقی نہیں ہے۔

اسی لیے کہا گیا کہ اللہ بس باقی ہوس۔

منظر امام

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلیفۃ الارض بنا کر دنیا میں بھیجا مگر ساتھ میں شیطان بھی آگیا۔ جس نے انسانوں کو بھٹکانے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ حکم ربانی ہے کہ انسانیت کی خدمت کرو جب کہ شیطان نے انسانیت کی تباہی کا سامان پیدا کرنے پر زور دیا۔ یہ شیطان کے پجاری انسان کوقتل کرنے کے لیے مہلک سے مہلک ہتھیار تیار کرنے لگے۔

قتل وخوں ریزی کے لیے کیسے کیسے ہتھیار ہیں اسی کا تذکرہ

یہ انسان بھی کیا ہے۔ ایک دوسرے کو ممکن حد تک زندہ رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے فصلیں اگاتا ہے۔ دوائی بناتا ہے۔ ایک دوسرے کا علاج کرتا ہے۔ کوئی ناگہانی ہو جائے تو ایک دوسرے کی مدد کے لیے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آگ سے گھرے ہوئے مکانوں میں سے لوگوں کو باہر نکال لاتا ہے۔ سیلاب آجائے تو ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لیے خود اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ دوسری طرف انسان کو مارنے کے لیے طرح طرح کے ہتھیار بھی بناتا ہے۔ تیر، تلوار سے لے کر ایٹم بم تک اور اس سے بھی آگے۔

ذرا انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھیں، کتنے لوگ انسانوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں مارے جا چکے ہیں۔ ذرا سی بات ہوئی ایک دوسرے پر فوج کشی کر دی۔ بستیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ گولہ بارود کی برسات کر دی۔ یہ سب شروع سے ہوتا آیا ہے۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی ایسا کوئی دور رہا ہو جب مکمل سکون ہو، اگر کہیں سکون ہے تو دوسری طرف موت کا بازار گرم ہے۔ اگر ایک طرف پھول بانٹے جا رہے ہیں تو دوسری طرف موت دی جا رہی ہے۔ ہتھیار اور انسان کا ہمیشہ سے ساتھ رہا ہے۔

پہلے اس نے ہتھیار اپنے بچاؤ کے لیے بنائے تھے۔ کیونکہ اب سے لاکھوں سال پہلے کا انسان طرح طرح کی آفتوں میں گھرا ہوا تھا۔

ہر طرف دیو ہیکل جانور گھومتے پھرتے تھے جو موقع پاتے ہی اسے اچک لے جاتے۔ انسان نے ان سے مقابلہ کرنے کے لیے پہلے تو عام پتھروں کا سہارا لیا ہوگا پھر جب عقل آئی تو اس نے پتھروں کو گھس گھس کر نوکیلا بنا لیا، جو عام پتھروں کے مقابلے میں زیادہ مہلک تھا۔

بہت عرصے کے بعد اس نے ہڈیوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا یعنی ہتھیاروں کی تاریخ بہت قدیم رہی ہے۔ یہ ہتھیار اپنے بچاؤ کے لیے ہوتے تھے۔ پھر انسان نے ان ہتھیاروں سے دوسروں کو مارنا شروع کر دیا اور آج تک مارتا چلا آرہا ہے۔

آئیں ذرا ہتھیاروں کی تاریخ دیکھتے ہیں۔

15000 برس پہلے پتھروں کو پھینک کر یا دور سے مارنے کے اصول پر انسان نے تیر کمان کا بنیادی اصول وضع کیا۔ جانوروں کے سے تانت بنا کر کمان بنا لی اور تیر کی نوک بہت تیز کر لی جو کسی بھی جسم میں اتر سکتی تھی۔

2500 BC۔ انسان نے تانبے کا استعمال سیکھ لیا، اس نے لوہے کا استعمال بھی جان لیا اور بے ڈھنگی قسم کی تلواریں بھی بنانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کلہاڑیاں بھی بنانی شروع کر دی ہیں۔ اسی دور میں تانبے کے خود بھی بنائے گئے تاکہ دشمن کے وار سے بچ سکیں (یعنی یہ وہ زمانہ ہے۔ جب انسان ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگا تھا)

1800 BC۔ انسانی ذہن نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ وہ گھوڑوں کو سواری کے طور پر نہ صرف استعمال کر رہا ہے بلکہ گھوڑوں کو جنگ کے میدان میں بھی لے آیا ہے۔

اس نے دو گھوڑوں والی رتھ بنا لی ہے جو بہت تیز رفتار ہے اور جس پر سپاہی سوار ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

1500 BC۔ جنگ کے میدان میں جو تیر استعمال ہو رہے تھے ان کی پہنچ زیادہ دور تک نہیں تھی لیکن

اب انسان نے ایسے تیر اور کمان بنائے ہیں کہ جو دو سو سے تین سو گز دور تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

براعظم ایشیا میں گھڑسوار اور رتھ سوار دستے ایسے ہی تیروں کو استعمال کر رہے ہیں۔

(یہاں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اب دیوہیکل جانوروں کا عہد گزر گیا۔ اب سارے ہتھیار انسان اپنے جیسے انسانوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے)

1100 BC۔ تیر اور کمان کی ٹیکنالوجی میں اور ترقی ہوگئی اب تیروں کی پہنچ اور دور تک ہونے لگی۔

800 BC۔ ایک زبردست انقلاب۔ آسوریوں نے لوہے کو فولاد بنانے کی ٹیکنالوجی حاصل کرلی ہے۔

اب آسوری جو تیر بنا رہے ہیں۔ وہ بہت مہلک اور مضبوط ہیں۔ ان سے دشمنوں کی صفوں میں تباہیاں زیادہ تیزی سے پھیلائی جارہی ہیں۔

340 BC۔ اب ہتھیاروں میں بہت تبدیلیاں آچکی ہیں۔ مقدونیہ والوں نے ہتھیاروں کو نئی جہت دی ہے۔ یہ عہد فلپ دوئم اور سکندر اعظم کا ہے اب زرہ، بکتر، ڈھالیں، طرح طرح کی تلواریں، تیر، نیزے وغیرہ استعمال ہونے لگے ہیں۔

اب تلواریں زیادہ غضب ڈھا رہی ہیں۔ رتھوں کو بہت سبک رفتار کرلیا گیا ہے۔ اب باقاعدہ ایک مملکت دوسری مملکت سے ٹکرانے لگی ہے۔

یعنی انسانوں نے اپنے جھگڑوں کا دائرہ بہت وسیع کرلیا ہے۔

299 BC۔ رومن حکمرانوں نے اپنی تلواروں کو اور مہلک بنالیا۔ انہوں نے اپنے ہتھیاروں کے بل پر ایک مضبوط سلطنت قائم کررکھی۔

ہندوستان میں ایک اور قسم کے ہتھیار سے کام لیا جارہا ہے۔

یہ ہے انسانی زہریلی لڑکیوں کا ہتھیار۔ جنہیں ویش کنیا کہا جاتا ہے۔ چندر گپت موریہ کے عہد میں یہ ہتھیار اپنے عروج پر تھا۔

ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی بچی پیدا ہوتی اور وہ خوب صورت بھی ہوتی تو اسے راج محل میں بلا کر اس کی پرورش شروع کردی جاتی۔

اسے زہریلا بنانے کے لیے بہت تھوڑی مقدار میں سنکھیا دی جاتی اور آہستہ آہستہ سنکھیا کی مقدار بڑھاتے چلے جاتے۔

محل میں اس کی پرورش بہت شاندار طریقے سے کی جاتی۔ اس کا خوب خیال رکھا جاتا۔ اس کو رقص وغیرہ کی تربیت دی جاتی اور جوان ہوجانے پر وہ اتنی زہریلی ہوچکی ہوتی کہ صرف اپنی سانسوں سے کسی کو مار سکتی تھی۔

اس زہریلی لڑکی کو دشمن راجاؤں کے پاس کسی بہانے سے بھیج دیا جاتا اور دشمن راجا اس کی سانسوں کے زہر سے ہلاک ہوجاتا۔

چانکیہ نے اپنی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں اس طریقے کا ذکر کیا ہے۔ چانکیہ چندر گپت کا مشیر اور وزیر تھا۔

ہندو میتھالوجی میں بھی اس قسم کی کنیاؤں کا ذکر ہے۔
قدیم ہندو روایت میں ایک خاص کنیز سلوچنا کا ذکر ملتا ہے جو صرف دیکھ کر مار سکتی تھی۔

آہستہ آہستہ یہ روایت ختم ہوتی چلی گئی لیکن ہندوستان کی کہانیوں اور فلموں میں اب بھی اس کے چرچے ہوتے رہتے ہیں جیسے اوم پرکاش شرما کی مشہور کتاب ''ایک اور وش کنیا'' 2007ء کے ایک ناول میں ایسی زہریلی لڑکیوں کا ذکر ہے جو نوجوانوں میں ایڈز تقسیم کرتی ہیں۔ اس موضوع پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

1943 میں بننے والی فلم لیلا اور۔ 1991ء میں بننے والی فلم جس میں پوجا بیدی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

2013ء میں ایکتا کپور کا ٹی وی سیریل یودھا اکبر میں بھی زہریلی لڑکی موجود ہے۔

برطانیہ میں 1976ء سے 1987ء تک ایک میوزک بینڈ بہت مقبول رہا ہے۔ اس بینڈ کا نام ہی زہریلی لڑکیاں تھیں۔

ہم 299 BC تک آئے تھے۔ اب ذرا آگے کا جائزہ لیتے ہیں، یہ وش کنیائیں تو درمیان میں آگئی تھیں۔

250 BC چینیوں نے کراس کمان ایجاد کرلی۔ اب تیر اندازی بہت فاصلے سے کی جاسکتی ہے۔ اس ایجاد نے میدان جنگ میں لڑنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کردیں۔

674 عیسوی مسلمانوں کے ایک بحری بیڑے نے منجنیق کا استعمال کیا۔ یہ بازنطینیوں کے خلاف جنگ میں کیا تھا۔ اس کی مدد سے پتھروں کے بڑے بڑے گولوں کی بارش ہوتی تھی۔

1040 عیسوی۔ چینیوں کا ایک انقلابی قدم، پہلی بار انہوں نے گن پاؤڈر (بارود) کا استعمال کیا۔ دشمنوں پر اب آگ کی بارش ہوسکتی تھی۔

1139 عیسوی۔ یورپ میں کراس بو کا استعمال۔ یہ استعمال چین والے صدیوں پہلے 250 عیسوی میں کرچکے تھے۔

1200 عیسوی۔ برطانیہ (ویلز) کی جنگ میں تیروں کو دور تک پھینکنے کے لیے ایک بہت بڑی کمان استعمال کی۔

1298 عیسوی۔ برطانیہ میں اونچی کمان جس نے دشمنوں کو بہت نقصان پہنچایا۔

1327 عیسوی۔ ہتھیاروں کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم۔ پہلی بار توپ کا خاکہ تیار کیا گیا۔

1395 عیسوی۔ چودھویں صدی کے درمیان پٹہ دار (فولڈر ہونے والی) بندوقیں استعمال ہونے لگیں۔

1450 عیسوی۔ فرانس نے میدانِ جنگ میں دو عدد ہلکی توپوں کا استعمال کیا۔ اس مہلک ہتھیار نے فرانس کی فتح میں نمایاں کردار ادا کیا۔

1453 عیسوی۔ ترکوں نے جنگ کے دوران دشمنوں کے شہر پر منجنیق سے 19 ٹن وزنی پتھر برسائے۔

1610 عیسوی۔ فرانس میں ایک ایسے ہتھیار کا استعمال ہوا جس سے فائرنگ کی جاسکتی تھی۔

1688 عیسوی۔ فرانسیسی فوج نے پہلی بار Bayonet راکٹ کا استعمال کیا۔

1775 عیسوی۔ جنرل گاگا نے امریکی حریت پسندوں کے خلاف برطانیہ کی مدد کے لیے ایسے اوزار بیچے جو دشمنوں کے ہتھیاروں کو ناکارہ بناسکیں۔

1807 عیسوی۔ اسکاٹ لینڈ کے الیگزینڈر نے پرکوشن کیپ ایجاد کرلیا۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی۔

1846 عیسوی۔ پیرس کے ایک بندوق ساز نے بندوقوں کے لیے ایک نیا اور زیادہ اثر والا کارتوس بنالیا۔

1848 عیسوی۔ پہلی بار ایک جنگ میں لوڈنگ گن کا استعمال ہوا۔

1884 عیسوی۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ جب بندوق سے کارتوس فائر ہوجاتا تو پھر دوسرا کارتوس بھرنا پڑتا تھا۔ ہیرام میکسم نے خودکار سسٹم متعارف کروایا جو مشین گن کی ابتدائی شکل تھی۔ اس میں کارتوس خود بہ خود خالی جگہ کو پُر کردیتے تھے۔

1892 عیسوی۔ فریڈرک لوگارٹ نے جنگ میں اپنی بنائی ہوئی مشین گن کا کامیاب مظاہرہ کیا۔

1405 عیسوی۔ جرمنوں نے برطانیہ اور فرانس کے بحری جہازوں کو روکنے کے لیے پہلی آبدوز یا یو بوٹ سمندر میں اتاردی۔

1406 عیسوی۔ برطانیہ نے ایک طاقت ور بحری بیڑہ سمندر میں اتاردیا۔

1907 عیسوی۔ امریکا نے اپنی بحریہ کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔

1911 عیسوی۔ نیوٹن نے ایک ایسی ہلکی مشین گن

متعارف کروائی جس کو بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاسکتے تھے۔

1913 عیسوی۔ اولیپیا کے ایئر شو میں پہلی بار ایک لڑاکا طیارے نے پرواز کی۔

1915 عیسوی۔ نئی ایجاد ٹینک چرچل کے سامنے پیش کی گئی، چرچل نے اس ایجاد کی بہت تعریف کی۔

1915 عیسوی میں ہالینڈ کے ایک ڈیزائنر نے ایسی مشین گن متعارف کروائی جس کے ذریعے لڑاکا طیارے اب اور تیز رفتاری سے گولیاں برسانے لگے۔

1915 عیسوی جرمن طیاروں کو جدید مشین گنوں سے آراستہ کردیا گیا۔

1925 عیسوی۔ جنیوا میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے جنگ میں جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال ممنوع ہوگیا (ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا) اس معاہدے کے باوجود جراثیمی ہتھیار استعمال ہوتے رہے ہیں۔

1939 عیسوی۔ آئن اسٹائن نے ایٹم بم کی تھیوری پیش کی۔

1942 عیسوی۔ ایک برطانوی انجینئر نے جرمنوں کے خلاف ایک گھومتے ہوئے بم کا استعمال کیا۔

1942 عیسوی۔ امریکا کے رابرٹ کو نیوکلیئر ہتھیاروں کے پروجیکٹس کی ذمے داری دے دی گئی۔

جون 1944 عیسوی۔ لندن کی فضاؤں میں پہلی بار اڑتے ہوئے بم دیکھے گئے۔

ستمبر 1944ء۔ پہلی بار V3 راکٹ سے لندن پر حملہ ہوا۔

1944 عیسوی۔ جاپان کے پائلٹ کی خودکش لینڈنگ۔

1945 عیسوی۔ امریکی سائنس دانوں نے میکسیکو کے صحرا میں ایٹم بم کا تجربہ کیا۔

6 اگست 1945۔ امریکا نے جاپان کے شہر ہیروشیما .... پر ایٹم بم گرادیا۔ 80 ہزار افراد ہلاک۔

9 اگست 1945۔ ناگا ساکی پر دوسرا ایٹم بم گرایا گیا۔ ہزاروں ہلاکتیں۔

1949 عیسوی۔ پہلے روسی ایٹم بم کا کامیاب تجربہ۔

1951 عیسوی۔ امریکا نے اپنے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا۔

13 جولائی 1931ء کو سینٹرل جیل سری نگر میں مقدمے کی سماعت کا دن تھا۔ کشمیریوں کا باہر احتجاج جاری تھا۔ کشمیری قیادت لوگوں کو پُرامن رہنے کی اپیل کررہی تھی۔ بے قابو ہجوم دیکھ کر ڈوگرہ حکومت حواس باختہ ہوگئی۔ بجائے معاملہ سلجھانے کے گورنر نے ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اتفاق سے مسلمان نماز ادا کرنے کے لیے باغیچے میں پہنچ چکے تھے۔ پہلی گولی اذان دینے والے کو لگی وہ نیچے گر پڑا اس کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ اسی طرح 22 افراد نے اذان مکمل کی اور جام شہادت نوش کیا۔

مرسلہ: اظہر نورین۔ کراچی

1953 عیسوی۔ پہلا روسی ہائیڈروجن بم کامیاب تجربہ۔

1962 عیسوی میں کیوبا میں ایٹمی میزائل پلانٹ کی تنصیب جس کے خلاف پوری دنیا میں ہنگامہ ہوا۔

1962 عیسوی۔ روس کے خروشچیف اور امریکی صدر کینیڈی کے درمیان معاہدہ۔ جس کے تحت کیوبا کا پلانٹ بند کردیا۔

1962ء سے 2014ء تک اندازہ لگالیں کہ یہ دنیا کتنے مہلک ہتھیاروں سے بھردی گئی ہوگی۔

اور اب تو لیزر گنز، نہ نظر آنے والے ہتھیار، ڈرون اور نہ جانے کیا کیا ہیں، محوِ حیرت ہوں کہ یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی، ایک مجبوری سے ایک ضرورت سے کہ جنگلی جانوروں سے خود کو بچانا ہے۔ اس کے بعد کہاں تک آگئی۔

انسان نے انسان کو مارنے کے کیسے کیسے سامان ایجاد کرلیے۔ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی تمنا نے انسانیت کو کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے۔

ایک دفعہ شاید چرچل سے یہ پوچھا گیا کہ جناب یہ فرمائیں تیسری جنگ عظیم کن ہتھیاروں سے ہوگی۔

تو اس مرد دانا نے کیا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تیسری جنگ عظیم کن ہتھیاروں سے ہوگی لیکن چوتھی جنگ عظیم پتھروں اور ڈنڈوں سے ہوگی۔

یعنی انسان وہیں پہنچ جائے گا جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

نیرہ احتشام

ٹروٹسکی ایک بہت بڑا نام ہے۔ اس نے کمیونزم کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا تھا۔ اس کی اس جسارت پر کمیونسٹ برہم تھے، اس کے دشمن بن چکے تھے۔ مگر امریکی اور برطانوی حکومتیں اس کے لیے ڈھال بن کر کھڑی تھیں۔ کہیں کوئی کمیونسٹ اسے اغوا نہ کرلے اس وجہ سے اس کی حفاظت کے لیے کمیونسٹ مخالف قوتوں نے سخت پہرے بٹھا رکھے تھے۔ دوسری جانب کمیونزم کے حامیوں نے بھی اس کے اغوا کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ دونوں جانب رسہ کشی جاری تھی کہ ٹروٹسکی کا قتل ہو گیا، قاتل کون تھا؟

عالمی سیاست کی بساط پر کھیلا گیا ایک خونی ڈراما

”میں نے اپنا رین کوٹ اتار کر میز پر رکھ دیا تاکہ اس کی جیب میں رکھی ہوئی برف توڑنے والی ہتھوڑی آسانی سے نکال سکوں جو ایک طرف سے بے حد نوکیلی تھی۔ جب ٹروٹسکی نے میرا مضمون پڑھنا شروع کیا تو میں نے ہتھوڑی نکالی اور آنکھیں بند کرکے اس کے سر پر ایک شدید ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے ایک طویل دلخراش چیخ بلند ہوئی۔ ”آ......آ......آ......“ ایسی دردناک اور طویل چیخ جو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے میرے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ دیکھو اس کے دانت کے نشان اب بھی موجود ہیں۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ فرش پر گر پڑا۔“

اپنے وقت کا سب سے مشہور اور پُراسرار جاسوس اور قاتل جو اپنے آپ کو جیکیز رونارڈ کہتا تھا، اشتراکیت کے جلاوطن بزرگ لی اون ٹروٹسکی کے ارتکاب قتل کا اقبالی بیان دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”قتل کا یہ واقعہ 2 اگست 1940ء کو میکسیکو سٹی کے مضافات میں واقع ٹروٹسکی ولا میں پیش آیا تھا جس کی دیواریں اسٹیل سے بنی تھیں، جہاں سخت پہرا رہتا تھا اور کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس بہیمانہ سیاسی قتل کے جرم میں مورنارڈ کو بیس سال کی سزا ہوئی تھی جو اسے میکسیکو کے مرکزی جیل میں کاٹنی تھی۔

بیس سال قید کاٹنے کے بعد یہ سفاک قاتل 1960ء میں جیل سے رہا ہوا۔ اس پورے عرصے میں وہ اپنی شناخت، قتل کے محرکات اور سیاسی وابستگیوں کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کرتا رہا تھا۔ اس کی زبان بندی اور اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کے مؤقف پر سختی سے ڈٹے رہنے کے باوجود آنے والے ماہ وسال میں اس کی شناخت کی کڑیاں بتدریج آپس میں ملتی چلی گئیں۔ وہ درحقیقت ایک اسپینش تھا اور اس کا نام ریمون مرکیڈر تھا جو 1964ء میں پچاس سال کا تھا اور قتل کرنے کے ہنر میں ماسکو سے تربیت یافتہ تھا۔ اس نے دنیا بھر میں سب سے خوف ناک سیکرٹ پولیس آرگنائزیشن، ایس ایس ایس، سوویت اسٹیٹ سیکورٹی جو اس زمانے میں NKVD کہلاتی تھی کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے ٹروٹسکی کا قتل کیا تھا لیکن چونکہ وہ نہایت شدومد سے اپنی اصلی شناخت ظاہر کرنے سے انکار کرتا آرہا تھا لہٰذا اس قتل کے منصوبہ سازوں نے بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ اس جرم سے ان کا کوئی تعلق تھا یا یہ کہ وہ کسی بھی طرح اس میں ملوث تھے۔

جب وہ گرفتار ہوا تھا تو اس کے پاس سے تین صفحے کا ایک بیان برآمد ہوا تھا جو فرانسیسی زبان میں ٹائپ کیا ہوا تھا۔ اس پر پینسل سے دستخط کیے گئے تھے اور تاریخ ڈالی گئی تھی۔ اس بیان میں یہ تحریر تھا کہ وہ ایک پرانی بیلجیم فیملی سے تعلق رکھتا تھا، یہ کہ وہ پیرس میں جرنلزم کی تعلیم کے دوران ٹروٹسکی کی تحریک کے دوران گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے ٹروٹسکی سے ملاقات کی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں اسے ٹروٹسکی سے نفرت ہو گئی تھی اور جب اس بوڑھے اشتراکی نے اسے اس بات پر مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ سوویت یونین جائے اور اسٹالن کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کرے تو اس نے بالآخر ٹروٹسکی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اپنی گرفتاری کے بعد اس نے اپنے بیان میں جو تفصیلات بتائیں اور جو دعوے کیے وہ بہت جلد جھوٹ کا

پلندہ ثابت ہوگئے۔ اس نے جن لوگوں، اسکولوں کے نام بتائے اور جو پتے لکھوائے ان کا سرے سے یا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا یا پھر وہ اس کی تفصیلات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتے تھے لیکن ایسی کوئی منطق نہیں تھی جو اسے اپنا بیان بدلنے پر مجبور کرسکتی۔ میکسیکو کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر جوز اور ماہر مجرمیات ڈاکٹر الفانسو، چھ مہینے تک اس کا نفسیاتی امتحان لیتے رہے۔ شروع شروع میں مورنارڈ ان دونوں ڈاکٹروں کی طرف سے مشکوک نظر آتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا اگرچہ اس نے انہیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی جو اس کے نزدیک اہم تھی، وہ اپنے بارے میں خود ہی بہت کچھ بتانے لگا۔

دونوں ڈاکٹروں نے اسے صحیح معنوں میں ایک غیر معمولی شخص پایا۔ وہ روانی سے کئی زبانیں بول سکتا تھا۔ عورتوں کے لیے پُرکشش تھا اور مردوں کے نزدیک پسندیدہ۔ اس کی ذہانت اعلیٰ درجے کی تھی۔ بہت بردبار تھا اور اچھی اداکاری کرلیتا تھا۔ اسے قمار بازی، کوہ پیائی اور موٹر بوٹ چلانے سے بہت دلچسپی تھی۔ کئی معاملات میں اس کی ہنرمندی اور چابکدستی غیر معمولی تھی۔ وہ اندھیرے میں چارمنٹ سے بھی کم وقت میں ماؤزر رائفل کے حصے الگ کر کے انہیں دوبارہ آپس میں جوڑ سکتا تھا۔ وہ اسٹالن کے نظریات کا کٹر حامی تھا۔ وہ کئی مرتبہ اپنی ماسکو ٹریننگ سے بے وفائی کر چکا تھا۔ باتوں کے دوران اس نے ایک موقع پر کاموکا ذکر کیا۔ مغرب میں کاموکو شاید ہی کوئی جانتا ہو لیکن وہ NKVD میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی تاریخ سوویت یونین کے ان اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی جہاں جاسوسی کی غرض سے کسی ملک میں خفیہ طریقے سے داخل ہونا اور تباہی پھیلانا سکھایا جاتا تھا۔

جب اس کے تلفظ کا امتحان لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اگرچہ اس کی فرانسیسی عمدہ تھی لیکن اس میں اسپینش لب و لہجے کی جھلک تھی۔ شواہد سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ وہ اسپینش کمیونسٹ پس منظر کا حامل تھا اور پھر ستمبر 1950ء میں ماہر جرمیات ڈاکٹر الفانسو کو میڈرڈ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی پرانی گردآلود فائلوں میں ایک ایسے فنگر پرنٹس مل گئے جو مورنارڈ کے فنگر پرنٹس سے ہوبہو مطابقت رکھتے تھے۔ اس شخص کا نام ریمون مرکیڈر تھا۔ وہ 1935ء میں ایک نوجوان کمیونسٹ کی حیثیت سے بارسلونا میں گرفتار ہوا تھا۔ فائل میں اس کی تصویریں بھی تھیں۔ اس طرح یہ ثابت ہوگیا

کہ مورنارڈ درحقیقت ریمون مرکیڈر تھا۔

☆......☆

بارسلونا میں ریمون کا مکان ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ وہاں اس کا بوڑھا باپ ڈون مرکیڈر موجود تھا جو ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کررہا تھا۔ اسے ٹروٹسکی کے قاتل کی تصویر دکھائی گئی۔ اس نے تصویر کو بہت اچھی طرح دیکھا اور پھر کہا۔ ''ہاں، یہ میرا بیٹا ہے۔''

ڈون مرکیڈر کو اپنے بیٹے کے جرم کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ ''وہ بہت عرصہ پہلے فیملی سے خارج کردیا گیا تھا۔'' اس نے مزید کہا۔ ''میں اس سے دوبارہ رابطہ بحال نہیں کرنا چاہتا۔''

بعد میں سابق کمیونسٹوں کے انکشافات سے بھی مورنارڈ مرکیڈر کے بارے میں مزید حقائق دنیا کے سامنے آگئے۔

ریمون مرکیڈر 1913ء میں بارسلونا میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کا منجھلا بیٹا تھا۔ ڈون مرکیڈر ایک قدامت پسند، نیک انسان تھا لیکن زیادہ خوش حال نہ تھا۔ ریمون کی ماں کیری ایک نہایت پُرکشش، تنک مزاج، جوشیلی، متلون مزاجی، سماجی کارکن تھی۔ اسے 33 سال کی عمر میں مہم جوئی کا شوق چرایا جو جوش اور جذبے میں بدل گیا اور وہ انقلابیوں سے تعلقات استوار کرنے لگی اور 1925ء میں فرانس چلی گئی۔ وہ ایک رنگین مزاج اور دل پھینک عورت تھی۔ یہاں اس نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس کے متعدد فرانسیسی کمیونسٹ لیڈروں سے معاشقے چلے۔ وہ خفیہ پیغام رسانی کا کام انجام دینے لگی۔

ریمون جو کبھی ماں کے پاس رہتا تھا اور کبھی باپ کے پاس، اپنی ماں کا بے حد فرماں بردار تھا۔ کیری نے جلد ہی اسے بھی کمیونسٹ پارٹی میں کھینچ لیا۔ 1936ء میں جب اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ریمون اور اس کی ماں وہ اوّلین رضا کار تھے جو جنرل فرینکو کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں بھی شریک تھے۔ اس موقع پر ایک نیا عاشق کیری کی زندگی میں داخل ہوا۔ وہ NKVD کا ایک جنرل لیونڈ تھا جو جنرل کوٹوف کے نام کے تحت جاں باز کمانڈوز کی تنظیم کررہا تھا۔ اس یونٹ کا کام اسپین میں تباہی پھیلانا تھا۔ اس کے شاگردوں میں سے ایک ریمون مرکیڈر تھا۔ اس وقت نہ تو ریمون اور نہ ہی کیری کو یہ معلوم تھا کہ لیونڈ NKVD کے اس اسپیشل ڈویژن کا ایک نمایاں آفیسر تھا جس کا کام غیر ملک کی سرزمین پر سوویت کے سیاسی حریفوں کا خاتمہ کرنا تھا اور ٹروٹسکی ان کا نمبر ایک ٹارگٹ تھا۔

☆......☆

لی اون ٹروٹسکی، لینن کا وہ دست راست تھا جس نے لینن کے ساتھ مل کر نومبر 1917ء کے بالشویک انقلاب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس وقت اسٹالن کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی۔ وہ محض لینن کا ایک وفادار پیروکار تھا لیکن لینن کی موت کے بعد اس نے ساز باز کرکے ٹروٹسکی کو سیاست سے عملی طور پر الگ کردیا اور پھر 1929ء میں اسے سوویت یونین سے جلا وطن کرادیا۔ تب سے ٹروٹسکی ایک شکار کی سی زندگی بسر کرتا آرہا تھا۔ اسٹالن کے قاتل ہر جگہ اس کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ اس کے وفادار لوگوں کو ایک ایک کرکے اٹھالیا گیا۔ اس کے سیکریٹری کو اسپین میں قتل کردیا گیا۔ اس کا بیٹا پیرس میں اچانک فوت ہوگیا۔ ٹروٹسکی کو یقین تھا کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ آخر میں ٹروٹسکی نے 1937ء میں میکسیکو میں پناہ حاصل کرلی۔

اب ریمون اور کیری، لیونڈ یا جنرل کوٹوف کے ساتھ ماسکو میں تھے اور ریمون دہشت گردی کی نہایت اعلیٰ درجے کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ ابھی ایک بہت بڑے سیاسی قتل کے منصوبے کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی اور یہ معاملہ زیرِ غور تھا کہ میکسیکو میں ٹروٹسکی کا قصہ تمام کرنے کے لیے کس قسم کا آدمی درکار ہوگا۔ ان کا پہلا انتخاب یقیناً ریمون ہوگا جس کی مادری زبان اسپینش تھی۔ سوویت سیکرٹ پولیس نے اپنے مخصوص طریقے سے یہ فیصلہ کیا کہ ریمون غیر محسوس طریقے سے ٹروٹسکی کے گھر والوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھائے گا اور اس کے لیے وہ پہلے ان کی ایک نوجوان اور خوبرو کوریئر، سیویا پر ڈورے ڈالے گا جو امریکی سماجی کارکن اور ٹروٹسکی کے یوایس گروپ کی ایک وفادار ممبر تھی۔ NKVD نے ریمون کے لیے 1938ء کے موسم گرما میں سلویا سے پیرس میں اتفاقیہ ملاقات کا اہتمام کیا۔ یہ ملاقات بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ اس کے نتیجے میں سلویا اس وجیہہ اور پُرکشش نوجوان کی محبت میں گرفتار ہوگئی جس کے پاس خرچ کرنے کے لیے بہت رقم تھی۔ اس کے خیال میں ایسا ساتھی اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوگئے۔

☆......☆

ریمون نے فرینک جیکسن کے فرضی نام سے ایک جعلی پاسپورٹ پر سلویا کے ساتھ پیرس سے نیویارک کا سفر کیا۔ اصل پاسپورٹ ایک کینیڈین کا تھا جو انٹرنیشنل بریگیڈ کے ساتھ، اسپین میں ہلاک ہوگیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جیکسن کے نام کی ہجے بھی غلط تھی لیکن کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ اس نے اور سلویا نے گرینچ ولیج میں ایک عارضی اپارٹمنٹ لے لیا اور تب جیکسن نے سلویا کو بتایا کہ اسے میکسیکوسٹی میں ایک جاب کی پیشکش ہوئی ہے۔ لہٰذا جنوری 1940ء میں سلویا اس کے ہمراہ وہاں آگئی۔ میکسیکو میں لیونڈ اس قتل کو سپروائز کرنے کے لیے موجود تھا اور اس کے ساتھ کیری بھی تھی۔

اس مرحلے پر کیری نے اپنے ایک دوست کو یقین دلایا تھا کہ ریمون کا کردار صرف اور صرف ایک جاسوس کا تھا۔ اسے ٹرٹسکی ولا میں سیکورٹی سسٹم کی نوعیت کا پتا چلانا تھا۔ یہ ولا میکسیکوسٹی کے مضافات میں واقع تھا۔ ریمون نے سلویا کے ذریعے ولا میں انٹری حاصل کرلی۔ اس نے شروع کے چند وزٹ میں ٹرٹسکی سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اپنے خفیہ کیمرے سے مختلف جگہوں کی تصویریں لیتا رہا۔ اس کی یہ تصویریں ماسکو بھیج دی گئیں جو NKVD کی ایک خاص فائل میں رکھ دی گئیں۔

24 مئی 1940ء کی صبح کے اوّلین پہر میں میکسیکو میں سوویت جاسوس کمانڈوز نے ٹرٹسکی کی رہائش پر دھاوا بول دیا۔ پولیس اور فوج کی وردیوں میں ملبوس بیس آدمیوں کا ایک گروپ پھاٹک سے اندر گھس آیا اور سب مشین گنوں سے بیڈروم پر اندھا دھند گولیاں برسانے لگا لیکن ٹرٹسکی، اس کی بیوی اور پوتا حیرت انگیز طور پر اس حملے میں محفوظ رہے کیونکہ انہوں نے خود کو بستر سے نیچے گرادیا تھا۔ ایک ماہ کی تفتیش کے بعد میکسیکن پولیس نے لگ بھگ دو درجن افراد کو گرفتار کرلیا اور بعد میں بعض افراد پر مقدمہ بھی چلا لیکن ریمون مرکیڈر شبہ سے بالاتر رہا۔

اس مسلح حملے کے صرف چار دن کے بعد ریمون نے مسز ٹرٹسکی کو چند مشترکہ دوستوں کے ہمراہ خود ڈرائیو کر کے ویرا کروز لے جانے کی پیشکش کی اور یہی وہ موقع تھا کہ جب وہ پہلی بار اپنے مستقبل کے شکار سے ملا۔ وہ ولا میں داخل ہوا اور احاطے میں موجود ٹرٹسکی سے بڑے ادب اور احترام سے پیش آیا۔ دونوں کے درمیان مختصر سی گفتگو ہوئی۔ اس نے ٹرٹسکی کے پوتے کو ایک چھوٹے سے گلائیڈر کا تحفہ

محبت ایک اقلیم الفت ہے جس کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین اور دلکش ہے محبت مختلف کیفیات و واردات سے مملو ہوتی ہے جنہیں اس کے موسموں سے عبارت کیا جاتا ہے ان موسموں میں ہجر و وصال، مسرت و عسرت، حیرت و استعجاب اور سوز و گداز وغیرہ شامل ہیں محبت کے موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ دنیا و مافیا کے تمام تر موضوعات اس میں سما سکتے ہیں اور یہ تمام تر موضوعات کا سرنامہ ہے باقی جذبات و احساسات ذیلی اور معاون نوعیت کے ہیں ان افکار سے مرصع شاعری ہر عہد میں اعتبار ذوق رہی ہے اور رہے گی یہ تخیلات ہر عہد میں افتخار زریں قرار پاتے ہیں اور ان کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ سمجھی جاتی ہے ایسی شاعری ہر رت میں سدا بہار اور تر و تازہ رہتی ہے اگرچہ جدید شعری رویوں میں محبت سے انحراف اور اختلاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کی اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید نکھر کر سامنے آئی ہے جس سے یہ استخراجی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ جواں جذبوں کی اہمیت سے انکار اور فرار ممکن نہیں ہے اکثر و بیشتر شاعرات کا کلام محبت کے حسین احساسات سے مزین ہوتا ہے جس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ نسائی شاعری میں داخلی اظہار بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے محبت چونکہ داخلی کیفیت کا نام ہے کیونکہ محبت کی نمو انسان کے دروں سے ہوئی ہے اس لیے شاعرات کے ہاں رومان نگاری کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں۔

اقتباس: شاعرات ارض پاک۔ از شبیر ناقد

مرسلہ: نوید قمر۔ کراچی

دیا۔ کوئی فولادی اعصاب کا مالک شخص ہی ایک مسلح حملے کے بعد جس کا وہ کرتا دھرتا تھا، اتنا پُرسکون نظر آسکتا تھا۔

اب ماسکو نے فیصلہ کیا کہ صرف فرد واحد کے ذریعے ہی ٹرٹسکی کو قتل کیا جاسکتا ہے اور اس کام کے لیے ریمون مرکیڈر سے بہتر بھلا کون ہوسکتا ہے۔ کیری نے KNVD سے مل کر اپنے بیٹے کے لیے زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے اور اس کے وہاں سے زندہ فرار ہونے کا اہتمام کیا۔ اس منصوبے کے تحت ریمون نے ٹرٹسکی کے گھرانے سے میل جول بڑھانے کی رفتار تیز کردی۔ جولائی کے پچھلے تین ہفتوں

میں وہ ٹروٹسکی سے پانچ بار ملا اور جب بھی گیا کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر گیا۔ 17 اگست کو وہ اپنے ایک مضمون کی اصلاح کرانے کی غرض سے ٹروٹسکی سے ملا جو وہ لکھ رہا تھا۔ ٹروٹسکی اس پر راضی ہو گیا تھا کہ وہ اس کے مضمون کو چیک کرے گا۔ ریمون نے ٹروٹسکی سے اس کے اسٹڈی میں اس سے گیارہ منٹ تک گفتگو کی۔ اس موقع پر کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ بعد میں ٹروٹسکی نے اپنی بیوی سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اسے اس نوجوان کا رویہ عجیب لگا تھا۔

☆......☆

20 اگست کی شام کے پانچ بج کر بیس منٹ پر ریمون، ٹروٹسکی ولا پہنچا۔ وہ اپنا مضمون مکمل کر کے ٹروٹسکی کو دکھانے لایا تھا۔ وہ ایک خاکی رین کوٹ اٹھائے ہوئے تھا جس کے اندر ایک لمبا خنجر سِلا ہوا تھا اور ایک جیب میں برف توڑنے والی ہتھوڑی تھی جس کے دستے کو کاٹ کر چھوٹا کر دیا گیا تھا تاکہ اسے چھپانے میں آسانی ہو۔ اس کے پتلون کی پچھلی جیب میں اعشاریہ 45 کا ایک آٹومیٹک ریوالور تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ اس ہتھوڑی کے ایک ہی وار سے اپنا مشن مکمل کرلے گا جس سے کوئی آواز بھی نہیں ہوگی اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تھی تو وہ اپنا ریوالور استعمال کرے گا اور گولیاں برساتا ہوا وہاں سے فرار ہو جائے گا۔

پہرے داروں نے اسے پہچان کر ولا کا پھاٹک کھول دیا۔ ایک پہرے دار رہنمائی کرتا ہوا اسے ٹروٹسکی کے پاس لے گیا جو احاطے میں اپنے پالتو خرگوشوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ کئی بار آچکا تھا اس لیے پہرے داروں نے تلاشی بھی نہیں لی اور وہ ہتھیاروں کے ساتھ اندر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسز ٹروٹسکی نے اسے دیکھا۔ اس کے رین کوٹ پر ایک نظر ڈالی اور تبصرہ کیا کہ ایسے روشن دن میں وہ رین کوٹ کیوں پہنے ہوئے تھا۔

''آپ جانتی ہیں کہ موسم کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ بارش ہو سکتی ہے۔''

ٹروٹسکی کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے خرگوشوں سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بادل نخواستہ اپنے دستانے اتارے اور گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ریمون اس کے پیچھے چلتا ہوا اسٹڈی میں آیا۔ ٹروٹسکی نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی میز پر آ بیٹھا۔ میز پر اس کے ہاتھ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر اس کا بھرا ہوا ریوالور تھا۔

ریمون اس کے بائیں طرف الارم سسٹم کے سوئچ اور اس کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

ٹروٹسکی نے اس سے مضمون لیا اور پڑھنے لگا۔ ٹھیک اسی موقع پر ریمون نے اپنی ہتھوڑی نکال لی اور آنکھیں بند کر کے اس کی کھوپڑی پر بھرپور وار کیا۔ ہتھوڑی کا نوکیلا سرا تین انچ تک ٹروٹسکی کی کھوپڑی میں دھنس گیا۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور اپنے قاتل سے گتھم گتھا ہو گیا۔ مسز ٹروٹسکی بھاگتی ہوئی اسٹڈی میں داخل ہوئی اور دیکھا کہ اس کا شوہر کمرے میں لڑکھڑا رہا تھا۔

''دیکھو، ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔'' وہ بولا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اب ٹروٹسکی کے پہرے دار اندر گھس آئے تھے۔ ریمون اپنی جگہ کھڑا ہانپ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک پستول جھول رہا تھا۔ سارے محافظ ریمون پر پل پڑے۔ مسز ٹروٹسکی اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی جو اب بھی اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ ''اس کا کیا کیا جائے؟'' اس نے قاتل کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ لوگ تو اسے مار ڈالیں گے۔''

''نہیں......اسے قتل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔'' ٹروٹسکی کراہا۔ ''اسے ہر قیمت پر بولنے پر مجبور کیا جائے۔''

ٹروٹسکی کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ وہ راستے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کا آپریشن کیا گیا لیکن وہ چھبیس گھنٹے کے بعد دم توڑ گیا۔

وہاں سے ایک بلاک کے فاصلے پر کیری ایک کار میں بیٹھی ہوئی تھی جسے شوفر چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی ماں لگ رہی تھی جو اپنے بیٹے کے دفتر سے آنے کے انتظار میں اضطراب کا شکار ہو۔ جنرل لیونڈ ایک دوسری کار میں پاس ہی موجود تھا۔ جب پولیس الارم سنائی دیا اور ایک ایمبولینس سڑک پر تیزی سے نمودار ہوئی تو وہ سمجھ گئے کہ ریمون فرار نہیں ہو سکا ہے۔ کیری وہاں سے فوراً ایئرپورٹ پہنچ گئی اور ایک جعلی پاسپورٹ پر کیوبا پرواز کر گئی۔ جنرل نیولڈرات بھر ڈرائیو کر کے ایکاپولکو پہنچ گیا جہاں بندرگاہ پر ایک سوویت مال بردار جہاز اس کا انتظار کر رہا تھا۔

چند ہفتوں کے بعد کیری ماسکو میں جنرل لیونڈ سے جا ملی وہاں NKVD کے سربراہ نے خود اسے اسٹالن کے سامنے پیش کیا۔ اسے آرڈر آف دی لینن سے نوازا گیا جو کمیونزم کا سب سے اعلیٰ اعزاز تھا اور اس کے بیٹے کو سوویت

یونین کا ایک ہیرو قرار دیا گیا۔ ماسکو میں کیری بڑے فخر سے اپنے دوستوں سے ان اعزازات کا ذکر کرتی تھی۔

☆......☆

کیری نے جنگ کے ماہ و سال سوویت یونین میں گزارے جہاں اس کا عاشق جنرل لیونڈ اور کریملن کے اعلیٰ حکام اسے یقین دلاتے رہے کہ اس کے بیٹے کو بچانے کے لیے ایک آپریشن عمل میں لایا جائے گا۔ اسٹالن اس پر آمادہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن آخر میں اس نے کیری کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ریمون کو فرار کرانے کی کوشش کر سکتی ہے۔ کیری مارچ 1945ء میں ماسکو پہنچی لیکن اپنا ہدف حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ بھی نہیں سکی۔ NKVD نے اس پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں تاکہ ٹروٹسکی کے قاتل کی شناخت نہ ہو سکے۔

اب سفید بالوں والی بہتر سالہ کیری پیرس میں زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی ساری خوش فہمی وقت کے ریلے میں بہہ گئی ہے۔ سوویت یونین میں گزارے گئے ماہ و سال نے اس کی آنکھوں پر سے کمیونزم کی پٹی ہٹا دی۔ اس نے ماسکو میں ایک موقع پر اپنے ایک اسپینی دوست سے کہا۔ ”تمہاری بات درست ہے۔ ہمیں دھوکا دیا گیا۔ یہ جنت نہیں، جہنم ہے۔“

سلویا کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے عاشق نے ٹروٹسکی کو قتل کر دیا تھا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور اسے صحت یاب ہونے میں کئی سال لگ گئے۔ ریمون کو جیل میں جب اس بات کا علم ہوا تو وہ رویا لیکن بعد میں سلویا میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی۔ ٹروٹسکی کی بیوہ جنوری 1962ء میں پیرس میں فوت ہوئی۔ جنرل لیونڈ بھی مر چکا ہے۔

ریمون مرکیڈر ایک مثالی قیدی بن گیا تھا۔ وہ جیل میں ریڈیو مرمت کرنے کا کام کرنے لگا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا منافع بخش کاروبار تھا۔ وہ میکسیکو کی جیل کے قواعد سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے خاصی پُرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا جن کے تحت قیدیوں کو بہترین غذاؤں اور کتابوں کی فراہمی سمیت بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ اب ریمون بھاری بھرکم ہو گیا تھا اور ہر فکر و غم سے آزاد کوئی بہت بڑا بزنس مین لگتا تھا۔ قید کے دوران وہ تمام عرصہ خفیہ ذرائع سے کمیونسٹوں کے نیٹ ورک سے رابطے میں تھا۔ مئی 1960ء میں قید سے رہا ہونے کے بعد وہ چیکوسلواکیہ چلا گیا اور آہنی پردے کے پیچھے ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

1960ء کی دہائی کو پاکستانی موسیقی کے سنہرے دور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم، استاد امانت علی خاں، استاد فتح علی خاں، استاد نزاکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں، استاد شریف خاں پونچھ والے ستار نواز، کلارنٹ نواز سوہنی خاں، پیانو بجانے والے ماسٹر صادق علی، استاد نبی بخش خاں، سارنگی نواز، استاد حیدر بخش، استاد ناظم علی سارنگی نواز' استاد شوکت علی اور استاد طالب حسین خان طبلہ نواز کلاسیکی موسیقی کے تابندہ ستارے تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ براعظم میں کلاسیکی موسیقی ہندوؤں کی وجہ سے پھلی پھولی جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوؤں میں دھرو، پد، چھند، کبت اور دوہا گانے کا رواج تھا۔ راجا خاں سنگھ کے درباری بخشو اور مچھو نے دھرو اور پد کو ملا کر گانا شروع کیا جس سے دھروپد کی گائیکی شروع ہوئی۔ دھر کے معنی ٹھہرا ہوا اور پد کے معنی لفظ یا مرتبہ۔ دھر پد کے مزاج میں ٹھہراؤ اور دبدبہ ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ (1) استھائی (2) انترا (3) سنچاری (4 ابھوک۔ پندرھویں صدی میں جون پور کے شاہانہ شرقیہ میں سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا اور اس کا نام خیال رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے دوسری ایجادات کے ساتھ خیال بھی ایجاد کیا۔ شاہد احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ ممکن ہے یہ طریقہ امیر خسرو ہی نے وضع کیا ہو مگر خیال کی ترویج کا سہرا سلطان حسین شرقی کے سر ہی ہے۔ مسلمان گویوں نے خیال (گائیکی) کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی (1) الاپ (2) استھائی (3) انترا (4) ترانہ۔ الاپ کو ایرانی موسیقی میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسے ادا یا پیش بھی کہتے تھے۔ خیال گائیکی کی لطافت اور ریاض نے اسے اس بام عروج تک پہنچا دیا ہے جہاں اسے مسلمان گھرانوں کی میراث ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک استادوں کی موسیقی بن چکی تھی یعنی ان صدیوں میں اکابر موسیقار، گت کار، طبلچی اور پکھاوجی مسلمان استاد تھے۔ جنہوں نے ہندوستانی موسیقی کو وہ ہیئت اور اسالیب عطا کیے جو فی زمانہ بھارت اور پاکستان کی موسیقی میں رائج ہیں۔

مرسلہ: تسنیم بٹ۔ لاہور

قسط:18

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

فوزیہ سے رابطہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ کالیا کے ساتھ اس سے ملنے وہ اس کے گھر پہنچ گیا تب اسے معلوم ہوا کہ دبئی میں ڈاکٹروں کا سیمینار ہے نیرو پیشنٹ پر۔ اس میں فوزیہ بھی شریک ہوگی۔ نومی نے اپنے بھائی کو بھی کالیا کے ساتھ دبئی بھیج دیا اور خود بحرین چلا گیا۔ بحرین میں نومی کی ملاقات ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ہوئی وہ ڈرائیور اسے ایک سرائے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ بہرام خان جس سے وہ ملنے آیا تھا اسے کسی نے گولی ماردی ہے۔ نومی کاؤنٹر پر پہنچا تو ایک آدمی کسی سے فون پر بات کررہا تھا کہ بہرام خان کی بیوی خوب شور مچا کرگئی ہے۔ تبھی کسی نے عقب سے اسے للکارا۔ وہ آواز سے پہچان گیا کہ وہ آواز راکا کی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

میں نے دانستہ چونکنے کی اداکاری کی پھر نصف حد تک گردن گھمائی اور لہجے میں خوف سموتے ہوئے ہکلا کر بولا۔ ”کک......کون؟“

میں نے یہ کوشش چاہی تھی کہ وہ میری آواز نہ پہچان سکے، اسی لیے میں نے حلق پر زور دیتے ہوئے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں، جس کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔

”ہوں اں......بولتے انگریزی ہو اور بہروپ عربیوں والا ابھر رکھا ہے۔“ راکا کی زہر خند طنزیہ آواز ابھری۔

ادھر استقبالیہ میں فون پر مصروف گفتگو وہ گرانڈیل شخص بھی چونک کر ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

”اس طرف چلو۔“ راکا نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ساتھ ہی میری پشت پر لگی وہ سخت سی شے جو یقیناً پستول کی نال ہی ہوسکتی تھی، کو زور دیا۔ اشارہ وہ کرچکا تھا۔ جو سیدھے ہاتھ والے ایک شیشے کے دروازے کی جانب تھا۔ میں نے خاموشی سے مذکورہ سمت کی جانب قدم بڑھا دیے۔

راکا نے شاید استقبالیہ پر فون سے مصروف اپنے ساتھی سے بھی کچھ کہا تھا۔ اس نے بات ختم کرکے ہماری طرف ہی رخ کیا تھا۔

شیشے کا دروازہ خودکار انداز میں کھلا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہ ایک چکنے فرش والی راہداری تھی۔ دائیں طرف کمرے نظر آرہے تھے جو بھی خالی تھے۔ گرانڈیل شخص میرے آگے تھا، وہ اُلٹے ہاتھ والے آخری سرے پر بنے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچا اور اسے کھول کر محتاط انداز میں ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آرہا تھا۔

مجھے راستہ ملا اور اس کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ بھی......

ہم سب کے اندر داخل ہوتے ہی گرانڈیل شخص نے فوراً دروازہ بند کردیا۔

اب کمرے میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں اپنے ایک سفاک اور سنگین ترین دشمن کے رحم و کرم

پر تھا۔ اگر وہ مجھے یہ سب ”لوازمات“ اُتارنے کا حکم دے ڈالتا، جو میں نے فوری طور پر اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کے لیے اُوڑھ رکھے تھے تو اس خبیث کا مجھے پہچان لینا ایک یقینی امر تھا۔ میں اچانک ہی اس طرح اور بالکل غیر متوقع طور پر اپنے ایک خونخوار دشمن کے نرغے میں آجاؤں گا، یہ میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

اب راکا کی صورت میں ایک بھیانک موت مجھ سے محض چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کا ساتھی بھی خطرہ بھانپتے ہی اپنا پستول نکال کر چوکس کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرانے کی بس ایک حد تک ہی اداکاری کی تھی (اگرچہ اندر سے تو میں واقعی تشویش زدہ سا ہو رہا تھا)

”میں واقعی کچھ نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔“ بالآخر میں نے اپنے بھیانک دشمن کو لف کرنے کی سعی کی۔ ”ایک بڑے آئل فیلڈ میں ایک معزز نمائندے کے ساتھ ایسی غنڈہ گردی میری سمجھ سے باہر ہے۔“

میں نے حتی المقدور کوشش کے ساتھ اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ اپنی نپی تلی بات کی اثر پذیری کو بھانپنے کی غرض سے میری مشاق نظروں نے تاڑ لیا کہ دونوں کچھ ثانیے کے لیے چونکے تھے، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے جب راکا مجھ سے مخاطب ہوا تو اب اس کے لہجے کی درشتی میں قدرے کمی محسوس کی تھی میں نے۔

”معزز نمائندے اس طرح چھپ کر کسی کی ٹیلی فونک گفتگو نہیں سنا کرتے۔“

”چھپ کر؟“ میں نے حیران ہونے کی شاندار ایکٹنگ کی تھی۔ ”کیا میں کسی دیوار کے کونے میں یا کسی میز کے نیچے اور پوشیدہ گوشے میں چھپا ہوا تھا، مسٹر بدمعاش؟ میں تو دروازے سے اندر داخل ہوا تھا کہ استقبالیہ پر اپنے ساتھی مسٹر اوبرائے گرانٹ کا پوچھ سکوں کہ وہ یہاں مجھے کہاں مل سکتا ہے؟ ان صاحب کے فارغ ہونے کا منتظر ہی تھا کہ تم پیچھے سے آن دھمکے۔“ کہتے ہوئے میں نے اس گرانڈیل شخص کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایسے نازک اور سنگین لمحات میں بس! میرے ذہن میں

اپنی گلوخلاصی کے لیے یہی ایک نام ابھرا تھا اور لائیلا کی زبانی میں جانتا تھا کہ اوبرائے گرانٹ ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ میرا ہوائی تیر جو اندھیرے میں چلا تھا، ''ٹھک'' کر کے کے نشانے پر لگا۔ سب سے پہلے ٹیلی فون والے گرانڈیل شخص پر بوکھلاہٹ کے آثار اُبھرے تھے اور راکا تو جیسے یوں نظر آنے لگا، کہ اس کا پیشاب ہی خطا ہو گیا ہو۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اوبرائے گرانٹ ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔

''کک......کیا......؟ تت......تم مسٹر اوبرائے گرانٹ کے ساتھی ہو؟'' راکا غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آف کورس! میں اور اوبرائے گرانٹ کل ہی کی فلائٹ سے تو یہاں پہنچے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی گرل فرینڈ مس لائیلا بھی اس کے ساتھ تھی، وہ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کا کہہ رہے تھے لیکن میں نے ان کے بیچ مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور آج ملنے کا وعدہ کر کے مناما اپنے دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ ہم تینوں نے آج کیمپ تھری میں رپورٹ پیش کر کے صرائفہ کی طرف نکل جانا تھا۔''

''او......سوسوری......مسٹر؟'' راکا نے معذرت خواہانہ انداز... میں یہ کہتے ہوئے دانستہ استفساریہ، اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو میں نے وہ مکمل کرتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

''شیخ واحد الکریمی......آئل کولیون (collision) ایکسپلوزر ......ایکسپرٹ......''

میری کامن سینس یعنی عقل سلیم تیزی سے کام کر رہی تھی اور میں اپنی زیرک دماغی سے ان مضبوط عوامل کو اندھیرے کے تیر میں پرو کر چلانے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا جو میرے لیے بظاہر غیر متعلقہ تھے۔

''ویری ساری......مسٹر واحد الکریمی! ایکسٹریملی ساری۔'' راکا میری چال میں آ کر جیسے ڈھے گیا۔ اس نے اپنا پستول، جس کی نال وہ پہلے ہی جھکا چکا تھا معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے دوبارہ اپنی شرٹ کے نیچے پشت پر بیلٹ میں اُڑس لیا۔ اس کے گرانڈیل ساتھی نے بھی دیکھا دیکھی یہی کیا۔

''تشریف رکھیے جناب! درحقیقت آپ کو یہاں آ کر حالات کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ کچھ شرپسند ہمارے اس عظیم منصوبے کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں، بہرحال......میں ایک بار پھر آپ سے معافی کا طلب گار ہوں۔''

راکا ایک دم سے ہی عجز و انکسار کی تصویر نظر آنے لگا تھا۔ میرا تجربہ تھا کہ جو جتنا پکا اور بڑا مجرم ہوتا ہے، وہ ابتداء میں نہایت اخلاق اور مجرب زبانی کا ہی اظہار کرتا ہے۔ پھوں پھاں کرنا اور شور مچانا کچے مجرموں کا کام ہوتا ہے۔

''کوئی بات نہیں، ایسے حالات میں اس طرح کی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔'' میں نے بھی جلدی سے کہا اور دل ہی دل میں شکر کیا کہ اتنے میں ہی جان چھوٹ گئی۔

''تو آپ مسٹر اوبرائے گرانٹ کے ساتھی ہیں۔ میری ان سے اٹلی میں فون پر بات ہوئی تھی، تو کیا وہ آ گئے ہیں؟'' راکا نے کہا اور ساتھ ہی مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ ...کیا جبکہ میں اب یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ کیا خبر کس وقت یہ اوبرائے گرانٹ سے رابطہ کر کے میرا بھانڈا پھوڑ دے۔

''ہاں! میں نے مختصراً کہا۔ صوفے پر میں نہیں بیٹھا تھا۔ ''میرا خیال ہے وہ وہیں ہوگا، مجھے اب اسی جگہ پہنچ کر اس سے خود ہی مل لینا چاہیے۔ کیا مجھے اجازت ہے جانے کی؟''

میں نے راکا سے یہ کہتے ہوئے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کچھ تذبذب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے، وہ خبیث شاید مجھے یہاں باتوں میں لگا کر کسی قسم کی ''کنفرمیشن'' کے چکروں میں نظر آ رہا تھا۔

''آ......ہاں ضرور......لیکن ہمیں ذرا خدمت کا موقع دیں۔''

''مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ بہت شکریہ۔'' میں نے کہا اور ان دونوں کو سوچتا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

باہر آتے ہی میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ عملے کے لوگوں کے علاوہ اب وہاں کچھ مقامی باشندوں کا بھی جمگھٹا دیکھنے میں آ رہا تھا۔ یہ لوگ اس عورت کے واویلا کرنے کی وجہ سے جمع ہوئے تھے، جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ مقتول بہرام خان کی بیوی تھی۔

میں نے نکاسی والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیے تھے، جدھر ایک شاندار ڈبل ٹائر والی بس مناما کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ میں لپک کر اس میں سوار ہو گیا اور ذرا بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

کارواں سرائے (سرائے نما ہوٹل) اسی سڑک کے لب بام واقع تھا۔ ذرا دیر بعد بس روانہ ہو گئی۔ یہ ائر کنڈیشن بس بھی اور مناسب رفتار سے دوڑنے لگی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ریت کے زرد بگولے گرم ہواؤں کے زور پر اُڑتے پھر رہے تھے۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ تاحدِ نگاہ ریت کا سمندر

پھیلا ہوا تھا اور ہوائیں اس میں لہریں سی پیدا کرتی محسوس ہوتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد میں کارواں۔سرائے کے سامنے اُتر گیا۔بس ریت اور کنکر اُڑاتی آگے بڑھ گئی۔میں نے اپنے کمرے میں آکر ہی دم لیا۔

میں ایک بھیانک موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکل آیا تھا۔حالاں کہ میں بے حد احتیاط پسند تھا،شاید ایسا اس نئی جگہ اور نئے حالات کی وجہ سے ہوا تھا،تاہم یہ بھی تو میں ہی تھا جو اپنی زیرک دماغی سے بچ کر نکل آیا تھا۔

بہرام خان کی بے وقت موت نے مجھے واقعی اندھیری کھائی میں پھینک دیا تھا لیکن یہ اللہ ہی تو ہے جو راہ حق کے راستوں پر چلنے والوں کی ہر طرح سے مدد کرتا ہے۔بہرام خان کی جگہ اوبرائے گرانٹ سے میں نے فائدہ اُٹھا لیا تھا جو بے شک ''غائبانہ'' سہی۔اس بے چارے کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں نے اس کی اس قدر راہبیت کی حامل ''شناخت'' سے کتنا بڑا فائدہ اُٹھا لیا تھا۔دوسرا ساتھی میرا وہ ہندوستانی ٹیکسی ڈرائیور فاران احمد تھا۔وہ تو جیسے میرا بہترین ساتھی اور دست راست ثابت ہوا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا ایک بار پھر شکر ادا کیا کہ اس کا جتنا بڑا نام اُتنا ہی بڑا آسرا تھا۔

یہاں تک آتے ہوئے میں نے احتیاط رکھی تھی کہ را کا یا اس کا کوئی ساتھی میرے تعاقب میں نہ آتا ہو،مجھے پورا یقین تھا کہ میرا یہ بھانڈا اب تک یا تھوڑی دیر بعد تک یقیناً پھوٹ چکا ہوگا،جب را کا،اوبرائے گرانٹ سے رابطہ کر کے میرے فرضی نام سے اسے پوچھے گا۔

اس وقت بے شک اس کے پاس گرانٹ سے رابطہ کرنے کے فوری ذرائع نہ تھے،یہ میری خوش قسمتی ہی تھی۔اس میں انسان کی خوش قسمتی کے علاوہ وقت اور حالات کے علاوہ ان لمحات کا بھی دخل ہوتا ہے جن کا دھارا عارضی طور پر ہی سہی،موافقیت کی جانب بہہ رہا ہوتا ہے۔تاہم مجھے ابھی تک رانا بشیر سے فون پر بات کرنے اور اسے بہرام خان کے قتل سے متعلق بتانے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ممکن تھا اسے یہاں کی نئی صورتِ حال کا بتانے کے بعد وہ ہی مجھے کوئی مشورہ دیتا کہ اب بہرام خان کے ''مرحوم'' ہوجانے کے بعد مجھے کس سے ملنا چاہیے تھا؟ وغیرہ۔

میں نے کھانا منگوا کر کھایا اور فاران احمد کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ وہ اتنی جلدی لوٹتا۔وہ بے چارہ روڈ پر روزی کمانے نکلا ہوا تھا اور بہ قول اس کے وہ شام سے پہلے نہیں لوٹتا تھا،کبھی کبھار اسے لوٹتے ہوئے رات بھی ہوجاتی تھی۔میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا تھا،مجھے یہاں بہت سے کام نمٹانا تھے،جنھیں میں نے مرحلہ وار نمٹانے کی ایک ترتیب اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں بنا رکھی تھی۔

سب سے پہلا کام میرا فرحانہ کا کھوج لگانا تھا۔اس دوران میں مجھے را کا کو واصلِ جہنم بنانے کی کوشش بھی کرنا تھی اور شاہ میر کو بھی پاکستان کی عدالت کے کٹہرے میں لانا تھا۔آخرالذکر کام بے شک ذرا لمبے چوڑے ''پروسس'' کا سہی،تاہم میں نے یہ بھی دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ اس طرح میرے قابو میں نہ بھی آیا تو زندہ میں بھی اسے نہیں رہنے دوں گا۔اس مردود کو فنا کے گھاٹ اُتار کے کم از کم اپنے باپ کی بے گناہ موت کا تو انتقام ضرور لوں گا۔رابن رائڈ تو سردست اس سے میری براہِ راست کوئی خاص دشمنی نہیں تھی لیکن اگر اس نے بھی میرے راستے میں آنے کی کوشش چاہی تو میں زندہ اسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔

را کا جن غیر متوقع حالات میں میرا سامنا ہوا تھا اس نے میرا آیندہ کا پروگرام چوپٹ کر ڈالا تھا۔بہ صورت دیگر میں نے بہرام خان کی بیوہ سے فی الفور رابطہ کرنا تھا۔فاران احمد کے مشورے اور اس کے بتائے آدمی محمود الحسن سے بھی ملنا تھا،وہ کام بھی رہ گیا تھا۔

تب ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ را کا کا وہ گرانڈیل ساتھی جس کی فون پر میں نے بہرام خان کی بیوہ کو راستے سے ہٹانے سے متعلق گفتگو سنی تھی،ساتھ ہی میں نے اس کے منہ سے ''گلنارا'' کا نام بھی سنا تھا،جو یقیناً بہرام خان کی اسی بیوہ کا نام ہی ہوسکتا تھا۔مجھے اس کے بارے میں بھی اُسے آگاہ کرنا تھا اور اس سے یقیناً مجھے یہاں آباد میرے دشمنوں سے متوقع جنگ کے سلسلے میں اہم راہنمائی بھی مل سکتی تھی۔اس کی جان خطرے میں تھی اور یقیناً وہ بھی اس سے غافل نہ ہوگی۔

یہ اب مجھے فاران ہی بتا سکتا تھا۔را کا کا معاملہ نہ ہوتا تو میں اسی وقت کیمپ تھری میں کسی سے اس کا اتا پتا حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور بہرام کی بیوہ (گلنارا) کے پیچھے جا لگتا۔

میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے ایک اور ارادہ باندھا۔میرے پاس ابھی ٹیلی فونک رابطے کا پرسنل کوئی ذریعہ،یعنی موبائل وغیرہ نہیں تھا۔اس کا سارا بندوبست اپنے

طور پر میرے لیے بہرام خان نے کرنا تھا، جبکہ اب وہ خود قبر میں لیٹا منکر نکیر سے اپنا بندوبست کروانے میں مصروف ہو چکا تھا۔

میرے دل میں بے چینی گھر کرنے لگی تھی۔ مجھے بہرام خان کی بیوہ کو خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ وہ غم و غصے کے جوش میں کیمپ تھری کے اندر جو واویلا اور قانونی دھمکیاں دے کر گئی تھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے اور اس کے دونوں معصوم بچوں کے لیے کس قدر خطرناک اور جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ نہ ہی اُسے ابھی را کا جیسے جلاد انسان کا پتا تھا۔

میں پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا اور سوچا کہ ایک نئے بہروپ کے ساتھ دوبارہ مجھے کیمپ تھری کا چکر لگانا چاہیے۔ مگر میں کون سا نیا بھیس بھرتا؟ میرے پاس اتنا سامان نہ تھا۔ یہ عربی لباس بھی مجھے فاران احمد نے ہی مہیا کر کے دیا تھا۔

اس وقت مجھے فاران احمد کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ میری پہنچ میں نہیں تھا۔ بالآخر میں نے ایک اور رسک لینے کا فیصلہ کیا اور دوبارہ کیمپ تھری جانے کے ارادے سے اُٹھا۔ سرائے سے نکلا ہی تھا کہ سامنے نظر پڑتے ہی میں چونک پڑا۔

وہ فاران احمد کی ٹیکسی تھی اور خوش قسمتی سے وہ یہاں کی سواری لایا تھا۔ میرا دل مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اس وقت مجھے اس کی موجودگی نعمتِ غیر مترقبہ ہی لگی اس نے مجھے ایک بڑے رسک سے بچا لیا تھا۔

میں تیر کی طرح اس کی جانب لپکا۔ وہ ڈگی سے سواری کا سامان اُتار رہا تھا، مجھے دیکھ کر مسکرایا اور سلام کا اشارہ کر دیا۔

جب وہ فارغ ہو گیا اور وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ رہا تو میں نے اسے کچھ زیادہ بتائے بغیر جلدی سے کہا۔

''کیا تم مجھے اسی وقت بہرام خان کے گھر لے جا سکتے ہو؟''

وہ میری بات سن کر چونک پڑا۔ بولا۔ ''خیریت تو ہے نومی بھائی؟ یہ اچانک......''

''میرے پاس وقت بہت کم ہے، باقی باتیں راستے میں بتا دوں گا۔'' میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''بس...... یوں سمجھ لو اس کی جان خطرے میں ہے اور مجھے اسے ایک خطرے سے فوری طور پر آگاہ کرنا ہے۔''

فاران سمجھدار تھا، اس نے پھر کوئی دوسری بات مجھ سے نہیں کی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد ہی ٹیکسی ''اوالی'' روڈ پر فراٹے بھر رہی تھی۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ممکن ہے شہر والی رہائش گاہ کی بجائے ادھر ہی کیمپ تھری کی کالونی میں مقیم ہو، کیونکہ وہ آج ادھر ہی نظر آئی تھی اسی لیے ہم نے پہلے یہاں کالونی میں اسے دیکھنا ضروری سمجھا تھا، ورنہ شہر کا طویل چکر ہمیں خالی پڑتا۔ وقت الگ ضائع ہوتا۔

دن چڑھ رہا تھا اور سورج نصف النہار پر آگ برسا رہا تھا۔ کار ائیر کنڈیشن تھی۔ میں نے دوران سفر فاران احمد کو صرف اسی قدر ہی بتایا کہ مقتول کی بیوہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کیمپ تھری آئی تھی اور واویلا مچا کر اپنی جیپ میں لوٹ گئی تھی۔ یہ بھی کہ میں نے ایک مشکوک شخص کو کسی سے ٹیلی فون پر بات کرتے بھی اتفاق سے سن لیا تھا جو اپنے کسی باس سے مخاطب تھا۔

اس کے بعد را کا وغیرہ کے بارے میں بات گول کر گیا۔

''صاف ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ جو بہرام خان کے قاتل ہیں۔'' یہ سب سننے کے بعد فاران احمد نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا اور آگے بولا۔ ''مگر گلنارا نے یہ بڑی خطرناک بے وقوفی کی ہے۔ قانون اور ثبوتوں کی دھمکیاں دے کر اس نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو چونکا دیا ہے۔''

''گلنارا...... سے تمہاری مراد مقتول بہرام خان کی بیوہ ہے؟'' میں نے تصحیح چاہی تھی۔

''ہاں......''

''کاش! وہ ادھر ہی مل جائے۔ ویسے ادھر کہاں رہتی ہو گی؟''

''آج کل اوالی میں ہی رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کیمپ تھری کی کالونی اسی علاقے کے جنوب میں ہے۔''

''اوہو......'' میرے ہونٹ بے اختیار تشویش زدہ انداز میں سکڑ گئے۔

''پھر تو وہ اور زیادہ خطرے میں گھر چکی ہے۔ پتا نہیں اب تک......''

''نہیں......'' فاران نے میری بات کاٹی۔ ''اگر وہ اپنے بھائی کے ہاں نہیں گئی تو اسے کیمپ تھری میں کوئی خطرہ نہ ہو گا کیونکہ وہاں پولیس کا سخت پہرا ہوتا ہے اور ہر آنے جانے والا ریکارڈ رجسٹرڈ کیا جاتا ہے، خواہ وہ ایمپلائی (ملازم) ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ قاتل اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ اسے کیمپ تھری والی رہائش میں قتل کریں۔''

''اچھا......'' مجھے کچھ تسلی ہوئی۔تاہم ایک خدشے تلے بولا۔''لیکن کیا خبر اس نے اپنے بھائی کے گھر کا رخ کیا ہو تو۔''

''خدا کرے اس نے ایسا نہ ہی کیا ہو ورنہ خطرے کی زد میں آسکتی ہے۔'' فاران نے کہا اور ایک موڑ کاٹا، گرد وغبار کا ایک مرغولہ عقب میں بلند ہوا اور ہماری کار پر غلبہ پانے کے لیے لپکا، مگر موڑ کاٹتے ہی فاران نے کار کی رفتار پھر تیز کردی۔

ہم اب کیمپ تھری کے قریب سے گزرنے لگے۔یہاں سے مزید پانچ کلومیٹر بعد کار دائیں جانب نشیب میں اُتر گئی۔ اب ہم تپتے ہوئے ریگ زار کے بیچوں بیچ سفر کررہے تھے پھر لگ بھگ کوئی تین چار کلومیٹر مزید سفر کے بعد کار کی رفتار دھیمی پڑگئی۔

میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا، سامنے سیدھی صحرائی ویرانوں کی طرف جاتی سڑک کے دائیں بائیں سے دو سڑکیں اور نکل رہی تھیں۔فاران نے بائیں جانب والی سڑک پر ٹیکسی موڑ دی اور پھر اس کے بعد ایک بڑی سی کوئی پانچ، چھ فٹ اونچی دیوار ہمارے دائیں جانب ساتھ ساتھ چلنے لگی۔فاران نے بتایا کہ اس کے دوسری طرف کوارٹرز اور بنگلے بنے ہوئے تھے۔کوئی ایک کلومیٹر مزید چلنے کے بعد کار بائیں جانب گھوم گئی اور ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے رک گئی۔

میں نے سامنے دیکھا۔ایک بڑی سی ہرڈل راڈ لگائی ہوئی تھی جس کے دونوں جانب کنکریٹ کی مضبوط چیک پوسٹ کیبن بنے ہوئے تھے۔ان میں دورخی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔اندر باہر باوردی سیکیورٹی کے افراد نظر آئے۔چند افراد کے کاندھوں سے گنیں جھولتی نظر آرہی تھیں۔یہ لوگ مقامی نظر آرہے تھے۔

دونوں کیبنوں کے وسط میں موٹی سی ہرڈل راڈ ہمارا راستہ روکے ہوئے تھی۔

فاران نے اس کے قریب جا کر کار روک دی۔شیشے نیچے کیے اور اسی وقت ایک سیکیورٹی اہلکار ہماری جانب بڑھا اور بہ غور ہم دونوں کی طرف گھورتے ہوئے عربی میں کچھ بولا۔جو میرے پلے نہیں پڑا۔البتہ فاران نے اس سے انگلش میں کہا۔

''پلیز!انگلش۔'' وہ آدمی ایک دو سیکنڈ کچھ سوچنے کے بعد سیدھا ہوا اور کسی کو آواز دے کر بلانے لگا۔

''مجھے عربی آتی ہے، مگر میں چاہتا ہوں، تم بھی بات کرسکو اور سمجھ سکو۔'' اسے دوسری جانب متوجہ پاکر فاران احمد نے مجھ سے نیچی آواز میں کہا اور اس کی عقل مندی کا معترف ہونے لگا۔

''کون ہیں آپ لوگ؟'' ایک دوسرے اہلکار نے ہم دونوں کو بہ غور گھورتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے......'' فاران نے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ جمائے ہوئے میری طرف گردن کے اشارے سے کہا۔''محترمہ گلنارا صاحبہ سے ملنا ہے۔''

''آپ کم از کم تین چار گھنٹوں تک ان سے نہیں مل سکتے۔'' اس نے جواب دیا۔اس کی عربک لب ولہجے والی انگریزی بس گزارے لائق ہی تھی۔

''کوئی خاص وجہ؟''

''ان کے شوہر کا مرڈر ہوگیا ہے اور پولیس ٹیم اس وقت اندران کے پاس موجود ہے۔وہ خاتون سے ضروری تفتیش میں مصروف ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''مگر ان کا گلنارا سے ملنا بے حد ضروری ہے، ہم بھی اسی سلسلے میں ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ہم انتظار کرلیں گے۔''

اس نے جواب میں کہا۔''آپ کو ویٹنگ ہال میں جانا ہوگا۔گلنارا سے ہم ٹیلی فون پر آپ کی بات کرادیں گے لیکن اسی صورت میں جب وہ تین چار گھنٹے بعد فارغ ہوں گی اگر انہوں نے ملاقات کی ہامی بھری تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کو اس طویل انتظار کے باوجود ایسے ہی لوٹ جانا پڑے گا۔''

''جی شکریہ!ہمیں منظور ہے۔ویٹنگ ہال کہاں ہے؟'' اس بار میں نے پوچھا۔

اس نے فاران کو بتایا اور پھر فاران نے بھی اس کا شکریہ ادا کرکے کار کو ریورس گیئر میں ڈالا۔شکر تھا کہ گلنارا...... ادھر ہی تھی ورنہ مجھے شہر تک کا طویل سفر کرنا پڑتا۔

ایک نصف دائرے کا چکر کاٹ کر ہم عمارت سے متصل شیشوں کے دروازے والے ویٹنگ ہال کے بڑے سے گیٹ کے سامنے رکے اور کار سے نیچے اُتر آئے۔

وہاں گیٹ پر بھی دو مسلح سیکیورٹی اہلکار موجود تھے۔انہوں نے ہماری تلاشی لی اور ہمیں اندر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

بحرین کے اس تپتے سلگتے ریگزار میں ایسا جدید اسٹائل کا آرام دہ ائرکنڈیشن ہال کا موجود ہونا میرے لیے حیرانی کا سبب نہ تھا۔

میں اور فاران احمد خاموشی سے ایک آرام دہ صوفے پر

براجمان ہوگئے۔

میں طائرانہ نظروں سے ہال کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مجھے ایک مرد اور ایک عورت بھی بیٹھے نظر آئے۔ سامنے استقبالیہ طرف کا ایک کاؤنٹر تھا، مگر وہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ مختلف قسم کے ٹیلی فون سیٹس پڑے نظر آرہے تھے، جو نیلے پیلے اور سرخ رنگت کے تھے۔

ایک ملازم ٹائپ کا نوعمر لڑکا وہاں پانی وغیرہ پلانے میں مصروف تھا۔ ہمارے لیے بھی ٹھنڈے پانی کی مشکیزہ ٹائپ بوتل اور گلاس لے کر آیا تھا۔

فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر آئل فیلڈ متعلق پینٹنگز اور نقشے وغیرہ چسپاں تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک واش روم سے ہم نے خاتون کو برآمد ہوتے دیکھا۔ یہ بھی مقامی تھی اور اس نے سیاہ عبا پہن رکھی تھی۔ اس نے ہماری طرف ایک نظر ڈالی اور پھر اپنے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔

ٹھیک اسی وقت ایک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اس جوڑے کی طرف دیکھا جو ہمارے سیدھے ہاتھ کے صوفے پر براجمان تھا۔ وہ ان کی جانب بڑھے، عربی استقبالیہ خاتون نے ان سے عربی میں ہی کچھ کہا اور وہ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بھی شاید کسی سے ملنے کے انتظار میں بیٹھے تھے اور گویا ''پروانۂ راہداری'' پاتے ہی نکل لیے تھے۔

ہمیں اپنی باری کا انتظار تھا۔ جو تین چار گھنٹوں سے پہلے آنے کی نہیں تھی۔ اس میں بھی گلنارا کی مرضی کا دخل تھا کہ وہ ہمیں ''شرف باریابی'' بخشتی ہے یا اتنے طویل انتظار کے بعد ہمیں انتظار کی کوفت میں مبتلا کیے جانے کا احساس کیے بغیر ہمیں ایسے ہی چلتا کر دے گی، یعنی ملے بغیر۔

اس عربی خاتون نے ہماری جانب بھی دیکھا تھا اور عربی میں کچھ پوچھا تھا جس کا جواب فاران نے عربی میں ہی دیا تھا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''یہی کہ ہم کس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہم......''

انتہائی بور یکسانیت بھرا، ابھی صرف ایک گھنٹا ہی بیتا تھا کہ اچانک میری نظر شیشے کے دروازے کے پار پڑی۔ وہاں ایک بڑی سی چمکتی دمکتی نئی کار رکی۔ اس کے اندر سے دو افراد اُترتے دکھائی دیے۔ میں نے وہیں سے انہیں پہچان لیا اور یکلخت مجھے اپنا سینہ سکڑتا ہوا اور دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔

ان دو میں سے ایک تو وہی گرانڈیل بدمعاش نما آدمی تھا، جبکہ دوسرا راکا تھا۔ دونوں وہی تھے جن سے میری مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ مجھے اتنی جلدی ان سے دوبارہ سامنا ہونے کی اُمید ہرگز نہ تھی۔

''خطرہ......'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے بدبدانے والے انداز میں برآمد ہوا اور فاران نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''کک......کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، بس! ذرا خاموش رہنا تم۔'' میں نے بدستور شیشے کے پار اپنی نظریں جمائے اس سے کہا تو اس نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھا۔

''کیا یہ دونوں آدمی......'' فاران پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''پلیز، فاران!'' میں نے ہولے سے تادیبی انداز میں اس کی بات کاٹ کر کہا اور وہ چپ ہوگیا۔

راکا اور وہ گرانڈیل، دونوں دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور میرا دل تیز تیز دھڑکے جا رہا تھا۔ مجھے تسلی تو تھی کہ راکا کم از کم یہاں میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی جرأت دکھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں! البتہ وہ مجھے پہچانتے ہی میری طرف متوجہ ضرور ہو جائے گا، یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا مگر میری کوشش تھی کہ میں ابھی اپنے دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسی سبب میں ایک عرب باشندے شیخ واجد الکریمی کے بھیس میں راکا سے پہلے بھی جان چھڑا چکا تھا، ایک خدشہ ذہن میں اُبھرا تھا کہ کہیں یہ راکا میری اصلیت تو نہیں بھانپ چکا تھا؟ اور یوں کیمپ تھری سے ہی یہاں تک میرے تعاقب میں آرہا ہو؟

میرا ذہن اس وقت تیزی سے سوچوں کے تانے بانے بن رہا تھا کہ یہ لوگ کیوں آئے تھے؟ گلنارا سے ملنے؟ اگر ایسا تھا تو کالونی کے گیٹ پر سیکیورٹی کے اہلکاروں نے انہیں بھی طویل انتظار کے لیے یہاں بھیج دیا تھا؟ اگر ایسا تھا بھی تو یہ واپس بھی لوٹ سکتے تھے اور تین چار گھنٹے آرام سے اپنی آرام دہ کمین گاہ میں گزار کے دوبارہ بھی آسکتے تھے؟ یا پھر انہوں نے کسی اور سے ملاقات کرنی ہو، جو ایک آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد ممکن ہو سکتی ہو؟

ادھر ہال کا دروازہ کھلا اور میرا دل زور سے دھڑکا۔ سب سے پہلے راکا اندر داخل ہوا۔ اس سے چھپنے یا اپنا چہرہ

چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا اب۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا تھا اور اس کا ہال کے اندر داخل ہوتے ہی متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنا ہی مجھے کھٹک گیا کہ دال میں کالا تھا۔

پھر اگلے لمحے میں ہی مجھ پر اس کی نظر پڑی اور......

اسے پل بھر کے لیے میں نے سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہوتے دیکھا، مگر دوسرے ہی لمحے ایک حیران کن امر ظہور پذیر ہوا، وہ میری طرف ایک دم ہی یوں بے پرواہ سا نظر آنے لگا جیسے مجھے اس نے پہچانا ہی نہ ہو، میں اس کی مکاری بھانپ چکا تھا۔

اس نے استقبالیہ پر موجود عبا پوش خاتون سے مسکرا کر کچھ ہائے، ہیلو قسم کے جملے کہے، جس کا جواب بھی اسے مسکراتی آنکھوں اور نقاب کے اندر ہلتے لبوں سے ملا تھا۔

دونوں میں شناسائی کا ہونا میرے لیے مطلق اچنبھے کی بات نہ تھی۔

وہ عربی میں ہی مخاطب ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئے، اس کا گرانڈیل ساتھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ تاہم اس کے بھی انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے۔ وہ بھی راکا کی طرح کسی ''تلاش'' میں ہی یہاں آئے تھے۔

اچانک راکا میری جانب بڑی زہرخند مسکراہٹ سے گھورنے لگا اور پھر میں نے اسے اپنے گرانڈیل ساتھی سے کچھ کہتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی چونکنے کے آثار اُبھرے تھے۔

فاران یہ ساری حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا۔

استقبالیہ پر موجود خاتون بھی ہمارے ان ''اطوار'' کو کچھ شبے کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھی۔

تب ہی اچانک راکا اپنی جگہ سے اُٹھا، میرے چہرے پر ایک آخری گھورتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر میری نبضیں یکلخت دوڑنے لگیں۔ اس موذی مردود نے میری جانب ہی قدم بڑھائے تھے۔ مجھے اُمید تو نہ تھی کہ وہ یہاں مجھ سے کسی قسم کی چنگے بازی کی کوشش کرے گا، تاہم اس لعین خونی درندے سے کچھ بعید بھی نہ تھا، میں سنبھل سا گیا اور بغیر کسی مرعوبیت کے اس کی مسلسل اپنی جانب گھورتی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ہوئے ہی رہا۔

''ہیلو، مسٹر نعمان! بحرین کے صحراؤں میں راکا تمہیں

خوش آمدید کہتا ہے۔'' اس نے میرے قریب پہنچتے ہی عجیب سے گھمنڈی لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''تم سے دوبارہ ملاقات کی خوشی ہوئی۔'' کہتے ہوئے اس نے میری طرف کھڑے کھڑے ہی مصافحے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بڑھا دیا۔ مجبوراً مجھے بھی اخلاق کا مظاہرہ کرنا ہی پڑا اور کھڑے ہوکر میں نے بھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گویا چارو ناچار تھام لیا۔

''بیٹھو.........'' کہتے ہوئے وہ میرے سیدھے ہاتھ کے سنگل صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

راکا کے انداز و اطوار سے روایتی غرور مترشح تھا۔ ہم دونوں کئی بار ایک دوسرے کو زک پہنچا چکے تھے۔ کبھی وہ غالب آتا کبھی میں لیکن میں نے اکثر اسے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر ہی مجبور کیا تھا اور یہی میری اس پر فوقیت تھی۔

اس کا مکروہ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اب بھی مجھے یہاں دیکھ کر اندر سے بری طرح خار کھائے ہوئے تھا اور دکھاوے کی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیے ہوئے تھا۔

''یہاں تم یقیناً پرل ٹریڈرز کی طرف ہیوی ڈیوٹی مشینری امپورٹ کرنے کے معاہدے کے سلسلے میں آئے ہوگے۔'' اس نے کہا اور میں چونک گیا۔ وہ میری یہاں (بحرین میں) آمد سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

''تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔''

''تو پھر تمہیں اس وقت مسٹر جیکسن کے پاس موجود ہونا چاہیے تھا، یہاں تم کیا کر رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں طنز کی زہریلی کاٹ تھی۔ جیکسن کا نام میرے لیے اجنبی تھا، ممکن ہو بہرام خان کے بعد اس معاہدے کے سلسلے میں مجھے اسی آدمی سے ملنا پڑتا۔ تاہم محمود الحسن کا نام بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

''رہنمائی کا شکریہ!'' میں نے ہولے سے مگر تاؤ دلانے والے انداز میں اس سے کہا۔ لیکن اس کے سوال کا جواب دینا گوارا نہیں کیا۔

''ہم......ویسے تم واقعی بہت بہادر ہو جو یہاں تک چلے آئے۔'' وہ پھر بولا۔ میں نے اب خاموشی اختیار کرلی تھی۔ یہی نہیں اس کی طرف سے بے نیازی بھی برتنے لگا، وہ چند ثانیے سے میرے بولنے کا منتظر رہا اس کے بعد خاموشی سے اُٹھ کر آگے بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا وہ سیدھا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا، اس نے شاید اپنے گرانڈیل ساتھی کو بھی آنے کا اشارہ کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی میری طرف ایک گھورتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

شیشے کے پار سے میں نے ان دونوں کو کار میں سوار ہوتے اور روانہ ہوتے دیکھا۔

''کون تھے یہ دونوں؟'' فاران نے ان کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

''دشمن......'' میں نے مختصراً کہا۔

''اوہ......'' اس کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ''محسوس کر رہا تھا میں، وہ کھردرے چہرے والا تو تمہیں یوں گھور رہا تھا جیسے کھا ہی جائے گا۔'' اس کا اشارہ راکا کی طرف تھا۔

''ان کے نام کیا ہیں؟'' اس نے آخر میں دریافت کرنا چاہا۔

''نام ہی نہیں ان سے متعلق ساری تفصیل بھی سنا دوں گا بہت جلد، لیکن ابھی نہیں۔''

فاران سمجھدار تھا، اس نے پھر اصرار نہیں کیا۔

راکا......کی نظروں میں آنے کا مطلب تھا میں شاہ میر اور بن رائد کی نظروں میں بھی آ گیا تھا۔ دشمنوں نے مجھے یہاں دیکھ لیا تھا۔ راکا کا ادھر آنے کے مشکوک انداز سے ہی میں جان گیا تھا کہ ویٹنگ ہال میں اس کی یوں متلاشی انداز میں آمد خالی از علت نہ تھی۔ وہ بھی یقیناً گلنارا سے ملنے کے لیے آیا ہوگا مگر گیٹ پر تعینات سیکیورٹی اہلکاروں نے اسے بھی وہی جواب دیا ہوگا جو ہمیں دیا تھا، کیا خبر کسی گہری شناسائی کے سبب کسی نے اسے بتا دیا ہو کہ کچھ اور لوگ بھی اسی انتظار میں ویٹنگ ہال میں موجود ہیں، راکا چونکہ مجرم تھا اور یہی جاننے کے لیے اس نے بھی ویٹنگ ہال کا رخ کیا کہ دیکھا جائے اور کون سی ''پارٹی'' گلنارا سے ملنے کی منتظر بیٹھی ہے، یوں وہ ادھر آن دھمکا تھا۔

انہی سوچوں اور الجھنوں میں دو تین گھنٹے بیت گئے، اس دوران میں یہی دعا مانگتا رہا کہ گلنارا کسی خوف یا پریشانی کی وجہ سے کہیں ہم سے ملاقات کا ارادہ نہ ترک کر دے ورنہ اس قدر طویل انتظار کی ساری محنت اکارت چلی جاتی۔ راکا بھی تو ملنے آیا تھا۔ ممکن تھا وہ مجھے پہچان کر لوٹ گیا ہو اور پھر کسی وقت آنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

اسی وقت ٹیلی فون کی بیل گنگنائی۔ میں نے چونک کر استقبالیہ خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ ریسیور کان سے لگائے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ کچھ بولی اس کے بعد مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کی طرف چلا، فاران نے بھی میری تقلید کی۔

''گلنارا آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' خاتون نے سیاہ نقاب کی اوٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکراتی آنکھوں سے کہا۔ میں نے یوں اس کے نازک ہاتھ سے ریسیور جھپٹا تھا جیسے وہ انکار ہی نہ کردے۔

''ہہ..... ہیلو..... مس گلنارا؟'' میں نے انگریزی میں استفسار یہ کہا۔

''یس..... آپ کون ..... ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' دوسری جانب سے ایک تیز سی نسوانی آواز اُبھری۔ اس کی تیزی میں خوف کا عنصر بھی مجھے واضح طور پر محسوس ہوا تھا۔ اس کی انگلش رواں اور شائستہ تھی۔

''جی میں، آپ مجھے نہیں جانتیں اور جانتا تو میں بھی آپ کو نہیں ہوں لیکن مجھے آپ سے ضروری ملنا تھا، کچھ اہم باتیں کہنا تھیں آپ سے۔''

''کس قسم کی باتیں؟'' سوال پوچھا گیا۔

''وہ میں مل کر ہی آپ کو بتا سکتا ہوں۔''

''میں آپ سے نہیں مل سکتی، آپ فون انہی خاتون کو دیں۔'' گلنارا نے بدستور اسی طرح خشک لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے ملنے سے صاف انکار کردیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اس ملتجی سے لہجے میں کہا۔

''دیکھیے خاتون! میرا ہی نہیں آپ کا بھی مجھ سے ملنا ضروری ہے، میں کئی گھنٹوں سے یہاں ویٹنگ ہال میں آپ سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھا رہا ہوں۔''

میرے قریب کھڑے فاران احمد نے صورتِ حال فوراً بھانپ لی اور مجھ سے ریسیور لے کر خود اپنے کان سے لگاتے ہوئے شناسا لہجے میں گلنارا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مس گلنارا! یہ میں ہوں، فاران احمد، ٹیکسی ڈرائیور، مجھے تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں ناں..... کئی بار آپ اور آپ کی فیملی کو میں یہاں لاتا لے جاتا رہا ہوں؟''

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے بھی گلنارا سے ملنے کی میری سفارش کردی۔ تھوڑی دیر بعد بالآخر گلنارا نے فاران احمد کے توسط سے ملاقات کی حامی بھرلی اور اس کے

کہتے ہیں حوصلے بلند ہوں تو انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا، چین کے شی ہنگ کی مثال لے لیں جنہوں نے 1995ء میں ایک حادثے میں اپنے دونوں بازو گنوانے کے بعد بھی حوصلہ نہیں ہارا اور اپنے پیروں سے پینٹنگ کرنا شروع کردی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ معذور افراد کے فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

☆☆☆

موریطانیہ مغربی افریقا کا ایک ملک ہے اور یہاں کی اکثریت مسلمان ہے۔ یہاں پر اگر کوئی خاتون اپنی شادی سے خوش نہ ہو تو وہ طلاق لے کر اپنے والد کے گھر واپس آجاتی ہے، جہاں اس کی آمد کی خوشی میں ایک جشن منایا جاتا ہے جسے طلاق کا جشن کہتے ہیں۔ موریطانیہ شاید وہ واحد ملک ہے جہاں کے معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کو زیادہ عزت دی جاتی ہے اور گھر کے اہم معاملات میں اس کے مشوروں کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

تائیوان میں مائی کافی کے نام سے مشہور ایک کیفے ایسا بھی ہے جہاں کافی پر اتنے دلکش اور دلچسپ نقش و نگار بنائے جاتے ہیں کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کیفے میں کام کرنے والی فنکارہ جس کا نام چینگ کوئی فینگ ہے، صرف دس منٹ میں کافی تیار کرنے کے بعد اس کے اوپر ایسے منفرد اور دلفریب نقش و نگار بناتی ہیں کہ کافی کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے، جن میں انسانی اشکال، پالتو جانور یا گاہک کی من پسند تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ چینگ کافی پر تصویر کے نقش و نگار صرف کریم اور دودھ کی مدد سے بناتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کام میں سب سے زیادہ مشکل جھاگ کو ڈیزائن کے حساب سے ترتیب دینا ہوتا ہے جو ان کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز میمن۔ لندن

تھوڑی دیر بعد ہم کالونی میں انٹر ہو چکے تھے۔ اندر دور دور یہ ایک ترتیب کے ساتھ بنگلے اور مکانات بنے ہوئے تھے۔ کوارٹرز بھی نظر آرہے تھے۔

ہم ایک بنگلے کے دروازے پر پہنچ کر رکے اور فاران

نے کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا۔ یہ ایک کرخت صورت ایک مقامی عورت ہی نظر آرہی تھی۔ رنگت سیاہ تھی اور آنکھیں نیچی نیچی تھیں۔ قد بھی مردانہ انداز کا دراز اور چوڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ مرد مار عورت تھی۔

فاران نے اسے میرے اور اپنے بارے میں بتایا۔ وہ ہم دونوں کو ایک خرانٹ سی نگاہ سے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اندر آجاؤ۔''

اندر سے مکان کی آرائش و تزئین دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس قدر سجا سنورا ہوا آرام دہ گھر جو زندگی کی ساری سہولیات سے مزین بھی نظر آتا تھا، دیکھ کر میں خوامخواہ ہی مرعوب سا ہونے لگا۔ نشست گاہ بھی بہترین سجاوٹ کا نمونہ تھی، جو دورِ جدید کے ساز و سامان سے مرصع تھی۔

میں اور فاران آرام دہ صوفے پر براجمان ہو گئے، میں ابھی اطراف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میں نے گلنارا کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اُس نے حسبِ سابق نفیس قسم کی بنگالی طرز کی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کے نقوش جیسے تیکھے اور گہرے تھے، جیسا کہ مذکور ہو چکا وہ ایک سانولی مگر پُرکشش رنگت کی خاتون تھی، اس کی آنکھیں گہری اور کشش انگیز تھیں۔ سرو قد تھی۔ اس کے بیضوی چہرے پر اُداسی غم کے علاوہ خوف کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ تاہم اپنے خاص بارعب انداز و اطوار سے وہ ایک دبنگ خاتون بھی لگی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ بہرام خان کا ذکر کرتے ہوئے رانا بشیر نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ ایک انڈین نژاد مسلمان ہے، لیکن گلنارا مجھے بنگالن خاتون محسوس ہو رہی تھی۔ بہت نفیس خاتون نظر آتی تھی۔

قریب سے اس کا جائزہ لینے پر مجھے اس کی عمر کا اندازہ چوبیس پچیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ وہ کسی طور بھی دو عدد ٹین ایجرز بچوں کی ماں بھی نہیں دکھتی تھی، جنہیں میں آج صبح اس کے ہمراہ دیکھ بھی چکا تھا۔

میں نے اس کے احترام میں کھڑے ہو کر اسے سلام کیا۔ فاران نے بھی فوراً میری تقلید کی تھی۔ گلنارا نے فاران پر محض ایک سرسری سی نگاہ ڈالی تھی مگر مجھے وہ کافی غور سے تکتی رہی میرے سلام کا جواب دینے کے بعد مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر بڑی سج سے براجمان ہو گئی۔

اس کی قدرتی کجراری آنکھیں ہنوز میرے چہرے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ تاہم ان میں تشکیک کے گہرے سائے ہلکورے لیتے نظر آتے تھے۔

''آپ کی تعریف؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام نعمان ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں۔'' میں نے ترنت کہنا شروع کیا کہ کہیں یہ مجھے جلد ہی جانے کا نہ کہہ دے۔ کیوں کہ اس کے طرزِ تخاطب سے بیزاری اور تھکن بھی ظاہر ہو رہی تھی، وجہ ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس پارٹی کی طویل بیزار کن تفتیش ہی ہو سکتی تھی، جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بھگتا چکی تھی۔

میں کہتا رہا۔

''میں پاکستان میں پرل ٹریڈرز کا بزنس منیجر ہوں۔ میرے باس کا نام مسٹر رانا بشیر ہے۔ گلفو آئل کمپنی کے سلسلے میں میری ایک اہم ملاقات آپ کے مرحوم شوہر مسٹر بہرام خان سے طے تھی اور انہوں نے ہی مجھے ائرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے آنا تھا۔ لیکن افسوس.....''

میں نے کہتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

میں نے دیکھا، میری اتنی صراحت پر گلنارا کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ شکوک کے سائے بھی ماند پڑنے لگے تھے اب اس کی دلنشین کجراری آنکھوں سے۔

اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ پھر بولی۔ ''بہرام کی زبانی میں نے غائبانہ طور پر رانا صاحب کا نام سن رکھا ہے۔ بہرام پاکستان جاتے تو ہوٹل کے بجائے انہی کے ہاں قیام کرتے تھے لیکن اب تو وہ دنیا میں نہیں رہے، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

''یقیناً مجھے اب آپ سے کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن پھر بھی میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہوں گا، جو میرا فرض بھی بنتا ہے۔ پہلی تو یہ کہ جن لوگوں نے آپ کے شوہر کا قتل کیا ہے میں ان سے واقف ہوں، دوسری بات یہ کہ وہ میرے بھی دشمن ہیں۔''

یہ بتانے کے بعد میں نے اس کا ردِعمل دیکھنے کے لیے اس کے دلکش چہرے پر نظریں جمادیں۔ میرا خیال تھا وہ میری بات سنتے ہی چونک پڑے گی لیکن یہ میری محض خام خیالی ہی رہی، جس کا دور کہیں خدشہ مجھے بھی تھا۔

اس کے چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ اسی

لہجے میں مجھ سے بولی۔

''تم شاید تیسرے یا چوتھے فرد ہو جو کم و بیش اسی قسم کی بات کا اظہار پہلے بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔ خیر......'' وہ اپنی ساری کا پلو درست کرتے ہوئے ایک نگاہ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے فاران پر ڈالتی ہوئی مزید بولی۔

''یہ تو فاران کی وجہ سے اور کچھ رانا بشیر کے حوالے سے میں نے آپ کو اتنا وقت دے دیا، بہرحال آپ کا شکریہ، میرا خیال ہے کہ میں خود بھی بہت اچھی طرح سے یہ حقیقت جانتی ہوں کہ میرے شوہر کے قاتل کون ہیں اور پولیس کو بھی میں نے ان کے نام بتادیے ہیں، باقی ٹھوس ثبوت میں عدالت میں پیش کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔''

اس کا آخر میں کہنے کا انداز مجھے ایسا ہی لگا۔ ''لہٰذا اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

مجھے اپنے حلق میں کڑواہٹ سی اُترتی محسوس ہوئی۔ تاہم گلنارا خود ایسے حالات سے دوچار تھی کہ اس کا بھی قصور نہ تھا۔ میں رخصت چاہنے والے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور آخر میں بولا۔

''محترمہ گلنارا صاحبہ! خدا کرے کہ مجرم کوئی اور گل کھلانے سے پہلے قانون کی گرفت میں آجائیں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ میں اور آپ بہرحال مقامی نہیں ہیں مگر دشمن نہ صرف مقامی بلکہ بے حد اثر و رسوخ والے بھی ہیں۔ چلتا ہوں۔''

میں گلنارا کو سوچتا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں اور فاران اسی ملازمہ کے ساتھ دروازے تک آئے اور...... باہر نکلے۔ ملازمہ نے ہمارے عقب میں دھڑ سے دروازہ بند کیا۔ اس سے مجھے ناگواری کا انداز محسوس ہوا۔

میں نے سر جھٹکتے ہوئے انداز میں ایک قدم آگے بڑھایا اور چونک کر رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے فاران نے یک دم پوچھا۔

میں نے کوئی سن گن لینے کے انداز میں اس سے کہا۔ ''تم نے کوئی آواز سنی؟''

''نہیں تو! کیسی آواز؟'' تبھی ایسی ہی آواز دوبارہ میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''خطرہ......! اندر کوئی خطرہ ہے فاران!'' میں نے سنسناتے لہجے میں ہولے سے کہا۔ وہ ایسی ہی آواز تھی جو ملازمہ کے دھڑ سے دروازہ بند کرنے کے بعد اندر سے آتی ہوئی مجھے سنائی دی تھی جیسے کسی کو اچانک دبوچ لیا ہو اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی ہو، چوں کہ ابھی میں دروازے کی چوکھٹ بھی پار نہیں کر پایا تھا، یہ ہلکی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی، جبکہ دوسری آواز میں ایسی کھڑبڑاہٹ تھی، جس سے کسی گڑبڑ کا احساس اُبھرتا تھا۔

''اندر تو ہم ہی تھے بھلا اندر کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔''

''گلنارا کی جان خطرے میں ہے اندر فاران!'' کہتے ہوئے میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی اور میں نے فوراً پلٹ کر دروازے کو اندر کی طرف تھوڑا دھکیلا۔ وہ بند تھا۔ میں نے فوراً کال بیل بجانے کا ارادہ کیا مگر کچھ سوچ کر بدل دیا اور فاران سے بولا۔

''اندر داخل ہونے کا کوئی چور راستہ مل سکتا ہے ہمیں؟''

''ہرگز نہیں یہاں ایسی حرکت کرنا بھی مت۔'' فاران تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ مت سمجھو کہ سیکیورٹی اہلکار گیٹ تک محدود ہیں وہ خفیہ کیمروں سے ایک ایک مکان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں، پکڑے گئے تو مشکل میں پڑجائیں گے۔''

''فاران! تم جاؤ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم خوامخواہ میرے ساتھ......''

''ہرگز نہیں جناب!'' اس نے فوراً میری بات کاٹ کر جرأت مندی سے کہا۔ ''آپ نے جو کرنا ہے کریں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے اس وقت ایک ایک لمحہ نازک اور قیمتی ہے۔ مجھے اور تو کچھ بھائی نہ دیا، میں نے کم از کم اندر کی گڑبڑ کو ''بدحواس'' اور ''خبردار'' کرنے کے لیے فوراً کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فاران بھی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

''کون ہے؟'' اندر سے اسی مردمار ادھیڑ عمر ملازمہ کی کھردری آواز اُبھری، لیکن اس میں مجھے وہ پہلے جیسی سختی محسوس نہیں ہوئی۔

''دروازہ کھولیے ذرا...... میں ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔''

اندر پل بھر کی خاموشی رہی پھر اس کی جوابی آواز ابھری۔

''آ......آپ اب پھر کسی وقت آجایئے گا۔میم صاحبہ اب آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔'' ملازمہ نے کہا، میں اب اس کے لب ولہجے پر ہی نہیں بلکہ اس کی آواز پر بھی غور کررہا تھا۔اس کا انداز گھبراہٹ آمیز محسوس ہوا تھا مجھے۔

''پلیز! یہ بات بے حد اہم ہے اور مس گلنارا کے علم میں لانا ضروری بھی۔میں یہ انہیں بتائے بغیر یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔''

اندر پھر خاموشی چھا گئی، مگر لمحہ بھر بعد دوبارہ اس کی آواز ابھری۔''آپ ضدمت کریں اور برائے مہربانی واپس لوٹ جائیں، ورنہ میں سیکیورٹی کو کال کردوں گی۔''

''بے شک آپ سیکیورٹی بلالیں یہاں میں ہرگز ٹس سے مس نہیں ہوں گا۔'' میں نے بھی پُرقطیعت سے کہا اور اندر کی خاموشی اس بار طویل ہوگئی، میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہیں وہ واقعی سیکیورٹی کو فون کرکے نہ ادھر بلوالے، دونوں صورتوں میں بہرحال میرا مقصد ایک ہی رہتا۔

''اچھا کھول رہی ہوں میں دروازہ۔'' اچانک آواز آئی اور میرے شکوک وشبہات یقین کی حد تک جاپہنچے۔

دروازہ کھلا، اسی ملازمہ کا چہرہ نمودار ہوا۔میرا پہلا عمل یہی تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر اپنی بھانپتی نظریں جمادیں۔ جہاں پہلے جیسی بیزاری اور ناگواری جیسے تاثرات تو کجا اس کی پیشانی پر شکن کا ایک بل تک مجھے دکھائی نہیں دیا تھا بلکہ اس کے برعکس وہاں مجھے ہراس اور آنکھوں میں ایک خاموش اور مجبور قسم کی التجا محسوس ہوئی، وہ بہت ذہین تھی، اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے مجھے بہت کچھ ''سمجھا'' دیا۔ میرے حوصلوں کے بادبان بلند ہوگئے۔میں ڈر کے پیچھے ہٹنے والوں میں سے کب تھا؟ حالانکہ جانتا تھا کہ اندر میرے لیے کس قدر خطرہ مجھے نگلنے کے لیے کسی عفریت کی طرح تیار کھڑا تھا۔

میں نے فاران کو باہر دروازے ہی میں رکنے کی تاکید کی، میں اسے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا مگر وہ نہ مانا۔ملازمہ نے مجھے فوراً اندر آنے کا راستہ دیا تھا اور اندر قدم رکھتے ہی میری تیر جیسی نظروں نے اس کے اطراف اور عقب میں دیکھنا شروع کردیا۔

دروازے کے اندرونی حصے کے اس مختصر گوشے میں اب مدھم سی تاریکی کردی گئی تھی۔جو دانستہ عمل ہی محسوس ہوا تھا مجھے۔میں نے اپنے تئیں بہ ظاہر عجلت اور بے پروانہ انداز میں اندر قدم بڑھادیئے اور اسی وقت مجھے اپنے دائیں جانب قدرے عقب میں کسی سائے کی آہٹ ابھرتی محسوس ہوئی، میں اسی پھرتی کے ساتھ تڑپ کر پلٹا، اس سائے کے ہاتھ میں خنجر تھا، جو بلند کیے ہوئے میرے جسم میں اُتارنے کو تیار بھی تھا۔میں نے اس کے پیٹ پر ناف کے نیچے زوردار لات رسید کردی، یہ ضرب اس کے لیے یقیناً غیر متوقع نہ سہی مگر اچانک ضرور تھی، وہ حملہ آور اپنے حلق سے اُوغ کی گھٹی گھٹی آواز نکالتا ہوا دہرا ہوگیا، میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھے جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنے کی بھی ایک زوردار ضرب شدید رسید کرڈالی۔وہ ڈھے گیا اور میں نے لپک کر اس کا خنجر ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس کا جائزہ لیا، وہ کچھ دیر کے لیے اناغفیل ہوچکا تھا۔

''وہ......وہ......اندر بھی موجود ہیں۔'' ہک بک سی کھڑی اور مجھے یہ ساری ''کارروائی'' پل کے پل نمٹاتے دیکھتی ملازمہ کو جیسے زبان مل گئی۔فاران بھی تب تک اندر چلا آیا تھا اور حیران پریشان مجھے دیکھا رہ گیا۔

''کتنے لوگ ہیں وہ؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''دو......ان کے پاس پستولیں ہیں۔دونوں بچے بھی ان کے قبضے میں ہیں۔وہ لوگ میم صاحبہ کے منہ سے کچھ اُگلوانا چاہتے ہیں۔'' اس نے بتایا اور میں خنجر ہاتھ میں لیے اس کے بتائے ہوئے کمرے کی جانب بڑھا۔

''جناب! آپ وہاں نہ جائیں۔'' فاران نے ایک دم ہلکی آواز میں مجھ سے کہا۔''آپ کی جان خطرے میں پڑسکتی ہے، سیکیورٹی والوں کو مطلع......''

''نہیں فاران! کچھ پُراسرار معاملات کو اسی تاریکی کے پردوں میں ہی نمٹانا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔'' میں نے عجیب سے جوش تلے لہجے میں کہا ''تم دونوں فقط ایک کام جلدی سے کرڈالو، اس عورت کی مدد سے رسی لے کر اس بے سدھ آدمی کی مشکیں کس دو، تاکہ ہوش میں آنے کے بعد یہ کام نہ خراب کرڈالے میں آگے دیکھتا ہوں۔'' فاران اور اس خاتون کو یہ ہدایت دینے کے بعد میں اسی کمرے کی طرف بڑھا۔جہاں کا اشارہ ملازمہ نے کیا تھا۔

یہ وہی کمرا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میری گلنارا سے

ملاقات ہوچکی تھی ۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا اور قریب پہنچا، دروازہ بند نہیں بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چوڑی درز سے اپنی آنکھ چپکادی۔ اندر کا ماحول ہی نہیں ان کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی صاف سنائی دینے لگیں۔

اندر دو نقاب پوش افراد نے گلنارا اور اس کے دونوں بچوں کو محبوس کررکھا تھا۔ دونوں بچے رسن بستہ حالت میں تھے اور ان پر ایک تنومند سا بدمعاش پستول لیے مسلط کھڑا تھا۔ اس کے پستول کی غیر معمولی لمبی نال کو دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سائلنسر ڈ تھا۔

دونوں بچے خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ یہی حالت ان کی ماں یعنی گلنارا کی بھی تھی، جو ایک اور ایسے ہی بدمعاش کی گن پوائنٹ پر دوسری طرف سراسیمہ سی کھڑی تھی۔ دوسرے بدمعاش کا پستول بھی سائلنسر ڈ تھا۔

گلنارا کی حالت خوف اور تشویش سے بری ہورہی تھی۔ اس کے دونوں بچوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ پہلا والا اس سے کچھ اُگلوانے کی کوشش کررہا تھا اور نہ بتانے کی صورت میں اسے اور اس کے بچوں کو موت کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

میں ابھی ان دونوں نقاب پوش بدمعاشوں کو قابو کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”اس نامراد ٹمبلر کو دیکھو جا کر کہاں رہ گیا، دروازے تک گیا تھا۔“

وہ شخص پستول ہاتھ میں تولے دروازے کی طرف آنے لگا جس کی دوسری جانب میں کھڑا تھا۔ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں جلدی سے بے آواز ایک طرف کو چپ کر کھڑا ہوگیا۔

دروازہ کھلا، وہ آدمی پستول ہاتھ میں لیے باہر نکلا اور میں نے موقع پاتے ہی اچانک اسے پیچھے سے چھاپ لیا۔ میں نے کھڑی ہتھیلی...... کا وار اس کی گدی پر کیا تھا، وہ تیورا کر گرا، مگر گرتے ہی فوراً سنبھلا، ادھر ہی میں دھوکا کھا گیا، پستول اگرچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اور اسے ڈھتا دیکھ کر میں نے کچھ زیادہ ہی عجلت کا مظاہرہ کرڈالا۔

یکے بعد دیگرے اس پر وار کرنے کی دھن میں اس نے گرتے ہی حیرت ناک انداز میں سنبھلا لیا تھا اور اپنی دائیں ٹانگ سوئپ کی جو میری دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی، نتیجے میں فرش سے چند انچ اُچھل کر میں گرا، وہ اپنے گرے ہوئے پستول کی طرف لپکا۔ بلاشبہ اس نے کمال پھرتی ہی نہیں ناقابلِ یقین برداشت سے بھی کام لیا تھا ورنہ جاننے والے فائٹر جانتے ہیں کہ کھڑی ہتھیلی کا وار اور وہ گدی پر پڑے تو مدِ مقابل کی کیا حالت ہوجاتی ہے۔

میرے اچھل کر گرنے کی آواز خاصی ”دھم“ کی صورت میں اُبھری تھی... جو اندر موجود اس کے ساتھی کو چونکانے کا سبب بن سکتی تھی۔

اس بدمعاش کی حیران کن کارکردگی نے میرے وجود میں بھی جوشِ غیظ کا طوفان بھردیا اور میں بھی بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی جانب کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر جس قدر تیزی سے لپک سکتا تھا لپکا...... ادھر اس کا ایک ہاتھ اپنے پستول پر پڑا، اُدھر میں اس قدر قریب تھا اور میرا گھونسا اس کے بائیں پہلو پر پڑا، اس کے حلق سے کریہہ ناک چیخ خارج ہوگئی، میں نے پھرتی سے اس کے پستول والے ہاتھ پر وار کیا، جسے وہ میری جانب سیدھا کرنے والا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گیا مگر...... اس طرح اس کی لمبی نال ہی میرے ہاتھ میں آسکی، میں نے وہی گھما کر اس کی کنپٹی پردے ماری...... بھچاک کی آواز نے اس کی کنپٹی پھاڑ ڈالی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

میں وحشتِ خوں رنگ انداز میں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا اور ایک درندہ وار جوش تلے اسے ٹھوکر مارتا ہوا اندر جا پڑا لیکن یہ حرکت میری بہ ظاہر اندھادھند سہی مگر اس میں احتیاط کا عنصر یہ تھا کہ میں اندر موجود بدمعاش کے پستول کی زد میں نہ آؤں اور دہی ہوا۔ بھی وہ بری طرح ٹھٹکا تھا اور گلنارا سے دھیان ہٹا کر وہ میری طرف متوجہ ہوا مگر اسے مجھ پر اپنا پستول سیدھا کرنے کا موقع نہ ملا اور میں نے اس کے ساتھی سے چھینے ہوئے پستول کی ”خاموش گولی“ اس کے جسم میں اُتار دی، وہ ایک کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

لڑائی اور ”مارا ماری“ کا یہ ٹیکٹیکل (Tactical) انداز میں نے کالیا کی سنگت میں کچھ اور اس کے ساتھیوں سے اس کے اڈے پر ہی سیکھا تھا جو آج صحیح معنوں میں میرے کام آیا تھا۔

گلنارا حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے گھٹے گھٹے انداز میں رونے لگے تھے۔ اتنے میں فاران اور وہ ملازمہ عورت اندر داخل ہوئے۔

”باہر ایک اور شکار ٹھنڈا پڑا ہے، اس کی بھی مشکیں کس

کر یہاں لے آؤ۔"

میں نے ہانپتی سی آواز میں ان سے کہا اور پھر گلنارا کی طرف متوجہ ہوا جو مجھے ہنوزیوں تکے جا رہی تھی جیسے میں کسی اور دنیا کا باسی ہوں۔

"دیکھ لیا آپ نے...... خطرہ میرے خبردار کرنے سے پہلے ہی یہاں موجود تھا۔" میں نے شکوہ کناں انداز میں گلنارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اس کے دونوں بچوں کے جکڑ بند کھولنے لگا۔

"اوہ...... میرے خدا...... ام...... میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟ آ...... آپ تو میرے اور میرے بچوں کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے اور میں کیسی بدنصیب عورت ہوں کہ اپنے نصیب کو ہی ٹھوکر مار کے گھر سے چلتا کر دیا۔"

اس کی آخرالذکر بات کا مطلب میں سمجھ رہا تھا، بولا۔

"اللہ آپ اور آپ کے بچوں کی سلامتی رکھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی فیملی پر جو کل رات غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے اس میں اضافہ ہو کیونکہ اتفاق سے میں نے فون پر ان لوگوں کی گفتگو سن لی تھی اور اسی دن سے ہی آپ کو خبردار کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا، میں ایک صاف گو آدمی ہوں، یہ کہ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا اور آیندہ بھی جو کروں گا، اگر آپ چاہیں تو وہ بھی احسان نہ ہوگا بلکہ اس میں میرا بھی مفاد شامل ہے، ایک بار پھر یہی کہوں گا میں کہ آپ کے شوہر یا اب آپ کے دشمن درحقیقت میرے بھی دشمن ہیں۔"

"مجھے اب آپ کی باتوں سے پورا اتفاق ہے...... آں...... سوری آپ نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟" وہ متاثر انداز میں بولی اور میرا نام پوچھا۔

"نعمان احمد۔" میں نے بتایا۔

اس عرصے میں فاران اور وہ ادھیڑ عمر "مرد" ملازمہ دوسرے بدمعاش کو بھی رسن بستہ کر چکے تھے۔

گلنارا اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر میں تیسرے بدمعاش کی طرف متوجہ ہوا جو خون میں لت پت قالین پر پڑا تھا۔ اس کے دائیں پہلو سے خون بہے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن شہ رگ پر الٹا ہاتھ رکھا۔ وہ پھڑک نہیں رہی تھی۔ وہ میری چلائی ہوئی گولی سے ختم ہو چکا تھا۔

میں نے ملازمہ کو اشارہ کیا کہ دونوں بچوں کو ان کے کمرے میں پہنچا دے اور وہ خود بھی انہی کے پاس رہے جب تک میں نہ بلاؤں۔

گلنارا اور بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے فوراً کہا۔

"آپ اسی کمرے میں موجود رہیں اور فاران! تم بھی یہاں سے مت ہلنا، میں ذرا گھر کے دیگر اندرونی گوشوں کی تلاشی لے لوں، کہیں اور کوئی نہ چھپا بیٹھا ہو۔"

نصف گھنٹے تک میں بنگلے کے اندرونی گوشوں میں تاکتا جھانکتا رہا، چھت پر بھی گیا اور وہاں بنے ایک دو اسٹور نما کمروں میں بھی دیکھا۔ پوری تسلی کرنے کے بعد میں دوبارہ نیچے آ گیا اور سوچتے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

"آخر یہ بدمعاش اندر کیسے داخل ہوئے؟ جبکہ یہاں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس ٹیم موجود تھی؟"

"یہ ضرور پولیس ٹیم کے اہلکاروں میں سے ہی کوئی ہوں گے۔" گلنارا بولی تو فاران نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا اور بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا، یہ لوگ پہلے سے ہی یہاں گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ممکن ہے یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ آپ پولیس کو کیا بیان دیتی ہیں۔"

فاران کی بات پر میں حیران رہ گیا۔ اس نے بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔

"میں پوری طرح متفق ہوں تمہاری بات سے مسٹر فاران!" میں نے ایک جوش تلے کہا۔ گلنارا بے چاری کی حالت پتلی ہوئی جا رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر اسی انداز میں بولی۔

"ام...... مجھے واقعی آپ کی مدد کی ضرورت ہے نعمان صاحب! پلیز، میری مدد کیجیے...... میں اور میرے بچے واقعی بہت خطرناک لوگوں میں گھر چکے ہیں۔" گلنارا کو صورتِ حال...اور میرے "پانی" کا اندازہ ہوتے ہی فوراً احساس ہو گیا کہ وہ شوہر کے قتل ہونے کے بعد خود بھی کیسی خطرناک صورتِ حال کا شکار ہو چکی ہے۔ یوں میری اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ میری کارکردگی نے ہی نہیں بلکہ میری صاف گوئی نے بھی اس کے دل میں میرا اثر قائم کیا تھا۔

لہٰذا میں نے نہایت بردبارانہ اور مدبرانہ لہجے میں اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے خاتون! مجھے یقیناً اس بات کی خوشی ہوگی کہ میں آپ کے کام آؤں، آج صبح جب میں نے آپ کو کیمپ تھری میں غم و غصے سے شور مچاتے دیکھا تھا تو اسی وقت میں جان گیا تھا کہ آپ جوش میں ایک خطرناک غلطی کر رہی ہیں۔ مجھے موقع نہ مل سکا تھا ورنہ تو میں وہیں آپ کو

ایک طرف لے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا۔ خیر..... اب خدارا سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائیں۔"

"یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی جناب نعمان صاحب!" فاران نے کہا۔

"اب ان کا کیا کرنا ہے؟"

اس کا اشارہ ان تینوں بدمعاشوں کی طرف تھا، جن میں ایک میرے ہاتھوں لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے فاران کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی تھی پھر گلنارا کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس کو کیا بیان دیا تھا۔"

"یہی کہ مجھے انہی لوگوں پر شبہ ہے جن سے میرے شوہر کا جھگڑا چلا آ رہا تھا۔"

"آپ نے کن لوگوں کے نام بتائے تھے؟" میں نے دھڑکتے دل سے اگلا سوال کیا۔

"ایک تو حسان بن رائد ہے، دوسرا شاہ میر اور تیسرا شخص..... ایک گورا ہے، جس کا نام..... لارڈ ورتھ ہے۔"

"آپ کے شوہر کی موت سے انہیں کس نوعیت کا فائدہ ہو سکتا تھا؟ آپ نے ٹھوس ثبوت اور شواہد وغیرہ کا بھی کوئی ذکر کیا تھا۔" میں نے پولیس کے سے انداز میں اس سے سوال کیا۔

گلنارا نے جواب دینے کی بجائے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا اور اسے مسلنے لگی۔ میں نے دیکھا وہ اس وقت سخت قسم کی اعصابی اور ذہنی کشیدگی کا شکار نظر آ رہی تھی۔ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی اور اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مم..... مجھے پلیز! پہلے ایک گلاس پانی پلا دو....." میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور مجھ سے پہلے فاران حرکت میں آیا، وہ قریب رکھے فریج کی جانب بڑھا اور اسے کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی۔ کانچ کے گلاس شیشے کی ٹاپ والی میز پر رکھے تھے۔ فاران نے پہلے گلاس بھر کر گلنارا کو دیا پھر مجھے بھی تھمایا جسے میں نے شکریہ کہہ کر لیا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ فاران نے بھی پانی پیا۔

"یہ تینوں گلفو آئل کے شراکت دار ہیں لیکن مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔" پانی کا ایک گلاس ختم کرنے کے بعد گلنارا نے بتانا شروع کیا۔ "بلیک گولڈ یعنی کالا سونا، اس کا نام تم نے شاید سن رکھا ہو۔"

یہ نام میرے لیے غیر شناسانہ تھا اسی لیے میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔ وہ آگے بتا رہی تھی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری

(1287ھ/1868ء - 1368ھ/15 مارچ 1648ء)

مفسر۔ مناظر اور عالم دین۔ ابوالوفا کنیت والد کا نام خضر تھا۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب کشمیر کے نومسلم خاندان منٹو سے ملتا تھا۔ آپ نے مولانا غلام رسول قاسمی، مولانا احمد اللہ امرتسری، مولانا احمد حسن کانپوری، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث تھے چنانچہ اپنے مسلک کی ترویج کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اخبار اہل حدیث جاری کیا۔ فن مناظرہ میں مشاق تھے۔ زندگی بھر آریہ سماج اور قادیانیوں سے معرکتہ الآراء مباحثے کیے اور دین اسلام اور ختم نبوت کی حقانیت ثابت کرتے رہے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد سرگودھا میں مقیم ہوئے۔ آخر عمر میں فالج ہو گیا۔ اور اسی عارضے سے وفات پائی۔ آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن کی تفسیر کا نام "تفسیر القرآن بکلام الرحمن" ہے۔ اردو تفسیر کا نام، تفسیر ثنائی" ہے۔

مرسلہ: احمد ندیم، لاہور

"یہ ایک گروپ ہے، جو بہ ظاہر کالے سونے (تیل) کی تلاش میں رہتا ہے اور سروے ٹیم کے ساتھ ہیلپنگ ہینڈ میں ہوتا ہے۔ اسے مشترکہ طور پر تشکیل دیا گیا ہے۔ اس میں ووڈ ورتھ کمپنی، جس کے تعاون سے گلفو آئل کمپنی جو یوا ہے ای کی ایک مشہور زمانہ اور معتبر کمپنی جانی اور پہچانی جاتی ہے، جبکہ ووڈ ورتھ کو تو عالمی سطح کی اہمیت حاصل ہے، اس میں پانچ ایکسپرٹیز کو شامل کیا گیا ہے۔ جن میں دو افراد ووڈ ورتھ کمپنی کے اور تین گلفو آئل کے شامل ہیں۔ سارا معاملہ اسی "بلیک گولڈ" کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ اس کی مخالفت سب سے پہلے بہرام نے ہی کی تھی، اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ یہ گروپ بلاوجہ تشکیل دیا گیا ہے جو درون خانہ مجرمانہ نوعیت کی سرگرمی میں ملوث رہتا ہے۔"

''مجرمانہ سرگرمی سے آپ کی کیا مراد ہے؟''میں نے درمیان میں کہا۔

''بہرام کو پہلے اس پر شبہ تھا کہ یہ گروپ غیر قانونی طور پر تیل کی تلاش اور کھدائی وغیرہ کے راستے اپناتا ہے اور تیل کے ان سوداگروں کی راہ ہموار کرتا ہے جو عالمی سطح پر تیل کا مصنوعی بحران پیدا کرکے یا قیمتوں کے حوالے سے انتشار پھیلا کر اپنی مرضی کے سامنے بڑے بڑے ممالک کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتے ہیں، یوں وہ اپنی جائز و ناجائز (جو زیادہ تر ناجائز ہی ہوتی ہیں) بات منوا کر اپنا الوسیدھا کرتے ہیں، ان کی اس حرکت سے تیسری دنیا کے ممالک، جن میں پاکستان اور بنگلہ دیش سمیت کئی ایسے ملکوں کی معیشت ڈھے جاتی ہے، جن میں مسلم ممالک اور ان کے حلیف ملک شامل ہیں اور بدقسمتی سے وہی زیرِ عتاب آتے ہیں۔ معاملہ تب خراب ہوا جب بہرام خان نے اس ''بلیک گولڈ'' کے اصل خطرناک اور بین الاقوامی سطح پر معیشت کا ہراس پھیلانے کے ایک مکروہ منصوبے کا بھی کھوج لگایا، جو کسی سپر پاور کے کہنے پر عنقریب شروع کیا جانے والا تھا۔''

''وہ منصوبہ کیا تھا؟''میں نے ایک عجیب جوش تلے سے لہجے میں پوچھا۔ میرے اندر ایکا ایکی ایک سنسنی سی اُترنے لگی تھی۔

''وہ خطرناک مشن، جسے بلیک گولڈ یعنی کالا سونا گروپ نے ''او، پی، پی'' کا نام دے رکھا ہے۔''

''او، پی، پی؟''میں نے استفسار طلب لہجے میں دُہرایا اور سوالیہ نظروں سے گلنارا کا چہرہ تکنے لگا۔

''ہاں...... او۔ پی۔ پی...... یعنی ...... آئل پروڈکشن پلیٹ فارم کی خفیہ طور پر ایک مجرمانہ...... تعمیر۔'' گلنارا نے بتایا۔

''یہ کیا بلا ہے؟''میں تیل اور تیل کی سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔

''تیل کی صنعت کی سیاست میں یہ ایک بڑی اور بدبلا ہے، بشرطیکہ اس کے مقاصد نیک ہوں، یہ آئل پروڈکشن پلیٹ فارم درحقیقت ایک عظیم الشان ''آئل رگ'' (Oil Rig) ہے، جو ایک بڑے بحری بیڑے پر بنا ہوا ہے۔ جسے ''سی کوئین'' یعنی ''سمندری ملکہ'' کہا جاتا ہے۔

یوں سمجھو یہ ایک کنواں ہے۔ ایک دہکتا ہوا جہنم زار کنواں، جس کے اندر تیسری دنیا کے غریب ممالک کو ہی نہیں بلکہ ان ممالک کو بھی جھوک دیا جائے گا جو ابھی ترقی پذیری کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں۔ اس کنویں کا ایندھن سب سے پہلے اسلامی ممالک کو بنایا جائے گا۔ اس کا موجد ایک شیطان ہے، جسے ''کالا شیطان'' کہا جاتا ہے۔ اسے تیل کی صنعت کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور کئی بڑے ممالک کے سیکریٹری آف اسٹیٹس کی اسے زبردست حمایت بھی حاصل ہے کیونکہ وہ ان ممالک کو کروڑوں ڈالرز کے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ یہ خود اس وقت کہاں اور کس ملک میں چھپا بیٹھا ہے، کوئی نہیں جانتا۔

وہ کالا شیطان اس وقت خود کو سات پردوں میں چھپائے ہوئے ہے اور اس نے اپنی کٹھ پتلیوں کو آگے کر رکھا ہے۔ بہرام خان اپنے سینے میں ایک سچے مسلمان کا دل رکھتے تھے۔ انہیں اس ''کالے شیطان'' کے اس مکروہ منصوبے کی بھنک مل چکی تھی۔ یہاں تک اُنہوں نے پتا لگا لیا تھا کہ سات پردوں میں چھپا ہوا وہ کالا شیطان ووڈ ورتھ کے مالک مسٹر ڈی کارلو کو ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے وہ گلفو آئل کے بھی چند مقتدرہ لوگوں کو بھی اپنا ہمنوا بنا چکا ہے۔''

وہ اتنا بتا کر ذرا خاموش ہوئی۔ مجھے اس کی باتیں سن کر اپنے دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی سنسنی کا احساس ہونے لگا۔

''بہرام، مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے جو کچھ وہ یہاں محسوس کرتے مجھ سے نہ صرف شیئر کرتے تھے بلکہ مشورہ بھی کرتے۔ وہ اس گھناؤنی سازش پر اندر ہی اندر کڑھتے بھی تھے۔''اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''میں نے ان سے کہا بھی کہ اگر ایسی بات ہے تو اس نوکری پر ہی لعنت بھیج کر اپنے دیش (بنگلہ دیش) چلے چلتے ہیں کیونکہ انڈیا ہم چھوڑ چکے تھے۔ بنگلہ دیش ہمارا آبائی وطن تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ بڑے عجیب سے لہجے میں اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ گلنارا! میں اپنی ذات کے بارے میں کوئی بڑا دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں کوئی محبِ وطن ہوں یا اسلام کا کوئی بڑا سپاہی، ہرگز نہیں، میں ایسا خوش قسمت کہاں۔ ایک عام سا آدمی ہوں میں، لیکن کیا ہمارا کام صرف یہی ہونا چاہیے کہ ملازمت کی، تنخواہ لی اور پیٹ بھر لیا؟ اور بس؟ اس سے آگے ہمارا کوئی فرض نہیں بنتا؟ اگر میں کسی ایسی گڑبڑ کا کھوج لگا بیٹھا ہوں جس سے ملک و قوم سمیت دنیائے اسلام کی سربلندی کو خطرہ درپیش ہو رہا ہو تو کیا میں اس سے چشم پوشی اختیار کرلوں؟ نہیں گلنارا! میں اپنے وطن کا سپاہی تو نہ بن سکا، اگرچہ ہر محبِ وطن ایک سپاہی ہی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ایک سچے مسلمان ہونے کے ناطے میں ایسی گھناؤنی سازش

کو ہوتے دیکھ کر اس سے نظریں چرا کر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس کالے شیطان (بلیک ڈیول) کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا ہے۔ آگے اللہ میری مدد کرنے والا ہے۔''

وہ اپنے شوہر کے بارے میں اتنا بتا کر بے اختیار رو پڑی۔

میرے سینے میں ایک ہلچل سی مچنے لگی۔ ایمان کی تازگی شاید اسے ہی کہتے ہیں جب کسی دوسرے مسلمان کی قابلِ فخر کارگزاری، اس کی سوچ اور عملی اقدام، پھر اس کی اس نیک کاز میں شہادت، ازخود ہی دوسرے مسلمان کے سینے میں احساس کا چراغ روشن کرنے لگتی ہے۔ ہاں! میرے نزدیک بہرام خان کی موت، موت نہیں تھی بلکہ ایک شہادت تھی۔ وہ اگر چاہتا تو واپس اپنے وطن بنگلہ دیش چلا جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایک اسلام دشمن، ایک شیطان کے خلاف ڈٹ گیا۔

میرے ضمیر نے مجھے بھی اندر سے جھنجوڑ دیا۔ چراغ سے چراغ جلنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ میں بھی اپنے اندر ایک ایسی ہی لو کو ٹمٹماتے ہوئے، اس کی تپش کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اگرچہ میں تو پہلے ہی ان کی سرکوبی کے لیے آگے قدم بڑھا چکا تھا۔

''آپ تو ایک خوش قسمت خاتون ہیں، محترمہ گلنارا صاحبہ!'' اچانک میرے منہ سے بے اختیار ایک جوشیلے انداز میں یہ توصیفی کلمات نکلے تھے۔ اس نے اپنا اشکبار چہرہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں! گلنارا صاحبہ، آپ ایک بہادر انسان ہی نہیں بلکہ ایک سچے اور مجاہد مسلمان کی بیوی تھیں اور اب ایک شہید کی بیوہ ہونے پر آپ کو فخر ہونا چاہیے۔ افسوس کہ میں بہرام خان سے تو کبھی نہیں مل سکا لیکن اس کے بارے میں اپنے باس رانا بشیر سے یہی سنا تھا کہ وہ ایک بڑی تیل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میں بھی انہیں کاروباری آدمی ہی سمجھا تھا لیکن مجھے تو آج آپ کی باتیں سن کر یہ احساس ہوا کہ وہ تو ایک عظیم انسان تھے۔'' میں اتنا کہہ کر ذرا رکا اور عجیب ہمکاری لینے کے انداز میں کسی غیر مرئی نقطے پر اپنی سوچتی سی نظریں گاڑتے ہوئے جیسے ایک عزم صمیم تلے لہجے میں دوبارہ اس سے بولا۔

''بھائی بہرام کی شہادت نے میرے اندر بھی ایک نئے جوش و جذبے کو اُبھارا ہے۔ مجھے اب یہ بتائیں......'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس اپنے شوہر کے قاتلوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہیں؟ اگر ہیں تو وہ کس صورت میں ہیں؟ محض قیافہ اس کی بنیاد ہے یا......''

''رتی بھر بھی قیافے پر منحصر نہیں ہیں وہ ثبوت۔'' وہ فوراً ایک جوش تلے لہجے میں بولی۔ ''بہت ٹھوس شواہد ہیں، وہ سب میرے پاس محفوظ ہیں اور میں نے وہ پولیس کو دے دیئے ہیں۔''

''اپنے پاس بھی کچھ رکھا ہے یا سب ان کے حوالے کر ڈالے آپ نے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو وہ شاید میری اس بات کا مطلب سمجھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی اور ایک جواب دینے کی بجائے اسی لہجے میں مجھ سے بولی:

''کیا مطلب آپ کا؟ کیا پولیس بھی؟''

''ممکن ہے۔'' میں نے کاندھے اُچکا کر کہا۔ ''کیونکہ دشمن خاصے بارسوخ ہیں اور ان کی پشت پر مجھے بعض بڑی عالمی طاقتوں کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ آپ کو یہ ثبوت پولیس کو دینے کی بجائے عدالت میں پیش کرنے چاہیے تھے۔''

''او میرے خدا! مجھ سے تو واقعی یہ ایک بڑی غلطی ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

میں نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔ ''پریشان نہ ہوں آپ کچھ سوچ لیتے ہیں، کاش! میری آپ سے پہلے ملاقات ہو جاتی تو میں آپ کو مشورہ دے سکتا۔''

''آپ نے وہ ثبوت پولیس کو دیتے وقت ان سے کوئی ریسیونگ لیٹر لیا تھا؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد فاران نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے صوفے پر پریشان بیٹھی گلنارا سے پوچھا۔

''نہیں، فاران بھائی! ایسا تو میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو خود پریشان اور غم زدہ تھی، میری عقل ہی کام نہیں کر رہی تھی، جوش میں آکر میں نے ایک بڑی غلطی کر ڈالی۔''

وہ بے چاری مسلسل پریشان ہوئے جا رہی تھی۔ میں نے پھر اسے تسلی دی اور اس کے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں پوچھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ نے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیونکہ آپ کے شوہر کے مقتول ہونے کے بعد تو اب ان کی نوکری اور تمام معاہدے ختم ہوگئے، آپ کو عنقریب یہ رہائش گاہ ہی نہیں بلکہ اس علاقے کو بھی خیرباد کہنا پڑے گا؟''

''میں اپنے شوہر کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہوں گی۔'' وہ تند سے لہجے میں بولی۔ ''منامہ میں

میرا بھائی منصور رہتا ہے۔ وہ ایک آئی ٹی کمپنی میں کمپیوٹر انجینئر ہے۔ میں اسی کے پاس رہوں گی، وہ آج شام تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”ان تینوں کا کیا کرنا ہے، نعمان صاحب؟“ فاران نے پوچھا۔ اس کا اشارہ بدمعاشوں کی طرف تھا۔ گلنارا بھی ان کی وجہ سے پریشان نظر آرہی تھی۔ کیونکہ یہ سارا ہنگامہ اسی کے گھر پر ہوا تھا۔

”پولیس کو انفارم کرنے کی صورت میں آپ لمبی چوڑی تفتیش کا شکار ہو جائیں گے، کوئی بعید نہیں کہ ایک بڑی مصیبت بھی گلے پڑ جائے۔“

”یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ میں نے گہری تفکیر سے کہا۔ ”بہ صورتِ دیگر ہم اس سے زیادہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔“

”میرے ذہن میں ایک راہ سجھائی ہے۔“ اچانک گلنارا نے کہا اور فاران اور میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولی۔

”آج شام تک میرا بھائی منصور مجھے ساتھ لے جانے کے لیے پہنچ رہا ہے۔ ہم خاموشی سے نکل جاتے ہیں، کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بعد میں یہاں کیا ہوا، پولیس خود جانے اوران کا کام...... وہ انہیں چور ہی سمجھیں گے۔“

”اور...... لاش کا کیا بتائیں گی آپ؟“ فاران نے کہا۔

”تم نے دیکھا کہ یہ لوگ نقاب اُوڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھی دستانے نظر آرہے ہیں۔“ گلنارا جیسے ہمیں اس گمبھیر صورتِ حال سے نجات دلانے کے لیے ہمیں تدبیر سجھا رہی تھی۔ آگے بولی۔ ”نعمان ان کے پستول سے اپنے فنگر پرنٹس صاف کرلیں، بعد میں سیکیورٹی اہلکار یا انتظامیہ کے افراد یہاں آبھی گئے تو ان تینوں کو چور ہی سمجھا جائے گا۔“

اس کی تجویز قابلِ غور تھی کیونکہ وہ تینوں غیرقانونی طور پر اندر داخل ہوئے تھے۔ جن میں سے اب ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں واصلِ جہنم بھی ہو گیا تھا لیکن گلنارا کی بات پر غور کرنے کے دوران میرے ذہن میں بھی ایک خیال کلک ہوا تھا۔ میں نے ابھی تک ان کی جیبوں کی تلاشی نہیں لی تھی اور دوسرے یہ کہ ان سے پوچھ گچھ ضروری تھی۔

میں نے اوّل الذکر کام نمٹایا۔ دونوں ہوش میں آچکے تھے۔ باقی ان کے پاس سے کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہیں ہوئی تھی۔

”کس کے آدمی ہو تم؟“ میں نے ایک سے پوچھا۔

”تم زندہ نہیں بچو گے۔“ اس نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی ڈھٹائی پر غصہ آگیا۔ میں نے نفرت سے ہونٹ بھینچ لیے، میں اسے ہاتھ لگانے سے قاصر تھا۔ نہیں چاہتا تھا میں کہ اپنے فنگر پرنٹس کو صاف کرنے میں دوبارہ محنت کروں، جو ایک گھنٹا پہلے کر چکا تھا۔ بنگلے کے ان گوشوں سے بھی میں اپنے فنگر پرنٹس صاف کر چکا تھا، جہاں جہاں ان کے پائے جانے کا خدشہ تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے ان سے کچھ اُگلوانے کا نعمان صاحب!“ فاران نے کہا۔ ”یہ کچھ بتائیں یا نہیں، ایک ہی بات ہوگی۔“

مجھے فاران کی اس بات پر صاد تھا۔ گلنارا کا بھی کم و بیش یہی خیال تھا، مگر میں نے سفاکی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے پھر وہی کارروائی کرنا پڑے گی جو ہم سوچ چکے ہیں۔ انہیں اسی حالت میں بندھا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کوئی یہاں آیا تو ان کی قسمت ورنہ ادھر ہی دونوں اپنے ساتھی کی لاش کے پاس بھوکے پڑے گل سڑ کر مر جائیں گے۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات کا ردِعمل دیکھنے کے لیے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا بھی تھا۔ دونوں کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔

”انہیں اندر کمرے میں لے جا کر بند کر دو دوبارہ جہاں ان کے ساتھی کی لاش رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے فاران سے کہا۔

”دیکھو تم سب بری طرح پچھتاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہمیں جانے دو۔“ ایک نے غصے سے میری جانب گھوم کر تہدید کی۔ اس کے دھمکانے پر میں نے دانت پیس کر کہا۔

”خاطر جمع رکھو مسٹر! پہلے اپنی فکر کرو۔“

”اگر ہمیں یہاں سے برآمد کر بھی لیا تو ہم تم سب کو پھنسوا دیں گے کہ تم لوگ ہمارے ایک ساتھی کو قتل کرنے کے بعد فرار ہو گئے پھر پولیس تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گی۔“

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ ایسی حرکت کر سکتے تھے۔ مگر میں ان کی چال کا توڑ بھی کرنا جانتا تھا۔ پورے اعتماد مگر زہریلی اور کاٹ دار مسکراہٹ سے بولا۔ ”پھر تو میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی والی ترکیب پر ہی عمل کر لینا چاہیے۔ یعنی تم دونوں کا خاتمہ۔“

''میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ رہی تھی کہ ان کا قصہ ہی پاک کر دینا چاہیے، یہ میرے شوہر کے قاتلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے سینے میں جلتی انتقام کی آگ کچھ تو ٹھنڈی پڑے گی۔'' گلنارا نے بھی ان پر نفسیاتی حربہ استعمال کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''ہم..... ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں کمرے میں لے چلو، ایک کا گلا تم دبانا اور دوسرے کو میں تختہ مشق بناؤں گا۔'' میں نے فاران کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نن..... نہیں..... تت..... تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' ان کا دوسرا ساتھی ایک دم خوف زدہ ہو کر بولا۔

''کیوں؟ نکل گئے سارے کس بل؟ ابھی تو اکڑ رہے تھے بہت۔'' میں نے اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' پہلے سے کہا۔

''کس کے آدمی ہو؟ مگر یاد رکھنا میں صرف سچ سنوں گا کیونکہ حقیقت کا مجھے بھی کافی اندازہ ہے۔''

''سچی بات یہ ہے کہ ہم صرف حکم کے غلام ہیں۔ ہمیں حکم دینے والے خود پردے کے پیچھے ہوتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے وہ اپنے آدمی پیچھے رکھتے ہیں۔ ہمیں صرف کرائے پر ہائر کرتے ہیں۔ مرنے کی صورت میں وہ ہمارے لواحقین کو ایک مقررہ رقم تھما دیتے ہیں، الغرض ہم تو پولیس کو بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے، بھلا پردے کے پیچھے موجود لوگوں کے بارے میں ہم بتا بھی کیا سکتے ہیں؟ یا پھر فون پر گفتگو کرنے والوں کو کیسے پہچان سکتے ہیں۔''

مجھے اس کی باتوں سے سچائی کی بُو آ رہی تھی کیونکہ یہ حقیقت بھی تھی کہ جغادر قسم کے بڑے گینگسٹر گندی مکھی کی طرح اپنا ایک پَر بچا کر رکھتے تھے۔ شاید بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں کہ گندی مکھی جب کسی گندیا مٹھاس پر بیٹھتی ہے تو وہ اپنا ایک پَر آغشتہ (آلودہ) ہونے سے بچاتی ہے، خدا جانے اس میں کیا منطق ہے، ممکن ہے ایسا اس لیے کرتی ہوں کہ دوبارہ اُڑنے کے قابل رہیں۔ بہر کیف..... میں نے اگلا سوال داغا۔

''تمہیں کیا حکم ملا تھا؟''

''گلنارا سے اُن ثبوتوں کے بارے میں پتا کرنا جو اس نے پولیس کو دینے کی دھمکیاں دی تھیں۔'' وہ جواباً بولا۔ ''وہ حاصل کرنے اور انہیں زائل کرنے کے بعد گلنارا کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا ہمیں۔''

''ہم.....'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ''یہ بتاؤ، تم لوگ اتنی سخت سیکیورٹی کے باوجود کیسے اندر داخل ہوئے تھے؟''

''ہم پولیس مین بن کر اندر داخل ہوئے تھے، ہر قسم کے جعلی آئی ڈی کارڈ ہر وقت ہمارے پاس ہی ہوتے ہیں، اندر آنے کے بعد ہم نے اصل بھیس بھرا اور اس طرح اندر داخل ہوئے تھے۔''

''اب اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو تم کس طرح باہر نکلو گے؟'' کسی خیال کے تحت میں نے کہا، میں انہیں آزمانا چاہتا تھا۔

''بہت آسانی سے، یہ ہمارا کام ہے۔''

''اپنے مرے ہوئے ساتھی کا کیا کرو گے؟''

''اس کی لاش ہم ساتھ لے جائیں گے باہر ایک الگ گوشے میں ہماری کار کھڑی ہے۔''

میں نے تھوڑا غور کیا، یہ ہمارے لیے بے کار تھے۔ یہاں چھوڑنے کی صورت میں دونوں طرف سے مسائل پیدا ہوں گے اور نتیجہ سوائے پریشانی کے کچھ بھی برآمد نہ ہوگا۔ میں نے ان سے ایک ''معاہدہ'' کر لیا۔ وہ بھی جان چھوٹنے کے چکروں میں راضی ہو گئے۔

انہیں روانہ کرنے کے بعد میں نے گلنارا سے اس کا کونٹیکٹ نمبر لے لیا۔ اس بے چاری نے میری ایک مدد اور کر دی کہ ایک فالتو موبائل سیٹ کنیکشن سم کے ساتھ مجھے دے دیا۔ اس میں کافی بیلنس بھی تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا۔ میں نے وہ شکریے کے ساتھ سنبھال لیا۔

ہمارا زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا میں اور فاران بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر کالونی سے بہ خیر و عافیت باہر نکل آئے۔

''واہ..... جناب نعمان صاحب! مان گئے آپ کو۔'' اوالی روڈ پر آتے ہی فاران نے توصیفی لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''کس خوبی سے ایک گھمبیر پڑتی صورت حال کو آپ نے نمٹایا لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''لیکن کیا؟''

''نعمان صاحب! کیا یہ ہم نے اچھا کیا کہ ان لوگوں کو ایسے ہی جانے دے دیا؟''

''یہ ہمارے کسی کام کے نہیں رہے تھے، بلکہ اُلٹا مصیبت بننے لگے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ یہ اصل آدمی تھے ہی کب..... محض حکم کے غلام تھے اور وہ بھی ایسے کہ اپنے سائے سے بھی لاعلم، ایسے میں وہ ہمیں یا پولیس

کو کیا بتاتے؟"

"ہاں! یہ بات تو ٹھیک تھی، خیر.....اب کہاں چلنا ہے؟"

"کیمپ تھری....." میں نے کہا اور تھکے تھکے انداز میں اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

میرے بحرین پہنچتے ہی نت نئے ہنگاموں نے سر اُبھارنا شروع کر دیا تھا۔ ریت کی دلدل تھی جس میں خود کو میں دھنستا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔

میں یونہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ صحرا میں شام اُترنے لگی تھی۔ ریت کے زرد مرغولے ہم رکاب محسوس ہوئے۔ دور ریتیلے ٹیلوں کے پیچھے سورج کا دہکتا گولہ پیچھے کی طرف لڑھکتا محسوس ہوا۔ ایک عجیب بے رونق سی خاموشی اور اُداسی کا احساس ہوتا تھا۔

کیمپ تھری پہنچ کر میں نیچے اُترا، جبکہ فاران کو میں نے انتظار کرنے کا کہا۔

کچھ تھکے تھکے سے متعلقہ عملے کے لوگ ادھر اُدھر منڈلاتے نظر آئے۔ رات والے واقع کے بعد آج صبح جو یہاں غدر مچا ہوا تھا اس کے اب آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں نے سیدھا اسی عمارت کا رخ کیا جہاں استقبالیہ تھا، حالانکہ مجھ سے یہاں پہلے بھی کہا گیا تھا کہ میں محمود الحسن سے کل صبح ہی ملاقات کر سکتا ہوں لیکن بس! ایک جنون تھا مشن کو نمٹانے کا، سو میں اندر داخل ہو گیا۔

استقبالیہ پر مجھے ایک مغربی دوشیزہ ملی۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک کمپیوٹر رکھا ہوا تھا اور وہ اسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ اطراف میں ایک طائرانہ سی نظر ڈال کے میں اس کی طرف بڑھا۔

ہال میں چند ایک افراد ہی موجود تھے۔ جو کہ باتوں میں مشغول تھے۔ ان کے سامنے دو تین کپ رکھے ہوئے تھے۔

"ایکسکیوزمی....." میں نے ہولے سے کھنکھار کر لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ ایک بیس بائیس سالہ خوبصورت سی دوشیزہ تھی، قد ٹھگنا تھا اور جسم صحت مند جس پر اس نے مغربی طرز کا چست لباس چپکا رکھا تھا۔

"جی فرمایئے؟" وہ کمپیوٹر اسکرین سے میری جانب متوجہ ہوئی۔ اس کے عنابی سے نرم لبوں پہ مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

"مجھے محمود الحسن صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے بھی ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"اس وقت تو آپ کسی سے نہیں مل سکتے۔ آپ کل صبح تشریف لے آئیں۔" وہ یہ کہہ کر پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ گویا جان چھڑانا چاہ رہی ہو۔ گفتگو انگلش میں ہی ہو رہی تھی۔

مجھے اس کا یہ بے رخا انداز کھل گیا اور اس بار ذرا گھمبیر سے سخت لہجے میں بولا۔ "خاتون! آپ کا نام کیا ہے؟"

میرے اس طرح اچانک استفسار پر وہ قدرے بھنویں اُچکا کر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "جی!"

"جی! میں نے آپ کا نام پوچھا ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔" وہ بھی ذرا اکھڑے سے لہجے میں بولی۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کے ادنیٰ ملازمین بھی سر چڑھے تھے۔ اس میں یقیناً یہاں کے "باس" کا دخل تھا یا پھر انتظامیہ کو ہی ایسا رکھا گیا تھا۔

"ضرور ہونی چاہیے، تاکہ میں آپ کی اس غیر اخلاقی حرکت کا جواب اخلاق سے دینے کے لیے آپ کو نام سے پکار کر یہ کہہ سکوں کہ ابھی میں یہاں سے گیا نہیں ہوں کہ آپ فوراً کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو جائیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ایک ضروری لیٹر ٹائپ کر کے ای میل کرنے والی تھی۔" لڑکی نے خشک لہجے میں کہا۔ "بولیے اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" انداز اس کا ویسا ہی رہا سو میں نے بھی وہی انداز اپنائے رکھا۔ بولا۔

"میں پاکستان سے آیا ہوں اور میری ایک ضروری بزنس میٹنگ طے تھی ان کے ساتھ۔" میں نے تھوڑے سے جھوٹ کا تڑکا لگانا ضروری سمجھا۔

تب ہی وہ میری بات پر چونکی اور تھوڑا گھبرائی بھی پھر..... میرا نام وغیرہ پوچھنے کے بعد دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کی بورڈ پر جلدی جلدی کچھ ٹائپ کیا پھر ایک نظر اسکرین پر اُبھرنے والے ان گنت الفاظ کے جال کو غور سے پڑھنے کے بعد بولی۔

"جی ہاں! آپ کی میٹنگ مسٹر بہرام خان سے طے تھی لیکن افسوس کہ....."

"مجھے معلوم ہے، کل رات ان کا مرڈر ہو گیا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن..... آج صبح ہی یہاں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اب محمود الحسن سے مل لوں۔"

”میرا جواب اب بھی وہی ہوگا۔“ وہ اس بار تھوڑا مسکرائی، یوں جیسے وہ بھی بار ہو اس پر، تاہم اس کا لہجہ کچھ بہتر ہو گیا تھا۔

”مسٹر محمود آج سہ پہر میں ابوظہبی چلے گئے ہیں، اب وہ کل صبح ہی آئیں گے۔“

”کل صبح ان سے ادھر ہی ملاقات ہو جائے گی؟“

”آف کورس۔“

”تھینک یو۔“ میں نے کہا اور دروازے کی جانب پلٹا، یونہی میری نظریں ان چند افراد پر بھی پڑیں۔ ایک کالے سے شخص کو میں نے اپنی جانب گھورتے پایا۔ باقی آپس میں مشغول تھے۔ وہ ان میں ایک طرف تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی میگزین تھا اور نشست کی ہتھی پر بنے کپ اسپاٹ پر کافی کا مگ دھرا پڑا تھا۔ اس نے کشمشی رنگ کا چغہ سا پہن رکھا تھا۔

میں نے بہ ظاہر اس پر کوئی توجہ نہ دی اور دروازے سے باہر آ گیا۔

”کارواں سرائے نکل چلو.....“

میں نے فاران کے برابر میں سیٹ پر بیٹھتے ہی کہا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ٹیکسی اسٹارٹ کر لی تھی۔ گیئر ڈال کر آگے بڑھا دی۔

کیمپ تھری کے احاطے سے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ایک مخصوص زاویے سے گردن گھما کر دفتری عمارت کی طرف دیکھا تو میرے ہونٹوں پہ ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔

وہ چغہ پوش عرب آدمی شیشے کے دروازے سے باہر آ رہا تھا اور پھر جب تک فاران نے ٹیکسی احاطے کے مین گیٹ سے باہر سڑک پر نکالی تو میں نے اس کالے عربی کو ایک شاندار سی کار میں سوار ہوتے دیکھا، اس نے عجلت کے سے انداز میں لمحہ بھر کو ہماری جانب دیکھا تھا اور پھر اپنی کار کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہونے لگا۔

فاران تب تک ٹیکسی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

سرائے ہوٹل قریب آنے لگا۔ میں بیک ویو مرر میں دیکھتا آ رہا تھا کہ اس کالے عربی کی کار بدستور کیمپ تھری سے ہمارے تعاقب میں تھی۔

”آج تو آپ کو سرائے میں اکیلا رہنا پڑے گا لیکن ذرا محتاط رہیے گا جناب!“ سرائے ہوٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر فاران نے کار روکتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ تم آج یہاں رات نہیں گزارو گے؟“

”نہیں، اُدھر اسی قصبے میں ایک فیملی نے سیل فون پر میری ٹیکسی بک کر رکھی ہے۔ انہیں شہر (منامہ) پہنچانا ہے۔ دیکھوں گا، واپس لوٹ سکا تو ٹھیک ورنہ رات وہیں کہیں گزار کے صبح دوسری سواری اُٹھا کر ادھر آ جاؤں گا لیکن.....“ وہ کہتے کہتے رکا۔

”لیکن کیا؟“

”نعمان صاحب! میرا دل بھی نہیں کر رہا ہے آپ کو ان خطرناک حالات میں یہاں اکیلا.....“

”تمہارا شکریہ بھائی!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر فوراً مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب کیا تم میری وجہ سے روزگار بھی نہیں کرو گے، تم بے فکر ہو جاؤ، میں نے چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ یہ لو اپنا آج تک کا کرایہ۔“ کار میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے اسے، میٹر میں دیکھ کر جو کرایہ بنتا تھا وہ میں نے اسے بحرین دینار کی صورت میں ادا کر دیا۔ اس نے انکار کیا تھا مگر میں نہ مانا۔

میں کار سے اُتر آیا اور اس نے ٹیکسی واپس گھما لی۔ میں نے یونہی گیٹ کی جانب دیکھا۔ تعاقب میں آنے والی وہ کار مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ لائٹ آن کی اور بیٹھنے کی بجائے سیدھا کھڑکی کی جانب بڑھا اور اسے تھوڑا کھول کر نیچے جھانکا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہی کار گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں اس کالے عربی کی چالاکی سمجھ چکا تھا۔

وہ کار سے اُترا اور تیزی سے سرائے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ اب میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

ایک اور نامعلوم خطرے کے پیش نظر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا وہ میرے کمرے میں آنا چاہتا تھا؟ مگر وہ تنہا بھی تھا، بھلا میرا کیا بگاڑ لیتا یا پھر ممکن ہے، نیچے سے میرا کمرا وغیرہ معلوم کر کے وہ واپس لوٹ جاتا اور بعد میں اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ بھی آ سکتا تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ آیا واپس جاتا ہے یا نہیں، میں وہیں کھڑکی کے پاس ہی کھڑا رہا۔ اگر اس نے جانا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ سے چند منٹوں بعد اپنی کار میں لوٹ جاتا۔

ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

(باقی آئندہ)

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

نگہت حسن.........شیخوپورہ

یہاں اہلِ محبت عمر بھر برباد رہتے ہیں
یہ دریا ہے اسے کچا گھڑا اچھا نہیں لگتا

علی بیگ.........لاہور

یہ طرفہ کرشمہ ہے اندازِ نظر ہی کا
ویرانہ بھی گلشن گلشن بھی ویرانہ

عبدالستار.........ساہیوال

یوں اس نگاہِ مست میں حل ہو گیا ہوں میں
شفاف پانیوں کا کنول ہو گیا ہوں میں

اسد علی.........شیخوپورہ

یہ کس مقام پہ لایا ہے مجھ کو سوزِ دروں
وہ خود بھی مجھ سے جو پوچھیں تو کچھ بتا نہ سکوں

عباس حسن.........سکھر

یہ علم کا سودا یہ رسالے یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں

ارشد خان.........شیخوپورہ

یہاں مانا کہ کچھ نہ جانا ہے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

(شبیر شاہ گڈو بیراج کا جواب)

نازش سلمان.........سکھر

اب آگے خدا عشق کی لاج رکھے
ابھی تک تو ہم دل کو بہلا رہے ہیں

اسد علی.........شیخوپورہ

ایک فریب مستقل ہے زندگی
زندگی سے غیر ممکن ہے نجات

انیس الحق.........سکھر

آپ اپنی ضیا سے ڈرتے ہیں
غم کدوں کے چراغ ہیں ہم لوگ

(انعام الحسن لاہور کا جواب)

ابرار الحسن.........لاہور

نہیں فرصت یقیں مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں تیری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں

رخسانہ انعام.........لاہور

نالے ہیں نہ آہیں ہیں نہ رونا نہ تڑپنا
بے خود ہوں تری یاد میں فرصت کے دن آئے

امداد علی چانڈیو.........حیدرآباد

نہ بزم اپنی نہ اپنا ساقی نہ شیشہ اپنا نہ جام اپنا
اگر یہی ہے نظامِ ہستی تو زندگی کو سلام اپنا

(امیر حمزہ اشرف ملتان کا جواب)

توحید احمد.........سرگودھا

ایسا جانباز محبت نہ ملے گا ان کو
اس لیے خود کو مٹاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ارباب شیخ.........چنیوٹ

اب عشق کے جادے سے قدم ہٹ نہیں سکتے
اے شمع اگر آگ برستی ہے تو برسے

آفتاب حسین.........لاہور

اس کے نین سمندر جیسے گہرے نیلے پُراسرار
آئی ہو گی اس کے سر کتنے لوگوں کی غرقابی

(منشی عزیز مئے وہاڑی کا جواب)

تہذیب الحسن.........لاہور

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
رہے دل میں ہمارے یہ رنج و الم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

نادیہ سلیم.........کراچی

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجیب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

عابد عطاری.........میرپور خاص

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 150

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش ذہنی آزمائش ہے کہ بتائی گئی شخصیت کو پہچانیں۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد اس مقابلے میں حصہ لیتی رہی ہے لیکن کچھ قارئین کا کہنا ہے کہ یہ دو صفحہ بھی کہانیوں کو دے دیا جائے۔ بحالت مجبوری اس سلسلے کو بند کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے وہ قارئین جو مسلسل حصہ رہے ہیں وہ تعاون کریں گے۔

علمی آزمائش 149 کا جواب

سردار عبدالرب نشتر 13 جون کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سیاست میں آئے تو برصغیر کے مقبول لیڈر میں شمار ہوئے۔ حکومت میں بھی شامل رہے اور اپوزیشن لیڈر کے طور پر بھی شہرت حاصل کی۔ کراچی میں مدفون ہیں۔

انعام یافتگان

1۔ احمد علی گھشکوری، لاہور 2۔ زاہدہ عارف، ملتان 3۔ خلیل اللہ عطاری، ملتان

4۔ غلام عباس کاظمی، کوئٹہ 5۔ اشرف سلطانی، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

میانوالی سے افتخار حسین شاہ۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی، عبدالستار، ممتاز علی خان۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اویس طارق۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے افنان علی عبداللہ۔ اٹک سے نزاہت انشال (فتح جنگ)۔ کشمور سے شبیر شاہ۔ پشاور سے شاہ جہاں (حیات آباد)، وحیدہ جان، گل مست خان، (ارمڑ پایان)، زرولی خان، علی شاہ، شبیر جان، بشیر اشرف، گل باز خان۔ نوشہرہ سے خاور شیخ۔ ڈیرا غازی خان سے محمد اظفر، ظہیر الدین، سلطان اشرف۔ ڈیرا مراد جمالی سے شاکر عطر خان، احمد فیض۔ نظیر آباد سے نواز حسن خان، قسیم اللہ۔ کراچی سے وجاہت وکیل عثمان خان، عبدالحکیم ثمر، صفیہ افسر، جلیل احمد جعفری، نسرین عزیز، محمد احمد، سید معصوم حسن، فہیم الدین، اعجاز حسین درانی، محمد اظفر، ظہیر الدین، اشرف علی سلطان، سید امتیاز حسن زیدی۔ بہاولنگر سے خالد بٹ، ثمینہ شیخ۔ بہاولپور سے سلیم اختر، کلیم اصغر، رحمین شاہ۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، انور یوسف زئی، وحید خان، غضنفر عباس مرزا، طاہر پردیسی، نعمان نذیر، فہیم الدین، شاہین عثمانی، کمال حسن کمال، شاکر عباس، محمد اسلم، سلطان علی، فتح محمد جوکھیو، اقبال حسن۔ راولپنڈی سے نادیہ خان، انور شاہ، امجد حسن، شوکت کمال، اختر کوکب، بلقیس بتول، شاہینہ بتول، شاور علی، شازیہ اکرام، بہادر خان اچکزئی، کلیم الحسن، افروز جہاں۔ حیدرآباد سے اختر عباس، زبیر احمد، امروز اقبال، احسان علی، زاہد شاہ بخاری، چوہدری اشفاق، مرزا ہادی بیگ، محمد فیضان، ثانیہ حسن، اظہر حسین۔ جھنگ سے بانو بر جیس، احمد رشید مصطفائی۔ لاہور سے احسان خان، ثناء اللہ، اشفاق حسن، نادیہ خان، علی نواز شاہ، شوکت ملک، افروز جہاں، نوشین اختر، تمکین جعفری، صنوبر علی شاہ، محمد عاقل شاہ، محمد عماد، طٰہ حسین، زرین پروین، فرید اسلم ڈوگر، حکیم فیروز، افرا تبسم، چوہدری ممتاز علی، فرید اسلم، ثانیہ حسن ثانی، زبیر ملک۔ فیصل آباد سے عتیق اسلم، منور سلیم، عرفان مروت، دلاور حسن۔ منڈی بہاؤالدین سے عباس علی۔ رحیم یار خان سے فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، گل باز خان۔ سرگودھا سے نصرت جہاں، عباس علی اصفہانی۔ فیصل آباد سے عتیق احمد، منور سلیم، کلیم اصغر، اعجاز حسین زیدی۔ میرپور خاص سے ندیم عیسیٰ، گل باز خان، اقبال فریدی۔ میرپور آزاد کشمیر سے عمیر بٹ، فخر الدین رازی، نعمان احمد بھٹ، صدر الدین ملک۔ ایبٹ آباد سے محمد فیض، اقبال حسن، فرحت اللہ، مجاہد عباس۔ شجاع آباد سے نصرت زیدی۔ ٹنڈو جان محمد سے عباس۔ کمالیہ سے اصغر حسین۔ خوشاب سے ظہیر شاہ۔ نوشہرو فیروز سے احمد علی۔

بیرون ممالک سے ابرار شاہ (دبئی)، صدر الدین (العین)، عباس علی سید (ٹورنٹو)، ظہیر علی شیخ (مانچسٹر یوکے)۔

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
مرسلہ روداد میرے دوست محسن کی ہے۔ اس کی زندگی جہنم بننے والی تھی کہ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے سب کو حیران کردیا۔ اس کے اس فیصلے نے کس طرح بساط الٹ دی، یہ آپ اس سچ بیانی میں پڑھ لیں گے۔ اس سچ بیانی میں ایک بہت بڑا سبق ہے،یہ سبق ہر ایک کو ازبرکرلینا چاہیے تاکہ زندگی آسان ہو جائے، ماں اور بیوی میں کیا فرق ہے آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔
ایس ایم نوشاد
(کراچی)

شام کا ملگجی اندھیرا تیزی سے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو صادقہ بیگم کی نظریں بے اختیار گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ پونے سات بج رہے تھے اور محسن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی اور وہ عموماً ساڑھے پانچ یا پونے چھ بجے تک گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ جب سے اس کی بینک میں جاب لگی تھی، اس کا یہی معمول تھا اور اگر اسے چھٹی کے بعد کام ہوتا تو صبح ماں کو بتا کر جاتا تھا۔ اتنی دیر تو اسے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے تو وہ ہمیشہ سے ہی اس سواری کے خلاف تھیں۔ شہر کے بڑھتے ہوئے بے ہنگم ٹریفک کی وجہ سے سب سے زیادہ حادثے بھی موٹر سائیکل سواروں کو ہی پیش آتے ہیں۔ انہوں نے محسن کو اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ وہ جانتی تھیں کہ محسن کو بچپن سے ہی موٹر سائیکل چلانے کا شوق تھا اور وہ بڑی حسرت سے اپنے دوستوں، رشتے داروں اور محلے والوں کو موٹر سائیکل پر آتے جاتے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں محرومیوں کے سائے لرزنے لگتے لیکن وہ جانتا تھا کہ موٹر سائیکل خریدنے کے لیے ایک معقول رقم درکار تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ ماں جیسے تیسے کر کے اسے پڑھا رہی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سلائی کی آمدنی اور مکان کے کرائے سے ملنے والی رقم بھی گھریلو اخراجات کے لیے کم پڑنے لگی تو محسن نے خود بھی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح اس کے تعلیمی اخراجات پورے ہونے لگے لیکن موٹر سائیکل اب بھی اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ اس نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ جاب ملتے ہی وہ سب سے پہلے بائیک خریدے گا تاکہ کام پر آنے جانے کے لیے اسے بسوں میں دھکے نہ کھانے پڑیں۔

صادقہ بیگم دروازہ سے کان لگائے بیٹھی تھیں لیکن جس مخصوص آواز کا انہیں انتظار تھا وہ ان کی سماعت سے دور تھی۔ مغرب کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہوگئیں۔ پریشانی کے باعث دماغ میں الٹے سیدھے خیالات آرہے تھے اس لیے نماز بھی بڑی مشکل سے ادا کی۔ سلام پھیر کر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو انہیں یوں لگا جیسے وہ تپتی دھوپ میں کڑی مسافت طے کر کے کسی شجر کے سایہ میں آ کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کے پورے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ محسن نے دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی کی اور گنگناتا ہوا ماں کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں صادقہ بیگم دعا سے فارغ ہو چکی تھیں۔ محسن نے سلام کیا تو وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔ ”کہاں رہ گئے تھے بیٹا اگر دیر سے ہی گھر آنا تھا تو کم از کم ایک فون ہی کر دیتے۔“
محسن نے چونک کر ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی تو اس کے چہرہ پر خفت کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”واقعی آج تو مجھے بہت دیر ہو گئی۔ سوری امی میری وجہ سے آپ کو انتظار کی کوفت اٹھانا پڑی۔ دراصل گلی کے نکڑ پر ایک دوست مل گیا تھا۔ اس نے باتوں میں ایسا لگایا کہ وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا، بہرحال اب ایسا نہیں ہوگا۔ آیندہ میں احتیاط رکھوں گا۔“
”تم جانتے ہو محسن، میرا اس دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے تم جتنی دیر گھر سے باہر رہتے ہو، میں سولی پر لٹکی رہتی ہوں۔ اوپر سے تم نے یہ موٹر سائیکل لے کر میری ٹینشن اور بڑھا دی ہے، کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ ایک موبائل ہی لے لو۔ کم از کم بوقت ضرورت میں تم سے رابطہ تو کر سکوں

گی۔"

"امی آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ موبائل چوری ہو جاتے ہیں یا میں خود کہیں رکھ کر بھول جاتا ہوں۔ اسی لیے میں نے موبائل رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال آپ کہہ رہی ہیں تو اس مہینے یہ خواہش بھی پوری کردوں گا۔ بس اب آپ جلدی سے مجھے چائے پلوا دیں، پھر مجھے آپ سے لڑنا بھی ہے۔"

"ہیں، کیا کہا؟" صادقہ بیگم چونکتے ہوئے بولیں۔ "اب تم اتنے بڑے ہو گئے کہ مجھ سے لڑنے کی باتیں کرنے لگے۔"

"مجبوری ہے کیونکہ ویسے تو آپ میری کوئی بات مانتی نہیں ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" صادقہ بیگم حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ "کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تمہاری کوئی بات نہ مانی ہو۔"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ چائے پلوا دیں تاکہ تازہ دم ہو کر لڑ سکوں۔"

محسن کے لہجے سے صادقہ بیگم کو یہ اندازہ تو ہو گیا کہ کوئی ایسی سنجیدہ بات نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسئلہ بنا کر ماں سے الجھ جاتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ مطمئن انداز میں چائے بنانے کے لیے چل دیں اور محسن نے بھی لباس تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ دوبارہ صحن میں آ چکا تھا۔ وہ صادقہ بیگم کے تخت کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کپڑوں کے ڈھیر اور سلائی مشین کی طرف دیکھنے لگا جن کی بدولت وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ چائے کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ذہن میں وہ جملے ترتیب دینا شروع کر دیے جو کچھ دیر بعد اسے ماں سے بولنا تھے۔ وہ پتا کر چکا تھا کہ ہر قیمت پر اپنی بات منوا کر رہے گا کیونکہ اب اس میں یہ نظارہ دیکھنے کی مزید تاب نہ تھی۔

صادقہ بیگم نے چائے کی پیالی محسن کو تھمائی اور بے تابی سے بولیں۔ "ہاں، اب جلدی سے بتاؤ وہ کیا بات ہے جسے بنیاد بنا کر تم مجھ سے لڑنا چاہ رہے ہو۔"

"میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ سلائی کا کام چھوڑ دیں۔ اچھی بھلی تنخواہ ہے میری۔ اس میں ہم دونوں کا گزارہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ پھر یہ مشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

''عادی ہوگئی ہوں۔'' صادقہ بیگم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''پھر میں نے اسے کبھی مشقت نہیں سمجھا۔ یہ میرا کام ہے۔ کیا تم کسی درزی سے یہ کہہ سکتے ہو کہ اس کے بیٹے برسرروزگار ہوگئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی دکان بند کردے جس طرح تم صبح سے شام تک بینک میں کام کرتے ہو، اسی طرح میں بھی اپنی جاب کررہی ہوں بلکہ مجھے تو کہیں جانا بھی نہیں پڑتا، گھر بیٹھ کر ہی ٹھیک ٹھاک کما لیتی ہوں۔''

''جانتا ہوں کہ دلیل میں آپ سے نہیں جیت سکتا۔'' محسن نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے جو کچھ کہا وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرسکتا لیکن میرے پاس بھی دو پوائنٹس ہیں اگر ان پر غور کرلیں تو بڑی عنایت ہوگی۔''

''کہو میں سن رہی ہوں۔''

''پہلی بات تو یہ کہ کام کرنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرکار بھی اپنے ملازمین کو ساٹھ سال پر ریٹائر کردیتی ہے اس لیے میرے حساب سے اب آپ کو بھی آرام کرنا چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اہم پوائنٹ یہ ہے کہ کام ہمیشہ ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔ پہلے مجبوری تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں آپ کو سلائی کا کام چھوڑ دینا چاہیے اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ بیٹا بینک میں افسر ہے اور ماں لوگوں کے کپڑے سی کر گزارہ کررہی ہے۔''

صادقہ بیگم نے خالی کپ میز پر رکھا اور تخت پر رکھے گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔ ''تمہاری تینوں ہی دلیلیں بالکل پوری ہیں۔ اوّل تو میری عمر ابھی صرف پچاس سال ہے اور میری ریٹائرمنٹ میں ابھی دس سال باقی ہیں۔ تمہارا دوسرا پوائنٹ اس حد تک سمجھ میں آتا ہے کہ مجھے محض پیسوں کی خاطر سلائی کا کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ضرورت تمہاری تنخواہ سے باآسانی پوری ہورہی ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ میری اس سروس سے کتنے لوگوں کا بھلا ہورہا ہے۔ بازار میں سلائی بہت مہنگی ہوگئی ہے اور غریب یا متوسط طبقے کے لوگ اسے افورڈ نہیں کرسکتے۔ میں ان سے آدھی قیمت لیتی ہوں۔ اس محلے کے لوگوں نے پچیس برس میرا ساتھ دیا ہے تو میں انہیں کیسے چھوڑ دوں اور مجھے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں پچیس سال تک ہمیں کسی نے نہیں پوچھا۔ سگے بھائی کو میرا حال جاننے کی توفیق نہیں کہ بہن زندہ ہے یا مر کھپ گئی۔ شوہر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی۔ اس کے باوجود زندہ، خوش اور مطمئن ہوں۔ تمہیں بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، جس کا جو جی چاہے کہتا رہے، ہم وہی کریں گے جو مناسب ہوگا۔''

یہ کہہ کر صادقہ بیگم نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ گویا میٹنگ برخاست ہونے کا اشارہ تھا۔

محسن خاموشی سے اٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صادقہ بیگم دو تین گھنٹوں تک یادوں کے صحرا میں بھٹکنے کے بعد ہی واپس آئیں گی۔ اسے افسوس ہورہا تھا کہ اس نے بلاوجہ ہی غلط موضوع چھیڑ دیا۔ وہ تو انہیں نوشین کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا جس سے ان دنوں اس کا زوردار افیئر چل رہا تھا۔ وہ اسی محلے میں رہتی تھی۔ خاصے امیر لوگ تھے۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے باعث وہ کافی شوخ اور ضدی واقع ہوئی تھی جس چیز کے لیے مچل جاتی اسے حاصل کرکے ہی چھوڑتی۔ جو دل میں ٹھان لیتی۔ اس پر عمل کرکے ہی اسے چین آتا۔ وہ ڈگری کالج میں آخری سال کی طالبہ تھی ایک روز اتفاقاً کالج سے آتے ہوئے گلی کے نکڑ پر اس کی محسن سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن کبھی بات کرنے یا ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اس روز محسن ایک فائل گھر میں بھول گیا تھا۔ لہٰذا لنچ ٹائم میں وہ فائل لینے گھر آگیا۔ ابھی وہ اپنی گلی کے موڑ تک ہی پہنچا تھا کہ اس نے دیکھا ایک لڑکا نوشین کا پیچھا کررہا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا اور گلی بالکل سنسان تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ سیدھا نکل جائے۔ خوامخواہ کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے سے فائدہ، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں لیکن اس کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا۔ نوشین اسی کے محلے میں رہتی تھی اور اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض تھا۔ اس نے ان دونوں سے کافی فاصلے پر بائیک روکی اور ایک کیبن کی آڑ میں کھڑے ہوکر دیکھنے لگا۔ ابھی وہ پوری طرح ان دونوں کو فوکس بھی نہیں کرپایا تھا کہ وہی لڑکا اچانک نوشین کے سامنے آگیا اور اس کا راستہ روک کر کچھ کہنے لگا۔ محسن کے لیے یہ نظارہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، ان دونوں کے قریب پہنچا اور نوشین کو مخاطب کرتے ہوئے سختی سے بولا۔ ''کون ہے یہ؟ اور اس نے تمہارا راستہ کیوں روک رکھا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' نوشین کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ شخص بس اسٹاپ سے ہی میرے پیچھے لگا ہوا ہے اور

نہ جانے کیا الٹی سیدھی بکواس کیے جارہا ہے۔''
''ٹھیک ہے تم جاؤ میں اس سے نمٹتا ہوں۔'' محسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا۔'' میں ہوں نا تمہاری بات سننے کے لیے، مجھے بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے، تم جیسے لوگوں کا علاج کرنا مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے۔''
اس غنڈے نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن محسن کی گرفت بہت سخت تھی۔ اس نے نوشین کو جانے کا اشارہ کیا اور اس لڑکے کو کھینچتا ہوا مین روڈ تک لے آیا پھر اس کا گریبان پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا اور غضب ناک لہجہ میں بولا۔'' اگر دوبارہ اس علاقے میں نظر آئے تو ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔''
وہ لڑکا محسن کی طاقت اور غصے سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اس کی گھگی بندھ گئی جیسے ہی محسن نے اس کا گریبان چھوڑا، اس نے دوڑ لگا دی۔ محسن واپس اپنی موٹر سائیکل کی طرف آیا۔ نوشین ابھی تک اپنے دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ محسن کو دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھی اور بولی۔'' آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اس مدد کے لیے ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔''
محسن نے بائیک پر بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا۔'' یہ رسمی باتیں نہ کریں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔''
''بہرحال شکریہ ادا کرنا تو میرا فرض ہے۔'' نوشین نے ایک ادا سے کہا تو محسن کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ واقعی وہ ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر کسی کا دل بھی قابو میں نہ رہتا۔ وہ ہر اعتبار سے حسین کہلائے جانے کی مستحق تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں تراشیدہ لب اور دلفریب تبسم کسی بھی شخص کو دیوانہ کردینے کے لیے کافی تھا گو کہ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی لیکن محسن نے کہہ ہی دیا:
''اس طرح کے واقعات سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ نقاب کا استعمال شروع کردیں۔''
نوشین کو بے اختیار ہنسی آگئی اور ساتھ ہی اس کے گالوں پر ڈمپل نمودار ہوگئے۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس ادا نے محسن کے دل پر کیا قیامت ڈھا دی۔ اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہوگیا اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور جھینپتے ہوئے بولا۔'' بعض اوقات میں سوچے سمجھے بغیر بول دیتا ہوں آپ مائنڈ مت کیجیے۔''
نوشین مسکراتے ہوئے بولی۔'' میں نے بالکل مائنڈ نہیں کیا۔ البتہ اس بارے میں ضرور سوچوں گی۔''
گھر آنے کے بعد محسن کا کسی کام میں دل نہیں لگا۔ اس کی نگاہوں میں نوشین کی صورت جم کر رہ گئی تھی۔ وہ کوئی دل پھینک قسم کا نوجوان نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر نوجوانی تک اس کا ایک ہی مقصد رہا کہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے۔ اسی لیے اس نے فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے تعلیم پر پوری توجہ دی۔ بی کام کرنے کے بعد اس نے بینک میں جاب تو کرلی تھی لیکن وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا، اسی لیے اس نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا اور ایک پرائیویٹ کالج میں ہفتہ میں دو دن کلاسیں لیتا تھا۔ اسے قوی اُمید تھی کہ اس کے بعد اسے ایک بہتر ملازمت مل جائے گی۔ اسی لیے وہ بینک سے آنے کے بعد سارا وقت پڑھنے میں گزار دیتا لیکن نوشین سے ملنے کے بعد اس کے دل میں عجیب سی اتھل پتھل ہونے لگی اور وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کیفیت کو کیا نام دے۔
نوشین کے بارے میں وہ بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ شیخ عبدالعزیز کی بیٹی ہے جن کا کپڑے کا...... کاروبار تھا۔ ان کے چاروں بیٹے شادی شدہ تھے اور اپنا اپنا کاروبار کرتے تھے۔ البتہ چھوٹا بیٹا ارشد جس سے محسن کی تھوڑی بہت سلام دعا تھی، باپ کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ نوشین کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت شوخ اور چنچل ہے۔ اسے اچھا کھانے، اچھا پہننے اور شادی بیاہ کی تقریبات میں شریک ہونے کا بہت شوق ہے۔ محلے میں مہندی، مایوں یا منگنی وغیرہ کی کوئی بھی تقریب ہو، وہ بن بلائے ہی پہنچ جاتی اور خوب ہلا گلا کرتی۔ اسی طرح وہ مذہبی تقریبات مثلاً میلاد شریف، مجلس اور ختم شریف وغیرہ میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوتی۔
دوسری صبح محسن بینک جانے کے لیے گھر سے نکلا تو عین اسی وقت نوشین بھی اپنے گھر سے برآمد ہوئی، اس نے سیاہ رنگ کا عبایا پہن رکھا تھا اور چہرے پر بھی نقاب تھا۔ محسن تو اسے پہچان بھی نہ پاتا اگر وہ آداب کرنے کے انداز میں دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اسے سلام نہ کرتی۔ محسن نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے نقاب ہٹا کر بڑے دلنشین انداز میں کہا۔'' دیکھ لیجیے، آپ کے مشورے پر عمل کرنے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔''
محسن کے لیے اس کا یہ روپ بالکل انوکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ نوشین اتنی جلدی اس کی بات مان سکتی ہے۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔'' یہ آپ نے بہت اچھا

کیا۔ اس طرح بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ اگر باتوں میں لگ جاتا تو دفتر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ نوشین کچھ دیر کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی پھر کالج کے لیے روانہ ہو گئی۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ محسن جونہی اپنے کام پر جانے کے لیے نکلتا، عین اسی وقت نوشین بھی کالج جانے کے لیے دروازے پر آ جاتی۔ دونوں کے درمیان مسکراہٹوں اور چند جملوں کا تبادلہ ہوتا پھر محسن اپنی راہ لیتا۔ نوشین اسے کچھ دیر جاتا ہوا دیکھتی، اس کے بعد وہ بھی کالج کے لیے روانہ ہو جاتی۔ محسن عموماً لنچ کے لیے قریبی ریسٹورنٹ میں جایا کرتا تھا لیکن بعض اوقات اچھا کھانے کی خواہش ہوتی تو برنس روڈ کا رخ کر لیتا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ برنس روڈ سے لنچ کرنے کے بعد واپس بینک جا رہا تھا کہ کالج کے اسٹاپ پر اسے نوشین نظر آ گئی۔ محسن نے گھڑی دیکھی اور سوچ میں پڑ گیا اس وقت نوشین یہاں کیا کر رہی ہے جب کہ کالج کی چھٹی ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ نوشین نے بھی محسن کو دیکھ لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ کب سے کھڑی ہوں لیکن سب بسیں بھری ہوئی آ رہی ہیں۔ پلیز مجھے گھر تک چھوڑ دیں۔''

محسن شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی لڑکی کو بائیک پر نہیں بٹھایا تھا۔ ویسے بھی لنچ ٹائم ختم ہو رہا تھا اور اسے واپس بینک بھی پہنچنا تھا لیکن نوشین کو منع بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بادل نخواستہ اس نے ہامی بھر لی۔ نوشین اس کے ساتھ بالکل چپک کر بیٹھی تھی۔ اس کے قرب کی مہک نے محسن کو دیوانا بنا دیا تھا۔ یہ نشہ، یہ سرور، اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ یہ موٹر سائیکل یونہی چلتی رہے۔ نوشین اسی طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہے اور اس کی زلفوں کی آوارہ لٹیں اس کے چہرے کو چھوتی رہیں لیکن وائے حسرت۔ یہ سفر بھی دس منٹ میں ختم ہو گیا۔ محسن نے اسے مین روڈ پر اتار بھی دیا تو وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''موٹر سائیکل پر سواری کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ کل صبح مجھے یہیں سے پک کر لیجیے۔''

''دماغ تو صحیح ہے تمہارا۔'' محسن جھلاتے ہوئے بولا۔ ''صبح کے وقت محلے کا کوئی نہ کوئی فرد اس اسٹاپ پر ضرور موجود ہوتا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔''

''مجھے تو نقاب کی وجہ سے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ البتہ آپ کے لیے پرابلم ہو سکتی ہے۔ ٹھیک ہے ایسا کریں وہ جو اگلا موڑ ہے وہاں سے پک کر لیں۔ اس طرف کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ضرورت کیا ہے موٹر سائیکل پر جانے کی، ہمیشہ بس میں سفر کیا ہے، اب کیا ہو گیا؟''

''اتنا رش ہوتا ہے کہ کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔ دروازے پر لٹکنا پڑتا ہے۔ کسی دن گر گئی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاؤں گی۔''

''اچھا بابا ٹھیک ہے۔'' محسن نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کبھی کبھی روز یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔''

پھر تو یہ معمول بن گیا۔ نوشین روزانہ صبح کو محسن کے ساتھ جانے لگی۔ واپسی میں بھی اکثر وہ اسے گھر پر ڈراپ کر دیتا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آتے جا رہے تھے لیکن محسن کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اگر کسی نے نوشین کو اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھ لیا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس نے جب بھی نوشین کے سامنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر کہتی۔ ''تم بھی نہ جانے کس دنیا میں رہتے ہو۔ ارے آج کل تو ہر لڑکا بیک وقت چار چار لڑکیوں سے فلرٹ کرتا ہے اور تم سے ایک نہیں سنبھل رہی۔ اوّل تو کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ تمہیں واچ کرے اور بالفرض کوئی دیکھ بھی لے تو یہی سمجھے گا کہ محسن میاں بالغ ہو گئے ہیں۔ اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے دس کام چھوڑ کر تمہاری اماں کو یہ بتانے جائے گا کہ اس نے ایک لڑکی کو تمہارے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کرتے دیکھا ہے۔ چلو مان لیا کہ تمہاری رپورٹ ہو گئی۔ اماں پوچھیں تو بتا دینا کہ وہ لڑکی تمہارے ساتھ بینک میں کام کرتی ہے۔ اس نے لفٹ مانگی اور تم نے بٹھا لیا۔''

محسن کو اس کی ذہانت اور حاضر جوابی پر پیار آنے لگا۔ ویسے تو وہ اس کی بہت سی خوبیوں کا معترف تھا اور جیسے جیسے ان کے درمیان قربت بڑھتی جا رہی تھی، اس کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آ رہے تھے۔ اس کا حسن بے مثال تھا۔ وہ ذہین، حاضر جواب اور بذلہ سنج تھی۔ اسے گفتگو کرنے کا فن آتا تھا۔ بلا کی جامہ زیب، ہمیشہ موسم، وقت اور ماحول کی مناسبت سے لباس کا انتخاب کرتی۔ محفلوں کی جان، خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والی، محسن نے اس کے

بارے میں کئی انداز سے سوچا لیکن اسے نوشین میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاید وہ نوشین میں کوئی خامی دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ محسن محسوس کر رہا تھا کہ نوشین کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی قربت رفتہ رفتہ محبت کا روپ دھار رہی ہے اور محبت میں تو یہی ہوتا ہے کہ محبوب کے عیب بھی خوبیوں کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔

وہ بھی موسم بہار کی ایک خوشگوار سہ پہر تھی۔ صبح سے ہی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہی محسن پر جذباتی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے نوشین کا ہاتھ تھاما اور انتہائی رومانٹک موڈ میں بولا۔ ''نوشین ہم کب تک اس طرح چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے، اگر تم کہو تو امی کو تمہارے گھر بھیجوں؟''

وہ تو نجانے کب سے یہ جملہ سننے کی منتظر تھی۔ محسن کو اس نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ لہٰذا اس کے پاس انکار کرنے یا ٹالنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''جب تم مناسب سمجھو۔''

اس کا جواب سن کر محسن کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے ذرا واضح انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات تمہارے علم میں ہے کہ نہیں لیکن اس کا جاننا تمہارے لیے بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ میری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ میں نے آج تک اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھی۔ ماں نے ہی محلے والوں کے کپڑے سی کر مجھے پالا اور میٹرک کے بعد میں نے ٹیوشن کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ہم ماں بیٹے عرصہ دراز سے اس محلے میں رہ رہے ہیں۔ ہمارا ماضی اور حال سب کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ حیثیت کا فرق ہمارے راستے کی دیوار نہ بن جائے۔''

''تمہیں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گھر والے میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کریں گے پھر بھی میں اپنی بھابیوں کے ذریعے تمہارا پروپوزل والدین اور بھائیوں تک پہنچا دیتی ہوں۔ اس طرح ان کا ری ایکشن بھی معلوم ہو جائے گا۔''

''اگر ان لوگوں نے مجھے ریجیکٹ کر دیا تو......''

''یہ معرکہ سر کرنا میرا کام ہے۔'' نوشین نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''تم کچھ دن انتظار کرو اور جب میں گرین سگنل دوں تو اپنی والدہ کو رشتہ مانگنے بھیج دینا۔''

کچھ دن بعد نوشین کی جانب سے گرین سگنل مل گیا اور اب وہ ماں کو اسی کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ نوشین کے لیے یہ مرحلہ آسان نہیں تھا۔ بھابیوں اور ماں کے علاوہ گھر میں کسی نے بھی اس پروپوزل کو پسند نہیں کیا۔ باپ اور بھائی تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔ انہیں محسن کی شخصیت، تعلیم، قابلیت اور ملازمت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ محسن اور اس کی ماں کو برسوں سے جانتے تھے۔ اس کا پورا ماضی ان کے سامنے تھا پھر وہ آنکھوں دیکھی مکھی کیسے نگل سکتے تھے۔ بے شک وہ کوئی آوارہ، نکما، جاہل یا بدمعاش قسم کا بندہ نہیں تھا۔ اس کی ماں نے بھی ساری عمر بڑی عزت، شان اور خودداری سے زندگی بسر کی لیکن محسن کا یہی جرم کیا کم تھا کہ وہ ایک ایسی عورت کا بیٹا تھا جس کا شوہر شادی کے چند سال بعد ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے اپنے بیٹے کی پرورش محلے کے لوگوں کے کپڑے سی کر کی۔ بے شک محسن ایک سیلف میڈ شخص تھا اور مستقبل میں اس کے پاس ترقی کرنے کے بے شمار مواقع تھے لیکن فی الوقت مالی اور خاندانی اعتبار سے اس کا معاشرہ کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ شیخ عبدالعزیز بیٹی کو اپنے سے بڑے... لوگوں میں بیاہنا چاہ رہے تھے تاکہ بڑے خاندان سے ناتا جوڑ کر ان کی شان میں بھی اضافہ ہو لیکن محسن کا نام سنتے ہی انہیں یوں لگا جیسے کھیر کھاتے ہوئے کوئی کڑوا بادام بیچ میں آ گیا ہو۔

انہوں نے تو فوراً ہی یہ رشتہ مسترد کر دیا تھا۔ نوشین کے بھائیوں کی رائے بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ محسن اپنے ماضی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس گھر سے رشتہ جوڑنا چاہ رہا ہے۔ سب سے بڑے بھائی اس بات پر طیش کھا رہے تھے کہ محسن کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ شیخ عبدالعزیز کی بیٹی کے بارے میں سوچ سکے لیکن نوشین کی ماں اور بھابیاں اس رشتے کے حق میں تھیں کیونکہ نوشین نے انہیں اپنی پسند سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اگر اس کی شادی محسن سے نہ ہوئی تو پھر کسی سے بھی نہیں ہوگی۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ نوشین کی ماں اور بھابیاں سر جوڑ کر بیٹھیں کہ کس طرح گھر کے مردوں کو اس رشتے پر راضی کیا جائے کیونکہ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی

تھیں کہ نوشین اپنے باپ اور بھائیوں کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ضدی اور خودسر ہوگئی ہے۔ ایک بار اس کے دماغ میں کوئی بات آجائے تو وہ اسے پورا کر کے ہی دم لیتی ہے۔ نوشین نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی محسن سے نہ ہوئی وہ خودکشی کرلے گی اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتی تھی۔

نوشین کی ماں اور بھابیوں کے لیے یہ کٹھن مرحلہ طے کرنا ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے کے مترادف تھا۔ اس کے لیے انہوں نے یہی حکمت عملی اختیار کی کہ وہ سب انفرادی طور پر اپنے شوہروں کو راضی کرنے کی کوشش کریں گی۔ بھابیوں کو تو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ وہ چاروں جوان اور خوب صورت تھیں اور شوہروں کو انگلیوں پر نچانے کا فن اچھی طرح جانتی تھیں۔ البتہ نوشین کی ماں کو لوہے کے چنے چبانے پڑ گئے۔ شیخ عبدالعزیز تو محسن کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھے پھر نوشین کی ماں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولیں۔ ''دیکھو جی، آج کل اچھے منیجر کہاں ملتے ہیں۔ محسن نے بی کام کرلیا ہے اور اب ایم بی اے کی تیاری کررہا ہے۔ اسے داماد بنانے میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ بیٹے تو اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ تمہارے کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ محسن یہ کمی پوری کرسکتا ہے۔ اس پر احسان بھی ہوجائے گا اور وہ ہمیشہ ہم سے دب کر رہے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ ہاں کردو۔ ایسے رشتے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔''

شیخ عبدالعزیز نے غور سے بیوی کی طرف دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کوئی عقل کی بات کی تھی۔ اس لیے ان کا چونکنا ایک فطری سی بات تھی۔ انہوں نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کیے اور بولے۔ ''کہتی تو تم ٹھیک ہو، ویسے وہ لڑکا ذاتی طور پر مجھے پسند ہے۔ میں نے آج تک اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی لیکن پھر بھی اس سے رشتہ جوڑنا کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ خاندان، برادری والے کیا کہیں گے کہ کس ٹٹ پونجیے سے لڑکی بیاہ دی۔ میں تو نوشین کے لیے بہت اچھا گھر تلاش کررہا تھا جہاں میری بیٹی راج کرے۔''

''وہ یہاں بھی راج ہی کرے گی۔ محسن اور اس کی ماں دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ وہ دل سے ہماری بیٹی کی قدر کریں گے اور خاندان برادری کا کیا ہے جو چاہے کہتے رہیں۔ ہم تو وہی کریں گے جس میں ہمارا فائدہ ہوگا۔''

شیخ صاحب پکے کاروباری تھے اور جہاں فائدہ کی بات آجائے تو ان کی دلچسپی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس معاملے میں بھی انہوں نے فائدہ کا پہلو دیکھا اور بیوی سے بولے۔ ''ٹھیک ہے، تم کسی چھٹی والے روز محسن اور اس کی ماں کو بلوالو۔ ذرا دو چار باتیں ان سے بھی ہوجائیں۔''

نوشین کی طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد محسن کی بے تابی مزید بڑھ گئی۔ وہ جلد از جلد ماں کو نوشین کے گھر بھیجنا چاہ رہا تھا۔ اب مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی۔ نوشین جیسی حسین اور دولت مند لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوچتا ہی رہ جائے اور کوئی دوسرا درمیان میں کود پڑے۔ اسی لیے اس روز اس نے دفتر سے آنے کے بعد ماں سے بات کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہوگیا اور تمہید کے طور پر کی جانے والی گفتگو کوئی دوسرا رخ اختیار کرگئی۔ اب محسن کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ رات کے کھانے پر ماں کے ساتھ دل کی بات شیئر کرے۔

کھانے کے بعد جب صادقہ بیگم برتن وغیرہ سمیٹ کر فارغ ہوئیں تو محسن نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور بولا۔ ''امی! آپ سارا دن گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ بوریت تو بہت ہوتی ہوگی۔''

صادقہ بیگم نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا، جہاندیدہ تھیں اس لیے بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''خیریت تو ہے۔ آج تمہیں میری تنہائی کا خیال کیسے آگیا۔ میں تو گزشتہ کئی برسوں سے یہ عذاب جھیل رہی ہوں۔''

''اسی لیے سوچ رہا ہوں کہ اب یہ تنہائی ختم ہوجانی چاہیے۔'' محسن نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اوہ، اب سمجھی، میں بھی تو کہوں کہ آج اماں کے اتنے لاڈ کیوں اٹھائے جارہے ہیں۔'' انہوں نے محسن کے گال پر پیار سے چپت لگائی اور بولیں۔ ''سچ کہنا محسن! کیا تم بھی وہی کچھ سوچ رہے ہو... جو میرے دل میں ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہو۔ ویسے بائی داوے آپ کے دل میں کیا ہے؟''

''وہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم کہو، کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں یہ گستاخی نہیں کرسکتا۔ آپ بڑی ہیں اس لیے پہلے آپ۔''

صادقہ بیگم کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ محسن کا کان پکڑتے ہوئے بولیں۔ ''اس پہلے آپ پہلے آپ کے چکر میں گاڑی نکل جائے گی اور ہم دونوں ہی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس لیے تکلف برطرف۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی لڑکی ہے یا تم کسی کو پسند کرتے ہو تو بلا جھجک بتا دو۔''

محسن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اٹکتے ہوئے بولا۔ ''وہ......وہ......آپ شیخ صاحب کے یہاں چلی جائیں۔''

صادقہ بیگم چونکتے ہوئے بولیں۔ ''کون شیخ صاحب! کہیں تم اپنے شیخ عبدالعزیز کی بات تو نہیں کررہے؟''

''جی......جی ہاں، وہی شیخ صاحب ان کی بیٹی ہے نا نوشین۔''

صادقہ بیگم تیز لہجے میں بولیں۔ ''محسن! تم ہوش میں تو ہو، ہماری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں اگر اس نیت سے وہاں گئی تو وہ اپنے نوکروں کے ذریعے دھکے دے کر نکال دیں گے۔ کیا تم اپنی ماں کی بے عزتی برداشت کرلو گے؟''

''کسی کی مجال نہیں کہ کوئی آپ کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے، میں اس کی آنکھیں ہی نکال دوں گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ انشاء اللہ کامیاب ہو کر ہی لوٹیں گی۔''

''تو یوں کہو نا کہ سب معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔''

''دیکھ لیجیے۔ میں نے آپ کا کام کتنا آسان کردیا۔ اب تو صرف رسمی کارروائی پوری کرنی ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتوار شام پانچ بجے کا وقت طے کرلو۔ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا تاکہ بردکھوے کا مرحلہ بھی ساتھ ساتھ نمٹ جائے۔''

محسن کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ماں اتنی آسانی سے اس رشتے کے لیے تیار ہو جائے گی بلکہ اسے تو شیخ صاحب کی طرف سے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ اپنی حیثیت سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے پر تیار ہوں گے یا نہیں لیکن شکر ہے کہ دونوں طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ جس کا ایک ہی مطلب لیا جاسکتا تھا کہ نوشین کے ساتھ اس کا رشتہ آسمانوں پر طے ہو چکا تھا چنانچہ اس نے دوسرے روز ہی نوشین کو اتوار کے پروگرام سے مطلع کردیا اور وقت مقررہ پر دونوں ماں بیٹے شیخ

بابا فرید ایک شب تہجد پڑھ رہے تھے کہ افغانستان سے ایک تجارتی قافلے کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس میں تقریباً 20،15 اونٹ تھے جن پر ڈرائی فروٹ از قسم اخروٹ، بادام، خوبانی، پستہ اور چلغوزے وغیرہ لدے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اس دور میں رواج تھا اس قافلے کے اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ قافلے کے چند محافظ اور تاجر آگے آگے چل رہے تھے اور چند پیچھے پیچھے تھے تاکہ نگرانی کرسکیں۔ بابا فرید عبادت میں اس قدر مستغرق تھے کہ ان کو پہلے تو معلوم ہی نہ ہوا کہ کوئی قافلہ گزر رہا ہے لیکن جب اونٹوں کی گھنٹیوں کی آوازیں تیز ہوگئیں تو آپ کے استغراق میں خلل آیا اور آپ نے مریدوں سے پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے؟ مرید حجرے سے باہر نکل کر دیکھنے لگے تو آخری اونٹ پتن پر سے گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ دو تین افغان محافظ بھی تھے۔ مرید ان کو لے کر بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا فرید نے پوچھا:

''یہ شور کیسا ہے، کہاں جارہے ہو؟''

قافلے والے یہ محافظ نوعمر لڑکے تھے ان کے بزرگ آگے آگے تھے اور ان لڑکوں کو پیچھے آنے کا حکم دیا ہوا تھا۔ انہوں نے بابا فرید کی بات سنی اور کہا ''زبان ہندی نمی دانم'' یعنی ہم ہند کی زبان نہیں جانتے۔

بابا فرید چونکہ فارسی جانتے تھے پوچھا ''ایں شور و غوغا چیست؟ کدام میری؟'' توشئہ شما چیست؟''

بابا فریدکی کی فصیح فارسی سن کر وہ دونوں لڑکے حیران ہوئے اور ان کو شرارت سوجھی۔ ایک نے جواب دیا۔ ''بابا می رویم بہ دہلی وتوشئہ ماسنگ است۔''

یعنی ہم دہلی جارہے ہیں اور وہاں پتھر لے جارہے ہیں۔ بابا فرید نے سن کر تبسم فرمایا اور ان کی زبان سے نکلا۔ ''سنگ باشد'' یعنی ''پتھر ہی ہوگا۔'' ولی اللہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ اونٹوں پر رکھے تمام کجاوؤں کے خشک پھل پتھر بن گئے۔

مرسلہ: انور حسن۔ لاہور

صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ رسمی باتوں کے بعد صادقہ بیگم نے اپنا مدعا بیان کیا تو شیخ صاحب سنبھلتے ہوئے بولے۔ ''یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے محسن جیسے سعادت مند اور ہونہار بیٹے کے لیے ہماری لڑکی کا انتخاب کیا ہمیں یہ رشتہ قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں کیونکہ محسن ہمارے سامنے ہی پل بڑھ کر جوان ہوا ہے اور آپ کی پوری زندگی بھی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے البتہ اگر اجازت ہو تو آپ کی موجودگی میں ہی محسن سے دو چار باتیں کرلوں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، بڑے شوق سے آپ جو چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔'' صادقہ بیگم نے خوش دلی سے کہا۔

''دیکھو محسن میاں، آپ کے مستقبل کے حوالے سے تو میں بالکل مطمئن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آگے چل کر آپ بہت ترقی کریں گے لیکن فی الوقت آپ کو سپورٹ کی ضرورت ہے اور میں بھی یہی چاہوں گا کہ میری بیٹی جس عیش و آرام کی عادی ہو چکی ہے اس میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ اس لیے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی ڈیمانڈ بتا دیں تاکہ اسی کی مناسبت سے فائنل بات کی جائے۔''

محسن نے بڑے تحمل سے ان کی بات سنی اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ''میری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہو تو مجھے میرے حالات سمیت قبول کرنا ہوگا کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو سسرال کے پیسوں پر نظر رکھتے ہیں۔''

''ویری گڈ۔'' شیخ صاحب خوش ہوتے ہوئے بولے۔ ''مجھے آپ سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی لیکن ہمیں یہ اختیار تو ہوگا کہ اپنی بیٹی کو جہیز کے نام پر کچھ دے سکیں۔''

''بالکل مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو جو کچھ دینا ہو اپنی بیٹی کو دیں۔ میرے لیے کوئی اہتمام نہ کریں۔''

''دوسری بات یہ کہ شادی کے بعد اگر آپ کو ہماری بیٹی سے کوئی شکایت ہو تو اسے خود ہی طے کرلیں۔ مجھ تک کوئی بات نہیں آنی چاہیے... کیونکہ میں میاں بیوی کے معاملات میں دخل دینے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لیے آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔''

''اللہ نے چاہا تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔'' محسن نے آہستہ سے کہا۔

اس طرح کی دو چار باتوں کے بعد یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ شیخ صاحب نے ان لوگوں کی تواضع کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب صادقہ بیگم نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو شیخ صاحب نے کہا۔

''بہن! آپ مطمئن رہیں ہم گھر میں مشورہ کر کے آپ کو جلد ہی جواب دیں گے۔''

محسن کی ماں کو یقین تھا کہ جواب ہاں میں ہی ہوگا اگر ناں کرنا ہوتی تو انہیں گھر آنے کی دعوت ہی کیوں دیتے، یہ تو لڑکی والوں کا طریقہ ہے کہ وہ پہلی دفعہ میں کبھی ہاں نہیں کہتے بلکہ لڑکے والوں کو دو چار چکر لگوانے کے بعد ہی کوئی جواب دیتے ہیں۔ جہاندیدہ عورت تھیں اور انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ اتنا تو جان ہی گئی تھیں کہ محسن اور نوشین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور نوشین کے گھر والے بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں ورنہ وہ اپنے گھر میں ان لوگوں کا داخلہ بھی برداشت نہ کرتے۔ انہوں نے اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی شیخ صاحب کی طرف سے رضا مندی کا اظہار ہوا، وہ فوراً منگنی کی رسم ادا کر کے چھ ماہ کے اندر اندر شادی بھی کردیں گی۔ ان کے خیال میں بات پکی ہو جانے کے بعد شادی میں تاخیر کرنا مناسب نہ تھا۔

ایک ہفتہ خیریت سے گزر گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ البتہ نوشین اور محسن کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ نوشین کی زبانی ہی محسن کو معلوم ہوا کہ ویسے تو گھر کے سبھی افراد ہی اس رشتے کو منظور کرنے کے حق میں ہیں لیکن شیخ صاحب چاہتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے بڑے بھائی سے بھی مشورہ کرلیں لیکن نوشین کی ماں اس کی مخالفت کررہی تھیں۔ ان کے خدشات بھی اپنی جگہ درست تھے۔ انہیں جیٹھ سے زیادہ جٹھانی سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ بے حد خطرناک، چالاک اور عیار عورت تھی اور اس کا ارادہ نوشین کو اپنی بہو بنانے کا تھا۔ جب کہ نوشین کی ماں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ مرتے مر جائیں گی لیکن بیٹی کی شادی اپنی سسرال میں نہیں کریں گی کیونکہ ان کی نظر میں جیٹھ اور نندوں کی اولاد میں کوئی اس قابل نہیں تھا کہ وہ اسے اپنا داماد بنا سکیں وہ سب لڑکے انتہائی نکمے اور نالائق تھے۔ انہوں نے اچھی تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی ڈھنگ کا کوئی کام کررہے تھے۔ وہ سب اپنے باپ کے پیسوں پر عیش کررہے تھے اور کسی کو بھی اپنے مستقبل کی فکر نہ تھی۔ اسی لیے وہ شیخ صاحب کو قائل کرنے کی کوشش میں تھی کہ اس معاملہ میں کسی سے کوئی مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی بیٹی کے لیے بہتر

سوچ سکتے ہیں۔

بڑی مشکل سے یہ بات شیخ صاحب کی سمجھ میں آئی اور انہوں نے محسن کا رشتہ منظور کرلیا لیکن انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ ان کے بھائی بہنوں کا ردِّعمل بڑا شدید ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ لوگ اس بات پر ناراض بھی ہو جائیں کہ اس رشتہ کے سلسلے میں ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا لیکن نوشین کی ماں کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی وہ صرف اور صرف اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتی تھیں اور اس کے لیے وہ ساری دنیا کی ناراضی مول لے سکتی تھیں۔

اس روز بھی نوشین اور محسن ایک ریستوران میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہی نوشین نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''اتنے دن ہوگئے۔ آپ کی امی نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ اب تک تو انہیں جواب لینے کے لیے آجانا چاہیے تھی۔''

محسن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ان کے مزاج میں جلد بازی نہیں ہے۔ وہ ہر کام سکون واطمینان سے کرنا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ تمہارے گھر والے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔''

''یہ بھی خوب رہی۔'' نوشین جل کر بولی۔ ''ایسا نہ ہو کہ وہ سکون اور اطمینان سے بیٹھی رہیں اور یہاں کوئی دوسری کہانی شروع ہوجائے۔''

''کیا اب بھی کوئی خطرہ ہے؟'' محسن نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''خطرہ نہیں بلکہ خطرات، اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ جلد از جلد اپنی امی کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ اب اس بات کو کافی دن ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کا آنا جلد بازی میں شمار نہیں ہوگا۔''

اس کے بعد نوشین نے اسے مختصر الفاظ میں گھر میں پکنے والی کھچڑی سے آگاہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ فی الوقت فیصلہ اس کے حق میں ہوا ہے تاہم اگر بات گھر سے نکل گئی تو کوئی بھی رکاوٹ کھڑی ہو سکتی ہے۔

محسن کی سمجھ میں ساری بات آگئی اور اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں کل ہی امی کو تمہارے گھر جواب لینے کے لیے بھیجتا ہوں۔''

اس روز محسن نے گھر پہنچتے ہی ماں کو سب سے پہلے یہی بات بتائی اور کہا۔ ''امی! اب آپ کو ایک چکر شیخ صاحب کے یہاں بھی لگا لینا چاہیے۔ اب تو اس بات کو کافی دن ہو چکے ہیں۔ انہوں نے یقیناً کوئی فیصلہ کرلیا ہوگا۔''

''تمہاری بے تابی میری سمجھ میں آرہی ہے۔'' صادقہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ کیا اتنی جلدی میرا جانا مناسب ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں مزید کچھ وقت ملنا چاہیے۔''

''ایک دفعہ جانے میں کیا حرج ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تاخیر ہی ہمارے لیے نقصان کا باعث ہوجائے۔''

''اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔'' اب صادقہ بیگم کو بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ''میں کل ہی شیخ صاحب کے یہاں جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں وہ کیا جواب دیتے ہیں۔''

دوسرے دن صادقہ بیگم نے دو کلو مٹھائی منگوائی اور محسن کے گھر آنے سے پہلے ہی شیخ صاحب کی طرف چل دیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ محسن کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ یہ خوش خبری اسے سنا دیں۔ انہیں پورا یقین تھا کہ فیصلہ ان کے بیٹے کے حق میں ہی ہوا ہوگا اور وہ اسی یقین کے سہارے نوشین کے گھر پہنچیں۔ وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اتفاق سے اس روز شیخ صاحب بھی جلد ہی گھر آگئے تھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد صادقہ بیگم نے اپنا مدعا بیان کیا تو شیخ صاحب بولے۔ ''ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ آپ جب چاہیں اپنی سہولت کے مطابق تاریخ طے کرسکتی ہیں۔''

''اللہ آپ کو خوش رکھے۔'' صادقہ بیگم دعا کے انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولیں۔ ''آپ نے مجھ بیوہ کا مان رکھ لیا۔ میں مرتے دم تک یہ احسان نہیں بھولوں گی۔''

''کیسی باتیں کررہی ہیں آپ۔'' شیخ صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''محسن جیسے بیٹے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ احسان مند تو ہمیں ہونا چاہیے کہ آپ نے اپنا ہیرے جیسا بیٹا ہمیں دے دیا۔ اب محسن ہمارا ہوا، اس کے بدلے میں ہم نے نوشین آپ کو دی۔''

نوشین کا ذکر آتے ہی صادقہ بیگم چونکتے ہوئے بولیں۔ ''ارے بیٹی کو تو بلائیں۔ میں سب سے پہلے اسی کا منہ میٹھا کراؤں گی تاکہ ساری زندگی اس کی زبان سے میٹھے بول ہی سنتی رہوں۔''

نوشین کی ماں نے بڑی بہو کو اشارہ کیا تو وہ اسے بلانے کے لیے چلی گئی۔ صادقہ بیگم نے مٹھائی کا ڈبہ اپنی

ہونے والی سمدھن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو شگن کے لیے تھوڑی سی مٹھائی لائی ہوں آپ تاریخ دے دیں تو میں رسم کے لیے آجاؤں۔''

''اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔'' نوشین کی ماں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ضرور۔'' صادقہ بیگم بولیں۔ ''آپ کی بات کا میں کیوں برا مناؤں گی۔''

''بس یوں سمجھ لیں کہ ہماری طرف سے بات پکی ہے۔ یہ رسم وغیرہ رہنے دیں کیونکہ ہمارے یہاں منگنی راس نہیں آتی۔''

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی لیکن مجھے اتنی اجازت تو دیں کہ اپنی بیٹی کو محسن کے نام کی انگوٹھی پہنا دوں۔''

''چلیں۔ یہ خوشی بھی پوری کر لیں لیکن منگنی کا اعلان نہیں کیا جائے گا کیونکہ فی الحال ہم اپنے خاندان میں اس کی تشہیر نہیں چاہتے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں بھی اپنی طرف سے پوری احتیاط کروں گی کہ بات پھیلنے نہ پائے۔'' صادقہ بیگم نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''البتہ میں اس اتوار کو محسن کے ساتھ آرہی ہوں۔ اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنانے۔''

ان کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ نوشین بھی اپنی بڑی بھاوج کے ساتھ آگئی۔ صادقہ بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کیا اور مٹھائی کا ٹکڑا اس کے منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔ ''خوش رہو، بس یونہی ہمیشہ مسکراتی رہنا تاکہ میرے گھر میں خوشیوں کی برسات ہوتی رہے۔''

اگلے اتوار کو صادقہ بیگم، محسن کے ہمراہ شیخ صاحب کے گھر گئیں اور نوشین کو انگوٹھی پہنا دی۔ نوشین کی امی نے بھی محسن کو انگوٹھی پہنائی۔ اس موقع پر گھر کے افراد کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا حالانکہ شیخ صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے بھائی بہنوں کو مدعو کریں لیکن ان کی بیگم نے منع کر دیا بلکہ سختی سے تاکید کر دی کہ ابھی کسی سے اس رشتے کا ذکر نہ کیا جائے لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود یہ بات پھیل گئی۔

شیخ صاحب کے بڑے بھائی کو جب معلوم ہوا کہ نوشین کا رشتہ کسی غیر لڑکے سے طے کر دیا گیا ہے تو انہیں بہت غصہ آیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ افسوس بھی تھا کہ چھوٹے بھائی نے اتنے اہم معاملے میں ان سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ دونوں میاں بیوی شیخ صاحب کے گھر آئے اور خوب گرجے برسے۔ نوشین کی تائی کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ نوشین کو اپنی بہو بناؤں لیکن آپ نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی۔ کم از کم ہمیں کچھ کہنے کا موقع تو دیا ہوتا۔''

''آپ نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔'' شیخ صاحب بولے۔

''میں نوشین کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ فارغ ہو جائے پھر آپ کے آگے جھولی پھیلاؤں گی۔''

''اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''اگر آپ پہلے ذکر کر دیتیں تو میں ضرور اس بارے میں سوچتا۔''

''خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔'' وہ اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے بولیں۔ ''رشتہ ہی طے ہوا ہے، کوئی نکاح تو نہیں ہوا، آپ ان لوگوں کو انکار کر دیں۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ سختی سے بولے۔ ''میں زبان دے چکا ہوں اور ویسے بھی وہ لڑکا ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ میں کس بنیاد پر انکار کر دوں۔''

''دیکھیے بھائی صاحب! آپ میرے بیٹے کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ نوشین پر پہلا حق ہمارا ہے۔''

''حق تلفی اس وقت ہوتی جب آپ نے رشتہ مانگا ہوتا اور میں انکار کر دیتا۔ اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' شیخ صاحب قطعی انداز میں بولے۔

ان کے جانے کے بعد نوشین کی امی بولیں۔ ''مجھے ان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔ کہیں یہ کوئی اور گل نہ کھلا دیں۔''

''کیا کر لیں گے۔ ہماری بیٹی کی تقدیر تو نہیں بدل سکتے۔'' شیخ صاحب بولے۔ ''تم اپنے دل میں اندیشوں کو جگہ نہ دو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

شادی کی تاریخ چھ ماہ بعد مقرر ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ صادقہ بیگم نے نوشین کے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ جہیز میں دلہن کے کپڑوں کے علاوہ کوئی بھاری چیز مثلاً فرنیچر وغیرہ نہ دیں کیونکہ ان کے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے۔ یہ سن کر شیخ صاحب دل مسوس کر رہ گئے کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو بھاری بھرکم جہیز دینا چاہ رہے تھے لیکن ان کی بیگم نے تجویز پیش کی کہ وہ ان چیزوں کے

بدلے نوشین کو نقد رقم دے دیں۔ وہ شادی کے بعد اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق خریداری کر لے گی۔

صادقہ بیگم کا مکان ایک سو بیس گز پر بنا ہوا تھا۔ وہ جب اس میں شفٹ ہوئیں تو صرف ایک کمرا، باورچی خانہ اور باتھ روم بنا ہوا تھا۔ انہوں نے دن رات محنت کر کے کمیٹی ڈالی اور ایک ایک اینٹ جوڑ کر اس مکان کو مکمل کیا۔ انہوں نے محسن کی شادی سے پہلے پورے مکان پر رنگ روغن کروایا، باتھ روم میں ٹائل لگوائے اور کچن بنوایا تھا کہ نوشین کو کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہو۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی بہو ایک بڑے گھر سے آرہی ہے جہاں اسے زندگی کی ہر آسائش میسر ہے گو کہ ان کا مکان شیخ صاحب کے گھر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ اسے ہر لحاظ سے نوشین کے لیے آرام دہ اور پُر آسائش بنانا چاہ رہی تھی۔

بالآخر شادی کا دن بھی آ گیا۔ صادقہ بیگم نے بری اپنی حیثیت کے مطابق بنائی، جس میں زیور کا ایک سیٹ اور دلہن کے گیارہ جوڑے تھے۔ وہ مقدار سے زیادہ معیار کی قائل تھیں اور ان کے ذہن میں یہی ایک بات تھی کہ جوڑے بے شک تعداد میں کم ہوں لیکن دیدہ زیب اور معیاری ہونے چاہئیں۔ نوشین کے گھر والوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن تائی اور ان کی بیٹیوں نے بری کا خوب مذاق اڑایا اور مسلسل طنز کے تیر برساتی رہیں، اسی طرح ولیمہ کی تقریب میں بھی ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی گو کہ محسن نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن وہ ہر بات میں کیڑے نکال رہی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر نوشین کی امی کا خون کھول رہا تھا اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیتیں۔

شادی سے پہلے نوشین نے محسن کا گھر نہیں دیکھا تھا لیکن شادی کے بعد اسے یوں لگا کہ وہ محل سے نکل کر کسی جھونپڑی میں آ گئی ہے۔ اسے محسن کا مکان دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی گو کہ وہ اس کے بیک گراؤنڈ سے اچھی طرح واقف تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ محسن کی ماں نے کس طرح تنکا تنکا جوڑ کر یہ مکان بنایا ہے لیکن وہ جس پُر آسائش زندگی کی عادی تھی اس کے مقابلے میں یہ گھر کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ عملاً ایک کمرا میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ باقی پورے گھر میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں کسی مہمان کو بٹھایا جاتا۔

شادی کو ایک مہینا ہو گیا تھا لیکن نوشین نے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے عادت ہی نہیں تھی۔ اپنے گھر میں بھی اس کی ماں اور بھاوجیں سارا کام کرتیں۔ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی تھی۔ نوشین نے کبھی کھانا نہیں بنایا تھا البتہ جب اس کا موڈ ہوتا تو وہ اپنے لیے چائے بنا لیتی۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہی معمول رہا۔ وہ صبح دیر سے سو کر اٹھتی۔ محسن خود ہی ناشتا کر کے بینک چلا جاتا۔ صادقہ بیگم اس کے انتظار میں بیٹھی رہتیں کہ وہ کمرے سے باہر آئے تو اسے ناشتا بنا کر دیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس کی صبح بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تو انہوں نے بھی اس کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ خود ہی چائے بناتی اور ناشتا کرنے کے بعد ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتی۔ شام کو محسن گھر آتا تو اسے بھی صادقہ بیگم ہی چائے بنا کر دیتیں پھر دونوں میاں بیوی گھومنے چلے جاتے اور صادقہ بیگم رات دیر تک ان کا انتظار کرتی رہتیں۔

بہت جلد نوشین کو احساس ہونے لگا کہ یہ وہ گھر نہیں جس کا شادی سے پہلے اس نے خواب دیکھا تھا۔ اسے صادقہ بیگم یا محسن سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کی ساس بہت ہی شفیق اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس سے کسی کام کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی سخت لہجہ میں بات کی۔ نوشین کو اس بات کا احساس تھا کہ انہیں اس عمر میں بھی گھر کا سارا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی لگا لی جائے لیکن صادقہ بیگم اس تجویز سے متفق نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں بہت سے تحفظات تھے تاہم نوشین کے بہت زیادہ کہنے پر انہوں نے ایک ماسی کا بندوبست کر لیا۔

آہستہ آہستہ صادقہ بیگم اور نوشین کے درمیان دوری بڑھنے لگی۔ صادقہ بیگم چاہتی تھیں کہ نوشین گھر کے کاموں میں دلچسپی لے لیکن وہ اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں تھی۔ گو کہ صادقہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن نوشین جانتی تھی کہ ہر ساس کی طرح وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ ان کی بہو کولہو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک گھر کے کاموں میں جتی رہے اور وہ تخت پر بیٹھ کر حکم چلاتی رہیں۔

نوشین کو اس دو کمرے کے مکان میں گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ محسن اسے بیچ کر کسی بڑے مکان میں شفٹ ہو جائے۔ اس گھر کو وہ اپنی مرضی کے مطابق سجا سکتی تھی اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی کر سکتی تھی۔ اسے جہیز میں پانچ لاکھ کا چیک ملا تھا۔ اس نے سوچا کہ ڈرائنگ روم میں نیا فرنیچر ڈلوا دے اور ایک ڈائننگ ٹیبل لے آئے لیکن

مسئلہ یہ تھا کہ یہ چیزیں کہاں رکھی جائیں گی۔ ڈرائنگ روم اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں بمشکل ایک صوفہ سیٹ ہی آسکتا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اگر لاؤنج میں رکھی جاتی تو وہاں چلنے کا راستہ بھی نہ بچتا۔ محسن سے مشورہ کیا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ صادقہ بیگم نے بھی نیا صوفہ سیٹ خریدنے کی مخالفت کی اور بولیں۔ ''کیا ضرورت ہے پیسے خراب کرنے کی۔ ان صوفوں میں کیا خرابی ہے؟''

نوشین نے دل میں سوچا کہ کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔ کباڑی کو دو گی تو وہ شاید مفت میں بھی نہ لے۔ تاہم اس نے ان کے مشورے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے وہی کیا جو سوچا تھا۔ ایک دن وہ محسن کو لے کر بازار گئی اور اپنی پسند سے نئے صوفے لے کر آگئی۔ پھر پردے والے کو بلا کر نئے پردوں کا آرڈر دیا۔ اس طرح ڈرائنگ روم کی کچھ شکل نکل آئی۔ پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس کے ذہن میں جس گھر کا تصور تھا۔ یہ مکان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

اس مکان کی وجہ سے وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے میکے یا سہیلیوں میں سے کوئی اس سے ملنے آئے اور اس مکان کی وجہ سے اس کی سبکی ہو اگر کوئی اس کے گھر آنے کے لیے کہتا تو وہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیتی۔ سہیلیوں سے بھی وہ فون پر ہی بات کرلیا کرتی تھی یا خود ہی ان سے ملنے چلی جاتی لیکن اس نے کبھی کسی کو اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی لیکن ایک دن یوں ہوا کہ اس کے کالج کے زمانے کی ایک سہیلی بغیر اطلاع کے اس سے ملنے چلی آئی۔ اس کی بھی شادی ہوگئی تھی اور وہ ڈیفنس میں رہ رہی تھی۔ نوشین کا شادی کے بعد اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا لیکن اس روز نہ جانے اس کی سہیلی رومانہ کو کیا سوجھی کہ اس نے نوشین کی امی کو فون کر کے ان سے نوشین کا پتا لیا اور اپنی نئی قیمتی چمچاتی ہوئی کار میں اس سے ملنے آگئی۔

اسے دیکھ کر نوشین کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ رومانہ کو کہاں بٹھائے۔ ظاہر ہے کہ دروازے سے تو واپس نہیں بھیج سکتی تھی۔ مجبوراً اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانا پڑا کیونکہ پورے گھر میں وہی ایک ڈھنگ کی جگہ تھی۔ دونوں سہیلیاں بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ کچھ دیر پرانے قصے دہرائے گئے۔ نوشین نے اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کہ رومانہ پر اچھا تاثر قائم ہو۔ اس کے باوجود رومانہ سے رہا نہ گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور گیٹ کے پاس آکر بولی۔ ''یار مجھے حیرت ہے۔ تم اتنے چھوٹے سے گھر میں کس طرح رہ رہی ہو۔ میرا تو ذرا سی دیر میں ہی دم گھٹنے لگا ہے۔''

نوشین شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا کریں بھئی مجبوری ہے۔ فی الحال اسی میں گزارہ کرنا ہے۔ محسن کی پروموشن ہونے والی ہے پھر کوئی بڑا گھر دیکھیں گے۔''

یہ بات اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہی تھی۔ محسن کی پروموشن کا دور دور تک پتا نہیں تھا اور نہ ہی گھر بدلنے کی بات ہوئی تھی تاہم اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلد از جلد بڑے گھر میں شفٹ ہونے کی کوشش کرے گی۔ اگر نیا گھر خریدنے کی گنجائش نہیں تو بے شک کرایہ پر ہی کوئی اچھا مکان یا لگژری فلیٹ دیکھ لیا جائے۔ کم از کم آنے جانے والوں کے سامنے شرمندگی تو نہیں ہوگی اور وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈیکوریٹ کر سکے گی۔

شام کو اس نے یہی بات محسن سے کہی تو وہ چونک اٹھا اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیوں اس گھر میں کیا برائی ہے جو ہم کسی اور جگہ شفٹ ہونے کے بارے میں سوچیں۔''

''برائی تو کوئی نہیں لیکن بہت چھوٹا اور پرانے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ آج کل تو ہر گھر میں اٹیچڈ باتھ، امریکن کچن اور ٹائل لگے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم کسی سرکاری کوارٹر میں رہ رہے ہیں۔''

''شکر کرو کہ ہمارے پاس سر چھپانے کے لیے اپنی چھت ہے ورنہ ہمیں بھی کرایہ کے مکان میں رہنا پڑتا۔''

''کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے بیچ کر کوئی نیا اور جدید طرز کا مکان خرید لیں۔''

''اس میں دو مسئلے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ مکان امی کا ہے۔ انہوں نے کئی برسوں کی محنت کے بعد ایک ایک اینٹ جوڑ کر اسے مکمل کیا۔ اس مکان سے ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ وہ کبھی اسے فروخت کرنے پر راضی نہ ہوں گی اور اگر وہ مان بھی گئیں تو اتنے پیسوں میں دوسرا مکان نہیں آسکتا۔ اس کے لیے مزید تیس چالیس لاکھ روپوں کی ضرورت ہوگی، وہ کہاں سے آئیں گے۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔ میں ابو سے لے لوں گی۔ مجھے امید ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔''

''لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔'' محسن نے سختی سے کہا۔ ''تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے رشتہ طے ہوتے وقت ہی ان

سے کہہ دیا تھا کہ میری نظر ان کی دولت پر نہیں ہے۔ اب میں کیسے اپنی بات سے پھر سکتا ہوں۔"

محسن کا سخت لہجہ دیکھ کر نوشین ڈر گئی اور اس نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کرلی لیکن وہ دل میں تہیہ کر چکی تھی کہ وہ ہر قیمت پر مکان بدل کر رہے گی۔ ٹھیک ہے اگر محسن اس کے باپ سے مدد لینا نہیں چاہتا تو وہ اپنا زیور بیچ دے گی اور صادقہ بیگم کو بھی اپنا مکان بیچنے پر راضی کرلے گی۔

محسن نے ایم بی اے کرلیا تو اس کی ترقی ہوگئی اور اسے بینک سے گاڑی بھی مل گئی۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ گاڑی کہاں کھڑی کی جائے۔ گھر میں تو جگہ تھی نہیں اور گلی میں نئی گاڑی کھڑی کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس فکر میں اس کی نیند بھی خراب ہونے لگی۔ وہ رات کو کئی مرتبہ اٹھ کر گاڑی دیکھنے باہر جاتا پھر اس نے گلی کے چوکیدار کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ مزید کچھ پیسے لے کر گاڑی کی دیکھ بھال کرتا رہے۔

نوشین کو تو جیسے بہانہ ہاتھ آگیا اور وہ بڑی شدت سے مکان بدلنے کا مطالبہ کرنے لگی۔ محسن بھی کسی حد تک اس سے متفق ہو چکا تھا۔ اس نے نوشین سے کہہ دیا کہ اگر امی مکان بیچنے پر راضی ہو جائیں تو وہ بقیہ رقم بینک سے قرض لے کر پوری کرلے گا لیکن جب اس نے صادقہ بیگم سے بات کی تو انہوں نے مکان بیچنے سے صاف انکار کردیا اور کہا۔ "تم لوگ جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

محسن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ ماں اور بیوی دونوں ہی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ نوشین کو صادقہ بیگم کے انکار سے بہت دکھ ہوا، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر مکان کی قربانی دینے پر تیار ہو جائیں گی لیکن جب اس کی توقع پوری نہیں ہوئی تو اس نے بیویوں والا روایتی ہتھکنڈا استعمال کیا اور یہ کہہ کر میکے چلی گئی کہ اب وہ اسی وقت واپس آئے گی جب محسن نئے مکان کا بندوبست کرلے گا۔

صادقہ بیگم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ نوشین اتنی معمولی سی بات پر گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ خود اسے منانے کے لیے گئیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ادھر محسن سے بھی نوشین کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ایک ہی ہفتے میں اس کی حالت دیوانوں جیسی ہوگئی۔ صادقہ بیگم کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تشویش ناک تھی۔ محسن کی حالت دیکھ کر ان کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انہوں نے بڑی محنت و مشقت سے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہوگیا تو......

اس سے آگے سوچنے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ انہوں نے الماری کھول کر مکان کی فائل نکالی اور محسن کو دیتے ہوئے بولی۔ "میرے لیے تم سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ نہیں تم پر میں ایسے دس مکان قربان کرسکتی ہوں۔ تم کل ہی کسی ایجنٹ سے بات کر کے اسے بیچنے کا بندوبست کرو۔ ویسے بھی میرے بعد یہ مکان تمہارا ہی ہے۔ اس لیے جو فیصلہ کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

محسن پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اسے ماں اور بیوی کا فرق سمجھ میں آگیا تھا۔ اسی وقت فیصلہ کرلیا پھر وہ نوشین کے گھر پہنچا اور سب کے سامنے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "یہ رہے اس گھر کے کاغذات، اگر بیچنا چاہو تو بیچ لو مگر میں تمہارے ساتھ نئے گھر میں نہیں رہوں گا، اس لیے کہ اتنے پیسوں میں بڑا گھر نہیں ملے گا۔ اس لیے یقیناً تم باقی کی رقم پوری کرنے کے لیے اپنے ابو سے مانگو گی اور میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا۔ اس لیے اس گھر میں نہیں رہوں گا۔"

نوشین کے ابا نے یہ سنتے ہی اٹھ کر اسے گلے لگالیا پھر بولے۔ "اسے کہتے ہیں خودداری، مجھے تم پر فخر ہے اس لیے میرا بھی ایک فیصلہ ہے۔ بیٹی پرائی ہوتی ہے اس کی شادی کردی۔ میرا فرض پورا ہوگیا۔ اب اس کا اس گھر سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ نوشین کے یہاں آتے ہی میں نے اپنی جائیداد تقسیم کردی۔ نوشین کا حصہ اسے تب ملے گا جب وہ اپنے گھر جائے گی۔" اپنی بات ختم کر کے انہوں نے بیٹی پر نظر ڈالی۔

نوشین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھا پھر شوہر کے سامنے جا کھڑی ہوئی پھر بولی۔ "چلیں، مجھے سمجھ آگئی ہے کہ اپنا گھر صرف شوہر کا ہوتا ہے۔ اب نہ میں اس مکان کو بیچوں اور نہ مڑ کر یہاں آؤں گی۔"

باپ نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ہوئی نا عقل مندی، تمہیں اسی گھر کو جنت بنانا ہے اس گھر میں تب آؤ گی جب کوئی تقریب ہوگی۔ اب جاسکتی ہو۔"

نوشین نے محسن کو اشارہ کیا اور دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔

دلہن

مکرمی جناب
السلام علیکم
محبت فاتح عالم۔ یہ معقولہ بچپن سے سنتا آیا ہوں لیکن اس کی تفسیر اب دیکھی ہے۔ افراہیم اور بانی کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ افراہیم کو اس سے نفرت تھی لیکن یہ نفرت محبت میں کیسے بدلی اسے سمجھنے کے لیے اس سچ بیانی کو پڑھنا ضروری ہے۔

ناصر حسین بلوچ
(تونسہ شریف)

اسے وہ دن یاد آرہے تھے جب وہ دادی کے ساتھ ان کی مرحومہ سہیلی کے گھر پہنچا تھا، دادی کی سہیلی شہر سے اتنی دور، اس چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

ماں باپ کے ایکسیڈنٹل موت کے بعد اسے دادی نے اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ گاؤں کی زمینوں سے اتنا آجاتا تھا کہ اس گھر میں کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہوا، صرف ایک دادی تھیں جن کی زبان پر ایک ہی بات رہتی تھی کہ اس گھر میں ایک بہو کی بہت کمی ہے۔ وہ ہنس کر ان کی بات ہوا میں اڑا دیتا۔ دراصل ابھی تک اسے آئیڈیل ملی نہیں تھی لیکن جب وہ دادی کے ساتھ گاؤں آیا تو زندگی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ ان کی سہیلی کی پوتی انہیں پسند آگئی اور اسے زبردستی قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ شہر واپس آتے ہوئے سرخ جوڑے میں ملبوس سنبل بھی آگئی تھی۔ اقبال نے بیوی کے لیے جو آئیڈیل بنا رکھا تھا وہ چُور چُور ہو چکا تھا۔

اقبال نے گاؤں میں ہی عہد کرلیا تھا کہ وہ اسے کبھی بھی بیوی کا درجہ نہیں دے گا۔

وہ چھٹی کا دن تھا اس لیے اسے بیدار ہونے کی کوئی جلدی نہیں تھی وہ دس بجے تک سوتا رہا اور دس بجے کے بعد جب اس کی نیند مکمل ہو چکی تھی تو وہ فریش ہونے واش روم چلا گیا جب باہر نکلا تو اس کی بلیک کلر کی شرٹ بیڈ پہ پڑی ہوئی تھی۔

مطلب آج اسے بلیک شرٹ پہننے کو کہا جا رہا ہے، اب وہ اسی کے استری شدہ کپڑے پہننے لگا تھا۔ جب اس کے ہاتھ کی بنی چائے پی سکتا ہے کھانا کھا سکتا ہے تو کپڑے پہننے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔

لیکن ایک بات اسے اب تک سمجھ نہیں آئی کہ اس لڑکی کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کس ٹائم بیدار ہوا ہے اور اسی وقت وہ شرٹ بستر پہ لا کر رکھ دیتی ہے یا پھر جب اس کے سر میں درد ہوتا ہے یا پھر چائے پینے کا موڈ ہوتا ہے تو بنا کہے وہ اس کے لیے چائے بنا کر لے آتی ہے حالانکہ اس نے روایتی شوہروں والا ایسا کوئی حکم بھی نہیں سنایا لیکن وہ خود بنا کہے اس کے سارے کام کرتی۔ وہ روایتی بیویوں والے سارے فرائض نبھا رہی تھی لیکن اس سب کے باوجود بھی وہ اسے قبول نہیں کر سکتا۔

اس میں وہ اعتماد اور وہ شعور ہی نہیں ہے جو اسے ایک بیوی میں چاہیے تھا۔ وہ خوبصورت ہے لیکن خوبصورتی ہی تو سب کچھ نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی صرف خوبصورتی کے ساتھ پوری زندگی گزاری جاتی ہے۔

ہر انسان کی طرح اسے بھی حسن متاثر کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک انسان کو خوبصورت بنانے کے لیے صرف حسن ہی کافی ہو حسن کے علاوہ بھی کئی اور چیزیں انسان کو خوبصورت بناتی ہیں۔

کنگھی کر کے وہ نیچے چلا گیا تب تک وہ ناشتا لگا چکی تھی ناشتا کر کے یونہی لان میں اخبار لے کر بیٹھ گیا چھٹی کا دن تھا اس لیے ذہن بالکل فریش تھا۔ ویسے اپنے اخبار پڑھنے کی

عادت تو نہیں تھی لیکن یونہی ٹائم پاس کرنے کے انداز میں وہ اخبار کی ہیڈ لائنز پہ نظریں دوڑانے لگا۔ چھٹی کے دن اس کی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوا کرتی وہ ہمیشہ چھٹی کا دن گھر پہ ہی گزارتا عام نوجوانوں کی طرح کوئی خاص دوستی بھی نہیں پالی تھی، اس نے اپنا سارا وقت سارے خواب اپنی ہونے والی جیون ساتھی کے لیے سمیٹ رکھے تھے لیکن اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ دادی کے آنے میں بھی ایک ہفتہ باقی تھا۔

اچانک اخبار پڑھتے پڑھتے اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا وہ ایک بار پھر اخبار پڑھنے لگا لیکن کچھ لمحے بعد اسے پھر احساس ہوا جیسے کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ اب کی بار اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سامنے دیکھا تو اسے پتا چلا کہ وہ لڑکی کچن کی کھڑکی جو باہر لان کی طرف کھلتی ہے اس سے چپکے چپکے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ اس کی چوری پکڑ چکا تھا شاید اسی لیے وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی تھی اسے کچھ عجیب سا لگا۔ دو دن پہلے جب صبح کے وقت وہ گہری نیند میں سو رہا تھا تو اچانک ایک آواز سے اس کی آنکھ کھلی تب اس نے اوڑھ رکھی چادر سے دیکھا وہ لڑکی ہاتھ باندھ کر اسے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا پھر وہ چادر کے اندر سے آنکھیں کھول کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ بھی اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر اسے پتا ہوتا تو وہ شاید گڑبڑا کر باہر نکل جاتی۔

اس صبح وہ کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا اور آج ایک بار پھر وہ اسے مسلسل گھور رہی تھی۔ کیا وہ ہمیشہ اسے ایسے گھور کر دیکھتی ہے جب وہ چائے پی رہا ہوتا ہے یا وہ کھانا کھا رہا ہوتا ہے لیکن کیوں؟

وہ اپنے دماغ کی حالت سمجھنے سے قاصر تھا مگر اس نے خود میں نئی تبدیلی یہ محسوس کی کہ وہ اخبار بالکل بھی نہیں پڑھ پا رہا تھا پتا نہیں کیوں وہ پھر سے اپنی توجہ اخبار پہ نہیں مرکوز کر سکا۔

وہ انہی سوچوں میں الجھا بیٹھا تھا کہ وہ اس کے بالکل قریب آئی اس کے کپڑوں سے اٹھنے والی خوشبو وہ اپنے بالکل پاس محسوس کر سکتا تھا اور خوشبو بھی اتنی لگا کر آئی تھی جیسے نہا کر آئی ہو، خوشبو کے ساتھ ساتھ کپڑے بھی اس نے ہمیشہ سے بہتر پہن رکھے تھے۔ وہ چائے لائی تھی جو اس نے ٹیبل پہ رکھ

دی۔ اس نے بغور سنبل کی طرف دیکھا اسے لگا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

''کچھ چاہیے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں وہ......'' کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہوگئی تو اقبال نے چائے اٹھا کر پینا شروع کر دی لیکن سنبل ایک جن کی طرح اس کے سر پہ کھڑی تھی۔

''وہ جی ہم باہر چلیں۔'' وہ دل کی بات زبان تک لے ہی آئی۔

اقبال نے چائے واپس ٹیبل پر رکھ دی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کہاں؟''

''جی وہ موسم اچھا ہے، ہم نے سوچا باہر چلیں گے جیسے فلموں میں ہیرو ہیروئین جاتے ہیں۔'' سنبل نے شرما کر اپنی لمبی چوٹی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''اوہو، کیسی کیسی خوش فہمیاں ہیں محترمہ کو، میں تو ہیرو لگتا ہی ہوں پتا نہیں خود کو کس فلم کی ہیروئین سمجھ رہی ہے۔'' اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچا۔

''نہیں میں ذرا مصروف ہوں۔'' اقبال نے رکھائی سے جواب دیا اور پھر لڑکی کا چہرہ بجھتے ہوئے دیکھا۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے خوشی کے رنگ نظر آرہے تھے وہاں اب اداسی تھی اس نے جان بوجھ کر نظریں چرائیں اور وہ بھاگتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وہ جانتا تھا اب کچن میں کوئی کونا پکڑ کر رونے کا شوق پورا کریں گی محترمہ۔

اقبال کافی دیر تک وہیں لان میں بیٹھا رہا پھر اندر آکر ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی ساتھ اِدھر اُدھر بھی نگاہیں دوڑانے لگا۔ اقبال جسے دیکھنا چاہتا تھا وہ کہیں نظر نہ آئی۔ کہاں گئی ہوگی؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا پھر پانی پینے کا بہانہ کر کے وہ کچن میں چلا گیا، وہاں بھی وہ اسے نظر نہیں آئی۔ کچھ سوچ کر وہ اپنے کمرے میں گیا وہ وہاں بھی نہیں تھی یونہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایک کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اندر سسکیوں کی آواز سن کر اس کے قدم رک گئے بے ساختہ وہ دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

''آپ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں، آپ اتنی بڑی دنیا اتنی بڑی کائنات کے مالک ہیں، کیا آپ کی اتنی بڑی دنیا میں سے مجھے ایک چھوٹی خوشی بھی نہیں مل سکتی۔ آپ تو مالک ہیں ناں؟ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ تو سب پہ اختیار رکھتے ہیں پھر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کر رہے ہیں وہ خدا سے شکوہ کر رہی تھی۔ ''میں نے ساری زندگی آپ کی عبادت کی ہے۔ ہمیشہ نماز پڑھی ہے۔ روزے رکھے ہیں، تو ان کا آپ مجھے یہ اجر دے رہے ہیں۔ آپ مجھے میری نیکیوں کا صلہ دے دیں مجھے آپ سے جو چاہیے آپ مجھے وہ دیں بھلے ہی آخرت میں میرے لیے کوئی حصہ نہ رکھیں لیکن اس وقت مجھے اپنے دروازے سے خالی ہاتھ مت لوٹائیں۔

وہ خدا سے اپنی نیکیوں کا اجر مانگ رہی تھی خدا کو اپنی عبادات جتا رہی تھی ایک چھوٹے بچے کی طرح اپنی دی ہوئی شے وہ واپس مانگ رہی تھی۔ یہ بھی بھول گئی۔ وہ خود ایک معمولی سی بندی ہے۔

انسان بھی کیا چیز ہے بڑے شوق سے عبادت کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پہ اپنی ہی عبادات کا حساب مانگنے بیٹھ جاتا ہے، پتا نہیں وہ کیا مانگ رہی تھی۔ آخر ایسی کون سی چیز تھی جو وہ خدا سے اتنا گڑگڑا کر مانگ رہی تھی۔

اقبال دروازے سے ہٹ کر واپس صوفے پہ آکر بیٹھ گیا تھا پتا نہیں کیوں اسے اس لڑکی کا رونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنے لہجے پہ پچھتاوا سا ہونے لگا۔

آخر کیوں نہیں اس نے اس کی بات مانی۔ کیا ہو جاتا اگر وہ اس کے ساتھ باہر چلا جاتا، ویسے بھی وہ کون سا اس کے جیون بھر کی ساتھی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ہی تو ہے اس گھر میں ایک بات تو وہ شروع سے اپنے ذہن میں بٹھا چکا تھا کہ دادی کے آتے ہی وہ انہیں ان کا لایا ہوا یہ تحفہ واپس کر دے گا، اس لیے ہمیشہ اسے دیکھ کر یہی سوچتا کہ وہ اس گھر میں مستقل طور پر نہیں ہے اور نہ ہی یہ وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ وہ اپنی ساری زندگی گزار سکتا ہے لیکن اتنے عرصے میں پہلی بار یہ بات سوچتے ہوئے وہ کچھ عجیب احساسات سے دو چار ہوا۔ کچھ ایسے جذبات جنہیں وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

کبھی کبھی انسان کچھ اضطراب میں، ایک ٹینشن میں ہوتا ہے لیکن وہ اس ٹینشن کی وجہ نہیں سمجھ پاتا مگر آگے چل کر حالات اسے ہر بات سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

سنبل اب سیڑھیاں اتر کر نیچے آرہی تھی۔ اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا، جہاں کوئی آنسو کوئی پریشانی نظر نہیں آرہی تھی مطلب وہ لڑکی اپنی کمزوری اس پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''سنو!'' سنبل جب کچن کی طرف جانے لگی تو اس نے

آواز دے کر اسے روک دیا۔
''آج کھانا مت بنانا، ہم باہر جا کر کھانا کھائیں گے۔''
''جی ہم بھی؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
''ہاں، ہم، مطلب ہم دونوں، اوکے؟'' وہ مسکرادی۔
''اور ہاں کپڑے بھی اچھے پہن لینا۔ اگر اس طرح کے کپڑوں میں جاؤ گی تو سبھی ہنس ہنس کر مذاق اڑائیں گے۔''
''جی!'' سنبل مسکراتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔
پتا نہیں کیوں لیکن اب اقبال بھی خود کو پُرسکون محسوس کررہا تھا وہ اپنی زندگی میں یہی تو چاہتا تھا لیکن اس طرح ہرگز نہیں۔
وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پہ پیدل چلنا چاہتا تھا، ہوٹلوں میں کھانا کھانا چاہتا تھا۔ اس نے تصور میں اپنے لیے ایک الگ ہی بیوی کی خواہش کی تھی لیکن اس قسم کی نہیں۔
وہ دونوں دو بجے ہی گھر سے روانہ ہوگئے تھے اور تین گھنٹے بعد لوٹے۔ وہ چونکہ تھک چکا تھا اس لیے تھوڑا آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
☆......☆
اس دن سنبل اس کے کپڑے استری کرنے لگی تھی جب اچانک اسے یاد آیا کہ وہ دودھ کی دیگچی چولہے پہ رکھ آئی ہے۔ وہ اب ابلنے ہی والا ہوگا۔ وہ بھاگتی ہوئی کچن میں گئی، چولہے کا بٹن بند کیا اور دودھ اتار کر سائیڈ پر رکھ دیا۔
اب وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے تک آئی۔ کمرے میں اسے عجیب بدبو کا احساس ہوا۔ اس نے استری کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر جیسے اس پہ آسمان گر گیا، وہ شرٹ جل چکی تھی۔
اس نے اپنے ماتھے پہ زور سے ہاتھ مارا۔
''یہ کیا کر دیا میں نے، یہ تو ان کی پسندیدہ شرٹ تھی۔ اب کیا ہوگا اللہ، اب تو وہ بہت غصہ کریں گے، کیا کہوں گی ان سے؟ کیسے بتاؤں گی، وہ تو پہلے بھی بہت ناراض رہتے ہیں۔ اب انہیں اس شرٹ کا پتا چلے گا تو وہ اور بھی ناراض ہوں گے۔''
وہ آفس سے واپس آگیا لیکن وہ اسے شرٹ کے بارے میں نہ بتا سکی، کھانے کے وقت بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ رات سوتے وقت بھی وہ اسے بتانا چاہتی تھی لیکن ہمت ہی نہیں پیدا کر پا رہی تھی۔
وہ اس کی عجیب، غیر معمولی تبدیلی کو نوٹ کر رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں گم تھی، کس ٹینشن میں تھی۔ جب سے وہ آفس سے آیا ہے اسے کسی پریشانی میں مبتلا لگی۔ کھانے کے دوران بھی

خیبر پختونخوا کے ضلع ہری پور جیل میں سزائے موت کے ایک قیدی نے پشاور ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی ہے کہ اسے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ قیدی سجاد 15 سال سے جیل میں قید ہیں اور دوران قید انہوں نے گریجویشن یعنی بی اے کے امتحان کے علاوہ ایم اے پولیٹیکل سائنس اور ایم اے انگلش بھی کیا ہے۔ جیل میں قیدیوں کی تعلیم حاصل کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن سزائے موت کے کسی قیدی کا جیل کے اندر گریجویشن اور ڈبل ایم اے کرنے کا یہ ایک منفرد واقعہ ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے حکام کے مطابق جیل میں قید افراد میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے اور ماضی کی نسبت اب زیادہ قیدی تعلیم حاصل کرنے کے لیے رابطے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سجاد کے وکیل خورشید خان نے بتایا کہ ڈاکٹر سجاد قانون کی ڈگری یعنی ایل ایل بی کرنا چاہتے ہیں اس لیے عدالت سے درخواست کی گئی ہے کہ ان کے لیے خیبر پختونخواہ کے کسی لاء کالج میں داخلے کا بندوبست کیا جائے اور انہیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ درخواست کے مطابق پاکستان پریزن رولز کے رول نمبر 215 کے تحت قیدی قانون کی تعلیم یا ایل ایل بی کرسکتا ہے اس لیے ہائی کورٹ اسے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے۔
مرسلہ: اسما توحید۔ جڑانوالہ

اس نے جگ کے ساتھ گلاس نہیں رکھا اور چائے میں بھی چینی کی جگہ نمک ڈال کر آگئی اس نے تو اسے کچھ نہیں کہا لیکن وہ کچھ نیا پن محسوس ضرور کررہا تھا۔
لیکن وہ خود بتا نہیں رہی تھی اور وہ تو اس سے زندگی بھر نہیں پوچھتا۔
صبح جب وہ ناشتا کر کے آفس جانے لگا تو پیچھے سے آواز دے کر اس نے روک دیا۔
''پیچھے سے آواز دینا ضروری تھا محترمہ، اب بتاؤ کیا چاہیے؟'' اقبال نے کہا مگر وہ خاموش، نگاہیں جھکا کر کھڑی تھی۔ شاید کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔
''اب آپ کچھ بولیں گی یا میں بیٹھ کر آپ کے بولنے کا انتظار کروں، ویسے بھی مجھے آفس جانے میں تو بالکل بھی دیر

نہیں ہو رہی۔" وہ طنز کے تیز چلا رہا تھا۔
"وہ جی میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"
اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر کہا۔
"جی ہم وہی سننے کے لیے تو کھڑے ہیں محترمہ۔"
"وہ غلطی سے آپ کی شرٹ استری کرتے ہوئے جل گئی۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی
اور اقبال پتا نہیں کیا کیا سوچ چکا تھا کل سے اور اب پتا نہیں وہ رو کیوں رہی تھی۔
"او کے، او کے، کوئی بات نہیں۔"
"لیکن وہ آپ کی پسندیدہ شرٹ تھی وہ نیلی والی۔"
اقبال نے اس سے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ "کہہ دیا ناں کوئی بات نہیں، اب یہ مگر مچھ کی طرح آنسو مت بہاؤ اسے اس کے آنسوؤں سے تکلیف ہونے لگی تھی وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑا پھر کچھ سوچ کر واپس اس کے پاس آیا۔
"تم تو آسانی سے یہ بات مجھ سے چھپا سکتی تھی، اتنی ساری شرٹس میں سے میں اپنی ہر شرٹ کا تو حساب نہیں رکھتا پھر تم نے اپنی غلطی کیوں بتائی۔"
"آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں خدا سے تو نہیں۔"
"وہ تو سب جانتا ہے، آپ سے جھوٹ بول کر میں بچ بھی جاؤں تو خدا سے کیسے جھوٹ بول سکتی ہوں؟ وہ تو سب جانتا ہے ناں۔"
اسے حیرت کا جھٹکا لگا، پتا نہیں کیسی پاگل لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیاں بھی دنیا میں ہوتی ہیں۔
وہ سارا راستہ اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔
☆......☆
اس رات وہ اپنے بستر پہ یونہی لیٹا تھا جب وہ اس کے کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھوں میں دودھ کا ایک گلاس تھا وہ ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے اس کے لیے دودھ لانا نہیں بھولتی تھی وہ ایک مشرقی بیوی کے روپ میں بالکل پوری اترتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس لڑکی کو بالکل بھی سمجھ نہیں پاتا۔ وہ اس سے جتنی بدتمیزی سے بات کرتا یا کبھی کبھی غصے سے بات کرتا تو وہ جواباً خاموش ہو جاتی، دوسری بیویوں کی طرح لڑتی جھگڑتی بالکل بھی نہیں تھی لڑنا تو دور وہ کبھی اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرتی تھی۔
وہ اپنے دوستوں کی جب شکائتیں سنتا جو وہ اپنی اپنی بیویوں کے بارے میں کرتے تو حیران ہو جاتا کہ کون سی بیوی صحیح قسم کی ہے وہ ایک ان پڑھ جاہل گاؤں کی لڑکی یا وہ پڑھی لکھی ماڈرن لڑکیاں، جو اپنے شوہروں پہ حکومت کرتی تھیں۔ نہ کھانا بنانا نہ بچوں کو سنبھالنا، ہر وقت میک اپ سے لدے رہنا، ہنس ہنس کے ہر مرد سے باتیں کرنا، اسے اس قسم کی عورتیں کچھ عجیب لگتیں لیکن وہ اپنی زندگی میں ایک بہت مختلف لڑکی دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو اس نے آج تک کبھی نہیں دیکھی۔
ایک وہ بیویاں تھیں جو شوہروں کی ہر بات پہ اعتراض کرتی تھیں اور ایک یہ ہے اگر اس سے کہا جائے کہ رات سفید ہے تو یہ اپنے شوہر کی ہاں میں ہی ہاں ملائے گی۔ یہ لڑکی تو اپنے شوہر کو مجازی خدا سمجھتی تھی ہر بات ماننے والی ہر کام کرنے والی۔
ایک بار اس کے آفس کے ایک دوست نے اس سے پوچھا تھا، اسے کس قسم کی بیوی چاہیے۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اسے اب تک نہیں معلوم تھا کہ بیویوں کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔
اس نے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ دودھ پیتے ہوئے اسے مسلسل اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا اور وہ نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔ کتنی عجیب لڑکی تھی۔ کسی اور تو کیا، شوہر سے نگاہیں ملاتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ وہ پہلی بار اس کی اس ادا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔
اس لڑکی کے ساتھ رہتے ہوئے اسے تیس دن ہو چکے تھے اور ان تیس دنوں میں اس نے نوٹ کیا کہ وہ لڑکی جھوٹ کبھی نہیں بولتی، بنا مقصد بنا مطلب کوئی بات نہیں کرتی، نماز پابندی سے ادا کرتی اور کئی بار اس نے صبح صبح اسے قرآن پاک کی تلاوت کرتے بھی سنا۔
وہ اب نیچے فرش پہ اپنا بستر ڈال کر سو رہی تھی۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میرا حق ادا کرو۔ بیڈ پہ سونا میرا حق ہے۔ وہ ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے کوئی نہ کوئی عجیب سا ٹاپک پکڑ کر اس پہ سوالات کرتی تھی اور وہ بس ہوں ہاں میں یا کبھی کبھی تو اسے غصے سے بھی جھڑک دیتا تھا مگر وہ کبھی اس کے غصے پہ ناراض نہیں ہوتی تھی، کوئی شکوہ نہیں کرتی تھی۔
لیکن آج وہ خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اسے ہمیشہ رات کو اس لڑکی کی باتیں بہت بری لگتیں لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ اگر وہ لڑکی بات نہ کرتی تو وہ الجھن کا شکار ہو جاتا۔

اور آج بھی جب وہ بنا کوئی بات کیے سو رہی تھی تو اسے ایک عجیب کرب کا احساس ہوا۔

''سو رہی ہو تم؟'' پہلی بار اس نے خود سے اسے مخاطب کیا

''جی، کچھ چاہیے تھا آپ کو؟'' وہ ایک دم چاق و چوبند ہو کر کھڑی ہو گئی وہ اس طرح جلد بازی میں اس کے کھڑے ہونے پہ ہنس دیا۔

''نہیں وہ...... یہ تم ہمیشہ یہی کپڑے ہی کیوں پہنتی ہو؟'' اس نے بات شروع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب سوال کیا۔ اس نے غور سے اپنے کپڑوں کو دیکھا جو سادہ لان کے کپڑے تھے۔

''جی وہ باقی میلے تھے اس لیے۔'' اس نے حیران ہو کر جواب دیا۔

''کتنے جوڑے ہیں تمہارے۔''

''جی پانچ۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا جبکہ وہ حیران ہوا جس لڑکی کا شوہر لاکھوں کے حساب سے تنخواہ لیتا ہو اس کی بیوی کے پاس صرف پانچ سادہ لان کے کپڑے ہیں یہ بات اسے بہت عجیب لگی۔ اس کے خود ڈھیروں کپڑے تھے اور اس نے بھی بھی کچھ نہیں مانگا۔

''کیوں نہیں مانگا، اسے مانگنا چاہیے تھا۔ یہ اس کا حق تھا۔ وہ اس کا شو......''

''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' وہ دکھ سے پوچھ رہا تھا جبکہ سنبل نظریں جھکائے ہوئے تھی جیسے اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہو۔

''اچھا ٹھیک ہے، ہم کل چلیں گے شاپنگ پہ، پھر لے لینا اپنے لیے کپڑے اور بھی تمہیں جو کچھ چاہیے وہ بھی او کے۔''

''جی۔''

''اچھا اب سو جاؤ۔''

وہ سونے کے لیے لیٹ گئی اس نے لیمپ آف کر دیا۔

اب اسے بھی اچھی نیند آتی، وہ سابقہ تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ جب بھی وہ لڑکی اس سے بات نہیں کرتی اسے نیند بڑی دیر سے آتی ہے۔

رات تقریباً گزر چکی تھی دور سے کہیں مؤذن کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے سوتے سوتے محسوس کیا کہ کوئی اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ اقبال چونک کر اٹھ گیا۔ وہ اس کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

اسے اتنی صبح صبح اس کا چھونا بہت برا لگا۔ غصے کی شدید لہر اس کے جسم میں پیدا ہو گئی پورا جسم جیسے جلنے لگا ہو، وہ کمبل کو پرے دھکیل کر بالکل اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ سہمی ہوئی نگاہیں نیچے جھکا کر کھڑی تھی۔ اس کے دل میں اس وقت آگ لگی ہوئی تھی اسے نہیں پتا تھا کہ اسے اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے لیکن وہ مزید اپنے غصے پہ قابو نہیں رکھ سکا۔

'' تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی کیا سمجھتی ہو تم خود کو اور کیا سوچ کر تم نے مجھے ہاتھ لگایا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں میں تمہیں بیوی کا درجہ کبھی نہیں دے سکتا تو زبردستی میری زندگی میں گھسنے کی کوشش مت کرو، او کے۔ نہ تو میں تمہیں کبھی قبول کر سکتا ہوں اور نہ کبھی کروں گا۔ اس لیے یہ روایتی بیویوں والی حرکتیں کرنا بند کر دو۔''

''وہ چلا چلا کر بات کر رہا تھا، اندر کے لاوا کو باہر آنے کا راستہ مل چکا تھا۔ اس کا پارہ ایک دم چڑھ چکا تھا۔ وہ بدستور سر جھکائے کھڑی تھی، اس نے محسوس کیا اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔''

''گیٹ آؤٹ۔'' اس نے چلا کر کہا پھر اسے یاد آیا تھا وہ جاہل گنوار لڑکی انگلش نہیں سمجھ سکتی اس لیے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی اپنے کمرے سے باہر نکالا اور کنڈی لگا کر بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ کافی دیر بعد وہ جب خود کو نارمل کرنے میں تھوڑا کامیاب ہوا تو دوبارہ بستر پہ لیٹ گیا پھر جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

چھٹی کا دن تھا اس لیے اسے بیدار ہونے کی کوئی جلدی نہیں تھی لیکن دس بجے آلارم نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ سر میں ہلکے درد کا بھی احساس ہوا، صبح چھ بجے والا واقعہ ابھی بھی ذہن میں تازہ تھا۔

وہ نہا کر جب باہر نکلا تو ٹھٹک گیا۔ اس کی شرٹ بیڈ پہ آج نہیں تھی ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ نہا کر نکلا ہو اور بیڈ پہ شرٹ نہ ہو، اسے کچھ عجیب لگا اس نے الماری سے ایک شرٹ نکال کر پہن لی اور ناشتے کے لیے نیچے چلا گیا۔ ناشتے کے دوران دوسری حیرت اسے تب ہوئی جب اسے ٹیبل پہ ناشتا نظر نہیں آیا یہ بھی پہلی مرتبہ ہوا تھا ورنہ وہ ہمیشہ اس کے جاگتے ہی میز پہ ناشتا سجا دیا کرتی تھی۔

تو اس کا مطلب وہ ناراض ہے، اس نے سوچا۔

''ناراض ہے تو ہوتی رہے ناراض...... میں نے کیا کیا ہے۔''

"تو نے اچھا بھی تو نہیں کیا، کتنی بری طرح سے پیش آئے اس سے...... دل سے آواز آئی۔"

وہ کچن میں چلا گیا اور خود اپنے لیے ناشتا بنانے لگا پھر اسے یک دم محسوس ہوا کہ ناشتا بنانے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اتنے دنوں سے وہ اس کے ہاتھوں کا بنا ناشتا کھا رہا تھا، خود کھانا بنانے کی تو اس کی عادت ہی چھوٹ گئی۔ وہ بنا ناشتا بنائے کچن سے باہر نکل آیا۔

وہ یونہی صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ ایک سوچ جو پہلی بار اس کے ذہن میں آئی۔

وہ کہاں ہے؟ یہ سوچ کر وہ کھڑا ہو گیا اور گھر کے کمروں میں اسے تلاش کرنے لگا لیکن وہ اسے کہیں نہیں ملی۔ اس کی ٹینشن میں مزید اضافہ ہوا، وہ ایسے تڑپنے لگا جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکال دیا جائے۔

کہاں چلی گئی؟

وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

جہاں چلی گئی چلی گئی اس سے اسے کیا، وہ بھی کہاں اسے اس گھر میں چاہتا تھا، اچھا ہوا خود چلی گئی ویسے بھی کسی نہ کسی دن تو اسے جانا ہی تھا ناں؟

وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ سنبل چلی جائے لیکن آج جب وہ چلی گئی تو اقبال اس طرح پریشان کیوں تھا، وہ خوش کیوں نہیں تھا جبکہ اصولاً تو اسے بہت زیادہ خوش ہو جانا چاہیے تھا۔

کیا وہ اس لیے پریشان ہے کہ جب دادی واپس آئیں گی تو وہ اسے کیا جواب دے گا۔

نہیں نہیں دل سے فوراً آواز آئی۔ وہ دادی کے لیے نہیں خود اپنے لیے پریشان تھا مگر کیوں اس نے دل سے پوچھا؟

کیونکہ تم اس سے پیار کرنے لگے ہو، دل نے ایک عجیب انکشاف کر دیا۔ وہ گم صم ہو گیا۔ یہ کیا کہہ رہا تھا دل، وہ اس سے پیار کیسے کر سکتا ہے وہ تو اس سے نفرت کرتا ہے شدید نفرت، نہیں دل جھوٹ بول رہا ہے۔

اس نے دل کو جھٹلانے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہیں کر سکا کیونکہ دل جھوٹ نہیں سچ بول رہا تھا۔

ہاں ہاں میں اس سے پیار کرتا ہوں، بہت پیار مجھے صرف اس کی عادت نہیں ہو گئی۔ میں اس سے پیار بھی کرنے لگا ہوں مگر وہ کہاں ہے؟ اس نے چلا چلا کر پورے گھر سے پوچھا اور پورا گھر خاموش تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار گھر میں اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اسے پہلی بار گھر کی خاموشی ڈرا رہی تھی۔

اس پہ پہلی بار انکشاف ہوا وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ جسے اس کی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا وہ یہی لڑکی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی اس سے پیاری تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اتنی معصوم اتنی اچھی اسے جیون ساتھی کے روپ میں صرف یہی لڑکی چاہیے تھی اور تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی اس جیسی لڑکی دنیا میں کہیں نہیں ہے جو اس کے اتنے غصے کے باوجود خاموش رہے، جو اس کے جاگتے ہی ناشتا لگا دے۔ اس کے مانگنے سے پہلے اسے چائے پلا دے اتنی صابر اتنی قناعت والی لڑکی اور کہاں ہو گی واقعی اگر دادی اس پہ بھروسا کرتیں تھیں تو بالکل سہی کرتیں تھیں۔ وہ واقعی اپنے پوتے کے لیے سب سے اچھی بیوی ڈھونڈ لائی تھیں اگر وہ خود ان کی مرضی کے خلاف کسی ماڈرن لڑکی سے شادی کرتا تو کیا ہو جاتا۔ وہ لڑکی کیا گھر کے کام کرتی۔ کیا اس میں اتنا صبر ہوتا؟ کیا وہ اس کے اس طرح چلانے پہ خاموش ہوتی نہیں نہیں نہیں۔ وہ پہلی بار اس کی کہی ہوئی ساری باتیں یاد کر رہا تھا۔

کیا جی بیوٹی پارلر؟ یہ کیا ہوتا ہے؟

یہ ٹی وی کرنٹ تو نہیں مارتا جی؟

ہمارے گاؤں میں پہلے مرد کھانا کھاتے ہیں پھر عورت اس کا بچا ہوا کھاتی ہے۔

آپ کو گاڑی چلانا آتا ہے جی؟

یا اللہ مجھے اپنے گھر سے خالی ہاتھ مت لوٹائیں۔ میں آپ سے جو مانگ رہی ہوں وہ مجھے دے دیں۔

جی آپ کی وہ نیلی شرٹ جل گئی۔

آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں خدا سے تو نہیں۔

وہ تو سب جانتا ہے آپ سے جھوٹ بول کر میں بچ بھی جاؤں تو خدا سے کیسے جھوٹ بول سکتی ہوں۔

او میرے اللہ یہ میں نے کیا کر دیا، کیوں کر دیا۔ میں نے اس سے کتنی بدتمیزی سے بات کی، صبح مجھے کیوں اتنا غصہ آ گیا تھا حالانکہ اس نے ایسا بھی کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ صرف ہاتھ ہی تو لگایا تھا اور میں......

اور وہ اتنی اچھی تھی کہ اس نے کوئی شکوہ کوئی شکایت تک نہیں کی لیکن وہ کہاں چلی گئی۔

پلیز واپس آ جاؤ میں تمہیں پھر کچھ نہیں کہوں گا، ہم دونوں مل کر پیار محبت سے رہیں گے۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا لوٹ آؤ...... اسے اپنے گالوں پہ نمی کا احساس ہوا۔ وہ بھاگتے ہوئے پورچ میں گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے

اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔
گاڑی وہ فل اسپیڈ سے چلا رہا تھا۔ اتنے رش میں اتنے اسپیڈ سے گاڑی چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن وہ ہر خطرے سے انجان بس جلدی جلدی ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کئی بار اس کی گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی وہ ریلوے اسٹیشن کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا۔ گاڑی سے نکل کر وہ بھاگتے ہوئے اسٹیشن تک گیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا یا تو ابھی تک ریل گاڑی آئی ہی نہیں ہوگی یا پھر آ کر......

وہ بھاگ کر بینچ پہ بیٹھے اس انسان تک گیا جو پتا نہیں کن خیالوں میں گم تھا۔
ایکسکیوز می، جناب یہ ریل گاڑی کی ٹائمنگ کیا ہے۔
اس آدمی نے حواس باختہ مخاطب کو دیکھا۔
ابھی تھوڑی دیر پہلے ریل گاڑی تو نکل چکی ہے۔ اسے لگا جیسے وہ آدمی کہہ رہا ہو آپ کی تو جان نکل چکی ہے۔ اس کے جسم میں خون کی گردش اچانک رکنے لگی۔ وہ مایوس ساری دنیا سے بیزار گھر لوٹ آیا اور صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔
ایسے کیسے جاسکتی ہے وہ؟
مجھے چھوڑ کر وہ نہیں جاسکتی۔
اتنی معمولی غلطی کی اتنی بڑی سزا کون دیتا ہے۔
کیا سب کچھ ختم ہوگیا اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا گیا۔
وہ سر تھامے صوفے پہ بیٹھا تھا جب اسے اپنے بالکل پاس ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔
وہ اس کے بالکل پاس کھڑی تھی، اس سے کچھ ہی فاصلے پر وہ چونک کر کھڑا ہوگیا۔
”تم کہاں چلی گئی تھیں کیوں گئی تھیں تم؟“
”جی وہ ہم تو...... ہم تو یہیں تھے۔“ اس نے اس کی بات نہیں سنی اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا وہ اس طرح اس کے گلے لگانے سے حیران بھی تھی اور خوش بھی۔
اب آیندہ تم کبھی مجھے چھوڑ کر مت جانا اور کے جا ہے میں تمہیں جتنا ڈانٹوں، ہم سب کچھ پھر سے شروع کریں گے۔ تم ایک بار پھر سے دلہن بنوگی اور اس بار تمہیں کمرے سے باہر نکالنے کی بجائے بانہوں میں سمیٹ لوں گا۔
خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
وہ صبح اس کے منہ سے نکلنے والے شعلے سن کر تو ٹوٹ ہی گئی تھی۔ اسے لگا اب اس کی زندگی کا تو کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا سب کچھ ختم ہوگیا۔
وہ کمرے سے نکل کر اس کے برابر والے کمرے میں جا کر روتی رہی اور روتے روتے وہ کب سوگئی اسے پتا ہی نہیں چلا اس کی آنکھ تب کھلی جب کوئی اسے پکار رہا ہے وہ بھاگ کر کھڑکی تک گئی تو اس کے شوہر محترم جو صبح آگ برسا رہے تھے اب بڑی بے تابی سے اپنی زوجہ محترمہ کو ڈھونڈ رہے تھے اسے حیرت بھی ہوئی اور اچھا بھی لگا۔ وہ بہت دیر تک کھڑکی سے اس کی اداس شکل دیکھتی رہی پھر اس نے چلا چلا کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ان دیواروں کے سامنے اس گھر کے اندر لیکن وہ نہیں جانتا تھا جس کے لیے وہ اقرار کر رہا ہے وہ اس کے بہت قریب ہے۔
وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے پیار کرنے لگا ہے۔ وہ کئی بار اس کے چہرے پہ اپنے لیے محبت کا پیغام پڑھ چکی تھی لیکن وہ اقرار نہیں کر رہا تھا کیونکہ ابھی تک خود اس کے دل نے ہی اقرار نہیں کیا تھا۔
رات کو دو بجے اٹھ کر بریانی کھائی جاتی ہے جناب چوری چوری قیمہ اپنی پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگتے ہیں گاڑی میں بیٹھ کر چپکے چپکے اسے دیکھا جاتا ہے صرف اقرار کرنے میں ہی مشکل پیش آرہی تھی جناب کو...... اس کے منہ سے اپنے لیے محبت کا اقرار سن کر اسے بہت اچھا لگا۔
وہ اس وقت اس کے پاس جانا چاہتی تھی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے قریب ہے لیکن وہ نہیں گئی وہ اسے تنگ کرنا چاہتی تھی جس شوہر محترم نے اسے اتنے دن تنگ کیا وہ بھی اپنا بدلہ وصول کرنا چاہتی تھی۔
صبح وہ اس سے ناراض تھی روئی تھی لیکن اگر آج کی صبح وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو وہ کبھی اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا یہ تقدیر کا تب کا فیصلہ تھا جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے بے شک کوئی ہے جو ہماری ہر سوچ پہ اختیار رکھتا ہے اور ہمارے لیے بہتر فیصلے تجویز کرتا ہے وہی جو اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے یہ ساری دنیا جس کے ماتحت ہے وہی تو خدا ہے۔
اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا بے شک جوڑے وہی بناتا ہے آسمانوں پر وہ اپنے انسانوں میں کبھی فرق نہیں کرتا نہ دیہاتی اور شہری میں اور نہ ہی غریب اور امیر میں وہ سب کو دو آنکھیں دو کان دو ہاتھ اور دو پاؤں نواز کر بھیجتا ہے فرق تو صرف انسان کرتے ہیں۔

امانت

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم
میں نے پہلی بار یہ سچ بیانی تحریر کی ہے۔ اس میں میرے علم کے مطابق ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے ، لیکن یہ بھی بتا دوں کہ یہ واقعات میرے نہیں میرے ایک قریبی دوست کے ہیں۔ اسی نے اپنے واقعات یہ کہہ کر سنائے ہیں کہ اسے سرگزشت میں بھیج دوں لیکن میں نے تمام کرداروں کے نام بدل دیئے ہیں۔

اسلم فاروق
(لاہور)

میں رات ایک بجے کے قریب نائٹ شفٹ ختم کر کے گھر پہنچا تو نیلم کے کمرے میں روشنی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ بھائی ابھی نہیں آئے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح ان کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میرے دل میں نیلم کے لیے بیک وقت افسوس اور ہمدردی کے جذبات ابھرے لیکن میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ میاں بیوی کا معاملہ تھا اور میں اس میں دخل اندازی نہیں کرسکتا تھا اور یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں تھی۔ کئی دنوں سے بھائی نے اپنا یہ وتیرہ بنالیا تھا اور وہ اکثر رات کو دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ پہلے تو یہ سب یہی سمجھے کہ شاید دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے انہیں گھر آنے میں دیر ہو جاتی ہو۔ ان کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی اور وہ چالیس پینتالیس منٹ میں گھر پہنچ جاتے تھے پھر آہستہ آہستہ ان کی آمد میں تاخیر ہونے لگی اور وہ آٹھ نو بجے گھر آنے لگے۔ کبھی کبھی دس گیارہ بھی بج جاتے اور اب تو حد ہی ہوگئی۔ گھڑی کی سوئی ایک بجا رہی تھی اور ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔

نیلم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بھائی سے تاخیر سے آنے کی وجہ پوچھ سکتی۔ دراصل بھائی نے اسے پہلے دن سے پیر کی جوتی بنا کر رکھا ہوا تھا اور وہ اس کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتے۔ یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ وہ اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ گھر میں اس کا ذکر کرتے۔ امی نے ایک دن اچانک ہی اعلان کردیا کہ وہ نیلم کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ بھائی نے تو اس فیصلے کو ماننے سے انکار کردیا لیکن مجھ پر بھی یہ خبر بجلی بن کر گری۔ نیلم میری چچازاد ہونے کے علاوہ بچپن کی دوست بھی تھی اور ہم دونوں میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتی اور میں بھی اس سے کچھ نہیں چھپاتا تھا۔

ہم دونوں جوانی کی حدود میں داخل ہوئے تو ہمارے درمیان خود بخود چاہت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ سو یہی حال ہمارا بھی تھا۔ گو کہ دل کی بات کبھی زبان پر نہیں آئی لیکن میں نے نیلم کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک دیکھ لی تھی اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ نیلم ہی میری شریکِ سفر بنے گی۔ میں نے ماس کمیونی کیشنز میں ماسٹرز کرنے کے بعد ایک اخبار میں ملازمت کرلی تھی اور وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد گھرداری کے کاموں میں چچی کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میں انتظار میں تھا کہ بھائی کی شادی ہوجائے تو امی سے نیلم کی بات کروں۔

بھائی کے انکار کے بعد گھر کا ماحول خاصا کشیدہ ہوگیا جب ان سے انکار کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کھل کر کہہ دیا کہ وہ اپنی کلاس فیلو نورین سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ امی اور بابا اس کے حق میں نہیں تھے کیونکہ ہمارے یہاں برادری سے باہر شادی نہیں ہوتی۔ یہی بات بھائی کو بھی سمجھائی گئی لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ بابا بھی ضد کے پکے تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر بھائی نے نیلم سے شادی نہ کی تو وہ انہیں جائیداد سے عاق کردیں گے اور ساری عمر ان کی شکل نہیں دیکھیں گے۔ بابا کی ابھی خاصی جائیداد تھی جس کے ہم دونوں بھائی ہی وارث تھے۔ بھائی کا عشق لیلیٰ

مجنوں یا شیریں فرہاد جیسا نہ تھا کہ وہ ایک عام لڑکی کی خاطر اپنے حصے کی جائیداد قربان کر دیتے۔ ان کی مالی حیثیت بھی اتنی مستحکم نہ تھی اور وہ ایک معمولی درجہ کی ملازمت کر رہے تھے چنانچہ انہوں نے طوعاً و کرہاً ماں باپ کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا اور یوں نیلم بھابی بن کر ہمارے گھر آ گئی۔

میرے لیے وہ بڑے ہی اذیت ناک دن تھے۔ اپنے گھر میں محبوبہ کو بھابی کے روپ میں دیکھنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ اگر وہ بیاہ کر کسی دوسرے گھر چلی جاتی تو میں کچھ دن رو پیٹ کر صبر کر لیتا لیکن بھابی بننے کے بعد تو وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ گو کہ میں حتی الامکان اس کے سامنے آنے سے گریز کرتا لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔ شروع شروع میں مجھے اس کی آنکھوں میں شکایت کی پرچھائیاں نظر آئیں جیسے وہ مجھے ہی اس شادی کا ذمے دار سمجھ رہی ہو۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اگر میں پہلے ہی گھر والوں کے سامنے اپنی پسند کا اظہار کر دیتا تو وہ بھائی کی بجائے میری بیوی بن سکتی تھی لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ بڑے بھائی کی شادی سے پہلے میں کس طرح یہ بات کہہ سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ ہم دونوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی لیکن ہمارے درمیان روایتی دیور بھابی جیسا تعلق نہیں تھا بلکہ ہم ایک ہی چھت تلے اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ میری اخبار کی نوکری تھی اس لیے زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا پہلے میں رپورٹنگ میں تھا اس لیے شام تک واپسی ہو جاتی تھی لیکن نیلم کے آنے کے بعد میں نے اپنی ڈیوٹی ڈسک پر لگوائی اور نائٹ شفٹ میں چلا گیا اب میں صبح دس گیارہ بجے گھر سے نکلتا اور واپسی رات گئے ہوتی۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ رات کو صرف سونے کے لیے گھر آؤں۔ اس لیے ڈیوٹی کے علاوہ باقی وقت اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزار دیتا۔ اس طرح نیلم سے میرا برائے نام ہی سامنا ہوتا۔ اس کے باوجود میں اس کے حالات سے لاعلم نہیں تھا۔

بھائی کا رویہ پہلے دن سے ہی اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ بند کمرے میں وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہوں گے لیکن دوسرے لوگوں کی موجودگی میں بھی وہ اس سے بہت بری طرح پیش آتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ ڈپٹ، بھڑکنا، چیخنا چلانا اور غصہ کرنا روز کا معمول تھا۔ میں جس نیلم کو جانتا تھا وہ ایک شوخ چنچل اور ہنستی مسکراتی باتونی لڑکی تھی لیکن اب اس کی جگہ ایک خوفزدہ

اور سہمی ہوئی عورت نے لے لی تھی، ہنسنا اور قہقہے لگانا تو دور کی بات اس کے چہرے سے مسکراہٹ ہی غائب ہو چکی تھی۔

نیلم کے ساتھ بھائی کا ناروا سلوک دیکھ کر امی نے بھی اپنا رنگ بدل لیا۔ حالانکہ وہ بڑے چاؤ سے اسے بیاہ کر لائی تھی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ بھی روایتی ساس بن گئیں۔ بظاہر ان کا رویہ مشفقانہ تھا لیکن اندر ہی اندر وہ بھی نیلم کو کچوکے دیا کرتیں۔ پہلے امی خود کھانا بناتی تھیں اور اوپر کے کاموں کے لیے ماسی رکھی ہوئی تھی۔ نیلم کے آنے کے بعد انہوں نے کھانا پکانے کی ذمہ داری اسے سونپ دی اور خود فارغ ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے ماسی کے کام میں کیڑے نکالنا شروع کر دیے جس کے نتیجے میں وہ کام چھوڑ کر چلی گئی۔ دوسری ماسی آئی لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہ رک سکی پھر یہ سلسلہ چل نکلا جو بھی ماسی آئی۔ وہ امی کے ناقابلِ برداشت رویہ سے گھبرا کر چند ہفتوں یا مہینوں میں چلی جاتی اور اس کے حصے کا کام بھی نیلم کو ہی کرنا پڑتا۔

نیلم کی حالت نوکرانیوں سے بھی بدتر تھی۔ گھریلو ملازمہ کے مخصوص اوقات کار ہوتے ہیں اور وہ ہفتہ میں ایک چھٹی بھی کرتی ہے لیکن نیلم کو ایسی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ اس کی ڈیوٹی فجر کی نماز کے بعد شروع ہوتی اور وہ رات گئے گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ صبح کے دو گھنٹے شوہر کی ناز برداری میں گزر جاتے۔ بھائی کو اتنی توفیق بھی نہیں تھی کہ الماری سے اپنے پہننے کے لیے کپڑے ہی نکال لیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے حکم چلاتے۔ ''فلاں کپڑے استری کر دو۔'' پھر وہ ان کے جوتے پالش کرتی اور جب وہ نہانے چلے جاتے تو کچن میں آ کر ناشتا تیار کرتی۔ اس دوران بھی اسے بار بار آوازیں پڑتیں۔ ''میرا بٹوہ کہاں ہے؟ چشمہ نہیں مل رہا۔ کہاں چلی گئی؟'' وغیرہ وغیرہ۔ نیلم کا ایک پاؤں کچن تو دوسرا کمرا میں ہوتا۔ ساتھ ساتھ اسے جھڑکیاں بھی پڑتی رہتیں۔ بھائی کی شکایتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ کبھی استری ٹھیک نہ ہونے کی شکایت تو کبھی چائے ٹھنڈی ہونے کی۔ بھائی کو تو بس ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا بہانہ چاہیے تھا اور نیلم بے چاری سر جھکائے یہ سب سہتی رہتی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرتی رہتی اور ایک ہی سوال مچلتا جیسے کہہ رہی ہو۔ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے اگر نورین سے تمہاری شادی نہیں ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں یا میرے گھر والوں نے تو تمہیں اس شادی پر مجبور نہیں کیا تھا لیکن وہ یہ سب باتیں زبان سے نہیں کہہ سکتی تھی ورنہ اس کی شامت آ جاتی۔ بس دل ہی دل میں گھٹتی رہتی۔

نیلم اس گھر میں عملاً ایک قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بھائی کو تو کبھی اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جاتے۔ یہاں تک کہ اس کا میکے جانا بھی امی کو ناگوار گزرتا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ شادی کے بعد ایک مرتبہ بھی دو چار دن کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہو۔ وہ ہفتہ دو ہفتہ بعد اپنے سارے کام نمٹا کر دوپہر میں جاتی اور شام کو بھائی اسے اپنے ساتھ واپس لے آتے، اس پر بھی امی کا منہ بن جاتا۔

کبھی کبھی میں سوچتا کہ نیلم کو اس حال تک پہنچانے کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر میں ہمت کر کے امی سے کہہ دیتا کہ نیلم کی شادی مجھ سے ہو گی کیونکہ میں اسے چاہتا ہوں تو اس کی زندگی برباد ہونے سے بچ جاتی لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ امی کبھی نہ مانتیں بلکہ الٹا مجھے ہی برا بھلا کہا جاتا اور بھائی کے دل میں بھی میری طرف سے شک پڑ جاتا۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ نیلم کی قسمت میں یہی لکھا تھا اور وہ اپنے حصے کی سزا بھگت رہی تھی۔

میں اس کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا لیکن اس کے لیے دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن نیلم کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ بھائی نے دیر سے گھر آنا شروع کر دیا جس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ بھائی دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد کہیں اور جانے لگے ہیں۔ مجھے ان کے مالی حالات کا علم تھا۔ وہ کوئی تفریح افورڈ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی ایسا قریبی دوست تھا جس کے ساتھ وہ رات کو دیر تک گھومتے رہتے۔ بس ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پھنس گئے ہیں اور شام کا بیشتر وقت اسی کے ساتھ گزارتے ہیں اور شاید نیلم بھی یہی سمجھ رہی تھی۔

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنی زندگی میں کسی دوسری عورت کا وجود اسے گوارہ نہیں۔ شاید اسی لیے اس کے چہرے کی سنجیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ اداس اور غمگین نظر آنے لگی تھی۔

نیلم کے کمرے کی لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ میں پانی پینے کے ارادہ سے باہر آیا تو مجھے اس کے کمرے سے کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی اور دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں فریج کی طرف بڑھنے لگا کہ نیلم کی آواز نے میرے قدم روک لیے وہ کہہ رہی تھی۔

”کھانا لگاؤں؟“

”نہیں۔“ بھائی کی کرخت آواز گونجی۔

”اچھا۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔”میں نے تو آپ کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“

”بہت احسان کیا مجھ پر۔“ بھائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔”مجھے یہ چونچلے پسند نہیں تم کھانا کھالیا کرو۔“

”آج تو بہت دیر کردی آپ نے؟“ نیلم نے خالص بیویوں والے انداز میں کہا۔

”ذلیل عورت مجھ سے سوال جواب کرتی ہے۔“ بھائی نے اس کے بال پکڑتے ہوئے کہا۔”آیندہ اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو زبان کھینچ لوں گا۔“

نیلم روتے ہوئے بولی۔”آپ مجھ سے اس طرح کیوں پیش آتے ہیں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟“

”تجھے مجھ پر مسلط کیا گیا ہے اور یہی تیرا سب سے بڑا جرم ہے۔ جس کی سزا ساری عمر بھگتنا ہوگی۔ میں تجھے کبھی اپنی بیوی تسلیم نہیں کرسکتا۔“

یہ سن کر میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا شوہر اسے بیوی ماننے سے انکار کردے۔ جی میں آیا کہ اسی وقت بھائی سے جا کر کہوں کہ وہ نیلم کو آزاد کردیں۔ میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ کوئی فلمی سچویشن نہیں بلکہ حقیقی زندگی کا منظر تھا۔ اگر میں ایسی بات منہ سے نکالتا تو قیامت برپا ہو جاتی۔ صرف بھائی ہی میرا دشمن نہ بنتا بلکہ نیلم کی زندگی بھی عذاب ہوجاتی۔

میری نیند غائب ہوچکی تھی۔ وہ رات میں نے کروٹیں بدلتے اور نیلم کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دی۔ میرے ذہن کی سوئی ایک ہی نکتے پر آن کر اٹک گئی تھی کہ بھائی کسی عورت کے چکر میں پھنس گئے ہیں اور ان کے دیر سے گھر آنے کی یہی وجہ ہے۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ صحافی کسی جاسوس سے کم نہیں ہوتے اور خاص طور پر کسی رپورٹر کے لیے معلومات حاصل کرنا تو بہت ہی آسان ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر واقعی یہ کسی عورت کا معاملہ ہے تو میں اس کا کھوج لگا کر ہی دم لوں گا۔

دوسرے دن میں نے ایڈیٹر سے درخواست کر کے دوبارہ رپورٹر کی ڈیوٹی سنبھال لی وہ خود بھی یہی چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رپورٹر کے کام میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں دفتر جانے کی پابندی سے آزاد ہوگیا۔ اس طرح میں باہر رہ کر بھائی کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔

بھائی وقت مقررہ پر دفتر سے نکلے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیئے۔ میں نے بھی کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب شروع کردیا۔ میں نے چونکہ ہیلمٹ پہن رکھا تھا اس لیے وہ بیک مرر میں میری شکل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی گاڑی کا رخ گھر کی طرف نہیں بلکہ وہ کہیں اور جارہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اُن کی کار گلشن اقبال میں واقع ایک مکان کے گیٹ پر رکی۔ ہارن دینے پر ایک لڑکی باہر آئی اور ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی میرا پہلا شبہہ درست ثابت ہوا۔ وہ واقعی کسی عورت کے چکر میں تھے۔

اب ان کی کار کا رخ سی ویو کی طرف تھا۔ وہاں پہنچ کر بھائی نے گاڑی ایک کنارے کھڑی کی اور وہ دونوں کار سے باہر آگئے۔ میں بھی ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے ذرا قریب سے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ خاصی قبول صورت تھی لیکن نیلم سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ نیلم اس سے کہیں زیادہ پُرکشش اور حسین تھی۔ اس لڑکی نے جدید فیشن کا لباس پہن رکھا تھا اور گہرے میک اپ سے اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کی تھی، بھائی اس کی ایک ایک ادا پر فدا ہورہے تھے اور وہ بھی کسی نئی نویلی دلہن کی طرح نخرے دکھا رہی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ رک کر کولڈ ڈرنک اور اسنیکس لیے اور ساحل پر چہل قدمی کرنے لگے۔ میں نے انتہائی محتاط طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے موبائل سے ان کی کچھ تصویریں بنا لیں جن میں اس لڑکی کی سولو پکچرز بھی تھیں۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے سی ویو پر گزارنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔ میں دیکھنا جا رہا تھا کہ بھائی اس لڑکی کو گھر چھوڑنے جاتے ہیں یا اس کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارنے کا ارادہ ہے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی ایک ریستوران کے سامنے رکی اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ جب تک وہ مجھے نزدیک سے نہیں دیکھیں گے پہچان نہیں سکیں گے کیونکہ میں نے ایک دوست کا دیا تحفہ استعمال کرلیا تھا۔ صبح صبح وہ مجھے اجرک اور ٹوپی دے گیا تھا۔ بائیک سے اترتے ہی میں نے سر پر ٹوپی اور کندھے پر اجرک ڈال لیا تھا۔ سفید شلوار قمیص پر وہ کھل رہا تھا۔ دیکھنے والے مجھے اندرون سندھ کا سمجھ رہے ہوں گے۔ اس لیے بلا جھجک میں نے ان کی تقلید کی۔ وہاں کا ماحول بے حد رومانی تھا۔ ہال میں ہلکی ہلکی

موسیقی گونج رہی تھی اور جوڑے سرگوشیوں میں گفتگو کررہے تھے۔ انہوں نے ہال کے آخری کونے میں ایک میز کا انتخاب کیا، خوش قسمتی سے مجھے بھی ان کے عقب میں جگہ مل گئی اور میں ایک ایسی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت ان کے پیچھے تھی۔ اس طرح وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے، البتہ میں ان دونوں کی باتیں سن سکتا تھا۔

بھائی نے بیرے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ لڑکی بولی۔ ''نوید! آخر ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے؟''

''نورین! مجھے کچھ وقت دو، تم جانتی ہو کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ دوسری شادی کے لیے مجھے پہلی بیوی سے اجازت لینا ہوگی۔''

نورین کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی تو شادی ہو چکی تھی پھر وہ یہاں کیسے آ گئی۔ میں فی الوقت اس مسئلے پر سوچ بچار نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ میرے لیے ان کی گفتگو سننا اہم تھا۔

''نوید! یہ تمہارا مسئلہ ہے اور تمہیں ہی اسے ہینڈل کرنا ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتی تو اسے چھوڑ دو۔''

''ناممکن! وہ میرے چچا کی بیٹی ہے، اگر میں نے طلاق کا لفظ بھی منہ سے نکالا تو بابا مجھے گھر سے نکال دیں گے اور میں جائیداد میں اپنے حصہ سے محروم ہو جاؤں گا۔''

''پھر ایک کام کرو۔'' نورین نے کہا۔ ''تم اپنے باپ سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہیں جائیداد میں سے حصہ دے دیں۔ ان سے کہو کہ ملازمت میں تمہارا گزارہ نہیں ہو رہا۔ اس لیے تم کوئی کاروبار کرنا چاہ رہے ہو جس کے لیے سرمایہ کی کمی آڑے آ رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ مان جائیں گے۔ آخر ان کے مرنے کے بعد بھی جائیداد کا بٹوارہ ہونا ہی ہے۔''

مجھ میں اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں تھی۔ ویسے بھی میں جو کچھ جاننا چاہ رہا تھا وہ معلوم ہو گیا۔ بھائی نورین کی محبت میں اتنا آگے چلے گئے تھے کہ وہ نیلم جیسی نیک اور شریف عورت کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے، میں نے تہیہ کر لیا کہ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا لیکن پہلے مجھے نورین کا حدود اربعہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کہاں سے ٹپک پڑی۔

دوسرے روز میں نے ایک ساتھی رپورٹر شیریں کو اعتماد میں لے کر اسے نورین کے بارے میں بتایا اور اس کے گھر کا پتا اور تصویر دے کر اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔ شیریں میری بہت اچھی دوست تھی اور میں نے بھی کئی معاملات میں اس کی مدد کی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے اور بہانے بہانے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ میری توقع سے بڑھ کر نتائج دے گی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک سیلز گرل کے روپ میں نورین کے گھر گئی اور پانی پینے کے بہانے اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں نورین کی بڑی سی پورٹریٹ دیکھ کر وہ چونک پڑی جس میں وہ ایک ماڈل کی طرح پوز بنائے کھڑی تھی۔ اس نے نورین سے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ ماڈلنگ کرتی ہے؟

''ہاں۔'' نورین نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''صرف ماڈلنگ ہی نہیں بلکہ ایکٹنگ بھی کرتی ہوں۔ لیکن ابھی ابتداء ہے۔ میں انڈسٹری میں قدم جمانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہوں۔''

شیریں نے کہا۔ ''میں ایک شوبزنس میگزین کے لیے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر بھی کام کرتی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس پرچے میں آپ کا انٹرویو اور فوٹو شوٹ لگوا سکتی ہوں۔''

''ضرور کیوں نہیں۔'' نورین خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ جب چاہیں میرا انٹرویو کر سکتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں ایڈیٹر سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گی۔ آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں تاکہ آپ سے رابطہ کر سکوں۔''

اس طرح شیریں نے نورین سے اس کا موبائل نمبر لے لیا اور باتوں باتوں میں اس کا پس منظر بھی معلوم کر لیا۔ نورین نے بتایا کہ اس کی شادی برادری میں ہوئی تھی اور وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی لیکن شوہر سے اس کی نہ نبھ سکی۔ دونوں کے لائف اسٹائل میں بہت فرق تھا۔ وہ شروع سے جدید طرز زندگی کی عادی تھی۔ اچھا لباس، فیشن، میک اپ، سیر و تفریح اور مردوں سے بے حجابانہ تعلقات جب کہ شوہر اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ سادہ لباس پہنتا سادہ غذا کھاتا اور دفتر سے آ کر گھر میں بند ہو جاتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی اسے ہوٹلوں میں جانے کا شوق تھا۔ چھ مہینے میں ہی نورین اس طرز زندگی سے اکتا گئی اور دونوں میں جھگڑے ہونے لگے جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا اور وہ شادی کے ایک سال بعد ہی میکے واپس آ گئی۔

وہ شروع سے ہی آزاد خیال اور بے باک واقع ہوئی تھی۔ مردوں سے دوستی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ

تھی کہ وہ آئے دن دوست بدلتی رہتی تھی۔ شوہر سے طلاق کے بعد وہ بالکل ہی آزاد ہوگئی اور گھر والوں کی طرف سے بھی اس پر کوئی روک ٹوک نہ رہی۔ اسی دوران اس کی دوستی ایک کمرشل فوٹوگرافر سے ہوگئی جس نے اسے ماڈل کے طور پر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں متعارف کروایا اور اسے اکا دکا اشتہار ملنے لگے۔ اس کے علاوہ وہ ٹی وی ڈراموں میں بھی کام حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن تاحال کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب شیریں نے اس کا انٹرویو لینے کی فرمائش کی تو وہ فوراً راضی ہوگئی کیونکہ اس انٹرویو کے شائع ہونے کے بعد وہ پروڈیوسرز کی نظروں میں آسکتی تھی۔

شیریں نے مجھے تمام صورت حال بتائی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ نورین کا انٹرویو ضرور کرے بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ فوٹوگرافر کے طور پر لے جائے۔ اس کا فوٹوشوٹ میں کروں گا۔

شیریں نے نورین کو فون کر کے انٹرویو کا وقت طے کیا اور ہم دونوں اس کے گھر پہنچ گئے۔ شیریں نے شاید اسے فوٹو سیشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اسی لیے وہ بنی سنوری ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے شیریں سے کہا کہ پہلے وہ انٹرویو کرے کیونکہ مجھے تصویریں بنانے میں وقت لگے گا۔ چنانچہ شیریں نے اپنا کام شروع کر دیا اور میں خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ نورین سے عام روایتی سوالات کر رہی تھی اور میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کیونکہ یہ ایک فرضی انٹرویو تھا جو کہیں شائع نہ ہوتا اور ہم نے صرف نورین کا حدود اربعہ جاننے کے لیے یہ ڈراما رچایا تھا۔ آخر میں شیریں نے ایک غیر متوقع سوال کر کے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "کیا تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے۔"

"نہیں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں سنگل ہوں۔"

اس کے سفید جھوٹ پر میں حیران رہ گیا۔ ایک طرف وہ میرے بھائی سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھی اور دوسری جانب اپنے سنگل ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا۔ کیا وہ بھائی کو بھی بے وقوف بنا رہی تھی۔

انٹرویو ختم ہونے کے بعد شیریں نے کہا کہ اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ لہٰذا وہ میرے انتظار میں نہیں رک سکتی۔ اس کے جانے کے بعد میں اور نورین تنہا رہ گئے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس کی نظروں کا مفہوم بھانپتے ہوئے بولا۔ "مس نورین! اگر آپ چاہتی ہیں کہ یہ فوٹوشوٹ دھوم مچا دے تو آپ کو میرے ساتھ پورا تعاون کرنا ہوگا۔"

وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "میں ہر طرح سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "سب سے پہلے آپ کو اپنا لباس تبدیل کرنا ہوگا، اپنی وارڈ روب میں سے ایسے ڈریسز کا انتخاب کریں جن میں آپ کے جسمانی خطوط پوری طرح نمایاں ہو جائیں۔"

"اوہ آئی سی۔" وہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ "اس سلسلے میں آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔"

وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ میں اس کی وارڈ روب دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عام گھریلو عورت کی بجائے کسی اداکارہ یا ماڈل کی وارڈ روب لگ رہی تھی جس میں ہر رنگ، ڈیزائن اور فیشن کا لباس موجود تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے وہ ملبوسات بستر پر پھیلانا شروع کیے تو میں بھی پریشان ہوگیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کروں، مجبوراً مجھے کہنا پڑا۔ "ان میں سے آپ کو جو بھی پسند ہو وہی پہن لیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہر لباس میں پُرکشش نظر آئیں گی۔"

اس نے اپنے سراپا پر فخریہ انداز میں نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں کوشش کروں گی کہ آپ کے معیار پر پوری اتر سکوں۔ آپ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔"

اس نے تیار ہونے میں آدھ گھنٹا لگا دیا۔ سرخ رنگ کی کرتی اور سفید ٹراؤزر میں اس کا انگ انگ بول رہا تھا۔ اس نے پہلا پوز ہی اتنے بے باک انداز میں دیا کہ میرے لیے اسے نظر بھر کر دیکھنا مشکل ہوگیا۔ اس نے میری ہدایات کے مطابق دو تین پوز دیے اور لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

اس بار اس نے ساڑی کا انتخاب کیا، جس کا مختصر سلیولیس بلاؤز نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ پوز دیتے وقت ساڑی کا پلو ڈھلکا دیتی جس سے اس کے جسم کا بالائی حصہ عریاں ہو جاتا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے نورین نہیں بلکہ کوئی آوارہ عورت ہے۔ مجھے اس سے کراہیت محسوس ہونے لگی۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہ ڈراما ختم کر کے فوراً چلا جاؤں

لیکن مجھے اپنا مشن بھی پورا کرنا تھا۔ اس لیے طوعاً و کرہاً اس کی حرکتیں برداشت کرنا پڑیں۔

یہ سلسلہ تین چار گھنٹے چلتا رہا۔ اس دوران اس نے چھ سات لباس تبدیل کیے اور کئی تصویریں بنوائیں۔ کام ختم ہونے پر میں نے اجازت چاہی تو وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''میں کھانا کھائے بغیر آپ کو نہیں جانے دوں گی۔''

''معذرت چاہوں گا۔ مجھے ایک اور جگہ جانا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہوگئی ہے۔''

''اچھا چائے تو پی لیں۔''

میں خاموش ہوگیا۔ وہ پانچ منٹ میں آنے کا کہہ کر چلی گئی اور میں آیندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا مقصد اس وقت حاصل ہوتا جب نورین، بھائی کا پیچھا چھوڑ دیتی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے کسی دوسرے راستے پر لگا دیا جائے لیکن ابھی تک میں اس راستے کا تعین نہیں کرسکا تھا لیکن یہ مشکل بھی نورین نے ہی آسان کردی۔

وہ چائے کے ساتھ لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی بھی لے آئی تھی۔ وہ میرے برابر میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور میری طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''شروع ہو جائیں۔''

میں نے پلیٹ واپس ٹرالی میں رکھ دی اور بولا۔ ''اس وقت میرا کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ بس چائے ہی کافی ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا پھر میرے لیے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔ ''چینی کتنی؟''

''ایک چمچہ۔''

اس نے چائے کا کپ مجھے تھمایا تو اس کی انگلیاں میرے ہاتھ سے مس ہوگئیں۔ اس نے ایک بسکٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس انٹرویو اور تصویروں کی اشاعت سے مجھے کوئی فائدہ ہوگا؟''

''کیسا فائدہ؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''اوہو، آپ بھی بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔'' اس نے ایک ادا سے کہا۔ ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کرنا چاہتی ہوں لیکن ابھی تک کوئی چانس نہیں ملا۔''

''حیرت ہے۔ آپ جیسی پُرکشش اور حسین لڑکی پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی۔''

''تعریف کا شکریہ۔'' وہ میری طرف کھسکتے ہوئے بولی۔ ''کوئی ترکیب بتائیں کہ میں لوگوں کی نظروں میں آجاؤں۔''

''دیکھیے محترمہ! آج کل تعلقات کے بل بوتے پر کام ہوتے ہیں۔ آپ بھی اپنے تعلقات بڑھائیں۔ پروڈکشن ہاؤس کے چکر لگائیں۔ تقریبات اور پارٹیوں میں بن بلائی مہمان بن کر پہنچ جائیں اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کی کوشش کریں۔ اُمید ہے کہ جلد ہی آپ کا کام بن جائے گا۔''

میں چاہ رہا تھا کہ وہ ان مصروفیات میں الجھ کر بھائی کا پیچھا چھوڑ دے لیکن پھر بھی میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا۔ ''آپ نے شیریں کو انٹرویو دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے، آپ کو آیندہ بھی یہ خیال رکھنا ہوگا کہ کسی کے ساتھ اسکینڈل نہ بننے پائے ورنہ آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔''

وہ میرے اور قریب آگئی۔ اب اس کا گداز جسم مجھ سے مس ہو رہا تھا۔ وہ میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے بھی تو شوبز کے لوگوں سے تعلقات ہوں گے کیا آپ کسی سے میری سفارش نہیں کرسکتے؟''

میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب مجھے اجازت دیں، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''کسی سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔''

رات کو میں دیر تک نورین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس سے ملنے کے بعد یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ وہ انتہائی مطلبی اور خودغرض عورت ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ جس طرح مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ اس سے اس کے آوارہ پن کا اظہار ہو رہا تھا۔ اگر میں ذرا سی بھی حوصلہ افزائی کرتا تو وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں گر جاتی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر وہ اداکارہ بننے کی خواہش مند تھی تو پھر بھائی پر ڈورے ڈالنے کا کیا مقصد تھا۔ یقیناً بھائی سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتی تھی اور اس کا اداکارہ بننے کا خواب ادھورا رہ جاتا۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی

نظریں بھائی کے پیسے پر تھیں اور اسی لیے اس نے انہیں جائیداد سے اپنا حصہ مانگنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ مجھے نورین کی مدد کرنی چاہیے۔ ایک دفعہ وہ اس چکر میں پھنس گئی تو وہ خود بخود بھائی سے دور ہوتی چلی جائے گی۔ ایک کام تو میں نے یہ کیا کہ اخبار کے دفتر میں جس تقریب کا دعوت نامہ آتا، میں اس کی اطلاع نورین کو دے دیتا اور وہ بن ٹھن کر وہاں پہنچ جاتی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بھائی سے اس کی ملاقاتوں میں وقفہ آنے لگا۔ وہ خوش تھی کہ اس طرح اسے شوبزنس کے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کا موقع مل رہا ہے۔ البتہ جس روز وہ فارغ ہوتی تو وہ شام بھائی کے ساتھ ہی گزارتی۔ میں سائے کی طرح ان دونوں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ البتہ ان کا تعاقب کرتے وقت اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتا۔ میں نے گھنگریالے بالوں والی ایک وگ اور نقلی مونچھیں خرید لی تھیں۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی مجھے دیکھ لیتا تب بھی نہ پہچان پاتا اس کے ساتھ ہی میں نے دوران تعاقب آلہ سماعت بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ کچھ فاصلے سے بھی ان کی گفتگو سن سکوں۔

میرا دوست شعیب ایک پروڈکشن ہاؤس میں معاون پروڈیوسر کے طور پر کام کرتا تھا اس سے میری کوئی خاص دوستی نہیں بس تھوڑی بہت جان پہچان تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ شاید وہ نورین کی کچھ مدد کر سکے۔ میں چاہ رہا تھا کہ ایک مرتبہ نورین پروڈکشن ہاؤس والوں کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ اسے اتنا گھمائیں گے کہ بھائی کا نام لینا بھول جائے گی۔ میں نے اسے فون کر کے نورین کے بارے میں بتایا اور اس کی پُرزور سفارش کی اس نے کہا۔ ”لڑکی کی تصویریں بھیج دو۔ انہیں دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔“

میں نے یہ بات نورین کو بتائی تو وہ اس پر تیار ہو گئی اور میں نے اس کی کچھ تصویریں شعیب کو بھیج دیں۔ دو دن بعد اس کا فون آ گیا کہ لڑکی کو بھیج دو۔ وہ اسے پروڈیوسر سے ملوانا چاہتا ہے۔ میرے بتائے ہوئے پتے پر نورین پروڈکشن ہاؤس چلی گئی جہاں اس کا اسکرین ٹیسٹ لیا گیا اور پروڈیوسر نے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ عنقریب ایک نئی سیریل شروع کرنے والا ہے اور اگر اس میں نورین کے مطلب کا کوئی کردار ہوا تو وہ ضرور اسے موقع دے گا۔

یہ سن کر نورین خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اس کے خوابوں کی تعبیر ملنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اس نے فوراً یہ خوش خبری مجھے سنائی۔ وہ میری احسان مند تھی اور اس خوشی میں مجھے ٹریٹ دینا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ پروڈیوسر نے اس کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ دی ہے۔ ورنہ اس وقت بھی اس کی دو سیریلز سیٹ پر ہیں۔ وہ اگر چاہتا تو کسی ایک میں نورین کو چانس دے سکتا تھا لیکن میں اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب اس کا کنٹریکٹ سائن ہو جائے تو میں ضرور اس کی خوشی میں شریک ہو جاؤں گا۔

اس کے بعد نورین نے ہر دوسرے تیسرے روز شعیب کو فون کرنا شروع کر دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ پروڈیوسر اپنی نئی سیریل کب شروع کر رہا ہے۔ شعیب سمجھ گیا کہ لڑکی پاگل پن کی حد تک ڈراموں میں کام کرنے کی خواہش مند ہے چنانچہ اس نے ایک نیا کھیل کھیلا اور نورین سے کہا کہ آج کل مقابلہ بہت سخت ہو گیا ہے اور پروڈیوسر صرف انہی آرٹسٹوں کو کاسٹ کرتے ہیں جن کی مارکیٹ میں ڈیمانڈ ہو یا پھر ان لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ان کی پروڈکشن میں سرمایہ کاری کر سکیں۔ شعیب نے نورین سے کہا کہ اگر وہ سرمایہ کا بندوبست کرے تو وہ اپنے ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کر سکتی ہے۔ سیریل کی تیاری اور اسے فروخت کرنے کی ذمے داری شعیب کی ہو گی اور وہ منافع میں برابر کا شریک ہو گا۔

نورین کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوچا کہ پروڈیوسروں کے پیچھے بھاگنے سے بہتر ہے کہ اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولا جائے۔ اس طرح اس کی ہیروئن بننے کی خواہش پوری ہو جائے اور آمدنی کا ایک ذریعہ بھی بن جائے گا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے نہیں سوچا کہ اس کام کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ اسے بس یہ اطمینان تھا کہ سب کچھ شعیب نے کرنا ہے اسے تو بیٹھے بٹھائے شہرت مل جائے گی اور ہر جگہ اس کے نام کا چرچا ہو رہا ہو گا۔ چنانچہ اس نے شعیب سے کہہ دیا کہ وہ پروڈکشن ہاؤس کھولنے کی تیاری کرے۔ وہ بہت جلد پیسوں کا انتظام کر دے گی۔

بھائی کو نورین کے تیور بدلے ہوئے محسوس ہوئے تو انہوں نے ایک دن نورین کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کر دیا۔ وہ اسی مخصوص ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں عام طور پر ان کا ڈنر ہوتا تھا۔ بیرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے بعد بھائی نے کہا۔ ”کیا بات ہے نورین۔ آج کل بہت

مصروف ہوگئی ہو۔ مجھ سے ملنے کے لیے بھی تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' نورین نے رکھائی سے کہا۔

''کیا مطلب، میں کچھ سمجھا نہیں۔'' بھائی نے سادگی سے کہا۔

''دیکھو ندیم۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسا کتنی اہمیت رکھتا ہے لیکن پیسے درختوں پر نہیں اگتے۔ اس کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور میں یہی کر رہا ہوں۔''

''لیکن تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری اچھی خاصی تنخواہ ہے۔ اس میں ہمارا گزارہ باآسانی ہو سکتا ہے۔''

''ہونہہ، ہمارا گزارہ۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ ہماری شادی ہو جائے گی۔ بھول گئے کہ تمہارے گھر والوں نے مجھے اس وجہ سے مسترد کر دیا تھا کہ تمہارے یہاں برادری سے باہر شادی نہیں ہوتی۔ وہ وجہ آج بھی موجود ہے بلکہ اب تو تمہارے پیروں میں ایک زنجیر بھی پڑی ہوئی ہے۔ تم اپنی بیوی کو اس لیے طلاق نہیں دے سکتے کہ تمہیں اپنے حصہ کی جائیداد سے محرومی کا ڈر ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ہماری شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔''

یہ سن کر بھائی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہاری دونوں باتیں درست ہیں۔ پہلے بھی بابا نے یہی دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے برادری سے باہر شادی کی تو وہ مجھے عاق کر دیں گے اور آج بھی میرے سر پر وہی تلوار لٹک رہی ہے۔ اگر میں نے نیلم کو طلاق دینے کی بات کی تو وہ ایک بار پھر وہی دھمکی دیں گے کیونکہ نیلم ان کے بھائی کی بیٹی ہے اور وہ کسی صورت میں بھی اس کا گھر برباد نہیں ہونے دیں گے۔'' ''اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''وہی جو میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ تم ان سے جائیداد میں اپنے حصے کا مطالبہ کر دو۔ اگر انہوں نے یہ بات مان لی تو تمہیں کوئی ڈر نہیں رہے گا۔ تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کر سکتے ہو۔''

''تم کیا سمجھتی ہو۔ وہ مان جائیں گے۔''

''ہاں بشرطیکہ تم انہیں قائل کر سکو۔ تم انہیں بتاؤ کہ اس ملازمت میں تمہارا گزارہ نہیں ہو رہا اور نہ ہی اس میں آگے بڑھنے کا کوئی امکان ہے۔ اس لیے تم اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہو جس کے لیے سرمایہ چاہیے اور وہ صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے جب تمہیں جائیداد میں سے حصہ دے دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ تمہارا حق ہے جو تمہیں ملنا چاہیے۔''

''لیکن میں کیا کاروبار کروں گا۔'' بھائی بولے۔ ''مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' نورین بولی۔ ''بلکہ میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے اور آج کل اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہی ہوں۔''

پھر اس نے بھائی کو پروڈکشن ہاؤس والے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ بھائی حیرت زدہ اس کی باتیں سنتے رہے۔ ان کی سمجھ میں کچھ آیا۔ جب نورین نے اپنی بات ختم کی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔ ''تم کتنی اچھی ہو نورین۔ تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔''

وہ اتراتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اگر میرے کہنے پر عمل کرتے رہے تو ساری زندگی عیش کرو گے۔''

بھائی نے اسے ممنونیت بھری نظروں سے دیکھا جیسے اس نے انہیں تسخیر کائنات کا نسخہ بتا دیا ہو پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''بس دعا کرو کہ بابا مان جائیں۔''

''مانیں گے کیسے نہیں۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''تم اپنا حق مانگ رہے ہو۔ کوئی خیرات نہیں، اگر وہ ذرا بھی چوں چرا کریں تو تم اپنی بات پر ڈٹ جانا۔ آدمی کو اپنے حق کے لیے لڑنا ہی پڑتا ہے۔''

غرض یہ کہ نورین نے بھائی کے کان اچھی طرح بھر دیے اور وہ بابا سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بابا ایک چٹان کی مانند ہیں اور ان سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن نورین کی جھوٹی محبت نے ان کی عقل ماؤف کر دی تھی اور وہ یہ خطرہ مول لینے پر تیار ہو گئے۔

نورین کی باتیں سن کر میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ جی میں آیا کہ اسی وقت بھائی کی میز پر جا کر اس کا بھانڈا پھوڑ دوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس کی جھوٹی محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور بھائی میری کسی بات کا یقین نہ

کرتے بلکہ الٹا مجھے سب لوگوں کے سامنے بے عزت ہونا پڑتا۔ اس لیے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور وہاں سے چلا آیا۔

رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد بھی میں بھائی اور نورین کے بارے میں سوچتا رہا، میرے ذہن میں بس ایک ہی بات گشت کر رہی تھی کہ کسی طرح بھائی کو نورین کی اصلیت اور اس کے عزائم سے آگاہ کیا جائے لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے نورین کا جو فوٹو شوٹ کیا تھا، ان میں چند تصویریں جو انتہائی فحش تھیں جن میں نورین نے اپنے جسم کی بھرپور نمائش کی تھی۔ کوئی بھی غیرت مند شخص اپنی محبوبہ کی ایسی تصویریں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ تصویریں بھائی کو دفتر کے پتے پر بھیج دی جائیں تو انہیں دیکھ کر بھائی کی غیرت جاگ اٹھے گی اور وہ اس سے متنفر ہو جائیں گے لیکن میں نے اس خیال کو بھی رد کر دیا اگر بھائی نے اس سے ان تصویروں کے بارے میں پوچھ لیا تھا تو وہ فوراً سمجھ جائے گی کہ یہ میری حرکت ہے اور مجھے اپنی صفائی دینا مشکل ہو جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بھائی کو ایک گمنام خط بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں نورین کا سارا کچا چٹھا بیان کرنے کے علاوہ اس کے منصوبے کا بھی تفصیل سے ذکر کر دیا کہ وہ کس طرح بزنس کی آڑ میں بھائی کی دولت پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ میں نے یہ خط ہاتھ سے لکھنے کی بجائے اردو میں ٹائپ کیا اور بھائی کے دفتر کے پتے پر بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے موبائل کی سم بھی تبدیل کر لی تاکہ اگر نورین کو مجھ پر شک ہو تو وہ مجھ سے رابطہ نہ کر سکے۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد بھائی اس سے بدظن ہو جائیں گے اور اس سے قطع تعلق کر لیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بھائی نے اس خط میں لکھی ہوئی باتوں پر بالکل بھی یقین نہیں کیا اور نورین کو اس کے بارے میں بتا دیا۔

وہ اس خط کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہونے لگے لیکن اس نے بھائی کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''نوید تم نہیں جانتے۔ شوبزنس کے لوگوں میں بہت حسد ہوتا ہے۔ وہ کسی کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے۔ لگتا ہے کہ کسی کو ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا ہے اور اس نے تمہیں بدظن کرنے کے لیے یہ خط بھیجا ہے۔''

''لیکن یہ خط مجھے کیوں بھیجا گیا؟'' بھائی نے غصے سے کہا۔ ''خط بھیجنے والے کو میرے اور تمہارے تعلقات کا علم کیسے ہوا؟''

''لگتا ہے کہ کوئی ہماری ٹوہ میں لگا ہوا ہے۔'' نورین منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''کہیں تمہاری بیوی نے تو جاسوس نہیں چھوڑ دیئے؟''

''توبہ کرو۔ وہ بے چاری تو گھر میں قید ہے۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ میری شامیں تمہارے ساتھ گزرتی ہیں۔''

''اس نے کبھی دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھی؟''

''ایک دفعہ اس نے یہ حماقت کی تھی۔ میں نے ایسی طبیعت صاف کی کہ اس کی دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''پھر یہ خط کس نے لکھا؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو یہ کوئی تمہاری ہی فیلڈ کا بندہ لگتا ہے۔ اس نے اتفاقاً مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا اور اس نے مجھے تم سے بدظن کرنے کے لیے یہ خط لکھ دیا۔''

''چھوڑو مٹی پاؤ اس قصے پر۔'' وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور سازش ہو۔ تم پہلی فرصت میں بابا کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں موقع دیکھ کر بات کرتا ہوں۔''

میرا یہ داؤ بھی خالی گیا۔ بھائی پر اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ الٹا نورین نے انہیں اور مضبوط کر دیا۔ وہ بابا کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب مجھے اس دن کا انتظار تھا کہ بھائی کب یہ بات منہ سے نکالتے اور بابا اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ویسے مجھے بابا کے جواب کا پتا تھا۔ انہوں نے صاف انکار کر دینا تھا اور بھائی کو منہ کی کھانی پڑتی۔ اس کے بعد نورین کا کیا ردِعمل ہوتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اپنا مقصد پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ بھائی سے کنارہ کشی کر کے کوئی نیا مرغا تلاش کرے گی اور میں یہی چاہتا تھا۔ بھائی نورین سے مایوس ہو کر گھر لوٹ آتے اور نیلم کی زندگی میں کچھ سکون آ جاتا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ بابا جانی ناشتا کرنے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ بھائی سہمی ہوئی بکری کی طرح کمرے سے برآمد ہوئے اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بابا کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ بابا نے ایک نظر انہیں دیکھا

اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ بھائی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور آہستہ سے بولے۔ ''بابا جانی۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو۔'' بابا نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''وہ میں یہ کہہ رہا تھا.....''

''ہاں کہو رک کیوں گئے؟''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نوکری میں میرا گزارہ نہیں ہو رہا، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کوئی کاروبار کرلوں۔''

''ہاں ہاں ضرور کرو، کس نے روکا ہے تمہیں۔''

''اس کے لیے کافی سرمایہ چاہیے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔''

''دیکھو بھئی اگر لاکھ دو لاکھ چاہئیں تو وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میری گنجائش نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ پراپرٹی سے جو کرایہ آتا ہے اسی سے گزارہ ہو رہا ہے۔''

''جی مجھے معلوم ہے لیکن مجھے تو بڑی رقم کی ضرورت ہے۔''

''دیکھو میاں پیسوں کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ خیال دل سے نکال دو اور خاموشی سے سر جھکا کر نوکری کرتے رہو۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر جائیداد میں سے میرا حصہ مجھے مل جاتا تو.....''

''کون سی جائیداد اور کیسا حصہ؟'' بابا گرج کر بولے۔

بھائی میں نہ جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی۔ وہ بولے۔ ''وہی جائیداد جو آپ نے برسوں کی محنت کے بعد بنائی ہے اور جس کے ہم دونوں وارث ہیں۔''

''میرے مرنے کے بعد۔'' بابا کڑک کر بولے۔ ''زندگی میں نہیں اب جاؤ اور مصلیٰ بچھا کر میرے مرنے کی دعا مانگو۔''

''بابا جانی! آپ بلاوجہ کی ضد کر رہے ہیں۔ آخر اس جائیداد پر ہمارا بھی کچھ حق ہے۔''

''بالکل ہے لیکن میرے مرنے کے بعد۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ جائیداد تمہارے نام کر کے خود کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاؤں۔ آئندہ ایسی بات منہ سے نہ نکالنا ورنہ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گا۔'' بھائی مایوس ہو کر بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن بھائی حسبِ معمول نورین کے ساتھ ریستوران پہنچے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ کافی خاموش نظر آ رہے تھے۔ نورین ان کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی کہ بات نہیں بنی پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا ہوا تم نے بابا سے بات کی؟''

''ہاں۔'' بھائی نے آہستہ سے کہا۔

''پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟''

''وہ نہیں مان رہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی زندگی میں جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہونے دیں گے۔''

''اوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''پیسے کے بغیر تم کاروبار کیسے شروع کرو گے اور میرا کیا بنے گا۔ میں نے تو تمہاری آس میں کئی رشتے ٹھکرا دیے۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' بھائی جلدی سے بولے۔ ''تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میں ہر قیمت پر تم سے شادی کروں گا۔''

''پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟''

''میں اسے طلاق کی دھمکی دے کر دوسری شادی کی اجازت لے لوں گا۔ وہ بہت ڈرپوک ہے۔ اپنا گھر بچانے کی خاطر وہ میری بات مان جائے گی۔''

''معاف کرنا، میں یہ حماقت نہیں کر سکتی۔ دوسری شادی کا سن کر تمہارے بابا آپے سے باہر ہو جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ وہ تمہیں گھر سے نکال دیں۔ کیا تم اپنی تنخواہ میں دو بیویوں کو افورڈ کر سکتے ہو؟''

بھائی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ اچانک ہی نورین اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ ''معاف کرنا ندیم، میں نے ہمیشہ ایک پُرآسائش زندگی کا خواب دیکھا ہے۔ تمہاری تنخواہ سے تو میرے میک اپ کا خرچ بھی پورا نہیں ہوگا۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ آج کے بعد میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں۔''

اس سے پہلے کہ بھائی کچھ کہتے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ریستوران سے باہر چلی گئی۔ بھائی کچھ دیر اپنا سر پکڑے بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر چل دیے۔ میں نے نورین کے بارے میں جو اندازہ لگایا۔ وہ بالکل درست نکلا۔ وہ انتہائی مطلبی اور خودغرض عورت تھی اور اس کی نظریں بھائی کے پیسے

پڑتیں۔ جب اس کی دال نہیں گلی تو اس نے بھائی کو ٹھکرا دیا۔ مجھے بھائی پر ترس آ رہا تھا اور ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ نورین ان کی زندگی سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی اصلیت جان لینے کے بعد وہ اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کریں گے اور نیلم کی زندگی قدرے پُرسکون ہو جائے گی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نورین کی بے وفائی نے بھائی کو ذہنی طور پر منتشر کر دیا وہ شدید غصہ اور مایوسی کے عالم میں گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہے تھے کہ اسٹیئرنگ پر ان کا کنٹرول نہیں رہا اور گاڑی سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت سے ٹکرا گئی اور بھائی موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

ہمارے گھر پر تو گویا قیامت گزر گئی۔ ہم سب صدمے سے نڈھال تھے لیکن نیلم کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور وہ دن رات بھائی کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی۔ عدت ختم ہوئی تو چچا اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس کے یہاں رہنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

میں اس کی خبر گیری کرنے دوسرے تیسرے روز چلا جاتا۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت اعتدال پر آتی چلی گئی۔ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا غم بانٹنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح سال گزر گیا۔ چچا اور چچی کو یہ فکر لاحق تھی کہ وہ پہاڑ سی زندگی کیسے گزارے گی۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہ رہے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے نیلم سے یہ بات نہیں کی تھی۔

میں بھی نیلم کی تنہائی اور اداسی دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اسے اپنا بنا لوں۔ وہ میری بچپن کی محبت تھی۔ مجھ سے زیادہ اس کا کون خیال رکھ سکتا ہے۔ اس نے جو دکھ جھیلے اور سختیاں برداشت کیں۔ میں ان سب کی تلافی کر دوں گا۔ اسے اتنی خوشیاں دوں گا کہ وہ اپنے سارے غم بھول جائے گی۔

مجھے یقین تھا کہ نیلم کو بھی اس پروپوزل پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ویسے بھی اس پر پہلا حق میرا تھا۔ اگر امی نے بھائی سے اس کا رشتہ طے نہ کیا ہوتا تو وہ بہت پہلے میری زندگی میں آ چکی ہوتی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ شادی سے پہلے وہ مجھے پسند کرتی تھی اور اس کے دل میں اب بھی میرے لیے گنجائش موجود ہوگی۔

یہی سب کچھ سوچنے کے بعد میں نے ایک دن اس کے سامنے حرفِ مدعا بیان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر سر جھکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے گی لیکن وہ میری بات سن کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر میں پریشان ہو گیا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیسے چپ کراؤں پھر اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کیے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا دوست اور بھائی سمجھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی بڑی بات کہہ دو گے۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تمہارے دکھ سمیٹنا چاہتا ہوں۔ تمہیں زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا ہوں۔ تمہارے سامنے پوری زندگی ہے۔ تمہیں کسی نہ کسی کا ہاتھ تو تھامنا ہی ہوگا۔ چچا اور چچی بھی تمہاری طرف سے بہت فکرمند ہیں۔''

''انہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں اگر وہ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں تو میں کسی ہاسٹل میں چلی جاؤں گی۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر کے اپنا گزارہ کرلوں گی اور تم بھی کان کھول کر سن لو اگر آئندہ ایسی بات زبان پر لائے تو ساری زندگی تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی۔''

میں نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ ''دیکھو نیلم زندگی کے فیصلے جذباتی بن کر نہیں کیے جاتے تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں۔''

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ میری شادی تمہارے بھائی سے ہوئی تھی۔ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے لیکن میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتی۔ زندگی بھر اس پر قائم رہوں گی۔ اب میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آئے گا۔ میں تمہارے بھائی کی امانت ہوں اور اس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں دم بخود کھڑا اس وفا کی پتلی کو دیکھتا رہا جس نے شوہر کے ہر ظلم اور زیادتی کو برداشت کیا اور مرنے کے بعد بھی اس کی یاد کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ واقعی مشرقی عورت کی گھٹی میں وفاداری پڑی ہے۔ مرد کتنا ہی بے وفا کیوں نہ ہو، عورت وفا کا دامن نہیں چھوڑتی۔

●◆●

معاوضہ

جناب مدیراعلیٰ
السلام علیکم
میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں۔ ہر روز ایسے ایسے مریضوں سے ملتا ہوں جن کی روداد بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔ ایک شوقیہ کہانی کار بھی ہوں۔ اس لیے جب بھی کوئی اچھی آپ بیتی سنتا ہوں تو اسے کہانی کے قالب میں ڈھال دیتا ہوں، یہ روداد بھی سبق بھری ہے۔ اس لیے سرگزشت کے قارئین کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ تھوڑی سی ترمیم بھی کی ہے یعنی جن کرداروں کا نام دیا ہے وہ فرضی ہیں۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر ظفر احمد خان
(کراچی)

ساحر اس وقت لکھنے میں منہمک تھا۔ اس کی کہانی کے لیے کئی بار فون آچکے تھے۔ مدیر کا ایک ہی تقاضا تھا کہ جلد از جلد کہانی بھیجی جائے لیکن کہانی تھی کہ آگے بڑھ نہیں رہی تھی خاص نمبر کے لیے کہانی کا اے دن ہونا ضروری ہے لیکن اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے کہ کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی وہ کوئی نیا قلم کار تو تھا نہیں۔ ادب کی دنیا کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس کی تخلیقات کا بڑا چرچا تھا۔ اس کی تحاریر قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیا کرتی تھیں۔ اس کا انداز بیان ایسا مسحور کن تھا کہ پڑھنے والے کو لگتا تھا کہ جیسے وہ خود وہاں موجود ہے اور سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہورہا ہے۔ اس کی منظرکشی لاجواب تھی۔ اس کا شمار شہر کے مہنگے لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ اس کی لکھنے کی رفتار بھی ناقابل یقین تھی۔ شہر کے جتنے بھی رسالے تھے ہر ایک میں اس کی کوئی نہ کوئی تحریر لگی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھا ڈراما نگار بھی تھا۔ اس وقت بھی اس کے کئی ڈراما سیریل مختلف چینلز پر ٹیلی کاسٹ ہورہے تھے۔ اس کے ہم اثر ادیب اسے ”لکھنے کی مشین“ کہتے تھے۔ اس کی کہانیوں کے مرکزی خیال بڑے اچھوتے ہوا کرتے تھے۔

وہ اپنے آفس میں موجود تھا اور کافی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اسٹاف میں اس کا اسسٹنٹ اقبال اور ایک ملازم سلطان جو اوپری کاموں پر مامور تھا آچکے تھے۔ اقبال کمپیوٹر پر گرافک کا کام کرنے میں مصروف تھا اور سلطان فی الحال کرسی توڑ رہا تھا جب کہ ساحر اپنے ایک اسکرپٹ سے الجھا ہوا تھا۔ دراصل آج کا دن اس کے لیے بڑی خوش بختی کی علامت تھا۔ آج ملک کے ایک نامور ڈائریکٹر سید محمود نے اسے فلم لکھنے کی آفر کی تھی۔ کل شام اس سے ساحر کے آفس میں میٹنگ ہوئی تھی۔ دراصل سید محمود کو بھی ساحر کی شہرت اس تک کھینچ لائی تھی۔ فلم کا موضوع بھی بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے قدیم دور کی محبت کو انتہائی جدید سائنسی ٹیکنالوجی کے آنے والے مستقبل کے دور میں پہنچا دیا تھا۔ وہ سوہنی جو ایک گھڑے کے ذریعے دریا پار کرکے اپنے ماہیوال سے ملنے آتی تھی۔ اب جدید ٹیکنالوجی کے دور میں کس طرح اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ جدید سائنسی دور کے ظالم سماج کس طرح ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ سید محمود بھی مرکزی خیال سن کر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ساحر کا دعویٰ تھا کہ اگر یہ فلم اپنے تقاضوں کے مطابق بن گئی تو بین الاقوامی منڈی میں بہت شہرت اور بزنس کرے گی اور یہ بات سچ بھی تھی کیونکہ لوگ اب گھسے پٹے موضوعات دیکھ دیکھ کر تھک چکے تھے۔ فلم اور ٹی وی ڈرامے تو محض ایک وقت گزاری اور تفریح کا سبب ہوا کرتے ہیں اور جب تفریح دلچسپ نہ ہو تو دیکھنے والا بے رغبتی کا شکار ہوکر متبادل کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔

ابھی وہ اسکرپٹ لکھ ہی رہا تھا کہ اقبال نے اطلاع دی کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے آئی ہے۔ اس نے اشارے سے کہا کہ بھیج دو۔ یوں بھی لڑکیاں اکثر اس سے ملنے.... آجایا کرتی تھیں لیکن جب وہ حسینہ عالم اس کے آفس میں داخل ہوئی تو ساحر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے آج تک ایسا منفرد، پُرکشش، نمکین اور میٹھے کا امتزاج نہیں دیکھا تھا۔ وہ ماڈرن لباس میں تھی۔ اس نے اسکرٹ اور ٹی شرٹ زیب تن کررکھی تھی۔ کھلے ہوئے بال سمیٹ کر ایک شانے پر ڈال رکھے

تھے۔

ساحر نے اسے سرتاپا دیکھا۔ سلام کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

''جی میڈم! میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔''

''جی میرا نام شرمین علی ہے۔ مجھے ابنِ ادیب نے بھیجا ہے۔'' اس کی جلترنگ بجاتی آواز گونجی۔

''جی اچھا......تو پھر......'' ساحر نے مستفسر لہجے میں کہا۔

''میں ایک پرائیویٹ چینل پر چھوٹے موٹے رول کرتی رہی ہوں لیکن اب میں فلمی دنیا کی طرف جانا چاہتی ہوں۔

اور آپ تو ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ سنا ہے آپ سید محمود کے لیے فلم بھی لکھ رہے ہیں۔ تو پلیز آپ میرے لیے سفارش کردیں تاکہ میں فلم انڈسٹری میں متعارف ہوسکوں۔'' وہ بولی۔

''ویسے تو میں سفارش کا قائل نہیں ہوں۔ صرف آپ کا ٹیلنٹ ہی آپ کو آگے لے جاسکتا ہے۔ سفارش کرنے سے کوئی فلم اسٹار نہیں بن جاتا۔'' ساحر نے کہا۔

''جی آپ نے ٹھیک کہا۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو مایوسی نہ ہو۔'' وہ کسی جادوگرنی کی طرح مسحور کن لہجے میں بولی۔ ساحر اس کے سحر میں گرفتار ہونے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے سید محمود سے بات کرکے آپ کو بتاؤں گا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ابن ادیب نے آپ کو آگے کیوں نہیں بڑھایا۔ ان کے پاس بھی بہت سارے پروجیکٹ ہیں۔''

''دراصل ان کے کئی پروجیکٹ تکمیل کے لیے پروڈیوسرز نے آپ کو دے دیئے۔ آپ کی وجہ سے انہیں قدم قدم پر زک پہنچ رہی ہے اس لیے وہ اپنے کیریئر سے مایوس ہیں۔''

''یہ ایک عجیب بات بتائی، ویسے میں نے کبھی اس کے پروجیکٹ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ پروڈیوسرز اگر کوئی سیریل مجھے دے دیتے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ابن ادیب کے پلاٹ میں خامی ہے۔''

ساحر نے شرمین کو معنی خیز نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ تمہیں فلم انڈسٹری میں بھیج کر اسے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ بھی بڑی کایاں لگ رہی تھی جیسے اس کے مقصد کو سمجھ گئی ہو۔ وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔
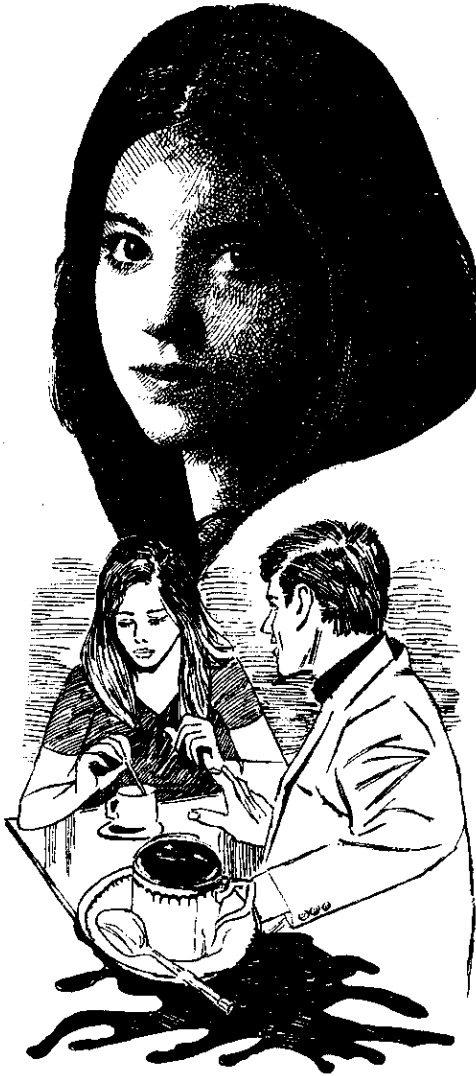
”بات کچھ بھی ہو مگر میں یہی مانتی ہوں کہ آپ ان سے بڑے رائٹر ہیں۔“

”میں اپنے پروڈیوسر سے بات کرتا ہوں۔“

”آپ کے یہاں کافی پلانے کا رواج نہیں۔“

”سوری..... کیوں نہیں۔“ ساحر جیسے اس کے سحر میں کھویا ہوا تھا گڑبڑا کر بولا پھر سلطان کو آواز دے کر کافی لانے کو کہا۔

”کیا آپ کا کارڈ مل سکتا ہے۔“ اس نے کہا تو ساحر نے فوراً دراز سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کے حوالے کردیا۔ اتنے میں سلطان کافی لے آیا۔ وہ اپنی مخروطی انگلیوں کو طبلا بجانے کے اسٹائل میں ٹیبل پر ہلا رہی تھی۔ اس کی گوری انگلیوں کے ناخنوں پر لگی بلیک کلر کی نیل پالش کسی زہریلے سیاہ سانپ کے پھن کی طرح لگ رہی تھی۔ ساحر اس کے حسن سے خاصا متاثر تھا۔ کافی پینے کے دوران وہ اپنے کیریئر کے بارے میں بتانے لگی۔ پھر فلم انڈسٹری اور ہدایت کار موضوع بحث آئے۔ کافی ختم کرکے وہ اٹھ گئی۔

”اچھا ساحر صاحب! اب اجازت دیں۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گی۔“ وہ مترنم آواز میں بولی۔

”جی میں آپ کو کال..... پر بتادوں گا۔“ ساحر کال کہہ کر رکا پھر بولا تو شرمین اس کا مقصد سمجھ گئی۔ وہ ہنسی پھر اپنے پرس میں سے اسمارٹ فون نکالا اور دوسرے ہاتھ میں موجود ساحر کے کارڈ پر درج نمبر ڈائل کرنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ساحر کا فون بجنے لگا۔

”یہ میرا نمبر ہے۔ سیو کرلیجیے۔“ اس نے فون اور کارڈ پرس میں رکھا اور واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ ساحر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی وقت اقبال کمرے میں داخل ہوا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”کہاں کھو گئے سر! اب ہوش میں آجائیں۔“ اقبال شوخی سے بولا۔ دراصل اقبال، ساحر سے خاصا بے تکلف تھا اور وہ اکثر ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ یوں بھی ساحر کافی شوخ مزاج تھا اور وہ چاہتا تھا کہ آفس میں مخصوص دفتری ماحول نہ ہو جو عجیب سی گھٹن پیدا کردیتا ہے۔ لہٰذا آفس میں بھی گھر کی طرح کا ماحول ہو۔

”ارے بھئی کیا غضب کی چیز تھی۔“ ساحر فضا میں ہاتھ ہلا کر بولا۔ جیسے کسی مشاعرے میں غزل کی داد دے رہا ہو۔

”مجھے تو وہ کوئی شرابی غزل لگ رہی تھی جس کے نشے میں میرا دوست مدہ مست ہوا نظر آتا ہے۔“ اقبال ہنسا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ ساحر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا۔

☆......☆

ساحر نے سید محمود سے شرمین کے حوالے سے بات کی تو وہ بغیر کسی پس وپیش کے راضی ہوگئے۔ چونکہ فلم بھی جدید طرز کی تھی لہٰذا انہیں ویسے بھی نئے چہروں کی تلاش تھی۔ ویسے بھی ساحر ایک مایہ ناز ادیب تھا۔ وہ اس کی بات کیسے رد کرسکتے تھے۔ سید محمود سے بات کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ یہ خوش خبری فوراً شرمین کو سنائی جائے۔ لہٰذا اس نے شرمین کا نمبر پنچ کیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی موبائل فون سے شرمین کی مترنم آواز ابھری۔

”جی ساحر صاحب..... کوئی خوش خبری ہو تو سنائیے۔“

”جی ہاں آپ کے لیے خوش خبری ہی ہے۔ سید محمود صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ آپ ان سے ایک میٹنگ کرلیں۔“ ساحر نے کہا۔

”اس کے لیے میں آپ کی احسان مند ہوں۔“ شرمین نے کہا۔

”احسان کی کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ ساحر رسمی جملے بولنے لگا۔

”چھوڑیں یہ رسمی باتیں۔ آج کی بات کریں کیا میں آج شام کو کچھ وقت آپ کے ساتھ گزار سکتی ہوں۔“ شرمین نے کہا تو ساحر کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے جیسے اس کی مراد بر آئی ہو۔

”کیوں نہیں میڈم۔“ ساحر نے خوش دلی سے کہا۔

”تو پھر آج شام کو ہم باہر کھانا کھائیں گے۔“ شرمین نے چہک کر کہا۔

”ٹھیک ہے، ڈن۔“ ساحر نے جھٹ کہا۔

”صرف میں اور آپ..... تیسرا کوئی نہیں۔“ شرمین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ساحر نے سوچا اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں، جب وہ خود ہی قریب آرہی ہے تو پھر سوچنا کیسا۔

”اوکے..... ڈن..... کیا آپ مجھے گھر سے پک کریں گے یا میں آپ کے آفس آجاؤں۔“ شرمین نے کہا۔

”میں آپ کو پک کرلوں گا، کل ٹھیک پانچ بجے میں آپ کے گھر کے قریب پہنچ کر آپ کو کال کروں گا اور اپنا ایڈریس مجھے میسیج کردیں۔“ ساحر نے کہا۔ اس کے بعد کال منقطع کردی۔ وہ تو خود بخود ساحر کی طرف پیش قدمی کررہی تھی۔ اس کا بیشتر لڑکیوں سے واسطہ پڑا لیکن شرمین جیسی اس

نے اب تک نہیں دیکھی تھی۔ اسے شرمین سے خاصا لگاؤ ہو گیا تھا۔ ساحر نے اقبال کو شرمین سے ملاقات کا ذکر کیا۔

''ارے بھئی آپ کی تو لاٹری لگ گئی۔ شرمین جیسی دوشیزہ خود بخود آپ کی طرف لپک رہی ہے۔'' اقبال نے ہنس کر کہا۔

''یار تم آج کل کی لڑکیوں کو نہیں جانتے یہ اپنا کام نکالنے کے لیے گدھے کو بھی باپ بنا لیتی ہیں۔'' ساحر نے کہا۔

''چلو یونہی سہی...... کچھ آ رہا ہے ناں...... جا تو نہیں رہا۔'' اقبال مسکرایا۔

''ہاں یہ تو ہے لیکن وہ اپنا کام نکلنے کے بعد پہچانے گی بھی نہیں اور اگر سید محمود نے اسے اپنی فلم میں کاسٹ کر لیا تو اس کے نخرے اور بھی بڑھ جائیں گے۔'' ساحر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اس غم میں کیوں گھلتے ہو دوست۔ جب تک کھیر کھانے کو مل رہی ہے کھاتے رہو۔'' اقبال نے مشورہ دیا۔

''ہونہہ...... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔'' ساحر نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

اگلے روز شام پانچ بجے ساحر اپنی کرولا میں آفس سے نکلا۔ اس کا رخ شرمین کے گھر کی طرف تھا۔ وہ پندرہ منٹ میں گلشن اقبال کے اس بلاک میں پہنچ گیا جہاں شرمین کا گھر تھا۔ ''مانی ہائیٹس'' اس نے اپارٹمنٹ کے ٹاپ پر لکھا دیکھا تو کار ایک طرف کر کے روک دی۔ اس نے فون پر شرمین کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ تقریباً تین منٹ بعد شرمین اپارٹمنٹ کے مین گیٹ سے باہر آ گئی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا کہ شاہی محل سے کوئی شہزادی باہر آ رہی ہے۔ واقعی وہ لاجواب حسن کی مالک تھی۔ وہ کیٹ واک کے اسٹائل میں چلتی ہوئی آئی اور ساحر کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کار آگے بڑھ گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساحر نے کھانے کا آرڈر دیا۔ شرمین اب تک کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔

''تم بہت خوب صورت ہو۔'' ساحر نے شرمین کو دیکھتے ہوئے بلاضرورت کہا۔

''جی شکریہ...... آپ بھی بہت اچھے ہیں ساحر صاحب۔'' شرمین نے جواباً کہا۔

''کیا تم سید محمود سے ملی تھیں۔'' ساحر نے پوچھا۔

''جی میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کل بلایا ہے۔ ویسے ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے فلم میں کاسٹ کرنے کے لیے ذہن بنا چکے ہیں۔'' شرمین نے کہا۔ اتنی دیر میں ویٹر کھانا لے آیا اور ان کی ٹیبل پر سرو کرنے لگا۔ وہ ویٹر کی موجودگی میں خاموش رہے۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ کھانا پلیٹوں میں نکالنے لگے۔

''فلم اسٹار بننے کے بعد مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی۔'' ساحر نوالہ چباتے ہوئے بولا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں ساحر صاحب، آپ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہیں۔'' شرمین مسکرائی۔ اس کا جملہ سن کر ساحر کا دل خوشی سے جھومنے لگا۔

''دراصل شہرت بہت بری شے ہے۔ اس کی بلندی پر جانے کے بعد نیچے دیکھنے پر اپنے بہت سے دیرینہ دوست چھوٹے نظر آتے ہیں۔'' ساحر نے کہا۔ شرمین نظر اٹھا کر ساحر کو دیکھنے لگی۔ ''میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی کیونکہ آپ میرے محسن ہیں۔'' شرمین بولی۔

''بس محسن!'' ساحر معنی خیز لہجے میں بولا۔ اس کے جملے پر شرمین مسکرانے لگی۔

''اور آپ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ اس کی بات پر ساحر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

''خیر چھوڑو، یہ بتاؤ مستقبل میں تمہارا کیا پروگرام ہے اپنے کیریئر کے حوالے سے۔'' ساحر نے موضوع تبدیل کیا۔

''میں فلمی دنیا میں جانا اور شہرت کی بلندیوں کو چھونا چاہتی ہوں۔'' شرمین دھیرے سے بولی۔

''گڈ! اچھی بات ہے۔'' ساحر نے جواباً کہا۔ پھر وہ کھانا کھا کر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساحر نے شرمین کو واپس گھر ڈراپ کیا پھر وہاں سے اپنے گھر ہو لیا۔ شرمین چند دنوں میں ہی اس کے دل میں اپنی جگہ بنا چکی تھی لیکن ساحر مخمصے کا شکار تھا کہ شرمین اس کو بطور سیڑھی استعمال کر رہی ہے یا واقعی اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ فی الحال کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوتا اس لیے اس نے خود کو جھوٹی تسلی دی کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

ویسے یہ کہانی یک طرفہ نہیں تھی۔ شرمین بھی ساحر کے قریب آ رہی تھی۔ سید محمود سے تعارف کرانے کے بعد شرمین کا ساحر سے واسطہ ختم ہو جانا چاہیے لیکن وہ خود اس سے مل رہی

تھی۔ اگلے دن وہ شام پانچ بجے پھر ساحر کے آفس پہنچ گئی۔ ساحر اسے دیکھ کر حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ پانچ بجے آفس ٹائم ختم ہو جاتا تھا۔ لہٰذا اقبال اور سلطان جا چکے تھے۔ صرف ساحر اور شرمین آفس میں موجود تھے۔

''خیریت تو ہے میڈم! آج پھر میرے نصیب جاگ گئے۔'' ساحر نے خوش دلی سے کہا۔

''ہاں تم سے مل کر مجھے اچھا لگتا ہے۔ جب سے تم سے ملی ہوں دل چاہتا ہے روزانہ تم سے ملوں۔'' شرمین نے کہا۔

''اچھا تو میں اس جذبے کو کیا نام دوں۔'' ساحر ہنس کر بولا۔

''پتا نہیں۔'' شرمین دوسری طرف منہ کر کے مسکرائی۔

''آج کہاں چلنا ہے۔'' ساحر نے پوچھا۔

''آج کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں تمہارے آفس میں ہی انجوائے کریں۔'' شرمین نے کہا۔

''اچھا لیکن آفس میں تو انجوائے کرنے کوئی سہولت نہیں ہے۔'' ساحر نے کہا۔

''انجوائے کرنے کی چیز میں ساتھ لائی ہوں۔'' شرمین نے کہا اور اپنے پرس میں سے ایک چھوٹی سی شراب کی بوتل نکالی۔

''ارے یہ کیا ہے۔'' ساحر نے مسکرا کر کہا۔

''انگلش ہے۔'' شرمین مسحور کن لہجے میں بولی اور اٹھ کر آفس سے ملحق چھوٹے سے کچن میں گئی اور وہاں سے شیشے کے دو گلاس لے آئی۔

''لیکن میں شراب نہیں پیتا۔'' ساحر نے کہا۔

''تو میں کون سی عادی ہوں۔ ہم تو صرف انجوائے کریں گے اور بس!'' شرمین نے کہا اور تھوڑی تھوڑی سی دونوں گلاس میں انڈیلی۔ پھر ایک گلاس ساحر کی طرف بڑھا دیا۔ ساحر نے جھجکتے ہوئے گلاس لے لیا۔

''چیرز......!'' شرمین نے ساحر کے گلاس سے گلاس ٹکرایا۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ ایک گھونٹ کے برابر محلول حلق میں انڈیل گئے۔ ساحر نے برا سا منہ بنایا۔

''بہت کڑوی ہے۔''

''مگر اس کا اثر بہت میٹھا اور مسحور کن ہے۔'' شرمین مستی بھرے لہجے میں بولی۔ ساحر نے سر کو جھٹکا۔ شاید اسے نشہ چڑھ رہا تھا۔ شرمین نارمل تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ شراب کی عادی ہے۔ پھر شرمین بڑی خوب صورتی سے ادائیں دکھانے لگی جیسے ساحر کو لبھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ساحر تو پہلے ہی اسے پسند کرنے لگا تھا اور نشے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ آہستہ آہستہ نشہ اور بڑھ گیا۔ ساحر کی آواز لہرانے لگی اور وہ باتونی انداز میں اول فول بولنے لگا۔ ادھر شرمین اسے اپنی اداؤں سے لبھانے لگی تو ساحر مزید اس کے قریب آنے لگا لیکن شرمین نے ساحر کو ایک مقررہ حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہی ہے۔

ساحر نشے میں دھت نیم بے ہوشی کی حالت میں صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہیں ہوئی کہ شرمین کب کی جا چکی ہے۔ تقریباً رات کے دس بجے اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے کسمسا کر انگڑائی لی۔ پھر اس نے اپنا فون اٹھا کر شرمین کا نمبر ملایا۔ ''ہیلو شرمین۔''

''جی ساحر صاحب۔'' دوسری طرف سے شرمین کی آواز آئی۔

''تم کہاں ہو؟'' ساحر نے تعجب سے پوچھا۔

''ارے ساحر صاحب لگتا ہے آپ کو زیادہ چڑھ گئی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ کی ایسی حالت ہو جائے گی۔ بہر حال مجھے دیر ہو رہی تھی اور آپ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ آپ مجھے گھر ڈراپ کر سکتے۔ لہٰذا میں گھر آ گئی۔'' شرمین نے صفائی پیش کی۔

''چلو ٹھیک ہے ڈونٹ وری، پھر ملتے ہیں۔'' ساحر نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔ ساحر جیسے ہی کھڑا ہوا اسے لگا کہ جیسے اس کے سر پر منوں وزن رکھا ہوا ہے۔ بہر حال وہ جیسے تیسے آفس بند کر کے گاڑی تک گیا۔ جسمانی طور پر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے ڈنڈوں سے مارا ہو۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو۔ ایک دو بار اس نے فلم ایوارڈ فنکشن اور ایک فنکاروں کے پروگرام میں پی تھی لیکن اس وقت بھی ایسی حالت تو نہیں ہوئی تھی۔ پھر رات گئے تک شرمین کا فون دوبارہ آیا۔ اس نے ساحر کی طبیعت پوچھی اور بہت معذرت کرنے لگی۔ ساحر نے اسے باور کرایا کہ اس کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ شرمندہ نہ ہو۔

اگلے دن ساحر حسب دستور اپنے آفس پہنچ گیا۔ سید محمود کا فون بھی آیا تھا۔ وہ اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ فلم کا اسکرپٹ جلدی شروع کر دے تاکہ یہ کام اگلے مرحلے میں داخل ہو سکے کیونکہ اسکرپٹ ہی اس پروجیکٹ کی پہلی سیڑھی تھی۔ اس نے سوچا کہ فلم کے اسکرپٹ پر آج سے ہی کام شروع کر دیا جائے۔ اقبال اور سلطان بھی آ چکے تھے۔ وہ فلم کے مرکزی خیال کے مطابق اسکرپٹ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا

لیکن یہ کیا۔ اسے اپنا دماغ بند محسوس ہو رہا تھا۔ ''لگتا ہے شراب کے اثرات ابھی تک دماغ پر ہیں۔'' اس نے سوچا پھر لکھنے کا ارادہ کچھ دیر کے لیے موقوف کر دیا۔ اقبال گرافنگ کے کام میں مصروف تھا۔ سلطان صفائی ستھرائی کے کام میں مشغول تھا۔

تقریباً تین دن تک ساحر کچھ لکھ نہیں پایا۔ اس دوران میں شرمین سے بھی کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ساحر ذہنی طور پر کچھ پریشان سا تھا۔ وہ ایک دن میں اچھا خاصا مواد لکھ لیا کرتا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گزشتہ تین روز سے لکھنے سے معذور رہا۔ اسے بار بار شراب کا خیال آ رہا تھا لیکن شرمین کا چہرہ تخیل میں آتے ہی وہ اپنی ساری کوتاہیاں اور شرمین کی حرکت بھول جاتا تھا۔

تین دن بعد شام کے تقریباً ساڑھے تین بجے شرمین آفس آ گئی۔

''ہیلو ساحر! کیسے ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ تین دن کہاں رہیں۔'' ساحر نے پوچھا۔

''اس دوران سید محمود صاحب سے میٹنگ ہوئی۔ انہوں نے مجھے اپنی نئی فلم کے لیے سائن کر لیا ہے۔ فی الحال تو سائیڈ ہیروئن کا کردار دیا ہے۔ وہ میری پرفارمنس دیکھ کر مجھے اپنی اگلی فلم میں ہیروئن کا کردار دیں گے۔'' شرمین نے بتایا۔

''اوہ...... گڈ...... مبارک ہو تمہیں۔'' ساحر نے خوش ہو کر کہا۔

''تم سناؤ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔'' شرمین نے کہا۔

''ویسے تو ٹھیک ہے لیکن گزشتہ تین دن سے سر بھاری سا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ اس دن میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔'' ساحر نے کہا۔

''نہیں ساحر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں، اتنا تو چلتا ہے۔ آپ گلٹی فیل نہ کریں۔ ڈونٹ وری۔'' شرمین نے کہا۔

''تھینک گاڈ! میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔'' ساحر نے کہا۔

''خیر چھوڑیں۔ آج میں آپ کو اپنے ہاتھ کی کافی پلاؤں گی۔'' شرمین بے تکلفی سے بولی۔

''کیوں نہیں۔'' ساحر نے خوش ہو کر کہا تو شرمین اٹھ کر بڑی بے تکلفی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ جہاں کافی بنانے کا سامان اور چھوٹا سا چولہا رکھا ہوا تھا۔ وہ کافی بنانے لگی۔ کافی کے دو کپ تیار کر کے اس نے اپنے گریبان میں سے کوئی چیز نکالی۔ یہ ایک چھوٹی سی ڈراپر بوتل تھی۔ اس نے کافی کے ایک کپ میں چند قطرے ٹپکائے اور بوتل واپس گریبان میں رکھ لی۔ ایک ٹرے میں کافی لے کر آفس میں آ گئی، اپنے ہاتھ سے اٹھا کر ایک کپ ساحر کو دیا اور دوسرا خود پینے لگی۔

''اوہ! تم تو بہت اچھی کافی بناتی ہو۔'' ساحر نے ایک چسکی لے کر کہا۔

''شکریہ ساحر صاحب! دراصل آپ ہیں ہی اتنے اچھے کہ میں چاہتی ہوں روزانہ آپ کو اپنے ہاتھ کی کافی پلاؤں لیکن قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔'' شرمین نے کہا۔

''ارے بھئی! تمہیں کس کم بخت نے یہاں آنے سے منع کیا ہے۔ تمہارا اپنا آفس ہے جب چاہو آؤ اور تمہاری قدر تو میرے دل میں ہے۔'' ساحر خوش دلی سے بولا۔ شرمین ساحر کی بات سے قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ پھر ایسا ہوا کہ شرمین روزانہ شام کو آفس آنے لگی اور اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر ساحر کو پلاتی، اپنے حسن کے جلوے دکھا کر اسے سحر زدہ کر کے چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ کافی دن تک چلتا رہا تھا۔ پھر اچانک شرمین غائب ہو گئی۔ اس نے آفس آنا چھوڑ دیا۔ ساحر نے دو تین بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شرمین اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ وہ حسن کی پری اس پر جادو کر کے نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

آج تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے اور ساحر اسکرپٹ لکھنے کے نام پر ایک نقطہ بھی نہیں لگا سکا تھا۔ پہلے تو وہ اسے شراب کا اثر سمجھتا رہا تھا لیکن شراب کا اثر اتنے دن تک نہیں رہتا۔ وہ تشویش کا شکار تھا کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ لکھ کیوں نہیں پا رہا ہے۔ سید محمود کے علاوہ تقریباً چار پانچ چینل پر اس کے ڈراما سیریل چل رہے تھے۔ وہ بھی نہیں لکھ پا رہا تھا۔ اس دوران اس کی کئی پروڈیوسروں سے تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دماغ بند کیوں ہو گیا ہے۔ اقبال نے اسے بتایا کہ وہ گزشتہ پندرہ دن میں خاصا کمزور ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں لیکن وہ تو نیند بھی پوری لے رہا تھا اور جسمانی طور پر اسے کوئی تکلیف بھی لاحق نہیں تھی۔

تقریباً مزید ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ساحر کو سر چکرانے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے کی شکایت بھی

شروع ہوگئی وہ ڈرائیونگ کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ تب اس نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے اس کا بیان سننے کے بعد چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیئے جن میں برین اسکین بھی شامل تھا۔ چند دنوں میں رپورٹیں بھی آگئیں۔ تب ڈاکٹر نے اس کی رپورٹیں دیکھ کر بتایا کہ اس کے دماغ میں نیوروسسٹم کئی جگہ سے متاثر ہے، جس کی وجہ سے نیوروٹرانسمیشن رخنہ اندازی کا شکار ہے اور اس کی وجوہات نامعلوم ہیں۔

"لیکن یہ پرابلم ہوا کیسے۔" ساحر نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"اس کی وجوہات میں ایک خاص قسم کا زہر ہے جو مختلف ادویات میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے سائیڈ افیکٹ کے طور پر یہ علامات پیدا ہوتی ہیں اور وہ زہر عموماً جان بچانے والی ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے آپ نے ایسی کوئی دوا استعمال کی۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب میں نے تو ایسی کوئی دوا استعمال نہیں کیں، کیا شراب سے ایسا ہوسکتا ہے کیوں کہ پچھلے دنوں میں نے اتفاقیہ طور پر پی لی تھی۔ ویسے میں شراب نہیں پیتا۔" ساحر نے بتایا۔

"جی نہیں یہ شراب کے اثرات نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"تو کیا اس کا علاج ممکن ہے۔" ساحر نے پوچھا۔

"اگر زہر کا نام پتا چل جائے تو اس کا تریاق کیا جاسکتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"لیکن میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ زہر میرے جسم میں کیسے گیا جب کہ میں نے تو کافی عرصہ سے کوئی دوا استعمال نہیں کی۔" ساحر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں کچھ ادویات لکھ کر دے رہا ہوں۔ آپ یہ استعمال کریں۔ خدا خیر کرے گا۔" ڈاکٹر صاحب نے کچھ ادویات لکھ کر پرچا ساحر کو دے دیا۔ ساحر، ڈاکٹر صاحب کی لکھی ہوئی ادویات استعمال کرتا رہا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ساحر کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ اس سے چلنا پھرنا بھی محال ہوگیا۔ آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے۔ نقاہت اتنی تھی کہ اس سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ساحر کی اچانک بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بڑے بڑے پروڈیوسر، ٹی وی چینلز کے ڈائریکٹر، اداکار اور ادیب اس کو دیکھنے اسپتال پہنچ رہے تھے۔

ساحر کے اس طرح صاحب فراش ہونے پر سبھی حیران و پریشان تھے۔ اس کے ان گنت پروجیکٹ ادھورے تھے۔ ہدایت کار اور ڈائریکٹر جن کے ادھورے اسکرپٹ ساحر کے پاس پھنسے ہوئے تھے وہ سخت ٹینشن میں تھے۔ لیکن ساحر کی حالت دیکھ کر وہ سب بے بس نظر آرہے تھے۔ وہ سب یہی چاہتے تھے کہ ساحر جلد از جلد صحت یاب ہوجائے اور ان کے پروجیکٹ مکمل کردے۔

اسپتال میں ساحر کے وارڈ میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ساحر ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی عیادت کے لیے آنے والوں سے مل رہا تھا اور بڑی نقاہت سے ان کے جواب دے رہا تھا۔ تبھی دو افراد اس کے وارڈ میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی دگرگوں حالت کے باوجود انہیں پہچان گیا۔ وہ ابنِ ادیب اور شرمین تھے۔ وہ دونوں اس کے بیڈ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔

"ارے ساحر صاحب! یہ سب کیا ہوا، کیسے ہوگیا۔" شرمین کی مترنم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"بھئی مجھے بڑا افسوس ہوا اللہ آپ کو صحت دے۔ آپ کے تو کافی پروجیکٹ ادھورے پڑے ہیں۔ ان سب کا کیا ہو گا۔" ابن ادیب نے کہا۔ ساحر کچھ بولنے کی کوشش کررہا تھا لیکن الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل پارہے تھے۔ ابنِ ادیب نے پھولوں کا بوکے اس کے سرہانے رکھ دیا۔ اس وقت وارڈ میں ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ابنِ ادیب شرمین کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں کچھ دیر ساحر کے قریب خاموش کھڑے رہے۔ پھر ساحر سے اجازت لے کر جانے لگے۔ ابنِ ادیب اور شرمین وارڈ کے خارجی دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ ساحر نقاہت کے سبب بول نہیں پارہا تھا لیکن وہ دیکھ اور سن سکتا تھا۔ اس نے وہیں سے لیٹے لیٹے دیکھا۔ ابنِ ادیب شرمین کو انگوٹھے سے لائیک کا نشان بنا کر دکھا رہا تھا۔ اس کے جواب میں شرمین نے بھی ایسا ہی کیا۔

"تم نے تو بہت اچھی فارمنس دکھائی۔ میرا خیال ہے کہ تم بہت ترقی کروگی۔" ابنِ ادیب نے کہا اور ایک لفافہ جیب سے نکال کر شرمین کی طرف بڑھایا۔

"یہ ہے تمہارا معاوضہ۔" ابن ادیب نے کہا اور شرمین نے جھپٹ کر لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ دور بیڈ پر لیٹا ساحر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

محترم مدیراعلیٰ
سلام مسنون
ایک دلچسپ اور سبق آموز سچ بیانی ارسال خدمت ہے جو ان سب کے لیے ہے جنہیں یقین ہے کہ میزانِ عدل کا فیصلہ ہی اہم فیصلہ ہے۔
اعتزاز سلیم وصلی
(فیصل آباد)

سیشن کورٹ کی عمارت کے قریب پارکنگ میں اس نے اپنی کار روکی اور چیمبر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیشن کورٹ کے چند بہترین وکلا میں سے ایک تھا۔ نام سید شاہ زیب تھا تعلق مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ گاؤں میں اس کی زمین تھی جس کی آمدنی سے گزارا اچھا ہوجاتا تھا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد اپنے ایک کلاس فیلو کے والد کے ساتھ جو کافی مشہور تھے مل کر اس نے پریکٹس شروع کی۔ چند سالوں میں بہت کچھ سیکھ کر جب اس نے اپنا الگ چیمبر بنایا تو اس کا شمار کامیاب وکلا میں ہونے لگا۔ آج بھی وہ ایک کیس کے سلسلے میں جلدی آگیا تھا۔ آفس میں بیٹھ کر اس نے کورٹ اتارا اور قریب پڑے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کا اسسٹنٹ پاس آیا۔ ''سر آج خالد کے کیس کی سماعت ہے۔''

''ہاں یاد ہے مجھے، تم ایسا کرو اس کی فائل پکڑاؤ اور ٹائم بتاؤ؟''

''دس بجے کے بعد عدالت پہنچنا ہے۔''

''اوکے۔'' وہ سر ہلا کے بولا۔ اسسٹنٹ اصغر نے فائل پکڑائی اور وہ غور سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

''اصغر، ایک کپ چائے کا منگواؤ۔'' سر اٹھائے بغیر اس نے کہا۔

''اوکے سر۔'' کہہ کر اصغر باہر چل دیا۔ اسی دوران خالد اور اس کا بیٹا احمد اجازت لے کر چیمبر میں داخل ہوئے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ کیس کے سلسلے میں بات کرنے لگے۔ یہ زمین کی تقسیم سے پیدا ہونے والا جھگڑا تھا اور مخالف پارٹی میں خالد کا بھائی اور اس کا سالا شامل تھے۔ چند ماہ پہلے زمین کے اس جھگڑے پر لڑائی بھی ہوچکی تھی جس میں احمد خاصا زخمی ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے آج کیس کا فیصلہ ہوجائے گا۔'' شاہ زیب نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں سر لگتا تو یہی ہے کیونکہ پٹواری اور تحصیل دار بھی ہمارے حق میں ہیں۔'' خالد مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں لگتا ہے کافی مال کھلایا ہے تم نے انہیں۔'' وہ ہنسا۔

''کروڑوں کی زمین ہے، قریب سے ہی دو بڑے شہروں کو ملانے والی سڑک گزر رہی ہے، آج اگر ایک کروڑ قیمت ہے تو بائی پاس بنتے ہی یہ چار پانچ کروڑ کراس کر جائے گی، اتنے پیسوں کے لیے لاکھ دو لاکھ دے دینا کوئی بڑی بات نہیں۔'' خالد نے تفصیل بتائی۔

''اچھا کیا، میں درخواست کروں گا جج سے آج ہی فیصلہ سنادیں۔''

''ہاں سر، مجھے بھی بہت جلدی ہے اس کمینے عامر کے چہرے پر مایوسی دیکھنے کی۔''

خالد کا بیٹا احمد جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا وہ بول پڑا۔ ''چند ماہ پہلے ہونے والی لڑائی میں عامر نے ہی اس کا سر پھاڑا تھا۔''

وہ رشتے میں خالد کے بھائی عابد کا سالا تھا۔ کافی تیز مزاج اور غصیلہ شخص تھا۔ سماعت شروع تو ہوئی مگر فیصلہ نہ سنایا گیا کیونکہ عابد کا وکیل بیمار تھا اس لیے اگلی تاریخ چودہ دن بعد دی گئی۔ خالد اور احمد کے چہرے پر مایوسی تھی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آج نہیں ہوا تو چودہ دن بعد ہوجائے گا۔'' شاہ زیب نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ دونوں ہاتھ ملا کر گھر کو چل دیے۔ راستے میں احمد نے عامر کو دیکھا۔ ''ابو وہ جا رہا ہے کتا۔'' وہ نفرت سے بولا۔

''چل ٹھنڈا رہ، کیس کا فیصلہ ہولے پھر اس سے بھی نمٹ لیں گے۔'' خالد نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ عامر نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔

☆......☆

خالد حسن اور عابد حسن، محمد حسن کے بیٹے تھے۔ عابد عمر میں تقریباً پانچ سال بڑا، دھیمے مزاج کا صلح جو شخص تھا۔ محمد حسن کی گاؤں میں زیادہ زمین نہیں تھی۔ اس لیے اس کی وفات کے بعد دونوں نے آرام سے اپنا اپنا حصہ لیا اور محنت کرنے لگے۔ عابد کی شادی نازیہ سے ہوئی تھی جو قریب ہی گاؤں کے زمین دار احسان کی بیٹی تھی جبکہ خالد کی شادی سکینہ سے ہوئی تھی۔ سکینہ کی تیز مزاجی اور بدزبانی سے تنگ آ کر ہی عابد نے چھوٹے بھائی کو اس کا حصہ دے کر الگ کر دیا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ خالد کے پاس ایک بیٹا احمد جبکہ عابد کے پاس تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی کرتے وقت عابد نے زمین کا کافی حصہ بیچ دیا۔ مجبوری میں اسے یہ کام کرنا پڑا۔ اس لیے زمینوں سے ہونے والی آمدنی میں کافی کمی ہو گئی۔ کچھ سال پہلے جب زمینوں کا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کیا گیا تو کئی ایسی زمینیں جو لاوارث پڑی تھیں یا جن پر غیر قانونی مالک قابض تھے، ان کا ریکارڈ سامنے آ گیا۔ گاؤں کے کئی زمین دار افراد کو ان کی زمینیں واپس مل گئیں۔ ایسے میں دو شہروں کو ملانے والے ڈبل روڈ پر خالد اور عابد کے نام زمین نکلی۔ یہ کروڑوں کی زمین تھی۔ عابد تقسیم کے لیے تحصیل دار اور پٹواری کے پاس گیا مگر خالد نے انکار کر دیا۔ اس کے مطابق محمد حسن نے یہ زمین اس کے نام کی تھی۔ پٹواری اور تحصیل دار کو پیسے کھلا کر اس نے زمین اپنے نام لکھوالی۔ پیسے کے لالچ میں اس کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سکینہ نے اس کے کان خوب بھرے۔ عابد ناانصافی پر چپ نہ رہا اور عامر کے مشورے پر عدالت سے رجوع کیا۔ دونوں جانب سے کافی بحث ہوئی مگر تحصیل دار اور پٹواری کی گواہی نے کیس خالد کے حق میں کر دیا تھا۔ بس فیصلہ ہونا باقی تھا۔ عابد اور عامر گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے مایوسی ظاہر ہو رہی تھی۔ خالد کی بیٹی اسما چائے بنا کر لے آئی۔

''میں نے پہلے کہا تھا تحصیل دار اور پٹواری کو تھوڑے سے پیسے دے دیتے تو وہ کم از کم ان کے حق میں تو نہ جاتے۔'' عامر نے چائے کی چسکی لی۔

''میں کہاں سے لاتا اتنے پیسے جو ان حرام خور افسروں کا پیٹ بھر سکیں۔'' وہ مایوسی سے بولے۔

''کیا کریں اب، خالد کا وکیل اس سے بڑا کمینہ ہے پتا نہیں کہاں سے لے آتا ہے دلیلیں اور ثبوت۔'' عامر دکھ سے بولا۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار احمد اور خالد کے چمکتے

چھرے آرہے تھے۔

☆......☆

''یہ کون ہے شاہ زیب جو بار بار کال کررہی ہے۔'' شاہ زیب کی بیوی نمرہ نے ناگواری سے پوچھا۔

''یہ سعدیہ کی دوست ہے۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں جھوٹ بولا۔ سعدیہ اس کی کزن تھی۔

''پھر آپ کو کیوں کال کررہی ہے؟'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کررہی تھی۔

''کیا یار نمرہ، ہر بیوی کا شکی ہونا ضروری ہے؟ سعدیہ کا ہی پوچھ رہی تھی، یہ روایتی بیویوں والے سوال مت پوچھو پلیز۔'' اس نے اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کرلیا۔

نمرہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شاہ زیب نے موبائل اٹھایا اور کال ملا کر بولا۔ ''شاہینہ، تم جان چھوڑ دو میری، میں شادی کرچکا ہوں اور میں خوش ہوں۔''

''اور میں؟ میں جو پچھلے سات سال سے تمہارے لیے بیٹھی ہوں میں کیسے خوش ہو جاؤں شاہ زیب؟'' شاہینہ کے لہجے میں دکھ نہیں غصہ تھا۔

''مجھے نہیں پتا، وہ ماضی کا قصہ تھا، اب ختم ہوچکا ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ ''شاہ زیب میری بات سنو۔'' اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شاہ زیب کال کاٹ چکا تھا۔ شاہینہ اور اس نے ایل ایل بی ایک ہی یونیورسٹی سے کیا تھا۔ پہلے سال ہی وہ ایک دوسرے میں اس قدر رانوالوہوئے کہ اردگرد کا ہوش بھلا بیٹھے۔ یونیورسٹی کے تین سال ان کے عشق کا چرچہ ہوتا رہا۔ دونوں ہر جگہ ساتھ ساتھ پائے جاتے تھے۔ ان کی جوڑی بہت مشہور تھی کیونکہ دونوں ہی خوش شکل تھے۔ شاہینہ امیر گھر سے تھی اس نے شاہ زیب پر خوب پیسا لٹایا۔ یہاں تک کہ اپنی جوانی کی کئی راتیں بھی اس کے نام کیں۔ شاہ زیب اس سے وعدہ کرچکا تھا کہ کچھ بنتے ہی وہ اس سے شادی کرلے گا مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے پریکٹس کے بعد جیسے ہی وہ کمانے کے قابل ہوا، اپنی بچپن کی منگیتر نمرہ سے اس کی شادی ہوگئی۔ شاہ زیب نے بالکل احتجاج یا اعتراض نہ کیا۔ شاہینہ اس کے لیے چکھا ہوا پھل تھا، اب وہ منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تھا۔

شاہینہ کو اس کی نمرہ سے شادی کی خبر ایک ماہ بعد ہوئی۔ اب اس کی روز آنے والی کالز اور ایس ایم ایس کا شاہ زیب کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆......☆

جج کے فیصلہ سناتے ہی عدالت میں شور اٹھا۔ عدالت سے باہر آکر شاہ زیب نے احمد اور خالد کو مبارک باد دی۔ ان کے چہرے فتح کی خوشی میں چمک رہے تھے۔ عامر اور عابد سست قدموں سے عدالت سے باہر نکلے اور ان کی طرف دیکھے بغیر گیٹ کی جانب بڑھے۔ احمد نے انہیں جاتے دیکھا اور بلند آواز میں بولا۔ ''وکیل صاحب دل خوش کردیا آپ نے، کچھ لوگ تو مرجائیں گے اس غم میں۔'' اس کی بات سن کر شاہ زیب ہنس پڑا۔ عامر کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا مگر عابد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ احمد نے پھر زہر اگلا۔ ''تایا جی لے جائیں اپنے سالا صاحب کو ورنہ پرانا حساب چکا بیٹھے گا۔''

اب بات عامر کی برداشت سے باہر ہوچکی تھی۔ وہ مڑا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب آیا۔ ''تیرے جیسے کمینوں سے بکواس ہی کی اُمید تھی اور حرام خور افسروں کو ملا کر یہ کیس جیت کے تو نے کوئی تیر نہیں مارلیا۔''

اس کی بات سن کر احمد کے ساتھ کھڑے شاہ زیب نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ''زبان سنبھال کر بات کریں مسٹر عامر ورنہ......''

''ورنہ کیا وکیل صاحب، آپ جیسا حرامی کر کیا لے گا۔'' عامر کے منہ سے دو تین گالیاں نکلیں۔ شاہ زیب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ عابد جانتا تھا، عامر نے بہت بڑی غلطی کردی ہے۔ عدالت میں وکیلوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو یقیناً شاہ زیب کا ساتھ دیتے اور یہی ہوا اچانک ایک ساتھ کئی وکیل عامر پر پل پڑے۔ ان کے ساتھ ان وکلا کے منشی بھی شامل تھے۔ عابد نے بھاگ کر اسے چھڑانے کی کوشش کی اور یہ اس کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں نے چند لمحوں میں ہی مار مار کر ان کا برا حال کردیا۔ خالد کی عمر کا لحاظ بھی کسی نے نہ کیا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھا۔ عامر کا سر پھٹ چکا تھا۔ عابد نے ہاتھ جوڑ کر شاہ زیب سے کہا۔ ''وکیل صاحب غلطی ہوگئی اس سے، معاف کردیں خدا کے واسطے۔'' مگر یہ وہ سب کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ پولیس والے دور دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ وکلا کے نزدیک کوئی نہیں جاتا تھا۔

''منہ کالا کرو اس کتے کا، یہ جانتا نہیں تھا اس نے کس کو گالی دی ہے۔'' شاہ زیب چیخا۔ عابد اور عامر کا منہ کالا کردیا گیا۔ وہ شرم سے سر نیچے جھکا رہے تھے مگر بے سود، کئی کلے اور

تھپڑ ایک ساتھ ان کے سر پر آ لگتے۔ عابد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔۔ بے بس انسان اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد کہیں سے وکلا کے صدر کی آمد ہوئی وہ بارعب لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب صاحب اتنی سزا کافی ہے اب جانے دو انہیں۔'' شاہ زیب نے اشارہ کیا اور سب وکیل ان سے الگ ہو گئے۔ عامر اور عابد سر جھکائے باہر کی طرف چل دیے۔ ان کے دل سے نکلنے والی بددعائیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں سن رہا تھا۔

☆......☆

''کچھ بتائیں بھی، کہاں جا رہے ہیں ہم۔'' نمرہ نے کوئی چوتھی بار یہ سوال پوچھا۔

''وہ سعدیہ کی دوست ہے ناں۔ شاہینہ، وہ ہماری شادی میں شرکت نہیں کر سکی تھی، آج اس کے ہاں دعوت ہے ہماری۔'' شاہ زیب نے بتایا۔ شاہینہ نے کل اسے کال کر کے کہا تھا۔ ''شاہ زیب، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں بس ایک بار اپنی بیوی سمیت مل لو مجھ سے، میں سب بھول جاؤں گی کبھی کال یا میسج نہیں کروں گی بس آخری بار مل لو شاہ زیب۔'' اور شاہ زیب انکار نہ کر سکا اس لیے آج وہ دونوں میاں بیوی اس سے ملنے جا رہے تھے۔ شاہینہ کے گھر والے دوسرے شہر میں تھے اور وہ یہاں ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ شاہ زیب کے بیل بجاتے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ ''خوش آمدید!'' اس نے مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ وہ خوش دلی سے ان سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کھانا میز پر لگایا اور وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔ شاہینہ کھا کم رہی تھی اور ان سے باتیں زیادہ کر رہی تھی۔ ''ارے یہ کسٹرڈ تو آپ نے کھایا نہیں، اسپیشل بنایا ہے اپنے ہاتھوں سے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے پلیٹ دونوں کی طرف بڑھائی۔

کھانا کھانے کے پانچ منٹ بعد ہی شاہ زیب اور نمرہ کو الٹیاں شروع ہو گئیں۔ ان کے منہ سے خون آ رہا تھا۔ شاہینہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''میرے نہیں ہو سکے تو کیا ہوا، اب تم کسی کے نہیں ہو گے۔'' اس کے لہجے میں دیوانگی تھی۔ نجانے کیوں شاہ زیب کی نظروں کے سامنے عامر اور عابد کا چہرہ آ گیا اور یہ آخری چہرے تھے جو اس نے دیکھے میزانِ عدل نے سچ کو جھوٹ بتانے پر اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ہمیشہ کے لیے۔

برصغیر میں کچھ ایسے استاد تھے جو مذاہب کے اختلاف پر یقین نہ رکھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ کوئی ترکیب استعمال کرنی چاہیے۔ ہندومت اور اسلام کو متحد کرنے کی سعی کے لیے یاد رکھا جانے والا بہترین مصلح کبیر تھا۔ کبیر پیدائشی مسلمان تھا مگر اپنے ہندو ہمسائیوں کے ساتھ عبادت کرنے لگا۔ ہندو دیوتاؤں کی پرستش کے دوران وہ یہ بھی تعلیم دیتا کہ حقیقی دیوتا صرف ایک ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ کیسے اس تعلیم کو فروغ دینے کے قابل ہوا مگر اس نے سکھوں اور ان کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ (کبیر سے پہلے بلکہ ریکارڈ کے مطابق سب سے پہلے 13 ویں صدی میں فریدالدین گنج شکر نے مذہبی بنیاد پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑا ختم کرنے کی بات کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اچھے اور نیک اعمال ہی اعلیٰ انسان کا معیار ہیں نہ کہ نمائشی اور ظاہری عقیدہ پرستی۔ سکھوں کے مذہبی صحیفہ گرنتھ میں فریدالدین کے 120 سے زائد دوہے شامل ہیں اور سکھ انہیں بابا نانک جیسی ہی عزت دیتے ہیں۔ مترجم) سکھ مت کا حقیقی بانی نانک (1469-1538ء) نامی شخص تھا جو شیخ فریدالدین کا جانشین کبیر کا معاصر تھا اور بلاشبہ ان سے متاثر تھا۔ نانک لاہور سے چالیس میل دور پنجاب کے علاقے میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔

مرسلہ: حیدر علی سلطانی۔ کراچی

شنتومت جاپان کا ایک مذہب ہے جو کہتا ہے: ''خدا کو خود سے دور نہ سمجھو بلکہ اسے اپنے دل میں تلاش کرو، کیونکہ دل خدا کا مسکن ہے۔ آسمان میں تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اور انسان کو اپنے پڑوسی سے محبت کرنا سکھانے والا وہی ہے اس لیے اس بارے میں شک نہ کرو کہ آسمان دل کی اچھائی کو پسند اور اس کے متضاد کو ناپسند کرتا ہے۔ آسمان اور اپنے اجداد کی تکریم و تحریم ''بزرگوں کی راہ'' کی اساس ہے۔

مرسلہ: آفتاب حسن۔ کراچی

محترم ایڈیٹر
سلامتی

زمین کا ایک چھوٹا ٹکڑا کس طرح ایک پورے خاندان کی تباہی کا سامان بنا، یہ آپ کو اس سچ بیانی میں نظر آجائے گا، ایسے واقعات ہر علاقے میں رونما ہوتے ہیں مگر جس کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا ہے اس سے پوچھیں کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔

پرویز احمد لانگاہ
(دادو)

رات کا اندھیرا ہر طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ باہر شدت کی سردی تھی لیکن امتیاز کے اندر الاؤ دہک رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا، کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کو بے دھیانی سے سنتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں مشغول چلتا جا رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ وہ چونک کے رک گیا۔ آواز اس کے لیے جانی پہچانی تھی لیکن جو جملہ اس کے کانوں نے سنا تھا۔ اس نے گویا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔

☆......☆

وارث علی، میر خان اور پیر بخش تین بھائی تھے۔ ان کا کوئی چچا اور ماموں نہیں تھا کیونکہ ان کے والد اور والدہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اب وارث علی اور میر خان بھی لاولد تھے اور عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں اولاد کی ساری امیدیں دم توڑ جاتی ہیں۔ پیر بخش کے البتہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ وہ پیر بخش کی اولاد کو ہی اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ پیر بخش کے بڑے بیٹے کا نام امتیاز اور چھوٹے کا نام وزیر تھا۔ وزیر پیدائشی طور پر معذور تھا اس کے سارے جسم، یہاں تک کہ پیر کے تلوؤں پر بھی زخم تھے۔ رہی سہی کسر شوگر نے پوری کردی۔ اس کا بہت علاج کرایا گیا مگر ڈاکٹرز کی اکثریت نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔

امتیاز صبح اسکول جاتا اور شام کو اپنے چچا اور والدین کے ساتھ گھر اور کھیت کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ سارے گھر والے امتیاز کے لاڈ اٹھاتے تھے کیونکہ ان کی نسل کو آگے بڑھانے والا وہی ایک تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ امتیاز نے میٹرک کا امتحان دے دیا۔ اس کے والدین اسے مزید پڑھانا چاہتے تھے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے والدین کی زمین کو اور زیادہ سرسبز و شاداب بناؤں گا۔ اس نے ایک سیزن کی فصل بیچ کر ساتھ والی دو ایکڑ زمین بھی خرید لی۔ اپنے گھر والوں کو بیل کے ساتھ ہل چلاتے دیکھ کر اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس لیے کچھ قرض اور کچھ سود پر پیسے لے کر ٹریکٹر خریدا تھا۔ ٹریکٹر سے ان کو بہت بڑی آسانی ہوگئی اور پیداوار پر بھی اچھا خاصا فرق پڑا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی دونوں بہنوں کی شادی کرادی۔

والدین اور چچا اسے زور دے کر شادی کرنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ ایک دن پیر بخش نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا امتیاز اب تم بھی شادی کرلو تا کہ ہم بھی اپنے آنگن میں چھوٹے بچوں کی قلقاریاں سنیں۔“

امتیاز نے جواب میں کہا۔ ”ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔ جب میں شادی کرنا چاہوں گا آپ کو بتادوں گا۔“

یہ الگ بات تھی کہ وہ ایک رشتے کے ماموں کی بیٹی کو دل ہی دل میں چاہتا تھا مگر اس نے کبھی کسی سے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ زرینہ بھی اسے چاہتی تھی۔

گھر والوں کی باتیں سن کر اس نے زرینہ سے بات

کرنے کی ٹھان لی۔ وہ ماموں جبار کے گھر گیا۔ زرینہ گھر میں ہی تھی تاہم وہ مامی کی موجودگی میں اس سے بات نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے چائے پی کے زرینہ کو اشارہ کیا اور چھت پہ آ گیا۔ کچھ دیر بعد زرینہ بھی چھت پر آ گئی۔ وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے امتیاز نے اس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھو زرینہ، اب اماں اور بابا شادی کے لیے زور دے رہے ہیں اور تم جانتی وہ میری شادی خاندان سے باہر کرنا چاہتے ہیں۔" وہ زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔

"تم کو تو پتا ہے بابا کتنے غصے والے ہیں اور میں امی سے بات کرتے ہوئے بہت ڈرتی ہوں۔" زرینہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے اضطراب سے بولی۔

"تم بس ایک بار...... بس ایک بار ممانی سے بات کرلو اگلے دن ہی میں خود اماں کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔" وہ التجائیہ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے میں موقع پا کر امی سے بات کرلوں گی۔" وہ دھیمے سے بولی۔ امتیاز کی آنکھوں میں امید کے جوت جل اٹھے۔ وہ مسکراتے ہوئے زرینہ کی طرف بڑھا لیکن زرینہ گھبرا کے پلٹی۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگی تھی کہ اس نے سیڑھیوں کے نیچے کسی کی جھلک دیکھی۔ اسے لگا کہ وہ اس کی ماں ہے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں سے اتر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹ کے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھو گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی ماں نے اس کی امتیاز سے کی جانے والی ساری باتیں سن لی ہیں۔

☆......☆

زینت نے جب سے امتیاز اور زرینہ کی گفتگو سنی تھی وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ اسے امتیاز کے پورے گھرانے سے شدید نفرت تھی۔ وہ زرینہ کی شادی کسی صورت امتیاز سے نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس شادی کو روکنے کے منصوبے ترتیب دینے لگی۔

جب وہ رات کو سونے لیٹے تو وہ اپنے شوہر جبار سے بولی۔ "میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔" جبار نے اس کی طرف کروٹ بدلی اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''دیکھو جبار ہماری لڑکی اب شادی کے لائق ہوگئی ہے اس کی شادی کہیں طے کر دیتے ہیں۔'' وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

جبار کی آنکھوں میں اچنبھے کا تاثر ابھرا۔ وہ حیرت سے بولا۔ ''یہ آج تم کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی جو زرینہ کے رشتے کے لیے اچانک خیال آگیا۔''

''دیکھو جبار جوان بیٹی کا جتنا جلدی فرض پورا کیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ویسے بھی جوان بیٹیوں کی عزت کانچ کی طرح نازک ہوتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کانچ کو ٹھیس نہ لگ جائے۔'' اس نے اپنی دانست میں بہترین الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔ وہ اصل بات کرنے سے پہلے ''زمین'' ہموار کر رہی تھی۔ اس کی توقع کے مطابق جبار بھڑک اٹھا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ ہماری بچی ایسی نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔ زرینہ بہت معصوم اور بھولی بھالی ہے، لیکن زمانہ بہت خراب ہے۔ میں زمانے کے بدلتے تیوروں سے ڈرتی ہوں۔'' وہ باقاعدہ منصوبے کے تحت بات کو اپنی مرضی کے رخ پر لے جا رہی تھی۔

''تو ہوا کرے زمانہ خراب۔ ہماری زرینہ کا زمانے سے کیا لینا دینا۔ وہ کون سا کوئی باہر جاتی ہے جو ہمیں زمانے کا ڈر ہو۔'' وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''میں زمانے کے ڈر سے ہی اسے باہر جانے... نہیں دیتی۔ میں نے سات پردوں میں چھپا کے رکھا ہوا ہے اپنی بیٹی کو مگر......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کے جبار کی طرف دیکھنے لگی۔

''مگر کیا؟'' وہ اسے شعلہ فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''مجھے تمہارے بھانجے کا یوں سر اٹھا کر گھر چلے آنا اچھا نہیں لگتا۔''

زینت نے آخرکار دھماکا کر ہی دیا لیکن جبار کا تاثر اس کی توقع کے خلاف تھا۔

''ارے تم کوئی غلط خیال دل میں نہ لاؤ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن سمجھتے ہیں۔'' جبار بھانجے کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔

''غلط فہمی میں تو آپ ہیں۔'' زینت، امتیاز کی حمایت کہاں برداشت کر سکتی تھی، بھڑکتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' جبار بھی اس کا لہجہ دیکھتے ہوئے بھڑک اٹھا۔ زینت نے اسے آج کی روداد لفظ بہ لفظ سنا دی۔

جبار یہ سن کر آگ بگولہ ہوگیا۔ وہ چھلانگ مار کے بیڈ سے اترا۔ ''یہ بات ہے تو میں آج ان دونوں کا ہی کام تمام کر دیتا ہوں۔''

''پاگل مت بنو جبار ایسے میں ہماری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ میں ایسا کرتی ہوں کل ہی میکے جاتی ہوں اور اپنے بھائی کے بیٹے سے رشتہ پکا کر کے آتی ہوں۔'' زینت نے اپنے دل کی خواہش ٹھیک وقت پہ اپنے شوہر کو بتائی۔

''ٹھیک ہے تم یہ کام کر کے آؤ، ایک کام میں بھی کرتا ہوں۔'' جبار پُرسوچ انداز میں بولا۔

☆......☆

دوسری طرف گاؤں کا وڈیرہ امتیاز کی محنت اور زمین کی پیداوار دیکھ کر اس زمین کو ہڑپنا چاہتا تھا مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اس زمین پر قبضہ کرے۔ مشورہ کرنے کے لیے اس نے اپنے منشی سے پوچھا۔ ''امتیاز کی زمین تو سونا اگل رہی ہے۔ کرم داد، تم کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے اس کی زمین حاصل کی جائے۔''

کرم داد اس کی بات سن کے سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ لمحات کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''سرکار ایک سال پہلے امتیاز نے سود پر پیسے لیے تھے اور اتار بھی دیئے تھے۔''

''تو اس میں زمین حاصل کرنے کا تو کوئی حل نہیں۔'' وڈیرے نے بگڑ کر کہا۔

''مائی باپ امتیاز نے سود آپ ہی کے کھاتے میں دینو سے لیا تھا، اب آپ دینو کے ساتھ کچھ لوگ بھیج دیں کہ سود واپس نہیں کیا اس کے پیسے اتنے بنتے ہیں وہ واپس کرو۔'' منشی نے مکارانہ لہجے میں کہا۔

وڈیرے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''واہ یہ کی ناں تم نے کام کی بات۔'' منشی کے چہرے پہ مکارانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تو سرکار پھر سود دینے والے کو بلا لوں۔'' وہ اسی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آج ہی اسے پیغام بھیجو کہ وڈیرہ سائیں تمہیں یاد کر رہے ہیں۔'' وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ منشی اس کی بات سنتے ہی ایک ملازم کو آوازیں دینے لگا۔

☆......☆

امتیاز کھیتوں میں مصروف تھا کہ اس نے تین چار لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ قریب پہنچے تو امتیاز نے انہیں

پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جن سے امتیاز نے قرض سود پر حاصل کیا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کے رک گئے۔ ایک شخص آگے بڑھ کے غصے سے بولا۔ ”تم نے پیسے واپس کیوں نہیں کیے؟ تمہارے پیسے واپس نہ کرنے کی وجہ سے سود دوگنا بڑھ چکا ہے۔“

امتیاز حیرت سے بولا۔ ”وہ تو میں کب کا لوٹا چکا ہوں۔“

سود دینے والوں کو تو جیسے کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ وہ اسے مارنے پیٹنے لگ گئے کہ کب دیا تھا، کس کے سامنے دیا تھا۔ جھوٹ بولتے ہو۔

امتیاز تین کے مقابلے میں اکیلا تھا۔ وہ ان سے مقابلہ نہ کر سکا۔ وہ بے دم ہو کے نیچے گر گیا۔ سود دینے والے اس کے ٹریکٹر پر سوار ہو گئے۔ ایک شخص ٹریکٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹریکٹر ہم لے جا رہے ہیں۔ یہ تمہیں تبھی واپس مل سکتا ہے جب تم سود کی رقم واپس کرو گے۔“ امتیاز بے بسی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا وجود غصے سے کھول رہا تھا۔

☆......☆

اگلے دن امتیاز اپنے باپ کے ساتھ گاؤں کے وڈیرے کے پاس گیا۔ وڈیرہ اپنے مصاحبین کے ساتھ بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا کہ ایک ملازم نے اسے امتیاز اور اس کے باپ کی آمد کی خبر دی۔

”انہیں اندر بھیجو۔“ وڈیرے نے ملازم کو حکم دیا۔ اس کے چہرے پر مکارانہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

امتیاز غصے میں تھا تاہم اس کا باپ عاجزی سے بولا۔

” صاحب، آپ کے لوگوں نے ہم سے زیادتی کی ہے سود کے پیسے کب کے واپس کر چکے ہیں مگر کل انہوں نے آ کر مار پیٹ کی اور ٹریکٹر بھی لے گئے۔“

”دیکھو پیر بخش یہ لوگ بیشک میرے ہیں مگر میں ان کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ ان کا اور تمہارا کیا معاملہ ہے مجھے نہیں پتا۔“ وڈیرہ مکاری سے بولا۔

”مگر سرکار ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ ہمارے تو مائی باپ آپ ہی ہو۔ ہم اس ظلم کی شکایت آپ کے پاس نہیں لے کے آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔ ان سے کہیں، کھاتے والی کتاب آپ کو دکھائیں، جس میں اس نے میرے سامنے سب حساب ختم کیا تھا۔“ پیر بخش عاجزی سے بولا۔

مگر وڈیرے نے دوٹوک اور روکھے لہجے میں کہا۔ ”بابا مجھے اس مسئلے سے دور رکھو اپنا جھگڑا خود نمٹاؤ۔“

اس کا ٹکا سا جواب سن کے پیر بخش اور امتیاز لوٹ آئے۔ اب ان کے پاس اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ حل ان کے مسئلے کا حل نہیں بلکہ ایک نئے مسئلے کا پیش خیمہ ہے۔

☆......☆

اگلے دن امتیاز پولیس اسٹیشن این سی کٹوانے گیا مگر وہاں الٹا امتیاز کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تین دن اور راتیں مسلسل اس پر تھرڈ ڈگری آزمائی گئی اور یہ زور دیا گیا تم اقرار نامہ لکھ کر دو کہ وڈیرے کے گھر پر تم نے ڈاکا ڈالا تھا۔ تین دن کے بعد اس کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی اس کے گھر والے کچھ رشوت دے کر اور کچھ منت سماجت کر کے اسے چھڑوا کے لے گئے مگر پولیس والوں نے کہا کہ ایک ہفتے بعد آئیں گے یا تو اقرار نامہ لکھ کر دینا یا پھر اپنی ساری زمین وڈیرے کے نام لکھ کر دینا ورنہ زندہ نہیں بچو گے۔

امتیاز کے باپ نے یہ سن کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ”سائیں ہم پر رحم کرو ہم غریب مزدور آدمی اسی زمین پر محنت کر کے گزارا کرتے ہیں وہ زمین ہی ہمارا اثاثہ ہے۔“

تھانے دار نے ایک غلیظ گالی بکی اور چنگھاڑتے ہوئے بولا۔ ”پیرو، بکواس بند کر۔ ورنہ تجھے بھی بیٹے کے ساتھ اندر الٹا لٹکا دوں گا۔“

پیر بخش کو اندازہ ہو گیا کہ امتیاز کی جان زمین کے بدلے ہی چھوٹ سکتی ہے۔ اس نے مجبوری کے عالم میں یہ تلخ گھونٹ بھر لیا۔ اس نے زمین کے کاغذات پر دستخط کرنے کی رضامندی دے دی۔ امتیاز کا خون کھول رہا تھا مگر وہ بے بس تھا۔

پیر بخش اپنے بیٹے کو گھر لے کر آیا جہاں اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر سارے گھر والے پریشان ہو گئے۔ اس کی ماں رونے لگی۔

امتیاز تین دن کے اندر یہ سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں شریف لوگوں کی کوئی جگہ نہیں خاص طور پر دیہاتوں میں جہاں پر جنگل کا قانون چلتا ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بھی اپنا جنگل خود بنائے گا جہاں اس کا قانون چلے گا۔ دو دن کے بعد گھر والوں سے یہ کہہ کر گیا کہ میں شہر جا رہا ہوں جہاں کچھ دن لگ جائیں گے۔

اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ یہ اس کے گھر والے نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے اجازت دے

دی۔

شہر جا کر امتیاز نے اپنے دوست کے توسط سے ایک پستول اور ایک ڈبل بیرل بندوق خرید لی کیونکہ توے کی دہائی میں ہتھیار آسانی سے نہیں ملتے تھے۔

واپس گھر آ کر بندوق اپنے باپ کو دی اور کہا۔ ''بابا وڈیرے نے کھل کر ہم سے دشمنی کا اعلان کر دیا ہے اس لیے میری غیر موجودگی میں یہ بندوق کام آئے گی۔''

پیر بخش جس نے ساری زندگی سادگی اور جھگڑوں سے دور رہ کر گذاری تھی بندوق دیکھ کر سہم گیا اور بولا۔ ''دیکھو بیٹا ہم غریب لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ لڑ نہیں سکتے۔''

''بابا میں لڑنے کی بات نہیں کر رہا بس اپنا دفاع کر سکیں اس لیے یہ بندوق لایا ہوں۔'' امتیاز نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا لیکن اس کا باپ ناسمجھی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆

رات کا اندھیرا ہر طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ باہر شدت کی سردی تھی لیکن امتیاز کے اندر الاؤ دہک رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا، مرکزی سڑک سے اتر کر کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا۔ وہ ایک ضروری کام سے شہر گیا تھا اور اب وہ واپس گھر جا رہا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا تھا اور کھیتوں کی طرف مڑ گیا تھا ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ گاہے بگاہے کتے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کو بے دھیانی سے سنتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں مشغول چلتا جا رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ وہ چونک کے رک گیا۔ آواز اس کے لیے جانی پہچانی تھی، لیکن جو جملہ اس کے کانوں نے سنا تھا۔ اس نے گویا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔

''خبردار جو بھاگے، گولی مار دوں گا، جو کچھ بھی ہے سب نکالو۔'' امتیاز ایک ٹک اپنے گرد موجود ہیولوں کو گھورتا رہ گیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھا رکھی تھیں۔ جن کی روشنی میں بس اتنا ہی پتا چل رہا تھا کہ آنے والوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے ہیں۔

چند لمحوں بعد آواز دوبارہ گونجی۔ ''سنا نہیں تم نے، اپنی جیبیں خالی کر دو۔''

امتیاز بولا۔'' اگر میری جیبیں خالی ہوں تو کیا کرو گے؟''

''تو ابھی تمہارے سینے میں ایک سوراخ کر کے نہر میں پھینک دیں گے۔''

بولنے والا اس بار خوفناک لہجے میں بولا۔

''مگر یار فرید تم تو یاروں کے یار تھے اپنے پرانے دوست کو مارتے ہوئے ہاتھ نہ کانپیں گے تمہارے؟'' امتیاز کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ اس کے دوست فرید کی آواز ہے۔ اس نے پہچان لینے کے بعد فرید سے کہا۔

یہ بات سن کر فرید کے گروہ کا ایک آدمی آیا اور فرید سے کہا۔ ''اس نے تم کو پہچان لیا ہے اب اس کو زندہ چھوڑا تو ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔''

''نہیں پہلے تھوڑی روشنی کرو میں اس کا چہرہ دیکھوں یہ ہے کون۔'' فرید نے اس آدمی کو کہا۔

روشنی ہونے کے بعد فرید اس کو دیکھ کر گہری سوچ میں پڑ گیا پھر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ''تم امتیاز ہو نا میرے کلاس فیلو؟''

امتیاز وڈیرے کی جانب سے خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں وڈیرہ اس کے کھیتوں کو آگ نہ لگا دے، چوکیداری کی غرض سے وہاں جا رہا تھا کہ بیچ میں یہ لوگ ٹکرا گئے تھے۔

''ہاں فرید ٹھیک پہچانا تم نے میں امتیاز ہی ہوں۔'' امتیاز نے فرید کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

فرید اس کے ہاتھ کو پکڑے اندھیرے میں کھینچ گیا اور امتیاز سے حال احوال پوچھنے لگا۔ امتیاز نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ فرید کو ڈاکو کے روپ میں دیکھ کے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی مشکل وقت میں فرید اس کی مدد کر سکتا ہے یا نہیں۔

''تم بتاؤ، تم تو بہت شریف تھے ڈاکو کیسے بن گئے؟'' امتیاز نے فرید سے پوچھا۔

جواب میں فرید نے جو بتایا وہ امتیاز کے حالات سے کسی طرح مختلف نہیں تھا۔

فرید نے کہا۔'' امتیاز اگر وڈیرہ تمہیں زیادہ تنگ کرے تو مجھے اطلاع کر دینا مجھ سے جو بن پایا میں کروں گا اور ہاں کسی کو مت بتانا کہ آج یہاں لوٹ مار میں نے کی ہے۔''

''کیا مطلب، مجھے لوٹنے کی کوشش سے پہلے بھی تم یہاں لوگوں کو لوٹ چکے ہو۔'' امتیاز حیرانی سے بولا۔

''ہاں آج رات، دو گھنٹے میں ہم ایک موٹر سائیکل اور چند ہزار روپے مختلف راہگیروں سے لوٹ چکے ہیں۔ بس تم کسی کو یہ بات بتانا مت۔'' فرید نے ایک بار پھر اسے تنبیہہ

کی۔

''تم بے فکر رہو۔ میں کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے فرید کو تسلی دی۔ فرید کے جانے کے بعد وہ اپنے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

دوسری صبح وڈیرے کے گرگے امتیاز کے گھر آئے اور سود دینے والے نے کہا۔ ''امتیاز یا میرے پیسے مجھے واپس کرو یا زمین کے ان کاغذات پر دستخط کرو۔''

''جاؤ وڈیرے کو کہہ دو میں نہ پیسے دوں گا نہ زمین جو کرنا ہے کرلو۔'' امتیاز نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ سود دینے والے کے اشارے پر سارے لوگ امتیاز اس کے باپ اور چچاؤں پر پل پڑے پہلے تو امتیاز اور اس کے گھر والوں نے اچھا مقابلہ کیا مگر ان کی تعداد وڈیرے کے آدمیوں سے کم تھی اس لیے مار کھاتے کھاتے بے جان ہوگئے۔ وڈیرے کے آدمیوں نے زبردستی پیر بخش کے انگوٹھے کے نشان زمین کے کاغذات پر لگوا لیے۔

امتیاز تھوڑی دیر کے بعد اٹھا اور سب کو سہارا دے کر اندر لے گیا۔

''میں تو کہتا ہوں ہم یہ زمین وڈیرے کو دے کر اس گاؤں سے نکل چلتے ہیں۔'' پیر بخش کے بھائی وارث علی نے کہا

''چچا یہ گھر اور گاؤں ہم کسی طور پر نہیں چھوڑ سکتے چاہے کچھ بھی ہوجائے۔'' امتیاز نے جذباتی لہجے میں کہا۔ وہ سب کی دلجوئی کر کے باہر آیا۔

اپنے گھر والوں کے ساتھ وڈیرے کی طرف سے کیا گیا ظلم وستم وہ اب مزید برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے راست اقدام اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اسے فرید کی مدد درکار تھی۔ اس نے فرید کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملے۔ فرید رات کے اندھیرے میں اس سے، اس کے کھیتوں پہ ملنے آیا۔ امتیاز نے اسے اپنا سارا منصوبہ گوش گزار کردیا۔ وہ امتیاز کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگیا۔

وہ رات بہت بھیانک رات تھی کیونکہ اس رات میں کوئی ایک نہیں بہت سے واقعات رونما ہوئے جو کہ اس چھوٹے گاؤں میں بہت بڑی بات تھی۔

امتیاز فرید کے ساتھ رات کے اندھیرے میں وڈیرے کے گھر کی طرف ڈاکا ڈالنے جارہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ایک انجان خطرہ اس کے گھر کی طرف بھی بڑھ رہا تھا۔

''فرید ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ کوئی شور اور آواز نہ ہو اور ہم کسی کا خون بہانے سے بچ جائیں۔''

''تم کہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا مگر ضرورت پڑنے پر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' فرید نے سیدھی بات کی۔

وہ رات کے تین بجے وڈیرے کے گھر میں داخل ہوئے اور بچتے بچاتے ہوئے وڈیرے کے گھر سے سارا روپیا اور زیور چرا کر باہر نکلے۔ امتیاز نے باہر جاتے ہوئے اسٹور روم کو آگ لگادی ابھی وہ دیوار کود کر باہر نکلے تو کہیں سے فائر کی آواز سنائی دی۔

امتیاز جب وڈیرے کے گھر میں ڈاکا ڈال رہا تھا ٹھیک اسی وقت وڈیرے کے لوگ ڈھاٹا باندھے اس کے گھر میں داخل ہوئے سب کو اٹھا کر مارا پیٹا اور امتیاز کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ جواب میں بتایا گیا کہ وہ دوست کی شادی میں شرکت کرنے شام سے ہی شہر گیا ہے۔ ڈھاٹا پوشوں نے ان کو باندھ کر گھر کو آگ لگادی اور فائرنگ کرتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

☆......☆

جب زرینہ نے دیکھا کہ اس کی ماں اپنے بھانجے سے اس کا رشتہ طے کر کے آئی ہے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ رو رو کے خود کو ہلکان کرلیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سوچ سوچ کے اس کا سر درد کرنے لگا تھا لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کتنی ہٹ دھرم ہے۔ وہ جو کرنے کا ٹھان لیتی ہے، کر کے چھوڑتی ہے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنے حق میں اپنے ماں باپ کے سامنے آواز اٹھاتی۔ وہ اگر رشتے سے انکار کرتی تو اس کا باپ تو اسے زندہ زمین میں گاڑ دیتا۔

جہاں عقل وشعور کے دروازے بند ہوتے ہیں وہاں صرف موت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ زرینہ نے بھی ایسا ہی ایک خطرناک فیصلہ کرلیا۔ وہ اب سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے دل میں اپنے ماں باپ کے خلاف نفرت کا سمندر موجزن تھا۔ وہ ان سے بات نہیں کرسکتی تھی لیکن انہیں ایسی تکلیف دے سکتی تھی کہ ساری زندگی وہ اپنے غلط فیصلے پر ملال کرتے رہتے۔

جب سب سو گئے تو وہ اٹھی۔ ان کے باورچی خانے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھا تھا۔ اسے جلانے کے لیے مٹی کا تیل ہمہ وقت ان کے گھر موجود رہتا تھا۔ اس نے تیل کی تلاش میں پورا باورچی خانہ چھان مارا لیکن اسے تیل نہ ملا۔ اس نے چولہے میں سے ہی سارا تیل نکال لیا۔ وہ اس وقت جس

کیفیت میں تھی اس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت سلب کرلی تھی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر مٹی کا تیل پی لیا۔ تیل پینے کے بعد وہ لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے پیٹ میں درد شروع ہوگیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اندر آگ جل رہی ہے۔ پہلے پہل وہ تکلیف برداشت کرتی رہی لیکن جب تکلیف کی شدت بڑھ گئی تو وہ درد سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخ وپکار سن کر سب لوگ جاگ گئے۔ زینت اس کی طرف دوڑی۔ اس نے اس کے منہ سے مٹی کے تیل کی بو سونگھ لی۔ وہ زرینہ کے حلق میں انگلیاں ڈال کر اسے الٹی کروانے لگی۔

جبار اس کی حالت دیکھ کے گاڑی لینے چلا گیا۔

☆......☆

فرید اور امتیاز فائرنگ کی آواز سن کر گھبرا گئے اور بھاگتے ہوئے کھیتوں میں گھس گئے۔ امتیاز نے فرید سے کہا۔ ”یہ سارا مال تم لے جاؤ بعد میں تم سے حصہ لے لوں گا۔“

فرید جواب میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لوگوں کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں اور اس کے گھر والی سائیڈ پر آگ کے شعلے دکھائی دیے۔

وہ اپنے گھر کی طرف دوڑا کہ کہیں اس کے گھر کو تو آگ نہیں لگی۔ وہ جیسے گھر کے قریب پہنچا اس کا اندیشہ سچ بن کر سامنے آگیا۔ وہ جیسے ہی گھر پہنچا تو کچھ لوگ آگ بجھانے کے لیے پانی پھینک رہے تھے اور دو تین لوگ اس کے گھر والوں کو رسیوں سے آزاد کرا رہے تھے۔

”بابا یہ کس نے کیا مجھے بتاؤ میں اس کے گھر کو آگ لگا دوں گا۔“ امتیاز نے حلق کا پورا زور لگا کر چیختے ہوئے کہا۔

”بیٹا تم کچھ نہیں کر سکتے وہ وڈیرے کے آدمی تھے۔“ پیر بخش نے روتے ہوئے کہا۔

”کاش آج وڈیرے کا کام تمام کر دیا ہوتا موقع بھی تھا۔“ امتیاز نے دل میں سوچا۔

”بابا آپ فکر نہ کریں میں کل بڑے صاحب (ایس ایس پی پولیس) کے پاس جا کر اپنی فریاد سناؤں گا وہ کچھ نا کچھ کریں گے۔“ امتیاز نے باپ کو تسلی دی۔

دوسرے روز گاؤں میں ہر کوئی رات کو ہونے والے واقعات پر اپنے ہی اندازے لگا رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا وڈیرے کی فلاں وڈیرے سے دشمنی ہے اس نے وڈیرے کے گھر ڈاکا ڈلوایا اور گھر کو آگ لگا دی۔ کوئی کہہ رہا تھا اسی گروہ نے امتیاز کے گھر آگ لگائی مگر سب کو پتا تھا یہ کام وڈیرے کا تھا مگر زبان پر کوئی نہیں لا رہا تھا البتہ یہ کسی کو پتا نہ تھا کہ جبار کی بیٹی نے خودکشی کی کوشش کیوں کی۔ شہر کے اسپتال میں وقت پر پہنچنے سے زرینہ کی جان بچ گئی تھی۔

جبار کو اپنی بیوی سے زرینہ کی خودکشی کی وجہ کا علم ہوگیا تھا۔ زینت نے امتیاز کی نفرت میں ساری بات بڑھا چڑھا کے بیان کی تھی۔ امتیاز کے متعلق ساری باتیں جان کے اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ اس پر اعتماد کرتا تھا لیکن اس نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ کسی صورت اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف وڈیرے نے نشان ڈھونڈنے والوں کی وجہ سے یہ پتا کروالیا تھا کہ اس کے گھر میں ڈاکا امتیاز اور اس کے ساتھیوں نے ڈالا تھا۔

”منشی آج رات امتیاز کے کھیتوں میں آگ لگا دو اور امتیاز کو پکڑ کر یہاں لے آؤ۔“ وڈیرے نے منشی کو دانت کچکچاتے ہوئے حکم دیا۔

”جو حکم سرکار کا۔“ منشی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

ڈیرے پر کام کرتے ہوئے ایک مزدور نے یہ بات سن لی جو امتیاز کا خیر خواہ تھا گو کہ وہ کمرے سے باہر تھا مگر اندر کی ایک ایک بات اس تک پہنچ گئی۔ وہ جلدی جلدی کام ختم کر کے امتیاز کے گھر کی طرف دوڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے امتیاز کو کہا۔ ”وڈیرے نے تم کو آج رات مارنے کا پروگرام بنایا ہے تم یہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔“

”اب وڈیرے کی موت اسے بلا رہی ہے۔ آج رات میں ہی اس کو مار دیتا ہوں۔“ امتیاز انتہائی غصیلے لہجے میں بولا۔

”پاگل مت بنو بیٹا یہ وقت ہوش سے کام لینے کا ہے۔“ پیر بخش نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرو کچھ دن حیدرآباد چلے جاؤ وہاں میرا ایک دوست مل میں کام کرتا ہے وہاں تم کو کام دلوا دے گا جب ماحول ٹھنڈا ہوگا میں خود تم کو لینے آؤں گا۔“

”مگر بابا میں ان حالات میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“ امتیاز بے بسی سے بولا۔

”ہماری فکر مت کرو وڈیرہ ہم کو کچھ نہیں کہے گا۔“

آخرکار پیر بخش اسے سمجھانے میں کامیاب ہوگیا اور اسے حیدرآباد روانہ کر دیا۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔ زن اور زمین کی وجہ سے بننے والے امتیاز کے دونوں دشمن حرکت میں آ چکے تھے۔

امتیاز ابھی شہر جانے والی بس میں سوار ہو رہا تھا کہ ایک

پولیس موبائل سے اترتے ہوئے پولیس والوں نے اسے دبوچ لیا۔ پولیس والوں کو جبار نے پانچ ہزار دے کر امتیاز کی چھترول کا کہا تھا۔ امتیاز کو تھانے لے جا کر تشدد کیا جا رہا تھا اسی ٹائم وڈیرہ تھانے میں داخل ہوا۔

''آیئے سائیں آیئے آج کیسے ہم غریبوں کے بھاگ کھل گئے بسم اللہ۔'' تھانے دار چاپلوسی کرتے ہوئے بولا۔

''بس تم لوگ ہی نکمے ہو گئے ہو تبھی کیڑے مکوڑے جیسے لوگ ہمارے راستے میں آجاتے ہیں۔'' وڈیرے نے امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ کے سامنے اس کی ٹانگیں توڑتے ہیں۔''

''نہیں نہیں اب اس کو ہاتھ بھی نہ لگانا میں اس کی ضمانت کروانے آیا ہوں۔'' وڈیرے نے انگلی سے اوپر اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

وڈیرہ تھانے دار کو باہر لے کر گیا اور اسے پچاس ہزار دیتے ہوئے بولا۔ ''امتیاز کو حیدرآباد کے کسی تھانے کی حد میں قتل کراؤ خبردار میرا نام کہیں بھی نہ آئے۔''

تھانے دار جس نے دس ہزار سے زیادہ کبھی رقم نہ دیکھی تھی پچاس ہزار لے کر خوشی میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں سائیں آپ کا کام ہو جائے گا۔''

پیر بخش خوش تھا کہ اس کا بیٹا حیدرآباد پہنچ چکا ہوگا۔ چار دن گذر گئے تھے مگر وڈیرے نے بھی ان کو تنگ نہیں کیا تھا۔ پیر بخش سوچ رہا تھا کہ آج وڈیرے کی طرف جا کر اس سے امتیاز کے لیے معافی مانگے گا۔ اسی ٹائم باہر سے وارث علی بھاگتا ہوا آیا اور روتے ہوئے بتایا۔ ''ابھی تھانے سے ایک پولیس والا اطلاع دے کر گیا ہے امتیاز مانجھند پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا ہے اس کی لاش دو دن سے وہاں پڑی ہے جا کر لے آؤ۔''

پیر بخش یہ سنتے ہی چکرا کر نیچے بیٹھ گیا اور اس کی ماں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

امتیاز کی لاش کو آہوں اور سسکیوں سے دفنایا گیا۔ اس کے گھر والے بین کرتے ہوئے وڈیرے کو کوس رہے تھے۔ اسے بددعا دے رہے تھے۔ جوان اور نسل کو آگے بڑھانے والے بیٹے کی ناگہانی موت نے اس کے والدین کو جیتے جی مار دیا۔ سارے گھر والوں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ وہ دوسرے گاؤں جا کر رہنے لگے۔ امتیاز کی ماں..... جھلاتے ہوئے قاتلوں کو بددعا دیتی رہی۔

کہتے ہیں کہ مظلوم کی آہ عرش کو ہلا دیتی ہے۔ امتیاز کی ماں کی آہ نے بھی عرش کو ہلا دیا۔ عرش والا حرکت میں آگیا اور امتیاز کی موت کے حصے داروں کا مکافات عمل شروع ہو گیا۔

پندرہ سال بعد امتیاز کا ماموں کینسر کی وجہ سے دونوں ٹانگیں کٹوا کر دو سال تک بستر پر ہی رفع حاجت کر کے گند میں پڑا موت کا شکار ہوا اور وڈیرہ ایک ایکسیڈنٹ میں کمر تڑوا کر دس سال بستر پر پڑا رہا تھا۔ وہ ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا۔ اس کی اپنی اولاد کو دیکھے ہوئے بھی کئی سال گذر چکے تھے کیونکہ کوئی بھی اس کے بدبودار وجود کے قریب جانے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مرنے پر اس کی اولاد نے شکر ادا کیا۔

زمین کے ایک ٹکڑے کی خاطر پوری نسل ہی ختم ہو گئی۔

◆●◆

پہلے ڈزنی لینڈ کا نقشہ

کیلیفورنیا میں ایک نیلامی کے دوران پہلے ڈزنی لینڈ پارک کا اصل نقشہ سات لاکھ آٹھ ہزار ڈالر میں فروخت ہوا ہے۔ 1953 میں بنائے گئے اس نقشے کو والٹ ڈزنی نے فنڈنگ حاصل کرنے کے لیے فروخت کیا ہے کیونکہ اس کے اپنے ہی اسٹوڈیو نے فنڈنگ دینے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ سے بنے اس نقشے کو دونوں میں ڈزنی اور مصور ہربرٹ ریمن کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ لاس اینجلس میں وین ایٹن گیلری کے آکشنر مارک ایٹن کا کہنا ہے کہ کافی بہتر بولیوں کے بعد اس نقشے کو سات لاکھ آٹھ ہزار ڈالر میں فروخت کر دیا گیا ہے جس کے بعد یہ ڈزنی لینڈ کا سب سے مہنگا فروخت ہونے والا نقشہ بن گیا ہے۔

ان کا کہنا تھا ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ یہ نقشہ مسلسل سب کی جانب سے سراہا جا رہا ہے۔ خیال رہے کہ پہلا ڈزنی لینڈ کیلیفورنیا میں سو ایکڑ کار پارکنگ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ 60 سال قبل کھلنے والے اس پارک میں اب تک 650 ملین لوگ سیر کرنے کے لیے آچکے ہیں۔

مرسلہ: در طیبہ، ملتان

گناہ گار

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
سرگزشت میں سبق آموز کہانیوں کو ترجیح دی جاتی ہے اس لیے یہ سچ بیانی ارسال کی ہے، اگر سرگزشت کے معیار کی ہے تو اسے ضرور شائع کریں کیونکہ یہ سچ بیانی جرسِ صحرا ہے۔ راہ نما ہے۔ اس سچ بیانی کو پڑھ کر ایک نے بھی خود کو سنبھال لیا تو سمجھ لیں میری محنت پوری ہو گئی۔

ایم زیڈ شیخ
(آزاد کشمیر)

ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ آسمان بھی اس منظر پر شاید اشکوں کی لڑیاں بہا رہا تھا۔ چیخنے چلانے والوں کی دلسوز آہ و فریاد سے ماحول انتہائی غمگین تھا۔ تماشائیوں کی بڑی تعداد موجود تھی کچھ مدد کرنے والوں میں شامل تھے مگر جتنے بھی تھے سب کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ آٹھ اکتوبر 2005ء کا ہولناک زلزلہ گزرے ابھی دو سال ہی تو گزرے تھے کہ "نوشہرہ" اور اس سے ملحقہ علاقے کے باسیوں کے لیے ایک بار پھر قیامت صغریٰ بپا ہو گئی۔

ابھی تو پرانے زخم بھی نہیں بھرے تھے کہ ایک بوڑھا اپنے بیٹے کے گلے لگ کر رو رہا تھا۔ "میرے خدا رحم کر۔" کچھ عورتیں جھولیاں پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ کر چلا رہی تھیں۔ غرض، قیامت کی گھڑی تھی۔ پتھر دل بھی ہوتا تو اس منظر کو دیکھ کر اپنے آنسو نہ روک سکتا۔ ایسے میں ایک آواز آئی تو سب نے اُمید بھری نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مترادف سب کی نظریں مسیحائی کرنے والوں پر تھیں پر شاید دیر ہو چکی تھی۔

☆......☆

شکیل کی دلی خواہش تھی کہ وہ فوج میں چلا جائے مگر اس کی بدقسمتی کہ وہ مڈل کا امتحان پاس نہ کر سکا۔ کسی بھی اسکول سے مڈل پاس کی سند لینا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا مگر وہ اسے غلط سمجھتا تھا۔ اس کے دونوں لنگوٹیے دوست انڈر میٹرک ہونے کے باوجود بھرتی ہو گئے تھے۔ اس نے بہتیرے زور لگایا مگر وہ پرائمری پاس ہی رہا۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر اس نے صبر کر لیا۔ گھر کے حالات کچھ زیادہ ٹھیک نہ تھے، اس کے والد محنت مزدوری کرتے تھے تو گھر کی دال روٹی چلتی تھی۔ جب موسم کی خرابی کے باعث کام نہیں ملتا تھا یا پھر بیماری کا غلبہ ہوتا تو فاقوں تک نوبت آ جاتی تھی۔ ایسے میں اس نے اسکول کی تعلیم کو خیرآباد کہہ کر کوئی کام سیکھنے کا ارادہ کیا۔

کیو اے ٹیلرز کے مالک قدیر احمد نے اسے اپنی شاگردی میں لیا مگر اس کی طبیعت کام میں نہ لگتی۔ تین ماہ گزر جانے کے باوجود وہ کپڑے کاٹ تو لیتا تھا مگر سینے کا کام چند فیصد بھی نہ سیکھ سکا۔ اس کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے وہاں سے اسے فارغ کر دیا گیا۔ اسے شروع دن سے ہی وہ کام اچھا نہیں لگا تھا۔ پہلے ہی دن کالج کی لڑکیوں کے سامنے استاد نے اسے بے عزت کیا تھا تو اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کم از کم استاد قدیر کے پاس کام نہیں سیکھے گا۔ والد سخت طبیعت تھے اس لیے وہ کھل کر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے رویے کی بدولت اس نے استاد کو باور کروا دیا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ پیار، محبت کے چکر اور لڑکیوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی وگرنہ وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ درزی کی دکان پر مردانہ گاہک کم ہی آتے ہیں۔

والد نے اسے دوبارہ ایک دو جگہ درزی کے پاس چھوڑا مگر اس کام سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ ایک سال گزرنے کے باوجود وہ کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہ دے سکا جس کو دیکھتے ہوئے اس کے والد نے اسے درزی بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہوں نے اپنے ایک جاننے والے کے توسط سے اسے سبزی منڈی بھیج دیا۔ صبح سے شام تک وہ بھانت بھانت کی بولیاں سنتا اور شام کے وقت ایک تھیلا سبزی کا اور ایک سو روپیا لے کر گھر لوٹتا۔ گھر والوں کو اور کیا چاہیے تھا پس وہ مطمئن ہو گئے مگر وہ اطمینان چند دن ہی رہا۔

اس کا دل اس کام میں خوب لگ گیا تھا۔ صابر حسین اس سے دو تین سال بڑا تھا، اس لیے اس سے جلد ہی شکیل کی

دوستی ہوگئی۔ دونوں ایک ہی مالک کے لیے کام کرتے تھے اس لیے اکثر اکٹھے ہی ہوتے تھے۔

دن سارا گاہکوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے، بھاؤ تاؤ میں بحث وتکرار ہوتی تو خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ کچھ دن بعد صابر نے اسے ایک کارآمد گر بتایا جس کو سن کر شکیل کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر اس نے صابر کے کہنے کے مطابق ہر چیز کے ساتھ پانچ فیصد ٹیکس لگا دیا۔ وہ اضافی آمدن شکیل کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ مالک کو کچھ خبر نہ تھی کہ ان لوگوں نے خود ساختہ قیمتیں بھی لگا رکھی ہیں۔ بہرحال پتا چل بھی جاتا تو مالک کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچتا اسے تو پورا منافع مل رہا تھا۔ وہ صبح سبزی چھوڑ کر جاتا پھر شام کو واپس آکر حساب کر کے انہیں اپنی دیہاڑی دے کر باقی پیسے خود لے جاتا۔ ان دونوں کے پاس گھر والوں کو دے کر بھی ماہانہ اچھے خاصے پیسوں کی بچت ہو رہی تھی۔

یہ جمعہ کا دن تھا، نماز کے بعد گاہکوں کا رش تھا کہ شکیل کی نظر اس پری چہرہ پر پڑی۔ وہ سبزی دینا بھول گیا بلکہ اس کے ٹماٹروں جیسے سرخ گال اور کھلا کھلا چہرہ دیکھنے لگا۔ اچانک اسے کسی نے پیچھے سے دھکا دیا تو اس کے قدم لڑکھڑائے۔

''بھائی دیکھ کر، مستورات کا خیال کریں۔'' شکیل نے دھکا دینے والے سے نرم لہجے میں کہا۔

''چل کاکے ذرا یہ لسٹ پکڑ اور تمام چیزیں الگ کرتا جا۔'' لڑکی کے پیچھے کھڑے لڑکے نے شکیل سے کہا اور ساتھ ہی اپنا کندھا لڑکی کے کندھے سے ٹکرایا تو لڑکی نے گھور کر اسے دیکھا مگر وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔ شکیل کا خون کھولنے لگا۔ وہ کوئی اوباش قسم کا لڑکا تھا جو غالباً کسی شادی بیاہ میں سلاد وغیرہ کے لیے سبزی لینے آیا تھا۔ اس کی گاڑی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔

''آگے سے ہٹ جا نا دیکھ نہیں رہی دھوپ میں کھڑا ہوں۔'' لڑکے نے کہتے ہوئے ایک اور نازیبا حرکت کی جسے دیکھ کر شکیل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ دوسرے گاہکوں کو نمٹا رہا تھا جب کہ لڑکی اس کے دائیں جانب والی قطار میں کھڑی تھی۔

''بھائی صاحب صبر کریں ویلا نہیں ہوں آپ کے سامنے ہی ہوں، براہ مہربانی بھائی آپ ذرا خواتین کا خیال کریں۔'' اس نے غصے سے کہا اور صابر کی تلاش میں نظریں گھمائیں کیونکہ وہ ابھی تک واپس نہیں پہنچا تھا نماز پڑھ کر۔

''تجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے' بہن ہے' تیری کیا؟''

لڑکے کا جملہ سنتے ہی شکیل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاس رکھی چھری اٹھائی اور چھلانگ مار کر نیچے اترا۔ ''تیری تو......'' اس نے ایک گالی لڑکے کو دیتے ہوئے اس پر پل پڑا۔ پاس موجود لوگوں نے بروقت اس کے چھری والے ہاتھ کو پکڑ لیا ورنہ وہاں خون خرابہ ہو جاتا۔ اس کے منہ
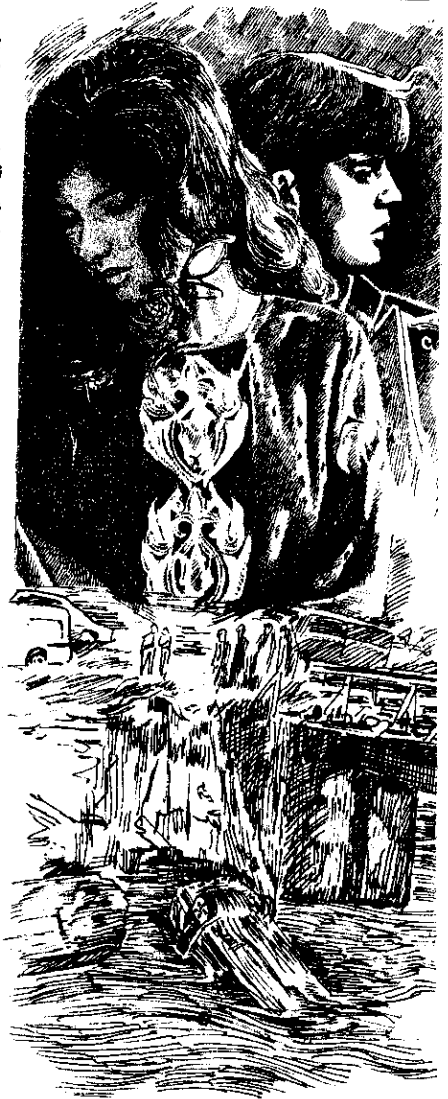
میں جو آ رہا تھا وہ بکتا جارہا تھا جبکہ وہ لڑکا جان بچا کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور نو دو گیارہ ہوگیا۔ شکیل غصے میں بھرا ہوا تھا، لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ کچھ لوگ بنا کچھ خریدے دوسری دکانوں کا رخ کرنے لگے۔ لڑکی بھی شرم کے مارے سبزی لیے بغیر واپس چلی گئی تھی۔ صابر واپس آ گیا تھا اس نے بڑی مشکل سے شکیل کو رام کیا۔ بعد میں شکیل نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

''یار مٹی ڈالو، ایسے واقعات تو روز ہوتے ہیں، شرم وحیا اور غیرت تو اب جیسے ناپید ہوگئی ہے۔''

شکیل اب نارمل ہو چکا تھا۔ آس پاس کے دکانداروں کی بھیڑ اب چھٹنے لگی تھی۔ لوگ ویسے بھی پرائے پھڈے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان دونوں کو اب فکر تھی کہ کہیں مالک تک بات پہنچی تو وہ سرزنش نہ کرے، اس لیے وہ دونوں چپ چاپ اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔

اگلے دن گاؤں میں شادی کے باعث شکیل سبزی منڈی نہ گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی وگرنہ وہ واپس اسٹریچر پر ہی آتا۔ صابر اور مالک کی موجودگی میں اوباش لڑکوں کی ایک ٹولی نے آ کر کل کے واقعہ پر دکان میں توڑ پھوڑ کی۔ وہ سب مشتعل تھے اور کل والے لڑکے کا مطالبہ کر رہے تھے جس نے بدتمیزی کی تھی۔ مالک نے معافی بھی مانگ لی مگر وہ دکان کو خاصا نقصان پہنچا چکے تھے۔ شکیل کو گھر پر پیغام پہنچا دیا گیا کہ وہ کل سے ہرگز سبزی منڈی نہ آئے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس ستم پر وہ تلملا کر رہ گیا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا تیر اب کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ کوئی فلمی ہیرو تو تھا نہیں جو للکارتے ہوئے گھوڑے یا موٹر بائیک پر نکل پڑتا۔

☆☆☆

شکیل کے لیے یہ خبر افسوسناک تھی کہ اب وہ سبزی منڈی میں کام نہیں کر سکے گا۔ اسے مالک کے نقصان کا بھی افسوس تھا۔ وہ حقیقت پسندانہ سوچ رکھنے والوں میں سے تھا اسے معلوم تھا کہ تھانے کچہری تک بات جائے گی تو جیت اس کی ہی ہوگی جو زیادہ پیسا لگائے گا۔ وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے وہاں کام نہ کرنے کا ہی فیصلہ کیا۔ اسے دکھ تھا تو فقط اس بات کا کہ اس کا دل اس کام میں لگ گیا تھا اب کوئی دوسرا کام سیکھنے کے لیے اسے مزید وقت درکار تھا۔

وہ سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا کہ کیا کرے۔ اسے جو کچھ کرنا تھا سرمایہ لگائے بغیر ہی کرنا تھا۔ وہ اسکول کے ایک دوست سے مشاورت کرنے کے بعد ڈرائیونگ سیکھنے لگا۔ اس کام میں مہارت کے بعد اسے پرائیویٹ ٹیکسی مل جاتی جس میں پچاس فیصد کے حساب سے اس کے اور مالک کے درمیان پارٹنرشپ ہوجاتی۔ یہ وہاں کا اصول تھا کہ دن بھر کی بچت مالک اور ڈرائیور کے درمیان تقسیم ہوتی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی دیکھ بھی لی تھی بس اس کے ڈرائیونگ سیکھنے کی دیر تھی۔ ابھی اس نے ڈرائیونگ لائسنس لینے کے لیے درخواست دی ہی تھی کہ اسے ایک اور آفر آ گئی۔ اسے تنخواہ پر ایک پرائیویٹ کالج کی گاڑی چلانی تھی۔ تنخواہ معقول تھی کالج کے ساتھ ساتھ اسکول کے بچے بھی تھے جنھیں صبح اور دوپہر چھٹی کے بعد دو تین پھیرے لگا کر اسکول سے گھر۔ اس نے اپنے دوست سے مشاورت کے بعد ہامی بھر لی۔ گو کہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر وہ اسکول کے بچوں کے لیے انکل بن گیا تھا۔ چونکہ کالج میں نرسری سے انٹرمیڈیٹ تک کلاسز تھیں اس لیے بیک وقت کالج اور اسکول دونوں کہلاتا تھا۔ ابھی اسے گاڑی چلاتے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک دن اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسے لگا چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ اسے وہی ٹماٹر جیسے سرخ رخسار نظر آ گئے۔ ہاں وہ وہی تھی، وہی جس نے پہلی نظر میں اسے دیوانہ بنا لیا تھا۔ ساری دنیا سے بے نیاز وہ مغلیہ سلطنت کی کسی ملکہ کی مانند چلتی ہوئی آئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شکیل کو لگا کہ اس کی گاڑی کی قیمت اور حیثیت کئی گناہ بڑھ گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

☆......☆

شکیل نے حسبِ معمول گاڑی کا بیک میرر ٹھیک کیا، اس کا مقصد نینا کی ایک جھلک دیکھنا تھا۔ اس کا اصلی نام تو ناصرہ تھا مگر پیار سے سب اسے نینا کہتے تھے۔ صبح، دوپہر اس کا دیدار کرنا شکیل کے لیے آبِ حیات کے مترادف تھا۔ اسکول کی وردی میں اسے دیکھ کر شکیل کو کسی حور کا گماں ہوتا تھا۔ نینا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ میٹرک کے بعد سالِ اوّل میں پہنچی تو ایک نئے جہاں کا آغاز ہوا۔ نیا اسکول، نئے کلاس فیلوز جن میں لڑکوں سے بڑھ کر لڑکیاں شرارتی تھیں۔ اس نے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر سرکاری اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر جونہی اس کا بھائی کام پر لگ گیا، گھر کے حالات تھوڑے بہتر ہوئے تو گھر والوں نے اسے پرائیویٹ کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ ساتھ ہی اس کے والد اور بھائی نے اسے متنبہ کیا کہ اگر کسی قسم کی شکایت گھر پہنچی تو وہ دن کالج کا آخری دن ہوگا اس کے لیے۔

اس پابندی کے باعث وہ اکثر لیے دیے رہتی تھی۔

لڑکیوں سے بھی اس کی کوئی خاص دوستی نہ تھی بس دعا سلام کی حد تک۔ باقی لڑکیوں نے تو انت مچا رکھی تھی۔ وہ جب بریک کے وقت انگلی ٹیڑھی کر کے لڑکیوں کو سیٹی بجاتے دیکھتی تو حیران رہ جاتی کہ ایسی بھی لڑکیاں موجود ہیں روئے زمین پر۔ اپنے بوائے فرینڈز کا تعارف جس انداز میں کرایا جاتا اسے سن کر شدید کوفت ہوتی۔ اسے لگتا شاید وہ اکیلی ہی کالج میں پڑھنے آتی ہے باقی سب تو وقت گزاری کے لیے آتے ہیں۔ والدین کی عدم توجہ اور پیسے کمانے کی دھن نے نوجوان نسل کو سانڈ کی طرح کھیتوں میں فصل تباہ کرنے کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ فارغ وقت میں لائبریری کا رخ کرتی تھی۔ چپ چاپ اس پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر اسے سکون ملتا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وین کا ڈرائیور شکیل اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ لڑکی تھی اور جنس مخالف کی نظروں کا مطلب سمجھتی تھی، شکیل ایک گبرو جوان تھا، خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی تھا اور وہ اسی کے گاؤں کا رہائشی تھا۔ اس کی بہادری کا مظاہرہ وہ تب دیکھ چکی تھی جب وہ بازار سبزی لینے گئی تھی، بعد میں اسے کسی رشتہ دار سے پتا چلا تھا کہ شکیل کو اس واقعہ کی پاداش میں مالک نے نکال دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس سے متاثر ضرور تھی مگر اپنے بھائی فہد کا چہرہ جب بھی اس کی نظروں کے سامنے آتا وہ کانپ جاتی۔ فہد سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کسی قسم کی شکایت پر اس کے اور اس سے رسم وراہ بڑھانے والے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ گو کہ اخلاقی لحاظ سے وہ گھر میں اور پورے علاقے میں بہت اچھا تھا مگر اصولوں کے خلاف بات پر مرنے مارنے پر اتر آتا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے ناصرہ کو سمجھایا تھا کہ اس کی کوئی بھی شکایت ناقابلِ معافی جرم ہوگی۔ انہی باتوں سے مجبور ہو کر اس نے اپنی زندگی میں حسرتوں اور خواہشات پر تالا لگا دیا تھا۔

اسے یہ سب یاد آیا تو عجیب سی کیفیت اس کے دل پہ طاری ہوگئی مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ مقدم اس کے والدین کی عزت ہے۔ اسے مدرسے کی باجی سے سنا ایک جملہ یاد آیا وہ کہتی تھیں۔ ”لڑکی ایک سفید کپڑے کی مانند پاکیزگی کا نمونہ ہوتی ہے جیسے سفید کپڑوں پر لگا ذرا سا داغ نمایاں نظر آتا ہے اور لوگ سفیدی کو بھول کر اس دھبے کی جانب توجہ مبذول کر لیتے ہیں، ایسے ہی ایک لڑکی کی زندگی کے سارے اچھے کاموں کو بھول کر لوگ اس پر لگے ایک دھبے کو دیکھ کر انگلی اٹھا دیتے ہیں۔“ ان باتوں کو سوچ کر اس نے اپنے آپ کو روک رکھا تھا ورنہ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جسے اندھی عمر (بلائنڈ ایج) کہتے ہیں۔

چھٹی کے وقت وہ کالج کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ شکیل کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی، بظاہر انجان بنی ہوئی نظریں جھکا کر وہ گاڑی میں سوار ہو جاتی۔ شکیل کی دلی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے مگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ذرا سی غلطی کے باعث اس کو اس نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اور وہ اس سہولت کو چھوڑ دینے کے تصور سے ہی کانپ جاتا تھا۔ وہ چپ چاپ

افسر ماہ پوری

یکم دسمبر 1918ء کو ماہ پور چھپرا (بہار) میں ظہیر عالم صدیقی پیدا ہوئے جنہیں شعروادب کی دنیا میں افسر ماہ پوری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ 1936ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مشرقی پاکستان کے مرکزی سیکریٹریٹ میں تقرری رہی۔ اردو کے ساتھ بنگلہ اور انگریزی پر بھی عبور حاصل رہا۔ انقلابی شاعر، قاضی نذرالاسلام کی 25 بنگلہ نظموں کا ترجمہ ”جامِ کوثر“ کے عنوان سے کیا۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے حوالے سے لاہور کے جرائد ادبِ لطیف، عالمگیر اور ماہنامہ نئی قدریں (حیدرآباد سندھ) میں آپ کے افسانے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، کامل رزاقی اور افسر ماہ پوری نے مشرقی پاکستان میں اردو ادب کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ کراچی آنے کے بعد افسر ماہ پوری نے مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے شعراء کے مجموعوں پر تقاریظ، مقدمات اور پیش لفظ لکھے۔ ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کی مجلس احباب ملت اور سطوت میرٹھی کی بزم ندرت کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ غزلوں کا مجموعہ غبار ماہ اور نظموں کا مجموعہ نگار ماہ اور نعتوں کا مجموعہ حرا سے طور تک اردو ادب کے قارئین کو آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔ 15 فروری 1995ء کو افسر ماہ پوری کا انتقال ہوا۔ آخری آرام گاہ کراچی میں بنی۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں، از سید محمد قاسم

مرسلہ: ظفر عابدی۔ کراچی

دل میں تمنا لیے فقط دیدار پر ہی قناعت کیے ہوئے تھا۔ اسے اُمید نہ تھی کہ اس کی دلی خواہش اتنی جلدی پوری ہو جائے گی اور نینا اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرے گی۔ وہ دن اس کے لیے عید کا دن تھا۔

☆......☆

نینا اپنے اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ گاڑی وہاں پہنچی۔ گاڑی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کہ شکیل نے اسے آواز دی کہ وہ فرنٹ سیٹ پر آجائے جہاں پہلے ہی ایک چھوٹا سا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ شکیل نے کہہ تو دیا تھا مگر اسے امید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا۔ پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے خراماں خراماں چلتے ہوئے نینا کو اس کی سمت بڑھتے دیکھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھی تو شکیل ہکا بکا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے گاڑی نہیں ہوائی جہاز ہے اور وہ اسے اڑاتا ہوا لے جا رہا ہو۔ راستے میں جمپ کھڈے دیکھے بغیر وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا کہ کہیں ڈر کر وہ اسے آہستہ چلانے کا مشورہ دے گی مگر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ شکیل پاس بیٹھے لڑکے سے ذو معنی گفتگو کرتا رہا مگر وہ حسنِ مجسم ایک قیمتی مجسمے کی مانند صم بکم کی عملی تصویر و تفسیر بنی رہی۔ سفر تھا ہی کتنا، مگر شکیل کے لیے وہ زندگی کا حاصل تھا بچوں کے جھٹکے لگنے پر چلّانے کی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں وہ بھی اس تیز رفتاری سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس نے کالج پہنچنے پر باہر نکل کر حسرت سے اسے جاتے دیکھا اور گہرے سانس لینے لگا۔ واپسی میں اس کے چہرے پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا تو وہ چونک گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اگر اس نے دیر کر دی تو ممکن ہے اس راہ میں کوئی اور امیدوار بھی سامنے آجائے۔ وہ اٹل ارادہ کر چکا تھا کہ اب اسے اظہارِ الفت کر دینا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

وہ مصمم ارادہ کر چلا تھا اگلے دو تین دن تو اسے موقع نہ ملا اس کے اندر کا لاوا پگھلنے کو تھا۔ عجیب سی کشمکش تھی اس کے اندر اور آخر کار اس نے اظہار کر دیا۔ نینا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا اور فقط اتنا ہی جملہ کہا۔ ''شکل دیکھی ہے اپنی؟'' اس جملے نے وہی کام کیا جو پیٹرول کے ڈرم میں جلتا سگریٹ کا ٹوٹا کرتا ہے۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ تو بات کر کے چلی گئی مگر اسے اپنی آگ میں جلتا چھوڑ گئی۔ دل نے تسلی و دلاسہ دیا ہزار دلائل دیے مگر سب بے کار۔ مرہم لگانے والا ہی جب قاتل بن جائے تو دل پر کیا گزرتی ہے وہی سمجھ سکتا ہے جس پر یہ حالات گزرے ہوں یا جوان حالات سے گزر رہا ہو۔

☆......☆

نینا کو بہت تکلیف ہوئی تھی وہ الفاظ کہتے ہوئے مگر وہ مجبور تھی۔ اپنے گھر کی عزت بچانے کی خاطر اور مزید تعلیم جاری رکھنے کی خواہش کے باعث اسے دل پر پتھر رکھنا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کے ارمانوں کا قتل کرنا تھا۔ وہ بہت روئی اور پھر دل کا غبار نکل جانے کے بعد اس کا ارادہ مزید مضبوط ہو گیا کہ اسے شکیل کے دل میں اپنی نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ وہی نفرت اس کے لیے فائدہ مند رہے گی ورنہ وہ کسی دوسرے راستے پر چلا جائے گا۔ وہ راستہ جس میں سوائے بدنامی کے کچھ نہ ملتا۔

دوسری جانب شکیل نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح پتھر، موم ہو جائے مگر وہ اپنے ارادوں میں اٹل نظر آئی۔ اس نے پگھلنا تھا نہ پگھلی۔ آخر کار بے شمار دفعہ نظر انداز کرنے کے باعث شکیل بددلی کا شکار ہو گیا۔ اس کا دل دنیا داری سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے دو تین اوباش دوستوں کی صحبت مل گئی تھی جو فارغ وقت میں ویران جگہ پر بیٹھ کر نشہ آور اشیا استعمال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس لعنت کا شکار ہوتا چلا گیا۔

اس کے گھر والوں نے کوشش کی کہ وہ شادی کر لے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ بات بے بات لوگوں سے جھگڑا کرنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ ابھی اس کے چند دوست ہی جانتے تھے کہ وہ اس لت کا شکار ہوا ہے۔ بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آتا تھا مگر اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس نے نینا سے بات چیت کرنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ نینا کے امتحانات شروع تھے اس لیے وہ اس کے ساتھ نہیں جاتی تھی۔

یہ سوموار کا دن تھا جب اسے نینا کی یاد نے سخت تنگ کیا ہوا تھا۔ دوستوں سے مل کر اس نے بے انتہا نشہ کیا۔ دن ڈیڑھ بجے وہ نیم غنودگی کی حالت میں گاڑی لے کر اسکول چلا گیا جہاں اسے آج صرف دو ہی پھیرے لگانے تھے۔ وہ بچے لے کر نشے کی حالت میں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا جبکہ بچے خوشی سے اچھل رہے تھے۔ اس کے دماغ پر نشے کی شدت کے باعث عجیب کیفیت طاری تھی جبکہ نینا کی شکل بار بار اس کے سامنے آرہی تھی۔ واپسی پر اچانک ہی اس نے رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اچانک اسے لگا کہ گاڑی کے دائیں جانب سامنے نینا کھڑی اسے بلا رہی ہے وہ یہ بھول گیا کہ اس طرف نشیب میں دریا کی بے رحم موجیں ہیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی دریا کی سمت موڑ دی۔

گاڑی نے سڑک سے نیچے اترتے ہی دو تین کلٹیاں کھائیں اور چھناکے سے دریا میں چلی گئی۔ اسے ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا ہے۔ آخری آواز اس نے جو سنی وہ بچوں کے چلانے کی تھی وہ اس بار خوشی سے نہیں خوف سے چلا رہے تھے۔

دریا کی بے رحم موجیں گاڑی کو اپنی آغوش میں لے چکی تھیں۔ جبکہ بچے چند لمحات کے لیے چیختے رہے پھر ان کی آواز آنا بند ہوگئی۔

☆☆☆

اسکول کی گاڑی کے حادثے کا جس نے بھی سنا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی ماؤں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ڈرائیور بے ہوش تھا کیونکہ جب گاڑی کھائی میں گر رہی تھی تو وہ اچھل کر باہر جا گرا تھا اور کھائی میں گرنے سے بچ گیا اسے ڈھلان پر اُگے پیڑوں نے نیچے گرنے سے بچا لیا تھا۔ اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔ کنارے پر کچھ بچوں کے بستے ملے تھے جو والدین اپنے سینوں سے لگا کر بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ایک یتیم بچے کی ماں کو اپنے بیٹے کا جوتا ملا اس کی حالت پر آسمان سے آنسوؤں کی برسات مزید تیز ہوگئی تھی۔ ''ہائے میرا بچہ آج پہلے دن اسکول گیا تھا۔'' ایک ماں کی آواز آئی۔ ہنگامی کارروائی کرتے ہوئے کچھ بچوں کی لاشیں تھوڑی دیر بعد نکال لی گئی تھیں۔ اس ماں کو دل کا دورہ پڑا تھا جس کے چار بچے بیک وقت لاش کی صورت میں اس کے سامنے لائے گئے تھے۔ ہر گھر کا اپنا دکھ تھا۔ کچھ والدین تو اس بات پر تڑپ رہے تھے کہ ان کے لختِ جگر کی لاش تک نہیں مل سکی تھی۔ رات تک مزید بچوں کی لاشیں بھی ان کے والدین تک پہنچا دی گئی تھیں۔ ابھی بھی کم از کم دس بچوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اسکول کی حاضری کے مطابق پچیس بچے اور بچیاں گاڑی میں سوار تھیں۔ وہ رات نوشہرہ اور اس کے گرد و نواح میں قیامت کی رات تھی۔ ہر گھر میں سوگ کا سماں تھا۔ ٹیلی ویژن پر بھی خبر نشر ہو رہی تھی۔ سانحہ پر سب افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ خاص کر اس ماں کے بارے میں بات ہو رہی تھی جس کے چار لختِ جگر لقمۂ اجل بن گئے تھے اب گھر میں کوئی بھی بچہ نہیں تھا۔

اگلے دن اجتماعی نماز جنازہ ادا کی گئی کچھ بچوں کے لیے غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی گئی اور ان کی لاش جلد مل جانے کے لیے دعا کی گئی۔ اگلے تین دن اسکول میں قرآن خوانی کی گئی اور تمام بچوں کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔ وہ جنت کے پھول تو پہلے ہی معصوم تھے گناہگار تھا تو بس ایک شخص جسے موت نے بھی قبول نہیں کیا تھا۔

شکیل کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ پولیس کو اس نے بیان دیا کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ حادثے کی وجہ کیا بنی۔ کسی کے مطابق بریک فیل، کوئی کہہ رہا تھا اسٹیرن لاک کوئی تیز رفتاری کو وجہ بتا رہا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

شکیل کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ اگلے چند دن میں اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ تحقیقات جاری تھیں۔ سب لوگ اسے حادثہ قرار دے رہے تھے مگر شکیل جانتا تھا کہ یہ سب نشے کی حالت میں ہوا ہے وہ اس کا قصور وار ہے۔

یہ اس کی گھر میں پہلی رات تھی۔ وہ اسپتال میں دوا کے زیر اثر ہوتا تھا۔ اب گھر میں جونہی اس کی آنکھ لگی وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے ہر طرف سے بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی آنکھیں پرنم تھیں مگر اب پچھتانے سے کیا ہوسکتا تھا۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا مگر بچوں کی چیخ و پکار نے اسے سونے نہ دیا۔ اس رات کے بعد ہر رات اسے بچوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی۔ وہ کئی راتیں جاگتا رہا اور آخر کار اس کا دماغ الٹ گیا۔ وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔ گھر اور گاؤں کے لوگ اس کی حالت سے باخبر تھے۔ ان کے خیال میں بچوں کے حادثے کے بعد شاک کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ جبکہ حقیقتاً وہ گناہوں کے بوجھ تلے اتنا دب چکا تھا کہ اسے دنیا کی کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔ اسکول کی وردی میں ملبوس جب بھی کوئی اسے نظر آتا اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ اس کی زندگی ناکارہ ہو چکی تھی۔ اب وہ سارا سارا دن سڑکیں ناپتا اور رات کو گھر آ جاتا۔ اکثر اس پر دورہ پڑتا تھا۔ وہ چیخنے چلانے لگ جاتا تھا۔ اسے بچوں کے ہاتھ اپنے گریبان پر نظر آتے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ دیتا۔

اس سانحے کو گزرے کئی سال ہو چکے ہیں۔ گناہگار اپنے گناہوں کی آگ میں جل رہا ہے۔ وہ اکیلا ہی نہیں اس کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگ بھی بے قصور جل رہے ہیں۔ ایک گھر میں موجود ناصرہ نامی ایک کنواری کے بالوں میں چاندی اتر آئی ہے۔ اس کا منگیتر ایک حادثے میں جاں بحق ہوگیا تھا۔ اب لوگ اسے منحوس سمجھ کر رشتے کی بات کرنا بھول گئے ہیں۔ وہ اکثر سوچتی ہے کہ شاید یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے۔ وہ گناہ جو اس سے سرزد ہوا تھا۔ ایک انسان کا دل توڑنے کا گناہ۔ اسے اس گناہ کی پاداش میں ساری زندگی جلتے رہنا تھا۔

بچھڑ گئے

جناب معراج رسول

السلام علیکم

اس بار جو ''سرگزشت'' بیان کررہا ہوں یہ ہماری وادی کی ایک بیٹی نیلم کی ہے گو کہ تقریباً ایک صدی سے ہماری وادی میں یہی کچھ ہورہا ہے۔ پہلے ڈوگرا راج کے سپاہی ہمیں مسلمان ہونے کی سزا دیتے تھے، اب ہندوستانی سپاہی وہی کچھ کررہے ہیں، نیلم کی یہ داستان ہر مسلمان کے لیے سبق ہے۔

افتخار حسین اعوان

(کشمیر)

روبی ایک پہاڑی پر اداس بیٹھی تھی۔

سورج کا آتشی گولا بہت تیزی سے مغربی افق میں سفر طے کر رہا تھا۔ نیلے نیلے امبر پر ڈوبتے سورج کی سرخی دیکھ کر اس کے دل میں اداسی اور آنکھوں میں بہت سے آنسو امڈ آئے۔ وادی میں کئی دن سے بہت کشیدگی تھی۔ کچھ نوجوانوں کی شہادت نے مقامی آبادی کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

اس وادی کی قسمت بھی بہت عجیب تھی۔ اتنا خون خرابہ ہونے کے باوجود اس کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لیتی۔ یہاں کے رہائشیوں پر اتنے ظلم ڈھائے جاتے تھے کہ انسانیت بھی شرما جائے۔

روبی ایک یتیم لڑکی تھی۔ اسے اپنے والد کی صورت بھی یاد نہیں تھی۔ وہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔ اس کی ماں نے بہت مشقت سے اسے پالا۔

ماں کی پُرخلوص محبت سے وہ بہت خوش باش زندگی گذار رہی تھی۔ وہ اپنی ہمسایہ لڑکیوں کے ساتھ گڈے گڑیا کے کھیل کھیلتی تو گڑیا کے ساتھ گڈا دیکھ کر ذہن میں کہیں تشنگی کا احساس ہونے لگتا مگر ابھی وہ اس احساس کو لفظوں کی شکل دینے میں ناکام تھی۔

آٹھ سال کی عمر میں اسے ماں نے باہر گلی میں کھیلنے سے منع کر دیا۔ وہ اس فیصلہ کی وجہ تو نہ سمجھ سکی لیکن ماں کی نافرمانی اس کی تربیت میں شامل ہی نہیں تھی اس لیے خاموشی سے اس حکم پر عمل کرنے کا وعدہ کرلیا۔

اگلے دن اسکول جاتے ہوئے وہ اپنے ذہن میں ان لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جس سے اس کی سہیلیاں اس فیصلہ کو سن کر ناراض نہ ہوں۔ اسمبلی ہوتے ہی اس نے اپنی سہیلیوں کو یہ خبر سنادی۔

''میری ماں نے بھی مجھے ایسا ہی کرنے کو کہا ہے۔'' نیلم نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''اللہ قسم! ایک ہفتہ پہلے میرے بڑے بھائی نے بھی مجھے باہر نکلنے سے منع کیا تھا لیکن میں چھپ چھپ کر کھیلنے آجاتی تھی۔'' بانو نے شرمندگی دکھائی۔

''لیکن سکھیو! وہ سب ہمیں منع کیوں کررہے ہیں۔ ہم سب اتنے سالوں سے اکٹھے کھیل رہے ہیں اور اب کیسے کھیل پائیں گے؟'' روبی نے الجھے لہجے میں کہا۔

''میں نے اپنے ابا کو امی سے بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ساتھ والے گاؤں میں فوجی بچے اغوا کر کے لے جاتے ہیں اس لیے نیلم کو گھر سے باہر مت جانے دیا کرو۔''

''ہاں۔ میرا بھائی بھی فوجیوں کا ذکر کررہا تھا۔ یہ وہی فوجی ہیں جو بندوق چلاتے ہیں۔'' بانو نے سر ہلایا۔ ''میرا بھائی کہہ رہا تھا اپنی سہیلیوں کو گھر بلا کے کھیل لیا کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم گھر والوں سے اجازت لے لیں گے۔'' ان دونوں نے بیک زبان کہا۔

''روبی تمہارے تو ابو بھی نہیں ہیں۔ تمہاری امی مان جائیں گی ناں۔'' بانو نے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ مان جائیں گی۔'' روبی کو اس کا سوال بہت برا لگا۔

اسکول سے چھٹی کے بعد روبی بہت خاموش تھی۔ گھر پہنچ کر بھی اس کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ شام کو اس کی ماں نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

''کیا بات ہے میری بٹیا ناراض ہے مجھ سے۔ میں نے باہر کھیلنے سے منع کردیا ہے اس لیے۔''

''نہیں امی جان۔ میں ناراض تو نہیں ہوں۔'' اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''تو پھر میری شہزادی اتنی خاموش کیوں ہے؟''

''امی جان! میرے ابو کب واپس آئیں گے؟''

''آپ کے ابو اللہ تعالیٰ کے گھر چلے گئے ہیں بیٹا! وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آسکتے۔'' سلمیٰ نے اپنے آنسو روکے۔

''وہ اللہ تعالیٰ کے پاس اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟''

''انھیں فوجیوں نے مار دیا تھا۔ وہ تو شہید ہیں۔ ایسا مقام ہر کسی کو نہیں ملتا۔'' سلمیٰ نے آسان لفظوں میں اس کی مشکل آسان کرنی چاہی۔

''یہ فوجی کون ہوتے ہیں امی جان؟ نیلم اور بانو بھی ان کا نام لے رہی تھیں۔''

''فوجی وہ بھیڑیے ہیں جو ہماری وادی پر زبردستی قبضہ کر کے بیٹھے ہیں۔''

''ہائے اللہ!! امی جی' بھیڑیے تو بہت ظالم ہوتے ہیں ناں۔ پچھلے سال ایک بھیڑیا نیلم کی بکری کھا گیا تھا۔ ہم سب بہت روئے تھے۔'' وہ خوفزدہ ہوگئی۔

''ہاں میری بچی! یہ بھیڑیے ان سے بھی زیادہ ظالم ہیں۔ تمہارے ابو کو بھی انہوں نے ایسے ہی کھا لیا تھا۔'' سلمیٰ بچی کی نفسیات کے مطابق اسے سمجھانے لگی۔

''میں اب گلی میں بالکل نہیں کھیلوں گی لیکن کیا میں تھوڑی دیر کے لیے بانو کے گھر چلی جایا کروں؟ نیلم بھی وہیں آجایا کرے گی۔''

''ٹھیک ہے میری بچی! چلی جانا لیکن شام ہونے سے پہلے پہلے گھر آیا جایا کرنا۔ شام کو یہ بھیڑیے کھلِ عام گھومتے ہیں۔''

''وعدہ۔ پکا وعدہ۔ میں شام ہوتے ہی لوٹ آؤں گی۔'' اس نے ماں کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

☆......☆

اپنے پاس ایک بکری کے ممیانے کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ شام ہونے ہی والی تھی اور اب اسے اپنے جانوروں کا ریوڑ سنبھالے جلدی سے گھر پہنچ جانا تھا۔ اپنی ماں سے کیا گیا وعدہ آج آٹھ سال بعد بھی اسے یاد تھا۔

سب بھیڑ بکریوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے اکٹھا کرتے ہوئے وہ اپنی سوتی اوڑھنی سر پر اچھی طرح جمائے گھر روانہ ہوگئی۔ جانوروں کو ان کی مخصوص جگہ پر بند کر کے وہ ابھی اندر آئی ہی تھی کہ ایک چبھتی ہوئی تلخ آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

''روبی!! اور روبی کہاں مرگئی تھی تو۔ میں کب سے تیرا انتظار کر

رہی ہوں۔"

"میں مویشیوں کو چرانے لے کر گئی تھی چچی جان! ابھی آئی ہوں" اس نے سہم کر کہا۔

"مویشیوں کو چرانے میں اتنی دیر کیوں لگا دی تو نے؟ کہیں پہاڑی پر کسی لڑکے سے یارانہ تو نہیں لگالیا۔" وہ چیخ کر بولی۔

"کیوں غلط سوچتی ہو چاچی! ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"غلط کی بچی! اگر کبھی ایسی کوئی حرکت کی تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔" چاچی نے دھمکایا۔

"میری ٹانگیں توڑ دو گی تو اپنی خدمت کیسے کرواؤ گی۔" وہ بڑبڑائی۔

"اب وہیں کھڑی وقت ضائع کرتی رہے گی یا کھانا بھی بنائے گی۔ ابھی تیرا چاچا آجائے گا۔ جلدی سے ہاتھ پاؤں چلا۔"

روبی خاموشی سے کونے میں بنے باورچی خانہ میں چلی گئی اور لکڑیاں جلا کر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

آج موسم بہت نم تھا اور یہی نمی لکڑیوں میں بھی موجود تھی۔ کھانستے کھانستے اس کا برا حال ہوگیا۔ دھواں گلے اور آنکھوں میں بری طرح چبھ رہا تھا لیکن روبی کو اسی دھوئیں کی آڑ میں اپنے دل کا غبار ہلکا کرنے کا موقع مل گیا۔

آج اسے اپنی ماں بہت یاد آرہی تھی۔ اس نے روبی کو واقعی شہزادیوں کی طرح پالا تھا۔ اسے گزرا ہوا وقت یاد آنے لگا۔

وہ دس سال کی ہوئی تو سلمٰی کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ وہ گاؤں کے حکیم سے دوائی لے آئی مگر بالکل بھی فرق نہ آیا۔

کچھ دن بعد اسے شدید کمزوری بھی ہوگئی۔ کھانے پینے کا بھی بالکل دل نہ کرتا تھا۔ روبی اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان رہتی۔ اردگرد کی ہمسائیاں اس کی عیادت کے لیے آجاتیں اور کچھ دیسی گھریلو ٹوٹکے بھی بتاتیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے گھر سے کھانا بھی لے آتیں۔

سلمٰی کا بخار دن بدن بگڑتا چلا گیا۔ اب اسے کھانسی بھی رہنے لگی۔ وہ اتنی شدت سے کھانستی تھی کہ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو جاتا پھر کچھ دن اور گزرے تو کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ اس دن سلمٰی بہت پریشان تھی۔ اس نے روبی کو بھیج کر بانو کی امی کو بلوالیا۔

اس کے آنے کے بعد سلمٰی نے روبی کو باہر صحن میں جانے کا حکم دے دیا لیکن روبی نے پہلی بار ماں کی نافرمانی کرتے ہوئے کمرے سے باہر آکر دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور ان دونوں کی باتیں سننے لگی۔

"یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے بہن تم نے؟ بخار میں فرق نہیں پڑا کیا؟"

"نہیں۔ اب تو معاملہ اور بھی خراب لگنے لگا ہے۔" سلمٰی کی نڈھال آواز آئی۔

"میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ بڑے ڈاکٹر کو دکھالو لیکن تم مانی ہی نہیں۔"

"ہاں بہن۔ میں نے غلطی کی۔ کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی۔"

"ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ کل چلے جاتے ہیں۔"

"مجھے کھانسی سے خون آنے لگا ہے۔ مجھے لگتا ہے میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔" سلمٰی مایوسی سے بولی۔

"ایسا نہیں سوچو۔ اللہ تمہیں اپنی بیٹی کے سر پر سلامت رکھے۔"

"میں تمہیں ایک پتا دیتی ہوں۔ تم اس پتے پر خط بھیج دو۔ میرے چاچے کا بیٹا ہے ایک۔ میں اس سے چند معاملات طے کرنا چاہتی ہوں۔"

بانو کی ماں کچھ دیر بعد ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھامے چلی گئی۔ روبی بہت خوفزدہ تھی۔ اس نے اپنی ماں کی صحت کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔

تین روز بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی سلمٰی سے ملنے چلا آیا۔ وہ کمزور جسامت، کھچڑی بالوں اور لمبوترے چہرے کے ساتھ عجیب سا تاثر دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر روبی کو پہاڑی ڈھلوان پر ایک بوڑھا درخت یاد آنے لگا جو کسی کو سایہ نہ دیتا تھا۔

بوڑھے شخص کی آمد کے بعد سلمٰی نے ایک بار پھر روبی کو اپنی سہیلی کے گھر کھیلنے کے لیے بھیج دیا۔ لیکن روبی کا دل اب کھیلنے کو بالکل بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کمرے سے باہر چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"مجھے تمہاری طبیعت کا سن کر بہت دکھ ہوا اس لیے خط ملتے ہی پہلی فرصت میں چلا آیا۔" اس شخص کی آواز بھی کسی مدھم جھرنے کی طرح نرم تھی۔

"میرا تو اب چل چلاؤ کا وقت ہے بھائی ریاض! قسمت نے مہلت ہی نہ دی کہ بیٹی کو اپنے گھر بار کا تحفظ دے سکوں۔" سلمٰی کی گلوگیر آواز نے روبی کا دل مٹھی میں بھینچ لیا۔

"روبی کے والد کی شہادت کے بعد ہی تمہیں کسی سسرالی رشتہ دار کے گھر پناہ لینی چاہیے تھی۔ گاؤں اور وادی کے

حالات تمہارے علم میں ہی ہوں گے۔ بھارتی فوجی تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عورتوں اور بچوں کا قتل عام کرتے ہیں۔ وہ کشمیر کو مکمل طور پر بانجھ کر دینا چاہتے ہیں۔''

''روبی کے والد کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ یتیم خانہ میں پرورش پاتے رہے پھر جہادی تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ بھارتی چوکیوں پر مغوی لڑکیوں کی بازیابی کے لیے حملہ کے دوران میری رہائی بھی انھی کی بدولت ممکن ہوئی۔ میرا گھر بار وہ درندے پہلے ہی جلا کر بھسم کر چکے تھے۔ وہ مجھے سہارا نہ دیتے تو پتا نہیں میں کن حالوں میں ہوتی آج۔'' سلمیٰ کے کھوئے ہوئے لہجے میں اسے پہلی بار اپنے والدین کے ماضی سے واقفیت ہو رہی تھی۔

''میں بھی ان دنوں سرینگر میں ملازم تھا۔ اگر اس حادثہ کا بروقت علم ہو جاتا تو میں تمہارا ہاتھ تھامنے میں ایک پل نہ لگاتا۔''

''نہ نہ۔ بھائی ریاض! ایسا بالکل نہ سوچو۔ میری زندگی میں کوئی ملال نہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک شہید کی بیوہ ہوں۔ اگر پروردگار مجھے اولاد نرینہ عطا کرتا تو میں اسے بھی مجاہد بنانا پسند کرتی لیکن روبی لڑکی ذات ہے۔ کمزور ہے۔ تم بس مجھ پر ایک احسان کر دینا۔ میرے بعد روبی کی سرپرستی میں کوئی کوتاہی نہ کرنا ورنہ میری روح تب بھی بیقرار رہے گی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

روبی اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ رکھتی تھی۔ وہ بھاری قدموں اور بوجھل دل لیے صحن میں سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ اپنا سر گھٹنوں میں دیئے وہ بے آواز روتی رہی۔ کچھ دیر بعد ریاض نے اس کے پاس آ کر شفقت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنی ماں کا آخری دیدار کر لو بیٹی! وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی ہے۔''

روبی دھاڑیں مارتی ہوئی ماں کی میت سے جا لپٹی۔ اس کے آنسو اور تڑپ بھی ماں کے مردہ تن میں کوئی حرکت پیدا نہ کر سکی اور وہ خاک اوڑھے ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے دور ہو گئی۔

اگلے روز ریاض اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آیا۔ رستے میں وہ اسے اپنی بیوی کی عادات اور مزاج کے متعلق آگاہ کرتا رہا مگر وہ بے دھیانی میں ہوں ہاں کرتی رہی۔ ریاض ایک سرحدی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی بیوی نے سخت الفاظ اور کرخت لہجے سے اس کا استقبال کیا۔

''یہ کسے اٹھا لائے ہو اپنے ساتھ؟'' اس کی چبھتی ہوئی آواز سماعت کو بہت ناگوار گذرتی تھی۔

''میری چچیری بہن سلمیٰ کی بیٹی ہے۔ اس کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں۔''

''تو اسے یہاں کیوں لے آئے، کسی یتیم خانہ میں بھرتی کرواتے۔''

''خدا کا خوف کرو گلبدن بیگم! میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے بیٹی کی طرح پالوں گا۔''

کتاب الھند

اس شہرہ آفاق کتاب کا پورا نام ''تحقیق مالِلہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ'' ہے۔ اس کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے سال ہا سال تک البیرونی نے پنجاب میں مشہور ہندو مراکز کی سیاحت کی، اور سنسکرت جیسی مشکل زبان سیکھ کر اس کے قدیم لٹریچر کو براہ راست خود پڑھا۔ پھر ہر قسم کی مذہبی، تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی معلومات کو جو اہلِ ہند کے بارے میں حاصل ہوئیں اس کتاب کے اوراق میں قلم بند کر دیا۔ البیرونی اگرچہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اہلِ ہند سے بالکل جدا مذہب رکھتا تھا لیکن اپنی کتاب میں اس نے ہندوؤں کے خیالات کا کہیں مذاق نہیں اڑایا اور نہ ان کے مذہب اور رسوم و عبادات کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے کیونکہ اس کے قول کے مطابق یہ باتیں ایک محقق کی شان سے بعید ہیں۔ اس نے اہلِ ہند کی داستان اپنے قلم سے عربی زبان میں اس مفہوم کے ساتھ بیان کر دی ہے جیسی ہندو عالم سنسکرت زبان میں اپنے اہلِ مذہب کے سامنے خود بیان کرتے ہیں۔ البیرونی پہلا شخص ہے جس نے ہندوؤں کے پرانے اور دیگر مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت گیتا، رامائن، مہا بھارت اور منوسمرتی وغیرہ کے اقتباسات کو عربی زبان میں ڈھال کر کتاب الہند میں پیش کیا اور اس طرح ہندوؤں کے قدیم ادبیات کو مسلمانوں سے خصوصاً علما کو عموماً متعارف کرایا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرا سٹی کراچی

''کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہو گی۔ اتنا خرچا کیسے برداشت کرو گے۔ ٹھیکیدار کی زمین پر کاشتکاری کی اجرت سے گھر کا نظام پہلے ہی بہت مشکل سے چلتا ہے۔''

''اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل نکال دے گا۔'' ریاض نے بے نیازی سے کہا۔

''اگر لانا ہی تھا تو کسی لڑکے کو لے آتے۔ بڑھاپے کا سہارا ہی بن جاتا۔''

''بیٹیاں بھی سہارا ہی ہوتی ہیں۔ روبی تمہیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ یہ بھی ہماری خدمت ہی کرے گی۔''

گلبدن نے شوہر کی اسی ایک بات کو اپنی گرہ سے باندھ لیا۔ اس نے روبی سے گھر کے تمام کام کاج کروانے شروع کر دیئے اور اسی جبر کی چکی میں پستے وہ اپنی عمر کے سولہویں سال میں آ گئی تھی۔

وادی کے حالات اس عرصہ میں مزید خراب ہو گئے تھے۔ سرحدی گاؤں ہونے کی وجہ سے یہاں آئے روز بھارتی فوج کی گولہ باری سے جانی نقصان کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ چھ ماہ پہلے ریاض بھی ایسی ہی ایک گولہ باری کی زد میں آ گیا۔

ریاض کی ٹانگوں پر بارودی ذرات کی وجہ سے زہریلے اثرات پیدا ہو گئے اور اس کی ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔ اس معذوری کے ساتھ وہ کھیتی باڑی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ گھر میں پہلے سے جمع شدہ کچھ رقم اس کے علاج میں صرف ہو گئی اور پھر نوبت فاقوں تک آ پہنچی۔

گلبدن کی بیزاری اور چڑچڑاپن بھی ان دنوں عروج پر تھی۔ اولاد سے محرومی کے دکھ نے اسے پتھر دل اور سخت مزاج بنا دیا تھا۔ وہ روبی کو بھی کبھی دل سے تسلیم نہ کر سکی۔ صورتِ حال دن بدن بگڑتی جا رہی تھی پھر ایک دن گلبدن نے اپنی بیوہ ہمسائی کا ریوڑ چرانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس نے یہ کام روبی کے ذمہ لگا دیا۔

روبی اس نئی ذمہ داری سے بہت خوفزدہ تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس گھر میں رہائش اور تحفظ کے احسانات چکانے کا وقت آ گیا ہے اس لیے بادل ناخواستہ اس نے ہامی بھر لی۔ وہ ہر روز انھیں پہاڑی چراگاہ میں لے جاتی اور شام ڈھلنے سے پہلے لوٹ آتی۔

ریاض کی بے بسی اور گلبدن کا رویہ روبی کے دل و دماغ میں گھٹن پیدا کر چکا تھا۔ وہ شدید تنہائی اور یاسیت کا شکار تھی۔ مرحومہ ماں کی یاد تو کبھی بھی دل سے جدا ہوئی ہی نہ تھی۔ وہ مویشیوں کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی اور ایک پتھر پر بیٹھی اپنی زندگی کا گہرائی سے تجزیہ کرتی رہتی۔

اس کے ذہن میں اکثر ایک سوال شدت سے پیدا ہوا کرتا تھا۔ ''میں کیوں زندہ ہوں؟ میری زندگی کا آخر کیا مقصد ہے؟''

دن یونہی اداسی اور بے کیفی سے بیتتے جا رہے تھے۔ ایک روز وہ معمول کے مطابق مویشیوں کو چرانے کے لیے گئی۔ موسم بہت خراب تھا۔ آسمان پر چھائے گہرے سیاہ بادل اور تیز ٹھنڈی ہوائیں بارش کے آثار بتا رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے شام کا گمان ہو رہا تھا۔

اس کے مویشی بھی اس دن بہت اڑیل ثابت ہو رہے تھے۔ تین بھیڑیں ریوڑ سے بچھڑ کر جانے کس جانب نکل گئی تھیں۔ اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی چپل گھسیٹتے ہوئے پہلے بقیہ مویشیوں کو گھر پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔

گھر پہنچتے ہی گلبدن کی صلواتیں عروج پر تھیں۔ اسے بھیڑوں کی گمشدگی کا علم ہوا تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

''ارے کم بخت! یہ نقصان کون پورا کرے گا۔ یاسمین تو میری جان کو آ جائے گی۔''

''تم فکر نہ کرو چاچی! میں انھیں ڈھونڈ لاتی ہوں۔'' وہ موسم کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے بھی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور تھی۔

''اگر نہ ملیں مویشی تو مجھے اپنی منحوس شکل دوبارہ مت دکھانا۔'' صحن عبور کرتے ہوئے اس فقرہ نے اسے بری طرح مجروح کیا۔

وہ ایک بار پھر پہاڑی ڈھلان پر پہنچ گئی۔ یہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا لیکن ہلکی بارش کے باعث ہونے والی پھسلن سے قدم جمانے میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ اپنی بھیڑوں کو تلاش کرتے ہوئے اب پہاڑی ڈھلان سے اوپر جنگل کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

بادلوں سے ڈھکے آسمان کی وجہ سے جنگل میں نیم تاریکی کا سماں تھا۔ یکدم اسے کسی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر دو بھیڑیئے موجود تھے۔ ان کے قریب ہی اس کی بھیڑوں کا نرخرہ ادھڑا ہوا تھا۔ بھیڑیوں کی خون آلود تھوتھنیاں اور گہری چمکدار آنکھوں نے اس کی وحشت وخوف میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور بے تحاشا دوڑنے لگی۔ بچپن سے ذہن میں بیٹھے ایک خوف نے اس کو ہوش وحواس سے بیگانہ

کر دیا تھا۔
سرپٹ دوڑتی اب وہ جنگل کے بیرونی حصہ کی جانب نکل آئی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی اور ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔ مویشیوں کی موت کے بعد گلبدن اور یاسمین کے ہاتھوں بننے والی درگت کا احساس اسے مزید خوفزدہ کررہا تھا۔
اسی وقت اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹی لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے سختی سے دبوچا اور کندھے پر ڈالے ایک کیمپ میں پہنچ گیا۔
یہ انڈین آرمی کا کیمپ تھا جہاں موسم کی رنگینی نے بھارتی فوجیوں کو بے قابو کر رکھا تھا۔ وہاں پانچ افراد موجود تھے۔ میز پر شراب کی بوتلیں رکھی تھیں۔ کیمپ کے ایک کونے میں ایک بہت بڑا صندوق بھی موجود تھا جو فی الحال غیر مقفل نظر آرہا تھا۔
''اس بلبل کو کہاں سے پکڑ لائے ہو راہول؟'' ایک درمیانی عمر کا آدمی اسے دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر روبی کو کچھ دیر پہلے ملنے والے بھیڑیوں کی یاد آگئی۔
''میں باہر پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہیں ایک درخت کے پاس بیٹھی تھی۔'' راہول نے کہا۔
''بھئی واہ! آج تو اور بھی کچھ مانگتے تو ہمیں مل جاتا۔ اس موسم میں ایسی حسین لڑکی تو پربھو کی دیا ہے ہم پر۔'' ایک اور فوجی نے قہقہہ لگایا۔
''لیکن مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔'' راہول بولا۔ ''کہیں یہ مسلوں کی جاسوس تو نہیں۔''
''اگر جاسوس ہے تو پھر تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اسے اس جرأت پر خوب انعام دیں گے۔''
روبی کی رہی سہی ہمت بھی ختم ہونے لگی۔ ان بھارتی فوجیوں نے اس کا لباس تار تار کردیا اور باری باری اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ رات گئے یہ کھیل یونہی چلتا رہا۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اپنی موت کی آرزو کرنے لگی۔
''کیا کرنا ہے اس کا اب؟'' اسی ادھیڑ عمر فوجی کی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔ وہ ان کا لیڈر تھا۔
''جیسا آپ حکم کریں سر۔'' راہول کی آواز نشے میں لڑکھڑا رہی تھی۔
''نہیں مار کر پھینک دیتے ہیں اسے۔ صبح ہوتے ہی گاؤں پر حملہ بھی کرنا ہے۔ وہاں سے اس جیسی اور بھی مل جائیں گی۔''
''اس گاؤں کا نام و نشان ہی مٹا دیں گے اس بار۔ کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا۔'' تیسرے فوجی نے کہا۔
''اسی لیے تو آئے ہیں یہاں۔ ان مسلوں کو ایک یادگار زخم دے کر جائیں گے۔'' لیڈر نے کہا۔ ''ہتھیار اور دستی بم ایک بار پھر چیک کر لینا۔ مجھے کہیں کوئی گڑبڑ نہیں چاہیے۔''
''سب کچھ ریڈی ہے سر! بس صبح ہونے کا انتظار ہے۔'' راہول بولا۔
نشہ ان پر مکمل حاوی ہوچکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی وادی میں چلے گئے۔ روبی بمشکل سانس کھینچتی اٹھی اور ایک کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ ان فوجیوں کے عزائم جان کر اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔
اس کے دماغ میں اس وقت ایک ایسا جذبہ طاری تھا جو اسے انوکھی توانائی دے رہا تھا۔ وہ ایک شہید کی بیٹی تھی۔ جسے اپنی بے حرمتی کا بدلہ لینے کے علاوہ سینکڑوں دیگر جانوں کو بھی کسی طرح بچانا تھا۔ روبی کے اندر ایک آتش فشاں سا ابل رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھی اور اس کمرے کی جانب بڑھنے لگی جس کے بارے میں راہول نے اپنے افسر کو بتایا تھا۔
صندوق میں دستی بم موجود دیکھ کر اسے اپنے فیصلہ پر عمل مزید آسان لگنے لگا۔ بچپن میں اسکول میں ایک بار ایسے بم کا استعمال بتایا گیا تھا جو اسے آج بھی یاد تھا۔ اس نے پوری قوت سے صندوق کا ڈھکن پیچھے ہٹایا اور چند بم نکال لیے۔
کھٹ پٹ کی آواز سن کر باہر پہرے پر موجود فوجی بھی اندر چلا آیا۔
''یہ کیا کررہی ہے!'' وہ چلّایا۔
''میں اس دھرتی کی کمزور بیٹی سہی، لیکن میں تم جیسے بھیڑیوں کو مزید شکار نہیں کھیلنے دوں گی۔ میری جنت نظیر وادی بہت مقدس ہے۔ جب تک اس وادی کا ایک بھی فرد زندہ ہے تم لوگوں کے ارادے کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔''
روبی نے ہسٹریائی کیفیت میں کہا اور گرنیڈ کی پن نکال کر مدہوش فوجیوں کی طرف اچھال دیا۔
ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور کیمپ کی دیواریں سرخ رنگ میں لتھڑ گئیں۔
کشمیر کی ایک لاچار، بے بس، مجبور بیٹی نے اپنی جان قربان کر کے اپنے گاؤں کو بچالیا تھا۔

▲▲▲

سلسلۂ عذاب

محترم و مکرم معراج رسول
السلام علیکم
یہ سرگزشت میری ہے۔ میں خود کو اذیت دے رہا ہوں لیکن کیسے یہ آپ کو اس سچ بیانی میں مل جائے گی۔ میں کیوں آوارہ گرد بنا، کیوں ملک ملک شہر شہر گھوم رہا ہوں یہ بات بھی میں نے اس سچ بیانی میں لکھ دی ہے۔
مرشد
(یو ایس اے)

میں ایک شدید اذیت میں مبتلا ہوں، ذہنی اذیت میں۔ میرے گناہ کا، وعدہ توڑنے کے گناہ کا، دھوکا دینے کے گناہ کا کوئی مداوا بھی نہیں ہے کیونکہ رہگزر کی دھول میرے قدموں کے نشانات بھی مٹا چکی ہے۔ اسی لیے میں چاہ رہا ہوں کہ میری آپ بیتی کوئی سن لے اور اگر اس سے کسی کی آنکھیں کھل گئیں، کوئی گرتا ہوا سنبھل گیا تو میرے ذہن کا بوجھ کم ہوجائے گا۔

میری روداد میں اہم موڑ اس وقت آیا جب میں نے گریجویشن کیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کی آفر ہوئی پہلے تین ماہ تربیتی مراحل کے طے کرنے تھے۔ پھر میری صلاحیتوں اور کام دیکھ کر آفیسر گریڈ میں ترقی دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مجھے پروڈکشن سائیڈ پر فیکٹری میں کام کرنا تھا مگر قباحت یہ تھی کہ وہ فیکٹری کئی سو میل دور ایک اجنبی شہر میں تھی۔ اس شہر میں جان پہچان کا کوئی نہ تھا پھر بھی میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔

کپڑوں کا ایک چھوٹا بیگ اور ایک بریف کیس لے کر اسی شہر کو جاتی بس میں سوار ہوگیا۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد بس اس شہر میں داخل ہوئی۔ میرے لیے اس شہر کی عمارتیں، ٹریفک اور چہرے غرض ہر چیز اجنبی تھی۔ ہزاروں چہروں کے بیچ میں میرا کوئی اپنا چہرہ نہ تھا۔ مجھے پہلے دن یہ اندازہ نہ تھا جب اس سفر سے باہر نکلوں گا تو کئی ایک کو اکیلا کر جاؤں گا۔

میں ایک چھوٹے سے شہر سے گیا تھا اور اتنی زیادہ ٹریفک اور بھیڑ دیکھ کر میں ہراساں تھا۔ ایک بڑے چوک پر بس سے اترا، ایک متوسط ہوٹل میں جا کر ایک ماہ رہنے کے لیے کرائے کے کمرے کی بات کی۔ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک بیڈ کے علاوہ میز کرسی رکھی تھی۔ اس تین منزلہ ہوٹل کے بیچ میں صحن تھا اور اردگرد کمرے بنے تھے۔ کمروں کے باہر راہداری تھی جہاں سے صحن میں جھانکا جاسکتا تھا۔ صحن میں ہر وقت چائے پینے اور کھانا کھانے والوں کا رش لگا رہتا تھا۔ وہیں لوگ بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہے ہوتے۔ میں نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا۔

میں پہلی بار اپنے شہر سے باہر نکلا تھا۔ عمر میری بائیس سال کے قریب تھی۔ زندگی کا کوئی تجربہ میرے پاس نہ تھا کہ اسے کس ڈھنگ سے گزارا جاتا ہے۔

یہ میری زندگی کا پہلا پڑاؤ تھا جس میں میں بالکل اکیلا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ تنہائی کتنے عرصے پر محیط ہوگی۔ کمرے میں سامان رکھ کر باہر نکلا تو شور اور بھیڑ سے مجھے وحشت ہونے لگی اور میں فوراً لوٹ آیا اور پھر سے کمرے کی تنہائی میں اپنے آپ کو قید کرلیا۔ میں واقعی اس وقت ایک غریب الوطن تھا جو اپنا کیریئر بنانے ایک نئے ہجوم میں آگھسا تھا۔

میں بنیادی طور پر ایک شرمیلا انسان ہوں۔ کسی اجنبی سے گفتگو میں پہل کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں ہوٹل کے صحن میں بیٹھا اپنے اردگرد کے لوگوں سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یوں بھی میں دوست بنانے میں احتیاط کرتا ہوں اس لیے دوست میرے کم ہیں اور دشمن تو بہت ہی کم ہیں۔ ایک بات اور بتا دوں کہ مجھ میں کوئی خاص بری عادت نہیں ماسوائے اس کے کہ حسن میری کمزوری ہے۔ حسن چاہے وہ چہروں میں ہو، مناظر میں، مجھے فوری اپنی جانب کھینچتا ہے۔

میں جس فیکٹری میں جاب کرنے آیا تھا وہ ایک مشہور کمپنی تھی۔ ہر بندہ اس میں جاب کرنا چاہتا تھا، خواہ لیبر کی ہی جاب کیوں نہ ہو۔ فیکٹری والے لیبر کو صرف چھ ماہ کے لیے رکھتے اور پھر اس کی چھٹی کردیتے۔ پرائیویٹ کمپنیوں کے ذریعے انہیں کنٹریکٹ پر رکھتے تھے تاکہ لیبر یونین سے

خلاصی رہے۔

وہ فیکٹری شہر سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ شہر کے مختلف مقامات سے فیکٹری کو ہر صبح بس لیبر کے لیے چلتی تھی۔ آفیسر کے لیے نئی نکور وین چلتی تھیں۔ میں چونکہ ابھی آفیسر نہ ہوا تھا اسی لیے مجھے لیبر کی بس میں فیکٹری جانا تھا۔ فیکٹری کے پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں لڑکیاں کام کرتی تھیں اور وہ آمدورفت کے لیے بسوں ہی کو ذریعہ بناتیں۔

میں نے ہوٹل کے منیجر سے فیکٹری جانے کے لیے بس کا معلوم کیا تو پہلے وہ مجھے مرعوب ہو کر ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا کہ میں اس مشہور کمپنی میں آفیسر بھرتی ہوا ہوں۔ اسے شاید یقین نہیں آرہا تھا تبھی بار بار میرا جائزہ لیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس ہوٹل سے دس منٹ کی پیدل مسافت پر ایک چوک ہے وہاں سے صبح چھ بجے بس ملتی ہے۔

سردیوں کے دن تھے۔ منہ اندھیرے میں ہوٹل سے نکلا۔ بس لی اور بے ہنگم موسیقی سنتا سات بجے پہلی شفٹ کے ساتھ فیکٹری کے گیٹ پر اترا۔ درجنوں باوردی سیکورٹی گارڈز گیٹ پر تعینات تھے۔

فیکٹری بہت بڑی تھی۔ ایک طویل سڑک کے دائیں جانب اس کی عمارتیں تھیں۔ درمیان میں لیبر میس تھا۔ بائیں جانب قطار در قطار درخت تھے جن کے نیچے پختہ بینچ بنے تھے۔

آفیسرز کا میس گیٹ کے دائیں جانب ایک خوب صورت کاٹیج تھا۔

مجھے اندر لے جایا گیا۔ ضروری کاغذات پر دستخط کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں دنیا کا خوش قسمت انسان ہوں جس کو پہلی جاب ملٹی نیشنل کمپنی میں ملی ہے۔

میرا منیجر مجھے اس لمبی سڑک پر چلاتا ہوا آخری عمارت میں لایا جہاں میرا آفس تھا جو فیکٹری کی مشینوں کے شور کے

درمیان بنا تھا۔

فیکٹری میں کہیں بھی آنا جانا ہوتا تو سب کو اس لمبی سڑک سے ہوکر گزرنا پڑتا تھا۔

گو میں کاغذوں میں ابھی آفیسر نہ تھا مگر کام اور ذمہ داریوں کے حوالے سے مجھے آفیسر والے اختیارات حاصل تھے۔

پہلا دن تھا اور میرے ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والا ایک لڑکا مجھے لیبر میس لنچ کے لیے لے گیا۔

ہال بھرا ہوا تھا اور پچاسوں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ لائن میں کھڑے ہوکر اپنی ٹرے میں کھانا لیا اور پھر سب سے پیچھے ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ اردگرد میزوں پر بیٹھے لوگ مجھے پرتجسس نظروں سے دیکھتے اور پھر ساتھ بیٹھے ساتھیوں سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے۔ میں ان کے لیے نیا تھا اور وہ میرے لیے نئے تھے۔

لڑکیوں کا لنچ روم اس بڑے ہال سے متصل تھا۔

میں سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا کہ سانولے رنگ کا ایک نوجوان چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے میرے ساتھ آبیٹھا۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ سلیم ہے اور فیکٹری کی ورکشاپ میں سپروائزر ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں بے تکلف ہوگئے۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ درختوں تلے کئی لڑکیاں سفید کوٹ پہنے بیٹھی ہیں یا پھر کھڑی ہیں۔ ہر جانب ان کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کہیں لڑکے بھی ان کے ساتھ کھڑے تھے۔

میں باہر نکلا تو بیشتر لڑکیاں اور لڑکے خاموش ہوکر مجھے دیکھنے لگے۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لاکر مڑا اور اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے لگا۔ میں خاصا نروس ہو رہا تھا۔

سلیم نے مجھے ایک منٹ رکنے کا کہا اور خود درخت تلے بینچ پر بیٹھی لڑکیوں کی جانب چلا گیا۔ لڑکیاں میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں میس کی جانب سے منہ پھیرے اپنی پینٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

ایک کیا پانچ منٹ ہوگئے مگر سلیم واپس نہیں آرہا تھا۔ سر گھما کر ادھر دیکھا تو وہ میرے بالکل عقب میں بینچ پر بیٹھی ایک لڑکی سے باتیں کررہا تھا۔ لڑکی نے مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ نظروں سے نظریں ٹکرائیں تو میں ساکت رہ گیا۔ اس کی آنکھیں سوئی سوئی سی نشے میں ڈوبی مگر چمک دار تھیں۔

سلیم نے واپس آکر میرا بازو تھاما تو میں شرمندہ سا ہو کر سکتے کی کیفیت سے نکلا۔ میں واپس اپنے آفس جا رہا تھا مگر ایک عجیب سا احساس دل میں محسوس کررہا تھا۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ میں لنچ کر کے باہر نکلا تو وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو اس کے کھلتے چہرے پر سوئی آنکھیں جا گیں۔ میری جانب اٹھیں اور پھر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔

پھر ہر روز یہی ہونے لگا۔ اسے ایک نظر دیکھنے کا میں سارا دن پلان بناتا۔ اسی ایک لمحے کو سوچتا، اس ایک لمحے کو پھولوں کی طرح ہار میں پروتا۔ خواب بناتا اور اس کو تعبیر تصور کرتا۔ ان آنکھوں میں چھپے بھید پانے کی کوشش کرتا اور اسی ایک لمحے کو کوئی دلکش روپ دے کر گھنٹوں آفس میں بیٹھا سوچتا اور مسکراتا رہتا۔ شاید مجھے محبت ہوگئی تھی۔

محبت اس طرح اچانک وار کرتی ہے اس کا تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔ میرے دن رات اسی کے ہو گئے تھے۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، سونا اور چلنا اسی لڑکی کی یاد میں ڈوب گیا تھا۔

میں صبح سات بجے فیکٹری پہنچ جاتا اور چھٹی کے بعد بھی وہیں رہتا۔ وہ شام سے پہلے چار بجے واپس چلی جاتی تھی۔ وہ چلی جاتی تو یوں محسوس ہوتا کہ شام اچانک اتر آئی ہے۔ میں کام سے فارغ ہوتا اور اسی بینچ پر بیٹھا فضا میں سگریٹ کے مرغولے چھوڑتا اس کی یاد میں گم ہوجاتا۔

ویک اینڈ کی دو چھٹیاں اوروں کو طمانیت دیتی تھیں مگر میں بے چین اور چڑچڑا ہو جاتا۔ اس کے بغیر دو دن گزارنا میرے لیے محال تھا۔ میں نے تصور ہی تصور میں اسے اپنی دلہن بنا لیا تھا۔ اسے سولہ سنگھار کراتا، زیور بھی خود پہناتا تھا اسے آنکھیں کھولنے کی التجا کرتا اور پھر ان میں ڈوب جاتا۔

ہوٹل میں رہنا مجھے پسند نہیں آرہا تھا۔ اسی لیے نئے کرائے کے گھر کی تلاش شروع کردی تھی۔ کسی نے بتایا کہ فیکٹری کے ڈرائیور نے دو منزلہ نیا گھر بنایا ہے۔ اوپر کا حصہ ابھی زیر تعمیر ہے اور نچلے حصے میں تین کمرے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ فیکٹری کے تین ملازمین کو وہ کمرے علیحدہ علیحدہ کرائے پر دے دے۔ میں نے اس سے ملاقات کی اور بات پکی کرلی۔ میرے علاوہ دوسرا کمرا فیکٹری میں فوٹو کاپی مشین کے آپریٹر جعفر نے لے لیا تھا۔ زیادہ کرایہ دے کر بڑا کمرا

میں نے حاصل کر لیا۔ تیسرا کمرا خالی تھا۔
یہ گھر شہر کی نسبتاً کھلے اور نئے علاقے میں تھا۔ گیٹ کے سامنے سیمنٹ کا پختہ چبوترہ تھا۔ ساتھ والے گھر والوں نے چبوترے کی جگہ تین فٹ کی چھوٹی چار دیواری بنا کر ایک احاطہ بنا لیا تھا جس میں انہوں نے بینچ رکھے تھے۔ متوسط لوگ اس علاقے میں رہتے تھے۔ آنے جانے کے لیے سوزوکی یا موٹر سائیکل کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ پاس ہی ایک کھلے میدان کے گرد مارکیٹ تھی جہاں مجھے ضرورت کا سارا سامان مل سکتا تھا۔ وہاں چند ایک چھپر ہوٹل بھی تھے جہاں میں کھانا بھی کھا سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے کے لیے بیڈ، دری، بستر، الماری کے علاوہ ٹی وی اور فریج بھی لے آیا۔ میرا مسکن آباد ہوا تو ایک نئے طرز کی زندگی گزارنے کے لیے میں مکمل تیار تھا۔ اچھی جاب کے ساتھ اور ٹائم بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ چند ماہ میں اگر مجھے آفیسر گریڈ مل گیا تو تنخواہ دوگنی ہو جانی تھی۔ پیسے کی فراوانی تھی اور ادھر اکیلی زندگی جس پر کوئی نگراں آنکھیں براجمان نہ تھیں۔

فیکٹری کی بس ہر صبح سامنے سڑک سے بھی گزرتی تھی، اگلے روز صبح تیار ہو کر بس کے لیے باہر نکلا تو سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی۔

میں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا جہاں سے بس آتی تھی۔ اس نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی تھی کہ وہ یہیں رہتی ہے، یہیں آس پاس اور میں اسے اکثر دیکھ سکوں گا۔

میں اس کے سراپے کو دیکھ رہا تھا۔ لمبی گردن، سیاہ چمک دار گیسو اور دراز قد میری نظروں کی تپش اتنی تھی کہ اس نے محسوس کر لیا۔ گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔

اس کی اداس آنکھیں ایکدم چونک اٹھیں جیسے سوتے ہوئے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں مگر نہ جانے کیوں پہلے کی طرح اداس سی ہو کر بے اعتنائی سے بس کا انتظار کرنے لگیں۔

اسے سامنے پا کر میرے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔ اسے دیکھ کر میں مکمل بے خودی میں گھر گیا تھا۔ قدرت نے اسے میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اوپر والا بھی اسے میرا بنانا چاہتا ہے۔

بس آئی تو وہ اگلے دروازے سے سوار ہوئی۔ میں نے جلدی سے سڑک پار کی اور بمشکل بس کے پچھلے دروازے سے اوپر چڑھا۔

اس دن میس سے لنچ کر کے نکلا تو وہ اسی بینچ پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو اسے اپنی جانب متوجہ پایا۔ میں ذرا سا مسکرایا تو اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو ذرا سی چمک ابھری مگر دوبارہ پھر سے اداسی سے بھر گئیں۔ شاید میرا مسکرانا اسے اچھا نہ لگا تھا۔

آخر ان آنکھوں میں اداسی کے لہریے کیوں ہوتے ہیں۔ میں اکثر یہ سوال اپنے آپ سے کرتا تھا مگر اب ان آنکھوں سے مجھے کچھ پیغامات مل رہے تھے۔ کئی سوال ان آنکھوں میں اپنے لیے پاتا تھا۔ میں خود میں اتنی ہمت رکھتا تو ان آنکھوں میں چھپے سوالوں کا جواب پا لیتا مگر میں تو اس کے آگے گنگ ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ اس سے اپنی دل کی حالت کس طرح بیان کروں۔ کیسے اسے بتاؤں کہ میں وہ کچھ نہیں بتا سکتا جو میرے اندر ہے۔

اسی دوران میری سلیم سے دوستی ہو گئی۔ وہ سلیم کی منہ بولی بہن تھی۔ اسی نے چھ ماہ کے لیے اس کی جاب کرائی تھی۔ سلیم نے مجھے بتایا کہ اس کا نام رابعہ ہے اور گھر میں سب اسے رابی کہتے ہیں۔ متوسط اور عزت دار لوگ ہیں۔ ضرورت کے تحت یہ جاب کر رہی ہے۔ اپنی تنخواہ سے کچھ ماں کو دیتی ہے اور باقی سے اپنا جہیز تیار کر رہی ہے۔ گھر میں سب سے بڑی ہے اور دو بہنیں اور ایک بھائی اس سے چھوٹے ہیں۔

میرے گھر میں بڑی بہنیں اور بھائی تھے جن کی ابھی شادی ہونی تھی۔ یہ میرے لیے ایک طرح سے ناممکن تھا کہ ان کی شادی سے پہلے میں گھر والوں سے اپنی شادی کی بات کروں۔ اس وقت کیا، میں تو اگلے سات آٹھ سال تک بھی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ اگر اس سے شادی ابھی نہیں کر سکتا تو اسے کیوں پیار کی راہ پر گھسیٹوں مگر دل تھا کہ مسلسل اپنی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

میں عمر کے اس دور میں تھا جہاں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کاش میں نے دل کے ساتھ کچھ عقل سے بھی کام لیا ہوتا۔ اسے کوئی موم کی گڑیا نہ سمجھتا بلکہ جیتی جاگتی حساس لڑکی سمجھتا۔ اس وقت سمجھ جاتا تو آج اس کرب میں نہ ڈوبا ہوتا۔

اسی علاقے میں شاہد بھی رہتا تھا۔ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ایک دو ملاقات کے بعد وہ میرا دوست بن گیا۔ وقت کے ساتھ یہ دوستی گہری

ہوتی گئی۔ پھر وہ اور جعفر دونوں میرے رازداں بن گئے۔ میں شام کو کھانے کے بعد شاہد کے گھر چلا جاتا۔ ہم لمبی واک کرتے۔ کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ میں ہر روز اسے اپنی محبت کی تازہ روئیداد سناتا۔ وہ ہمیشہ سن کر مسکرا تا دیتا۔ جعفر کو زیادہ نہیں بتاتا تھا کیونکہ وہ بھی اسی فیکٹری میں ملازم تھا۔

کچھ ماہ تک آنکھوں سے نکلے سندیسے آنکھوں سے ٹکراتے رہے۔ پھر اسی کی خاموش اور اداس آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہی مسکراہٹ ان آنکھوں سے نکل کر چہرے پر پھیل گئی۔

میں سوتا تو اسی کی یاد میں۔ میں اٹھتا تو اسی کا نام لے کر اور خیالوں میں اسے اپنے پاس بٹھا لیتا جب اکیلا ہوتا۔ صبح تیار ہو کر گھر کے باہر چبوترے پر کھڑا ہوتا تو نظریں اسے ہی ڈھونڈ رہی ہوتیں۔ وہ لیٹ ہو جاتی تو میں بے قرار ہو جاتا۔ وہ آجاتی تو اور بے قرار ہو جاتا۔

انہی دنوں ترقی پا کر میں آفیسر ہو گیا۔ اب مجھے وین پر جانا تھا۔ وین بس سے ذرا پہلے آجاتی تھی۔ اس لیے وقت سے پہلے میں نکل آیا۔

میں گھر سے باہر نکلا تو وہ عجیب شانِ بے نیازی سے دوسری سمت نامعلوم چیزوں کو تک رہی تھی۔ گیٹ بند کرنے کی آواز سن کر اس نے ادھر دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائی مگر پھر وہی اداسی اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔ آنکھوں کی مستقل اداسی اس کے حسین سراپے کی دلکشی کو دو چند کرتی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اس کے حسن میں حزن تھا۔ شوخی اس کے چہرے پر نہیں ٹکتی تھی۔ وہ بہت خوش ہو کر اداس لگتی اور بہت اداس ہو کر نہ جانے کیا لگتی ہو گی۔

اس روز وین آئی سامنے سے گزری نہیں بلکہ سامنے آکر ٹھہر گئی۔ میں چبوترے سے اتر کر وین میں بیٹھ رہا تھا تو اس کے چہرے پر حیرت تھی کہ خوشی، مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں وین کے اندر بیٹھنے سے پہلے اس کی جانب گھوما اور ہاتھ کے اشارے سے ذرا سا سلام کر دیا۔ اس کے ہونٹ وا ہوئے تو محسوس ہوا کہ اسے خوشی ہوئی ہے۔ اس نے سر کو جنبش دے کر جواب دیا تو میں سر سے پاؤں تک سرشاری میں نہا گیا۔

اس دن میں آفیسرز میس میں لنچ کرنے گیا۔ وہاں جانا مجھے کھل رہا تھا کیونکہ میں ہر روز لیبر میس سے نکلنے کے بعد رانی کو درخت تلے بیٹھا دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ آفیسرز میس کے مختلف اوقات تھے مگر میں جلدی لنچ کر کے باہر نکل آیا۔ درخت کے سامنے سے گزرا تو وہ وہیں سہیلیوں کے درمیان گم صم بیٹھی تھی۔ مجھے آتے دیکھا تو اچانک اس کے ہونٹ وا ہوئے اور رخساروں پر لکیر کھنچ گئی۔ میں سمجھ گیا وہ خوش ہے اور مسکرا رہی ہے۔

پھر ایک صبح اس سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ میں گھر سے باہر نکلا تو وہ اسٹاپ پر نظر نہیں آئی۔ چبوترے پر کھڑے ہو کر میں نے راستے کی جانب دیکھا مگر وہ بھی ویران پڑا تھا۔ وہ نظر نہ آئی تو یوں لگا کہ دن نہیں نکلا۔ پچھلے دو ماہ میں اس نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی، پر آج کیا ہوا، ضرور اس کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا ہے۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے میں اس نکتے پر غور کر رہا تھا۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ دن کیسے گزرے گا رات کیسے کٹے گی۔

میں سوچتا ہوا احاطے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اچانک ایک دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی۔ دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہ برابر والے مکان کے باہر بنے احاطے کی بینچ پر بیٹھی ہے مجھے اور ہراساں دیکھ کر ہنس رہی ہے۔ اسے اپنے اتنا قریب دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کچھ نہ سوجھا تو میں نے سلام کر دیا۔ لمحہ بھر کو خوش ہوئی پھر دائمی اداسی آنکھوں میں آٹھہری مگر خوشی سے ہونٹ وا تھے۔ مجھ سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو رہا تھا جس کی ادائیگی میرا رواں رواں کر رہا تھا۔ بس مجھ سے اتنا ہوا کہ اس احاطے کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ بھی بینچ سے اٹھ کر باؤنڈری وال کے قریب آگئی۔ اسے اتنا قریب پا کر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا اور میں نے گھبراہٹ میں کہہ دیا جس کی توقع مجھے ہرگز نہ تھی اور نہ اس کو۔ میں نے کہہ دیا۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے نازک ہونٹ بند ہوئے۔ اداسیوں کے پھیرے پھر سے آنکھوں میں سجے اور وہ حیرت سے بولی۔ ''یہ فیصلے تو ماں باپ کرتے ہیں۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں شرمندہ سا کھڑا تھا۔ میری شرمندگی کو سہارا دے کر اس نے کہا۔ ''آپ کا نام نوید طارق ہے ناں؟''

''جی یہی میرا نام ہے۔''

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' جب اپنے شہر کا بتایا تو حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ تو بہت دور

کے رہنے والے ہیں۔"

"جی ہاں لیکن اب تو آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔"

یہ سن کر اس نے اپنے تاثرات بڑی خوب صورتی سے چھپائے۔

میں ذرا اور بہادر بن کر بولا۔"میں آپ کا نام نہیں پوچھوں گا کیونکہ آپ رابی ہیں۔"

اس کے ہونٹ مسکرائے اور بولی۔"یہ تو مجھے گھر میں کہتے ہیں۔ میرے اپنے۔"

"آج غیر ہوں مگر کل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ راستے ایک ہوں تو غیر اپنے لگنے لگتے ہیں۔"

یہ سن کر اس کے ہونٹوں کے علاوہ آنکھوں میں بھی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

اتنے میں وین آگئی۔ میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے پجاری دیوی کو دیکھتا ہے۔ عقیدت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر میں وین میں جا بیٹھا۔

میں اور رابی عمر کے جس دور سے گزر رہے تھے وہ زندگی کے رنگین سال ہوتے ہیں۔ احساس اور خیالات تو لڑکے لڑکیوں کے ایک جیسے ہوتے ہیں مگر مطمع نظر مختلف ہوتا ہے۔ لڑکی خواب دیکھتی ہے اپنے آئیڈیل کے اس انسان کے جو اسے پسند آئے اور وہ بڑے چاؤ سے بیاہ کر اسے اپنے گھر کی عزت بنالے۔ لڑکیاں جسے پسند کرلیتی ہیں تو اسے ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں بند کرلیتی ہیں۔ وہ ٹھکانے نہیں بدلتیں۔ ایک کی ہو کر رہتی ہیں بھلے وہ اسے ملے یا نہ ملے۔ اگر شادی کہیں اور ہو جائے تو نئے گھر میں خود کو قرینے سے ایڈجسٹ کرلیتی ہیں مگر دل کی پھانس نہیں نکلتی لیکن لڑکا پہلا عشق کرتا ہے تو دوسرا بھی کرتا ہے۔ کسی ایک کا تب تک نہیں بنتا جب تک سامنے والی اپنے ٹیلنٹ سے اسے اپنا نہ بنا لے۔ بہت کم ہوتا ہے کہ لڑکا شادی کے لیے کسی لڑکی سے عشق کرے۔ دعوے تو کرتا ہے مگر مکاری کر رہا ہوتا ہے۔ پسند تو کرتا ہے مگر اپنا نہیں سکتا۔ وعدے تو کرتا ہے مگر ایفا نہیں کر سکتا۔ یہ ایک عمومی رویہ ہے جس کو میں بیان کر رہا ہوں مگر میرے ساتھ ایسا نہ تھا۔

اب وہ ہر دن اسٹاپ پر جلدی آجاتی اور آکر ساتھ والے احاطے میں بچھی بینچ پر بیٹھ جاتی۔ ہم باتیں کرتے ڈھیروں ڈھیر باتیں ایک دوسرے سے مذاق بھی کرلیتے تھے۔ میں ہنستا اور وہ صرف مسکراتی رہتی۔ اس کے حسن میں خاص بات اس کی آنکھوں کا حزن تھا جو اس کی پوری شخصیت پر قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کی اداس آنکھیں دیکھ کر میں کھو سا جاتا۔ کپڑے ہمیشہ سادہ اور پروقار پہنے ہوتے۔ وہ سادگی میں بھی نمایاں ہوتی۔ اس کی ذات میں خوبی اس کی تمکنت میں تھی۔

ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے پیار میں ڈھلتے چلے گئے۔ ایسے کہ ہمارے دن رات ہی ایک ہو گئے۔ وہ دن کا احوال سناتی اور میں راتوں کے قصے سناتا۔ وہ اپنے گھر کی باتیں بتاتی اور میں گھر بسانے کی باتیں کرنے لگتا۔ میں شادی کی بات کرتا تو حیا سے اس کی نظریں جھک جاتیں۔ میں تحفے لاتا تو وہ انکار کر دیتی۔ وہ لاتی تو میں لے لیتا۔ وہ باتیں کم کرتی اور مجھے دیکھتی رہتی۔ مجھ سے کبھی کوئی وعدہ نہ مانگا مگر میں ہر روز اسے اپنی قسمیں دیتا تھا۔ ایک دن کہنے لگی۔"مجھے اتنے وعدے کیوں دیتے ہیں۔ مجھے کیوں اتنی یقین دہانیاں کراتے ہیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ میں تو اعتبار کے کھونٹے سے بندھ چکی ہوں۔"

ایک بار میں فیکٹری کی سڑک پر جارہا تھا۔ وہ دوستوں کے ہمراہ درخت تلے ہمیشہ کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ اسے اداس بیٹھے دیکھا تو میرے قدم خود بخود رک گئے۔ میں رکا تو لڑکیوں نے اسے کہنیاں مارنا شروع کردیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ اس کی نگاہ میں میرے لیے التجائیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے بولی اور میں نے آنکھوں کی زبان سن لی۔

دوسری صبح وہ بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں میں میرے لیے بہت پیار... اور کچھ شکایتیں تھیں۔ سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔"کل لنچ کے وقت تم گھبرا کیوں گئی تھیں؟"

وہ اپنی عادت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر بولی۔"آپ ہمارے سامنے آئے تھے تو میرا دل رک گیا تھا کہ معلوم نہیں آپ کیا کہہ دیں؟ آپ کچھ کہیں گے تو لڑکیاں کیا کہیں گی؟ پہلے ہی سب مجھے چھیڑتی ہیں کہ نوید صاحب تم کو بہت چاہتے ہیں۔" پھر مجھے بغیر پلکیں جھپکائے کچھ دیر دیکھ کر بولی۔"مگر میں ہمیشہ انہیں انکار کر دیتی ہوں۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔"رابی تم انکاری کیوں ہو جاتی ہو؟"

اپنے سفید دوپٹے سے آنکھوں کے نم کونے صاف کرتی ہوئی بولی۔"اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں کہ آپ کا

خیال دل سے نکال دوں۔ رات دیر دیر تک جاگ کر آپ کے بارے میں سوچتی ہوں۔ رشتے کے بارے میں سوچتی ہوں۔ آپ ابھی لڑکے ہیں اور زندگی کے فیصلے آپ اکیلے نہیں کرسکتے۔ میرے بارے میں پھر کیوں اتنا بڑا فیصلہ گھر والوں سے پوچھے بغیر کرلیا۔'' کچھ دیر کے لیے رک گئی میں اس کے رخساروں پر بہتے آنسو بڑے کرب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''آپ صرف پیار کی بات کرتے تو اپنے تک رکھتی مگر جب شادی کی بات کی ہے تو میرے گھر تک جائے گی اور میرے گھر کی عزت داؤ پر لگ سکتی ہے۔ اب بھی بتادو کہ تم شادی نہیں کرسکتے تو میں اپنی ماں سے بھی ذکر نہیں کروں گی۔ صرف یہ کہوں گی تم سے نوید! تم سے میں واقعی بے انتہا پیار کرنے لگی ہوں اور یہ پیار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی مگر تم میری راہ چھوڑ دو یہ گھر چھوڑ دو۔ شہر نہیں چھوڑ سکتے تو محلّہ ہی چھوڑ دو۔''

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو رابی؟''

وہ بولی۔ ''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے شادی کرنا تمہارے اختیار میں نہیں۔ شادی کو بیچ سے نکال کر اپنے پیار کو بچالو اور مجھے اپنے سے دور کرکے کہیں اور مکان لے لو۔ آج کے بعد شادی کا کہا اور بعد میں نہیں کی تو میں سمجھوں گی کہ تم جھوٹے تھے تمہارا پیار جھوٹا تھا۔ اپنا مان رکھ لو نوید۔ چلے جاؤ۔ ورنہ جب مجھے بھی یہ احساس ہوا کہ میرا پیار کھوٹا تھا تو مر جاؤں گی۔'' وہ رونے لگی۔ روتے روتے بولی۔ ''آپ سے شادی کے بغیر رہ لوں گی مگر آپ کا پیار کھو کر جی نہ سکوں گی۔''

اسی دوران دور سے مجھے اپنی ویَن آتی دکھائی دی۔ جلدی سے اس سے کہا۔ ''تم لنچ سے پہلے میرے آفس میں آنا کسی کی جاب کے لیے کوئی درخواست بھی لے آنا مگر آنا ضرور، میں انتظار کروں گا۔''

ویَن رکی تو اس جانب بڑھنے سے پہلے میں نے رابی کو دیکھا۔ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں التجاؤں کے بادل تیر رہے تھے۔ میں سارا راستہ یہی سوچتا رہا کہ وہ کیا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کا خدشہ بجا تھا؟ یہ بھی سوچا کہ میں ایک دو سال میں اس سے شادی کرسکتا ہوں تو جواب مجھے نفی میں ملا۔ اس کے کہنے پر میں شادی نہ کرنے کا کہہ سکتا تھا مگر اس کے ساتھ اسے چھوڑنے کی شرط بھی اس نے لگا رکھی تھی جو میری اکیلی زندگی کو تہہ و بالا کردیتی۔ اپنے سے دور کرنے کا اسے میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جسے اتنی مرادوں سے پایا تھا اسے چھوڑ دینا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے مستقبل کا نہ سوچا اور رابی کو اپنے قریب لانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس دن میں لنچ پر نہیں گیا۔ اس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ وہ آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کی پتلی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

میں اپنی کرسی سے اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پہلی بار وہ میرے اتنا قریب آئی تھی۔ اس کے قرب کی مہک مجھے مدہوش کر رہی تھی۔ میں نے شدت پیار میں اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میرے بازوؤں کے مضبوط حصار میں پہلے وہ تھوڑا پھڑپھڑائی اور پھر بے خود ہو کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی تمازت سے میں جل رہا تھا۔ پھر اسے اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے میز پر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''میری بات غور سے سنو رابی، اگر تم سے پیار کرتا ہوں تو شادی بھی تم ہی سے کروں گا۔ اس پیار کا کیا فائدہ کہ ملاپ بھی نہ ہو، اگر تم سے شادی نہ کرسکتا تو تمہارے راستے میں بھی نہ آتا۔ تم میری ہو اور صرف میری۔'' پھر اس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ''ان آنکھوں کی قسم، نہ تم کو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی بھول سکتا ہوں۔ رات دن سوتے جاگتے صرف تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں مر جاؤں گا رابی مجھے مرنے سے بچالو۔''

اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے میرے چہرے کو چھوا اور بولی۔ ''اگر آپ کو اپنی باتوں پر اتنا یقین ہے تو آج سے رابی آپ کے یقین پر ایمان لے آتی ہے سرکار۔ آئندہ سے آپ نوید نہیں میری سرکار ہیں۔ اب یہ دل کیا میری جان بھی آپ کے حوالے ہے۔''

وہ اب اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے مسکراتے میرے گلے لگ گئی۔ میں نے کہا۔ ''رابی کیا ہم باہر کہیں مل سکتے ہیں۔ نہ فیکٹری میں زیادہ بات ہو سکتی اور نہ اسٹاپ پر، تمہارے ساتھ بیٹھ کر میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ کانپ کر بولی۔ ''یہ بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ یہ میری اور میرے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔ کسی نے کہیں دیکھ لیا تو سب ختم ہو جائے گا۔''

میں تیکھی نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ ''یہ بہت ضروری ہے کہ ہم باہر ملیں۔ ہم ملنے میں احتیاط کریں گے تاکہ کسی کو

معلوم ہی نہ ہو۔ چند ہفتوں میں تمہاری جاب ختم ہوجائے گی پھر کب اور کہاں تم سے بات کرسکوں گا؟ پلیز میری بات مان جاؤ۔''

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''مجھ پر رحم کرو، اتنا بوجھ مت ڈالو کہ مر ہی جاؤں۔''

''کیا میرے پیار پر بھروسا نہیں ہے؟'' میں نے اس کے سیاہ گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرا امتحان مت لو۔ مجھے گھر پر جھوٹ بولنا پڑے گا۔'' مجھے پھر افسردہ کھڑے دیکھ کر بولی۔ ''ٹھیک ہے سوچ کر بتاؤں گی۔''

آگے ویک اینڈ تھا، دو دن اسے بغیر دیکھے کاٹنا ایک عذاب تھا۔ اس کی یادوں کی محفل سجائے میں کمرے میں بند پڑا رہا۔ میرا چین وہ چھین کر لے گئی تھی۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میرے درد کا علاج یہ نہ تھا کہ اس کو دیکھوں۔ اسے دیکھ لیتا تو درد اور بڑھ جاتا تھا۔ یہ کیفیت مجھ پر پہلی بار آئی تھی۔ سرشاری بھی اور اداسی دونوں ایک ساتھ۔

گیٹ پر بیل ہوئی تو باہر آکر دیکھا تو شاہد کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر کہنے لگا۔ ''یہ کیا جوگیوں جیسی حالت بنا رکھی ہے۔ اس ایک لڑکی کی خاطر اپنا کیا حشر کیا ہوا ہے۔''

''یار اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ہر وقت اسی کا خیال پاس رہتا ہے۔ اپنے پر قابو بھی نہیں رہا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''شہزادے، لگتا ہے ڈراما کر رہا ہے۔ نہیں کر رہا تو کسی ڈاکٹر سے دماغی معائنہ کروا۔'' پھر شاہد اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لگتا ہے افسانے اور ناولیں بہت پڑھی ہیں، کسی لڑکی سے اچانک محبت ایک وقتی ابال ہوتا ہے۔ جب ایسا کوئی ابال سر اٹھائے تو عقل کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اپنے دماغ اور زبان، دونوں کا عقل مندی سے استعمال کرنا چاہیے اور تم اپنے اس معاملے کو سر پر نہ چڑھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ واپسی مشکل ہوجائے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تم کس واپسی کی بات کر رہے ہو، کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی فلرٹ کر رہا ہوں؟''

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تم فلرٹ کر رہے ہو۔''

''میں اس سے بے پناہ پیار کرتا ہوں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

جاپانی اپنے پالتو جانوروں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی موت کے بعد انہیں شاہانہ انداز میں دفنایا جاتا ہے، جس پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک کلو گرام وزنی جانور کی تمام رسومات پر پاکستانی 86 ہزار روپے لاگت آتی ہے۔ ''کوکولون'' نامی کمپنی اس کام میں ماہر ہے اور وہ ایک بڑے جانور یعنی کئی کلو وزنی کتے کی آخری رسومات پر ایک لاکھ روپے سے زائد رقم وصول کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اپنے پالتو جانور کی تدفین کے ساتھ پھولوں والی قبر یا پھر پیانو اور وائلن پر افسردہ دھن بجوانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اضافی پچیس تا تیس ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔

☆☆☆

پاکستان اور چین کی باہمی محبت کا ایک ثبوت چین نے اپنے شہر شنگھائی میں پاکستان کا شاہی قلعہ بنا کر دے ڈالا ہے، جی ہاں لاہور کا تاریخی شاہی قلعہ اب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شنگھائی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

برطانیہ کا 87 سالہ شہری رون گولڈ اسپنک عجیب و غریب بیماری کا شکار ہیں، ان کے دماغ میں مسلسل اپنے ملک کا قومی ترانہ بجتا رہتا ہے۔ طب کی زبان میں اس کیفیت کو میوزیکل ایئر سنڈروم ایم ای کہا جاتا ہے۔ بہرے یا کم سننے والے افراد اس کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز میمن۔ لندن

قہقہہ لگا کر بولا۔ ''تم ایک چھوٹے شہر میں ایک سادہ زندگی گزار کر آئے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ محبت وغیرہ سب دماغی فتور ہیں۔ محبت کرو مگر چپٹ نہ جاؤ اور نہ اسے اپنے ساتھ چمٹنے دو۔ شہزادے یہ سب ٹائم پاس ہے۔ آج میری باتوں کو نہیں سمجھے تو کل ضرور سمجھ جاؤ گے۔''

میں نے بے زاری سے کہا۔ ''شاہد تم نے مایوس کیا، سوچا تھا کہ تم سے اس کی باتیں کروں گا، میرا غم کم ہوگا مگر تم تو میری روح پر زخم لگانے آئے ہو۔''

''چلو تم سے ایک شرط لگاتا ہوں۔ اس سے بات

کرو۔ وہ بات بھی شادی سے شروع کرے گی اور ختم بھی اسی پر ہوگی۔ یہاں گھروں میں لڑکیاں شادی کے لیے تیار بیٹھی ہوتی ہیں۔ تمہارے جیسا کوئی بدھو مل گیا تو ان کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اچھی نہیں ہوتیں۔ اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رشتوں کی ضرورت مند بھی ہوتی ہیں۔'' شاہد نے کہا۔

میں نے شاہد کو نہیں بتایا تھا کہ میری اس سے بات ہو چکی ہے۔ حیرت تھی کہ ہم میں ایسی ہی بات ہوئی تھی مگر میں مطمئن تھا کہ رابی نے جو بات کی تھی اس کا مطلب شاہد کی باتوں سے بالکل مختلف تھا۔

مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔''تم آخر چاہتے کیا ہو۔ صرف محبت محبت کھیلو گے یا شادی بھی کرو گے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوگا مگر ایک بار وہ بن ٹھن کر میرے اس کمرے میں ضرور آئے گی۔ مجھے میری ماں کی قسم ہے جو اسے اس کمرے میں نہ لایا۔'' میں نے ایک عزم سے کہا تو شاہد کھڑا ہو گیا، بولا:''چل باہر چلتے ہیں فلم دیکھتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور باہر کی تازہ ہوا شاید تمہاری کھوپڑی کے لیے سودمند ہوگی۔''

میں نے جذبات میں آکر ایک بڑی قسم کھالی تھی۔ اپنی اس ماں کی قسم جس کا میں ورد کرتا تھا۔ ایسے وعدے تو میں رابی سے بھی بہت کر چکا تھا۔ وعدے تو سب یاد تھے اور یاد رکھنا کون سی بڑی بات تھی۔ اصل بات تو وعدے ایفا کرنا ہے۔

ویک اینڈ ختم ہوا تو میرا طویل انتظار بھی ختم ہوا۔ خوب تیار ہو کر اس کی چاہت میں لپٹا باہر آیا تو وہ بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ازلی اداسی اور خاموشی کے ساتھ بے پناہ وارفتگی بھی تھی۔

میں نے سلام کر کے پوچھا۔''رابی تم کب آتی ہو۔ ہر بار پہلے سے موجود ہوتی ہو؟''

آہستگی سے رک رک کر بولی۔''میں تو رہتی ہی یہیں ہوں، آتی تو جب اگر یہاں سے جاتی۔ اپنا جسم گھر لے جاتی ہوں مگر یقین کرو روح ادھر ہی تمہارے پاس ہوتی ہے۔''

ذرا دیر خاموش ہو کر بے خودی میں پھر بولی۔''پچھلے دو دن میں نے کس طرح سے تڑپ تڑپ کر تمہارے بغیر گزارے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ ایک پل بھی تم کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے، سرکار۔'' وہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔''پھر کیا سوچا رابی، ہم کہیں باہر مل رہے ہیں؟''

''ہاں اب کہیں بھی لے چلو۔ اگلے ہفتے جاب بھی ختم ہو رہی ہے تو پھر کس طرح آپ کو دیکھ پاؤں گی۔ نہیں دیکھوں گی تو مر نہ جاؤں گی۔ چار ماہ میں ہی میری دنیا... بدل گئی ہے۔ اچھا لگتا ہے یہ سب، بہت اچھا۔'' وہ ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ سجائے بولی۔

میں نے سرشاری سے کہا۔''تمہارے ساتھ بیٹھنا، تمہیں سننا، تمہاری آنکھوں میں دیکھ کر کھو جانا، تمہارے ہاتھ پکڑ کر تمہیں تکنا۔ یہی میرے خواب ہیں اور یہی آسان تعبیریں ہیں۔''

شاید زندگی میں لڑکیاں یہی سب سننا چاہتی ہیں جو میں اس دن رابی سے کہہ رہا تھا۔ میں جو بھی اسے کہتا اسے پلکوں سے چن لیتی۔ گو وہ سب میں اسے سچائی سے کہہ رہا تھا مگر اگر کوئی اچھا اداکار ہو تو اس سے زیادہ پُرتاثر باتیں کر سکتا ہے جو لڑکی کے وجود کو جکڑ لیں۔

میری ایسی باتیں سن کر اس کے چہرے پر خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔ اسی کیفیت میں وہ بولی۔''تمہارا کہا ایک ایک لفظ سحر میں ڈوبا ہوتا ہے۔ میں انہیں یاد نہیں حفظ کر لیتی ہوں۔ تمہارے وعدوں پر اعتبار کر لیا ہے۔ تمہاری قسموں پر ایمان لے آئی ہوں۔ سجدے انسان کو جائز نہیں ورنہ میرے سجدے تمہارے قدموں میں ہوتے، تمہارے نام کی تسبیح کرتی ہوں۔ تمہیں پڑھتی ہوں، تمہیں کیا پتا تمہیں ہی پوجتی ہوں۔''

میں اپنے لیے اتنے بڑے بڑے الفاظ سن کر خود کو دیوتا سمجھ رہا تھا۔ فرط مسرت سے میرا رواں رواں کھل اٹھا تھا مسکرا کر اس سے پوچھا۔''یہ اتنے مشکل الفاظ کہاں سے سیکھے؟''

ہنس کے اپنے چہرے سے سیاہ بالوں کی لٹ ہٹا کر بولی۔''خود ہی سکھاتے ہیں اور اب کہتے ہیں کہاں سے سیکھے؟ تم نے تو مجھے راستہ دکھایا۔ میں تو چل پڑی اس راستے پر۔ اگر تم نہ بھی آئے تو میں رکنے والی نہیں۔ چلتی رہوں گی بھلے اکیلی ہی ہو جاؤں۔ اب آپ کی ہوگئی یہ رابی۔ آپ چلے گئے تو کسی اور کی کبھی نہ بن سکوں گی۔ تمہاری طرح بہت سے وعدے تو نہیں کرتی مگر میری یہ باتیں اٹل ہیں یاد رکھنا سرکار۔''

اس دن اس کے اس لہجے اور روپ سے میں خود ہل

گیا تھا۔ وہ ایک عزم سے بول رہی تھی۔ وہ اس راستے پر مجھ سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ میری محبت بھری باتوں نے اس کے دل و دماغ کو مسخر کرلیا تھا۔ وہ جیسے کسی نشے میں یہ سب بسر کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، انداز گفتگو، اعتماد اور خود سپردگی کے عالم کو میں اپنی محبت کی جیت سمجھ رہا تھا۔ آج بیٹھا جب یہ سب لکھ رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں اسے جیتا نہیں بلکہ بہکانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں اسے کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اشارے سے مجھے چپ کرا دیا، بولی۔ ''وین آنے سے پہلے یہ بھی سنتے جاؤ۔ میں کبھی ایسی نہ تھی۔ میں نے زندگی کے ہر موڑ پر خود کو چٹان بنائے رکھا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی مگر میں نے سب کو ایک طرح سے دھتکار دیا۔ ابتداء میں آپ کو بھی میں نے ٹھوکر مارنی چاہی، کترا کر نکلنا چاہا مگر جہاں مڑی وہیں سامنے آپ ہی کو پایا۔ آج یہ رابی آپ کے سحر میں ڈوب کر صحرائی بن بیٹھی ہے۔ جس کی اب کوئی منزل نہیں۔ اس لیے اب یہ نہیں پوچھوں گی کہاں لے چلو گے۔ صرف یہ بتا دینا کہ کب لے چلو گے۔ مجھے تو ابھی بہت کچھ کہنا ہے اور ہاں اپنے بارے میں کچھ نہ بتانا کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے تو اتنا ہی بہت ہے کہ تم میرے ہو۔''

آج تو اس نے مجھے بھی چت کردیا تھا۔ میں سنبھلا اور بولا۔ ''تمہیں بتا دوں گا۔ دن اور وقت تمہاری سہولت کے مطابق طے کریں گے۔''

پھر اس کی جاب ختم ہوگئی۔ اس سے پہلے میں نے رابی سے باہر ملنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ اس نے گھر میں یہ بہانہ کیا کہ وہ کسی دوسری فیکٹری میں جاب انٹرویو دینے جارہی ہے۔

شاہد سے موٹر بائیک لینے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کو وجہ بتائی تو اس نے پوچھا۔ ''کہاں لے جاؤ گے؟''

میں اس نئے شہر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے مجھے ایک پارک کا بتایا جو دریا کے کنارے تھا۔ پھر مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اس لڑکی کے جھانسے میں پھنس رہے ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس کے گھر والے بھی اس منصوبے میں ملوث ہیں۔ ان کو پڑھا لکھا اچھی شکل و صورت والا برسرِ روزگار داماد مل رہا ہے اور انہیں کیا چاہیے۔'' پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھا تھا کہ دل لگی کرکے نکل جاؤ گے مگر تم تو اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہو؟''

میں بھڑک اٹھا اور بولا۔ ''بائیک یہ رہی، میں چلتا ہوں گاڑی رینٹ کرلوں گا۔''

چابی میرے ہاتھ پر رکھتا ہوا وہ بولا۔ ''دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں لگانا جلد آجانا۔''

دن کے وقت پارک خالی تھا۔ سامنے بہتے دریا کی موجوں میں مچھیروں کی کشتیاں کچھ دریا کے بیچ میں اور کچھ کنارے کھڑی تھیں۔ دریا کے پار، کچے کا علاقہ نظر آرہا تھا۔ ہم تھے اور خاموشی کی سائیں سائیں تھی۔

پارک کے ایک کونے میں کینٹین تھی۔ کینٹین بوائے کو کچھ کھانے پینے کا آرڈر دیا اور لان میں رکھی کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے۔ وہ آرڈر لایا تو میں نے ایک بڑا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بقایا اپنے پاس رکھنے کا کہا تو وہ ایک دم ہمدرد بن گیا۔ ہمیں وہاں سے اٹھا کر نزدیکی درختوں کے جھنڈ تلے بٹھا دیا جہاں بینچ کے علاوہ کرسیاں میز بھی تھیں۔ وہاں سے ہم کسی کو نظر نہیں آسکتے تھے مگر دریا اور کشتیاں ہمارے سامنے آگئی تھیں۔

میں ذرا گھبرایا ہوا تھا مگر وہ بڑے اعتماد میں تھی۔ ہلکے رنگ کے سوٹ میں اس کی شخصیت اور زیادہ نکھر آئی تھی۔ وہ حسین تو تھی ہی مگر جب تمکنت سے سر اٹھا کر چلتی تو لگتا کوئی شہزادی آرہی ہو۔

ہم بینچ پر بیٹھ گئے لیکن ایک فاصلہ اپنے درمیان رکھا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی پتلی ناک اور نازک ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے عارض پر پھیلے گیسو اپنی انگلیوں سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔ کچھ ہمت کرکے اس کے سفید مرمریں ہاتھوں کی نازک مخروطی انگلیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ ہنس کر بولی۔ ''کیا دیکھے جارہے ہیں؟''

اس کے بولنے سے میرا سحر ٹوٹا۔ میں نے کہا۔ ''یقین نہیں آرہا کہ تم میرے اتنا قریب ہو۔''

پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے گالوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب یہاں تمہارے شہر آرہا تھا تو دل بہت گرفتہ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ جس دیس میں اپنا کوئی ہے نہیں تو وہاں میری منزلیں کیوں لکھی ہیں۔ لیکن جب تم کو پہلی بار دیکھا تو وجہ سمجھ میں آگئی کہ قدرت کیوں مجھے یہاں کھینچ لائی ہے، پھر گھر ملا تو تمہاری گلی میں، اوپر والا ہمیشہ مجھ پر بہت مہربان رہا ہے مگر آج تو اس نے مجھے نواز ہی دیا۔''

میری باتوں کے دوران ہی وہ بڑے قرینے سے کھسک کر قریب ہوگئی۔ میں نے جب اسے اپنی بانہوں میں لیا تو اس نے کوئی مداخلت نہ کی۔ محبت کا ایک الاؤ اس کے روئے روشن پر چمکنے لگا۔ وہ میرے اتنا قریب تھی کہ اس کے تنفس کی حدت مجھے جھلسانے لگی مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ اجازتوں کی گلیاں کس موڑ سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں اور ممنوع کی تختیاں کہاں لگ جاتی ہیں۔

وہ خاموش اور پُرسکون تھی جیسی اسے نیند آگئی ہو۔ جیسے آنکھیں بند کیے کسی سہانے سپنے میں کھوئی ہو۔ مجھ سے لپٹی اپنی گرفت مضبوط کرتی جارہی تھی۔

پھر اچانک الگ ہوگئی جیسے کوئی سحر ٹوٹا ہو، جیسے کچھ یاد آگیا ہو، جیسے ڈر گئی ہو۔

پھر اس نے ہمت کی اور میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر میری آنکھوں میں نجانے کیا تلاش کرنے لگی۔ میں کچھ پوچھنے لگا تو انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش کرادیا جیسے کوئی بچے کو پیار سے چپ کراتا ہے۔ وہ فنا ہوجانے والی کیفیت میں تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنا پیار اس میں کہاں سے آگیا۔ وہ اتنی کم عمری میں میرے پیار میں جھلسنے لگی ہے؟ محبت کے شروع کے پیغام اس تک پہنچانے میں، میں نے بڑی شدت دکھائی تھی تاکہ اسے اپنے پیار میں باندھ دوں جو باتیں بعد میں طے ہونی تھیں وہ میں نے پہلے بولوں میں کر ڈالی تھیں۔ اسے اپنے پیار میں باندھ کر میں جیت چکا تھا۔ اس کا میڈل میرے گلے میں آچکا تھا مگر اس کی کون سی جیت ہوئی تھی؟ وہ تو اپنا دل بری طرح سے ہار بیٹھی تھی۔ اب میں خود کو اس کا مجرم تصور کررہا تھا کہ میری وجہ سے اس نے اپنی یہ کیا حالت کردی ہے۔ میں نے اس سے پیار تو کیا تھا مگر تڑپنے کے لیے نہیں بلکہ زندگی کو حسین بنانے کے لیے کیا تھا۔ میں تو چاہت کے معطر جھونکوں سے سیر ہونا چاہتا تھا مگر وہ تو روگی بن بیٹھی تھی۔

وہ جس طرح سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی مجھے لگا کہ سودائی ہوگئی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے چلے جارہے تھے۔ وہ کپکپا رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔ ''کیا ہورہا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک نہیں لگ رہیں؟''

وہ بہتے آنسوؤں کے بیچ بڑے عجیب انداز میں مسکرائی۔ میرے چہرے کو بے چینی سے ٹٹولنے لگی جیسے کوئی نابینا اپنی قیمتی چیز کو ٹٹولتا ہے۔ مجھے اس کی دماغی صحت پر شک ہونے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''مجھے پاگل سمجھ رہے ہو؟''

میں تشویش سے بولا۔ ''یہ تم کو کیا ہورہا ہے، کپکپا کیوں رہی ہو؟''

ایک بے خودی میں وہ بولی۔ ''جس کی پوجا کی جائے اسے باندھ کر تو نہیں رکھا جاسکتا؟''

''رابی یہ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا؟'' میں نے تشویش سے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

جذبات سے اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ وہ رندھے گلے سے بمشکل بولی۔ ''میری ایک بات خاموشی سے بغیر مجھے ٹوکے ایک بار سن لو۔ اپنی ساری ہمت جمع کرکے یہ بات کرنا چاہتی ہوں۔ آج نہ کرسکی تو پھر کبھی نہ کرسکوں گی۔''

میری گود میں سر رکھ کر کہنے لگی۔ ''میری منزل شادی نہیں۔ میں پچھلے کئی دنوں سے یہی سوچ رہی ہوں۔ تمہارا پیار ہی میرے لیے بہت کچھ ہے۔ اسی کو سنبھال لوں یہی بہت ہے۔ تم کو سنبھالنے کے لیے کوئی میری طرح کمزور نہیں بلکہ مضبوط لڑکی چاہیے وہ جو تمہارے اسٹیٹس کی ہو۔ میرا بس چلے تو اپنی سرکار کے لیے میں خود ہی کوئی ڈھونڈ لاؤں۔ ہم غریب لوگ ہیں، میرے والد ایک آڑھت میں منشی ہیں۔ ان کی آمدن سے ہمارا گھر بمشکل چلتا ہے۔ ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے، تمہارا یہ احسان بھی بہت ہے کہ مجھ سے محبت کی ہے۔ تم سے شادی کرکے میں تمہاری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ تم بڑے لوگ ہو اور میری سرکار کی شادی بھی بڑے گھر میں ہونی چاہیے۔ ہم غریبوں سے تمہیں کیا ملے گا سوائے میری محبت کے۔ تم شادی کہیں بھی کرلو میری محبت ویسے ہی ساتھ رہے گی۔ تمہاری رابی تمہارے قابل کہاں۔ یہ سوٹ جو آج اس نے پہنا ہوا ہے۔ وہ بھی کل رات سہیلی سے ایک دن کے لیے لائی ہے۔'' پھر وہ سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر کچھ کہنا چاہا تو لیٹے لیٹے بولی۔ ''ابھی کچھ اور کہنا ہے۔ پلیز تھوڑی دیر اور سن لو۔''

وہ بولی۔ ''تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ میرے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا تو سرخرو ہوجاؤ گے اور میں، میں تو تمہاری یاد سے بندھی کہیں بھی بیٹھی رہوں گی۔ تمہاری خوشی اور زندگی کی دعائیں مانگا کروں گی۔ کسی کی بھی بن کر ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی۔''

وہ دوبارہ سے رونے لگی۔ سسکیوں سے اس کے سر پر رکھا دوپٹا کھسک کر نیچے جا گرا۔ اس کے سیاہ گھنے بال اور

بالوں کو بل دے کر بنائی چوٹی اس کی پیٹھ پر تھپکیاں دینے لگی۔ اس کا میرے لیے ایثار دیکھ کر میں خود آبدیدہ ہو گیا تھا۔

میں نے دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ مجھ سے ایسے لگی جیسے کسی پناہ میں آ گئی ہو۔ جیسے کوئی کشتی تند و تیز طوفانوں کے گرداب سے بچ کر کھلے اور پُرسکون پانیوں میں آ جائے۔ طوفان سے بچ کر آنے والے جس طرح بے سدھ لیٹ کر رب کا شکر ادا کرتے ہیں ایسے ہی نڈھال رانی سستا رہی تھی۔ میں اس سے کہہ رہا تھا۔ "یہ مت کہا کرو تم میرے قابل نہیں۔ میرا اسٹیٹس بڑا ہے۔ میں خود بڑے کنبے میں پلا بڑھا ہوں۔ والد صاحب گھر کی کفالت کرتے تھے۔ کھیلتے کودتے پڑھ لکھ کر کوئی ڈگری لے لی۔ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ تم کہاں پلی بڑھی ہو۔ تم امیر گھر میں بھی ہوتی یا کہیں بھی ہوتی میرے لیے اتنی ہی اہم ہوتی جتنی ابھی ہو۔ اپنی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے کا گناہ میں نہیں کر سکتا۔ اب آیندہ سے مجھے یہ مت کہنا کہ میں تمہارے قابل نہیں۔ مجھے دکھی کر دو گی۔"

وہ بولی تھی۔ "میں صرف یہ چاہتی ہوں تم خوش رہو اور یہی میری خوشی ہے۔" پھر میری گود میں سر دوبارہ رکھ کر بولی۔

"بتاؤ کتنا تم سے پیار کروں کہ میرے ساتھ تم خوش رہو۔ میری سب ہنسی لے لو، سارے سجدے اور ساری عبادتیں لے لو۔ میری اگلی پچھلی ساری دعائیں لے لو۔ جو اب تک نہیں دیکھے وہ سارے خواب لے لو۔ جو خوشی میں نکلے تھے وہ آنسو لے لو۔ اس کے عوض صرف اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے دل میں کہیں بیٹھ کر تم پر دعائے حفظ و امان پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہوں۔"

اس دن میں نے اسے واپسی پر شہر میں ڈراپ کیا اور خود شاہد کو بائیک لوٹا کر تھکا ہوا کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

اس دن کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ کتابیں، افسانے کہانیاں نہ صرف اچھی سوچ دیتی ہیں بلکہ باتوں کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں۔ ایسی پیاری دل موہ لینے والی باتیں، خوبصورت جملے عام لڑکیاں کب کر سکتی ہیں۔ ایسی لڑکی کو کھو دینا عقلمندی نہیں تھی۔ اگلے ہی ہفتے اس کی بات ایک دوسری فیکٹری میں کرا دی۔ ایک جاننے والے سے بات کر کے آفس کی جاب دلا دی۔ اس کی تعلیم انٹر تھی مگر پھر بھی محنت سے کام کرتی تھی کہ مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔ وہ ایک دو ہفتے بعد کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے مجھ سے مل لیتی۔ ہم اکثر دریا کنارے اسی پارک میں بیٹھے رہتے۔ کبھی کوئی فلم اکٹھے دیکھ لی، کبھی کسی اچھے ریسٹورنٹ میں اسے کھانا کھلانے لے جاتا۔ اسے تحفے دلانے کی کوشش کرتا مگر وہ انکار کر دیتی، اچھے کپڑے خریدنے کا کہتا تو کہتی۔ "ابھی نہیں جب شادی ہو جائے گی تو لڑ کر لوں گی۔" میری اپنی جاب بھی جاری تھی اور اسے بھی وقت دیتا تھا۔

دس ماہ گزر گئے اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اسی دوران شاہد اور جعفر مجھے کہتے رہے کہ اس لڑکی سے پیچھا چھڑوا لو۔ وہ لگاتار میرے پیچھے لگے رہے تھے۔

ایک بار شاہد کی باتوں سے تنگ آ کر میں نے اس سے کہا تھا۔ "میں اس سے پیار کرتا ہوں اور وہ مجھ سے، مجھے اپنے علاوہ اس کی فکر ہے کہ اسے چھوڑ دیا تو اسے بہت دکھ ہو گا۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا، اگر اسے تم سے بہتر مل گیا تو تمہیں پہلی فرصت میں بھول جائے گی۔ اگر نہ ملا تو یاد کر کے تمہیں کوسے گی۔ محبت کچھ نہیں ہوتی ہر ایک کا اپنا اپنا مطلب ہوتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی طلب ہوتی ہے۔ تمہاری طلب ایک خوب صورت لڑکی تھی جس سے تم پیار کی باتیں کر کے رات کو رومینٹک گانے سنا کرو۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے کوئی ہینڈسم، پڑھا لکھا اور برسر روزگار جوان لڑکا مل جائے۔ جب بھی تمہیں اس سے کوئی دوسری خوب صورت لڑکی مل گئی یا اسے نصیب سے کوئی اور اچھا لڑکا مل گیا تو پھر آخری خط لکھ کر اپنی مجبوریوں کی داستانیں لکھے گی۔"

میں نے قائل ہونے سے بچنے کے لیے دوسرا نکتہ پیش کیا تھا۔ "اس کی باتوں سے کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ میری جاب سے متاثر ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ سے، میرے پیار میں ڈوب کر باتیں کی ہیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا، نہ اس نے کوئی تحفہ لیا اور نہ کوئی چیز، اس میں لالچ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ بہت دیر ہنستا رہا پھر بولا۔ "آج کل کے لوگ شیخ چلی دور کے نہیں کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کر ڈالیں۔" پھر آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ "میں بتاؤں میرے شہزادے اس سے کیا باتیں ہوتی ہوں گی جس سے تم بہت متاثر ہوئے ہو۔" میں خاموش رہا تو خود بولنے لگا تھا۔ "یہی باتیں ہوئی ہوں گی۔ تم نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔ میرے

رات دن تمہاری یاد میں گزرتے ہیں۔ تم پردیسی ہو اور چلے جاؤ گے میں آپ کے قابل نہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں اور اپنے جیسی لڑکی آپ کو مل جائے گی۔ مجھے تو آپ کی خوشی چاہیے۔'' اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ کہتا رہا۔ میں شاہد کی باتوں پر خاموش بیٹھا رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''پیار کے یہ سبق محبت کی ہر کتاب میں لکھے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا کیا پڑھ کر تم محبت کرنے یہاں آگئے۔ پہلے زندگی اور محبت کی کتابیں پڑھتے، یاد کرتے اور تب گھر سے نکلتے۔ میرے پینڈو شہزادے۔'' پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''کبھی بھی وہ تمہیں اپنے گھر بلوا سکتی ہے کہ امی جان کھانے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اب تم پر دباؤ ڈالنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ ایک نقطہ ذہن میں بٹھالو کہ شادی کی ہامی ان کے سامنے کبھی نہیں بھرنی۔''

ایک دن کہنے لگا۔ ''شہزادے شادی وہاں کرنا جہاں گھر والے چاہتے ہوں۔ یہ پیار وغیرہ جہاں چاہو اپنی مرضی سے کرتے رہو جو لڑکی جھوٹ بول کر تمہارے ساتھ باہر گھوم سکتی ہے وہ کیسے قابل اعتبار ہوسکتی ہے؟''

پھر جب آتا تو جعفر بھی اسی قسم کی باتیں کرتا۔ ہر بار یہی کہتا کہ کیوں اسے اپنے ساتھ نتھی کر رکھا ہے۔ بہت عرصہ ہوگیا اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے۔ اب ٹھینگا دکھا کر چلتا کرو۔ کبھی یہ کہتا کہ تم چھوٹے علاقوں سے آئے پڑھے لکھے لڑکے جاب ملتے ہی پہلا کام عشق میں ڈوب جانے کا کرتے ہو۔ پھر لڑکی کے گھر والے لڑکے پر اخلاقی دباؤ ڈال کر اسے بڑھاتے جاتے ہیں اور آخر ایک دن دونوں کا نکاح انجام پا جاتا ہے۔''

انہی دنوں میں خود کو بدل رہا تھا کیونکہ اس کی محبت فزوں تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کی دیوانگی بڑھتی جارہی تھی۔ ہر بار ایک ہی قسم کی جذباتی باتیں سن کر میں اب اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس پر سونے کا سہاگا شاہد کی نصیحتیں اور مجھ پر کم عقل ہونے کا الزام مجھے سوچنے پر مجبور کررہا تھا کہ میں غلطی کر بیٹھا ہوں۔

اس کا چہرہ گو وہی تھا، وہی اداس اور سوئی سوئی گہری آنکھیں، وہی خوب صورت ہاتھ اور وہی وارفتگی مگر مجھ میں وہ ہلچل پیدا نہ ہوتی جو شروع میں ہوا کرتی تھی۔ پھر میری جاب اور کیریئر کے حالات کے علاوہ کوئی اور نیا موڑ بھی میری زندگی میں آنے لگا۔

میری جاب کو ایک سال ہونے والا تھا۔ کمپنی نے مجھے اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ پر ترقی کے علاوہ نئی گاڑی کا وعدہ کیا۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا بریک تھرو تھا، اس عمر میں اور جاب کے ایک سال کے اندر اتنی بڑی آفر آج تک کسی اور کو نہ ہوئی تھی۔ اپنی پروڈکٹ کے فارمولے میں کچھ میکینکی تبدیلیاں کر کے میں نے کمپنی کو بڑے اور مستقل نقصان سے نجات دلا دی تھی۔ جس نے مجھے ادارے میں اہمیت کا حامل بنادیا تھا۔

کمپنی نے مجھے شہر کے پوش علاقے میں گھر کرائے پر لینے کے لیے میرا ہاؤس رینٹ بڑھانے کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔ یہ سب میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ اس علاقے میں جہاں میں رہ رہا تھا وہاں گاڑی رکھنا دشوار تھا کیونکہ سب اوسط درجے کے لوگ رہتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اب کمپنی بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں اس علاقے میں رہوں۔ لہٰذا میں نے بروکر کے ذریعے اچھے گھر کی تلاش شروع کردی تھی۔

انہی دنوں یونیورسٹی کے طالب علم اپرنٹس شپ کے لیے ہماری فیکٹری میں آئے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ اسی میں فوزیہ بھی تھی۔ خوش شکل، پڑھے لکھے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لباس ہر روز نیا ہوتا اور اس کو فیشن کے نئے تقاضے نبھانے کے فن بھی خوب آتے تھے۔ سادہ لباس والی رابی مجھے جدید لباس میں ملبوس فوزیہ کے مقابلے میں بجھی بجھی لگنے لگی۔ وہ اداس اور سوئی سوئی آنکھیں جو کبھی جان نکال دیا کرتی تھیں ان سے جان چھڑانے کے جواز خود سے پیدا کرنے لگا۔ میرا کام شاہد اور جعفر نے پہلے ہی سے آسان کر رکھا تھا اور اب فوزیہ نے آکر لکیر کھینچ ڈالی۔

فوزیہ میرے ڈپارٹمنٹ میں اپرنٹس کے لیے آئی تھی۔ اس نے اچانک اس طرح مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیا جیسے رابی نے کیا تھا۔ میں نے اپنے دل سے رابی کو مکمل نہ نکالا تھا بلکہ کچھ گنجائش پیدا کر کے فوزیہ کو بھی وہیں بٹھا دیا۔ میرے اسٹیٹس نے جمپ لگانے سے پہلے فوزیہ کو اپنی جانب راغب کرلیا تھا۔ ایک دو بار ان کے گھر کھانے پر اس کے والدین نے مدعو کیا تو مجھے ان کا ڈرائیور لینے آیا تھا۔ ان کا گھر اتنا بڑا اور شاندار تھا کہ میں بہت زیادہ مرعوب ہو گیا۔ گھر میں کئی کمرے چمکتے فرش، قیمتی قالین، بڑا ڈرائنگ روم، بارہ بندوں کی قیمتی ڈائننگ ٹیبل کے علاوہ ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ گھر میں تین تو صرف گاڑیاں تھیں۔

غرض یہ سب ہونے کے بعد میں اپنی حیثیت بھول کر اور رابی کی محبت یاد کر کے فوزیہ کے عشق میں بری طرح سے گرفتار ہو گیا۔ ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہو گیا کہ خود مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرف جانا ہے۔

اس دوران میں نے رابی کو کوئی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ اس سے دور ہو گیا ہوں کیونکہ مجھے ایسا تاثر دیتے ہوئے بہت زیادہ ہمت کی ضرورت تھی جو مجھ میں نہ تھی۔ میری ممکنہ ترقی پر وہ بہت خوش تھی کیونکہ وہ کہتی کہ دن رات میرے لیے دعائیں کرتی ہے۔

ایک بار اس نے بہت ضد کی تو میں اسے دریا کنارے میں اسی پارک میں لے آیا جہاں اسے پہلی بار لے گیا تھا۔ سامنے دریا کی لہریں سرشاری سے نہیں بلکہ خاموشی سے ایسے بہہ رہی تھیں جیسے کوئی تھکا مسافر جاتا ہے۔ کشتیاں وہی تھیں مگر اب دریا کنارے اداس کھڑی تھیں۔ نہ سورج میں کوئی رنگ تھے نہ زندگی میں کوئی خوشبو۔ رابی نے وہی کپڑے پہنے تھے جو وہ اکثر پہن کر آیا کرتی تھی۔ وہی آسمان جو پہلے رابی کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اب کھر درا نظر آتا تھا۔ فضا بوجھل تھی، سانس لینا بوجھل تھا کیونکہ اس کا قرب میرے لیے بوجھل تھا۔ میری جانب دیکھتی تو زبردستی مسکرانا پڑتا۔ گویا سب موسم دل کے اندر ہوتے ہیں۔

وہ میرے سینے سے پیٹھ لگائے اپنی ٹانگیں لمبی کیے بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''سرکار خاموش کیوں ہیں؟''

میں نے بات بنائی۔ ''یہ گھر والے بہت یاد آرہے ہیں سوچتا ہوں ان سے جا کر مل آؤں۔''

مڑ کر میری گالوں کی چٹکی لیتے ہوئے وہ بولی۔ ''اچھا ہے ناں جا کر مل بھی آئیں اور شادی کی بات بھی کر لیں۔''

شادی کے بار بار ذکر پر اب میں زچ ہو جاتا تھا مگر لہجے کو نرم رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں بات تو کرنی ہے بس موقع ہی دیکھ رہا ہوں۔'' پھر دل پر جبر کر کے اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے کان میں کہا۔ ''تمہیں جلدی ہے کیا؟''

وہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ''کہا تھا ناں آپ نے کہ گھر والے قبول کر لیں گے مجھے ویسے اگر نہ بھی کیا تو کوئی بات نہیں۔ ان کی اتنی خدمت کروں گی کہ وہ مان جائیں گے اور خود آپ سے میری تعریفیں کیا کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ اسے کیسے بتاتا کہ اب مجھے کوئی اور اچھی لگنے لگی ہے۔

ہم وہاں سے اٹھنے لگے تو وہ بولی۔ ''امی ملنا چاہتی ہیں آپ سے۔ میرے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکے کے گھر والے آئے تھے۔ کہتے تھے کہ ہمیں چاند سی بہو چاہیے۔ منحوسوں نے مجھے پسند کر لیا۔ اسی وجہ سے امی کو آپ کا بتانا پڑا۔'' اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں آؤں گا یا نہیں، بس بڑے اعتماد سے بولی۔ ''جب آنا تو ذرا بن ٹھن کر آنا۔ آخر رابی نے بھی دنیا کو منہ دکھانا ہے۔'' میں اسے اعتماد کی اس بلندی تک لا چکا تھا کہ اسے یقین تھا کہ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔

ایک دن میں اور جعفر گھر پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔ جعفر گیٹ پر گیا اور جب لوٹا تو رابی کا بھائی ہمراہ تھا۔ اس کا بھائی کہہ رہا تھا۔ ''نوید بھائی! امی کل رات آپ کو گھر کھانے پر بلا رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

جعفر نے سنا تو چہک کر بولا۔ ''کیوں نہیں نوید صاحب بھی آئیں گے اور میں بھی۔'' پھر اس کے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ''نوید صاحب بڑے افسر ہیں۔ دعوت ان کی شان کے مطابق ہونی چاہیے۔''

مجھے جعفر کی زبان درازی اور چرب زبانی سے پہلے ہی چڑ تھی۔ وہ جب بولنے پر آتا تو بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس کی یہ بات مجھے سخت ناپسند تھی اسی وجہ سے مجھے غصہ آگیا۔ ''اپنی زبان کو قابو میں رکھا کرو۔ پہلے دیکھ لیا کرو کس وقت کون سی بات کرنی ہے۔''

جیسے ہی وہ باہر نکلا جعفر ڈھیٹ پنے سے بولا۔ ''مفت کا مال ہے تو ہم عیاشی کیوں نہ کریں؟''

''اپنی منطق اپنے ہی پاس رکھو، میں نے سوچ لیا ہے کہ رابی سے شادی نہیں کروں گا۔ اسی وجہ سے مجھے اس کے گھر جانا اس کی دعوت قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی ہے۔''

میری اس بات پر جعفر ایسے خوش ہوا تھا جیسے اس کی دلی مراد بر آئی ہو، وہ خوشی سے شاد لہجے میں بولا۔ ''ایسی گلی محلے میں پھرتی لڑکیوں سے تمہاری جوڑی بنتی بھی نہیں، تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ اب آگے میں خود سنبھال لوں گا۔'' پھر مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اسے گھر لانے کی تمہاری قسم بھی پوری کروں گا۔ بس دیکھتے جاؤ۔''

اگلی شام نہ چاہتے ہوئے بھی میں جعفر کے ہمراہ ان کے گھر پہنچ گیا۔ ڈیوڑھی میں اس کے بھائی نے ہمیں خوش

آمدید کہا۔ صحن سے گزار کر اندر برآمدے میں لے گیا۔
چھوٹا سا گھر تھا۔ صحن کے ایک کونے میں پانی کا ڈرم رکھا تھا۔ ساتھ چوکی اور صابن پڑا تھا۔ تار پر وہیں نیا تولیا لٹکا تھا۔ صحن کو خوب رگڑ رگڑ کر دھویا گیا تھا۔ پاس ایک چھوٹا سا کچن تھا جس میں خوب گہما گہمی تھی، کئی دیگچے چولہے پر چڑھے تھے جن میں شاید صبح ہی سے کھانے تیار کیے جا رہے تھے۔ کچن میں کاؤنٹر پر نئی پلیٹیں اوپر نیچے رکھی تھیں۔
وہ دو کمروں کا گھر تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا جس میں بچھے صوفوں پر ہمیں بڑی عزت و توقیر سے بٹھایا گیا۔ صوفوں پر نئی چادریں بچھی تھیں کہ ان کی بوسیدگی چھپ جائے۔ برآمدے میں دیوار کے ساتھ میز پر اوپر نیچے غلاف چڑھے لوہے کے ٹرنک رکھے تھے۔ غرض انہوں نے گھر کو اپنے طور پر خوب بدلا تھا۔
میں صوفے پر بیٹھا دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ ان غریب لوگوں نے میرے لیے کتنا اہتمام کر رکھا ہے۔ گھر والے سب میرے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے۔ رابی کی امی مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اس کے بہن بھائی نئے نکور بنے گھوم رہے تھے۔ بہنیں رابی کو کہنیاں مار کر چھیڑتی تھیں۔ وہ بہن بھائیوں کو اشاروں کنایوں سے احکامات دیتی تھی۔ پھر کن انکھیوں سے میری جانب دیکھ کر مسکرا دیتی۔
وہ اس رات بہت حسین لگ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے کڑھائی والا نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس پر خوب جچ رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر اسے نہیں دیکھتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے نظر بھر کر ایک بار دیکھا تو نظریں نہ ہٹا پاؤں گا۔ اس کی خوب صورتی میں اس شب سب سے دلکش چیز اس کی آنکھوں تھیں جن میں میرے لیے پیار تھا۔
وہ آخری شب تھی جب اسے میں نے خوش دیکھا تھا۔ پھر اس شب کی تاریکی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔
اس کی ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ''ماشاء اللہ ترقی ہونے والی ہے۔ گاڑی بھی مل جائے گی۔ تنخواہ بھی اچھی ہو جائے گی۔''
میں نے دل میں سوچا کہ ان کی نظر میری گاڑی اور تنخواہ پر ہے۔ مجھے برا محسوس ہوا۔
رابی ماں کی یہ بات سن کر تڑپ اٹھی ماں سے بولی۔ ''اماں جی بس کریں۔ یہ کیا پوچھ رہی ہیں۔ یہ کیا سوچیں گے۔''
ماں جی پرانے وقت کی تھیں۔ سادگی سے بولیں۔ ''رابی! میں نے کون سا غلط پوچھ لیا ہے۔ دعائیں ہی تو دے رہی ہوں۔''
جعفر بول پڑا۔ ''اللہ کے کرم سے بڑے افسر ہیں۔ ایک سال میں اتنی ترقی ہوگئی۔ اب یہ محلہ ان کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ جلد یہاں سے کسی امیر علاقے میں چلے جائیں گے۔''
رابی یہ سن کر ایکدم سکتے میں آگئی۔ اسے میں نے اپنا یہاں سے شفٹ ہونے کا نہیں بتایا تھا۔ اس نے میری جانب دیکھا تو میں نے سر جھکا لیا۔
ماں جی بہت کچھ پوچھتی رہیں اور میں گول مول جواب دیتا رہا۔ میرا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ ہر سوال کا دو لفظوں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ میرے ماتھے کی شکنوں سے رابی کو صاف محسوس ہوگیا تھا کہ اس کی ماں کے پوچھے گئے سوالوں کا میں جواب نہیں دینا چاہتا۔ اس نے شاید بھانپ لیا تھا کہ میں فرار کی راہیں ڈھونڈ رہا ہوں جبھی تو اس کے چہرے پر جلتے قمقمے بجھ گئے تھے۔ کوئی سانولا بادل اس کے چہرے پر لہرانے لگا۔
کھانوں کی اتنی اقسام تھیں کہ جعفر ٹوٹ پڑا۔ میں نے اپنے لیے بہت کم لیا۔ ماں جی کے اصرار پر بھی نہ لیا۔ وہ کہتی رہیں کہ یہ رابی نے بنایا ہے۔ وہ رابی نے بنایا ہے مگر میں نے کسی چیز کو چھوا بھی نہیں۔ رابی جیسے ساکت ہوگئی تھی۔ میرا سرد رویہ اس کے لیے اندوہناک تھا۔ وہ شکستہ ہوئی اور جیسے ٹوٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ لڑکی تھی تو نازک بھی تھی۔ نازک تھی جبھی حساس تھی اور اس لیے میرے اندر کی تبدیلی کو بھانپ گئی تھی۔ میرا بدلہ رویہ اسے وقتی نہیں بلکہ دائمی لگا۔
کھانے کے بعد جعفر نے صوفے پر پڑی اجلی سفید چادر سے اپنے ہاتھ صاف کیے تو میں نے دیکھا کہ چادر کے نشانات رابی کے چہرے پر پڑے ہیں ایسی کملایا، مرجھایا اور بکھرا چہرہ جو رابی کا کبھی نہ ہوتا تھا مگر آج وہ رابی کا تھا۔
جعفر ماں جی سے کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی اگلے ویک اینڈ پر یہاں آرہی ہے۔ آپ لوگوں کی دعوت کرنا چاہتی ہے۔ آپ لوگوں نے ضرور آنا ہے تو ماں جی نے کہا۔ ''بیٹا میرے تو جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ میری بیٹیاں آجائیں گی۔''
''رابی ماں کو اشارے کر کے انکار کرنے کا کہتی رہی مگر ماں جی نے اس کے اشاروں کو نہیں دیکھا۔ جعفر نے ماں جی

کی بات سن کر دعوت پکی کر دی۔
اس شب واپسی کے لیے میں اٹھا تو ایک نظر رابی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ کملا گیا تھا جیسے یقین ٹوٹا ہو اور کرچیاں اس کی آنکھوں میں چبھ گئی ہوں۔ وہ گھائل نظر آرہی تھی جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹا ہے اس کا دل ٹوٹا تھا کہ اس میں رکھا میرا وعدہ؟"

میں خود بوجھل دل لیے واپس آیا تھا اتنا نہیں جتنا ہونا چاہیے تھا کیونکہ رابی پر فوزیہ کا سحر غالب آرہا تھا۔
پورا ہفتہ میں نے نہ رابی سے رابطہ کیا اور نہ اس نے مجھ سے۔ اگر وہ میرے اسٹیٹس کی بھوکی ہوتی تو مجھ سے محبت کی بھیک مانگتی۔ اسے یہ ادراک تھا کہ محبت جیت کی طرح گلے میں ڈالی جاتی ہے۔ بھیک کی طرح یہ جھولی میں نہیں پڑتی۔

میں ایک پوش علاقے میں کرائے کا گھر پسند کر کے آرہا تھا کہ وہ مجھے اسٹاپ پر کھڑی ملی۔ اسے اپنے آس پاس کا ہوش بھی نہ تھا۔ وہ اپنے دکھ اپنے دامن میں بھرے بوجھل بوجھل کھڑی تھی۔ وہ چند دنوں میں بہت بدل گئی تھی۔ جیسے کچے رنگ کی قمیص کو دھونے سے وہ بدرنگ ہو جائے۔ ہونٹ سیاہ اور رخسار زرد تھے۔ دل پر زخم کھا کے وہ کتنی دور نظر آنے لگی تھی۔ کتنی اجنبی نظر آرہی تھی۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کبھی میں اس کا کچھ تھا ہی نہیں۔ اس نے اپنے گھر دعوت پر مجھے عزت سے بلایا تھا مگر میں اس کا دل روند کر چلا آیا تھا۔
آج پچیس سال بعد میں یہ سوچتا ہوں کہ میں بھی کتنا خود غرض اور بے پرواہ تھا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بھول جاتا ہوں۔ پہلی بار اسے دیکھا تو اپنا دل بھول آیا۔ آخری بار اسے دیکھنے گیا تو اسے بھول آیا۔ میری کم عمری، میری بے وفائی، میری سنگ دلی اسے لے ڈوبیں۔ اس کے ساتھ جو برتاؤ میں نے کیا وہ میری اذیت کا سبب بن گیا۔ وہ ایسی فطرت کی لڑکیوں میں تھی جو جب بھی کسی کی ہوتیں تو سدا اسی کی رہیں۔ میں اس سے نظریں کترا کر نکل گیا تھا۔ یہ بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ کیا کیا کیفیتیں اس کے چہرے پر اتر رہی ہیں۔ میں نے دل میں یہ سوچا تھا کہ بیس پچیس دن بعد یہ محلہ چھوڑ جاؤں گا اور پھر ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔
کچھ دن بعد جعفر کی بیوی آئی تو ساتھ چھوٹی بہن کو بھی لائی۔ جعفر اپنی سالی کی تعریف میں رطب اللسان کہ وہ بہت سگھڑ ہے۔ بہت اچھے مزاج کی ہے۔

دعوت کے روز شام کو جعفر انہیں لینے خود گیا۔ رابی کو دیکھا تو میرے دل پر گھونسا پڑا۔ اس لڑکی نے اپنی کیا حالت بنالی تھی۔ وہ بجھ چکی تھی۔ رنگ زرد سے نیلا پڑ چکا تھا جیسے کسی زہریلی چیز نے کاٹا ہو۔ ہونٹ سیاہ اور سر کے چمک دار بال ایسے کہ رنگ کاٹ سے دھو کر آئی ہو۔
وہ میرے کمرے میں جعفر کی بیوی کے ہمراہ دری پر بہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے سلام کیا تو اس نے گیلی پلکیں اٹھا کر جواب دیا۔ یوں لگا کہ آنسوؤں کی ندیاں چھپائے بیٹھی ہو۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی سادھو دھونی رمائے بیٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں یہ پیغام تھا کہ اذیت دینا تو تمہاری فطرت نہ تھی پر نہ جانے یہ ادا کہاں سے سیکھی۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ لیے بیٹھی تھی۔ میں تو وہ ہاتھ چھوڑ گیا تھا مگر وہ میری گرفت لیے بیٹھی تھی۔
مجھے معلوم نہ تھا کہ جعفر نے راستے میں اسے میرے بارے میں کیا کیا بتایا ہے۔
میں پچھتا رہا تھا کہ اسے گھر پر کیوں بلایا۔ اس لیے کہ اس کے سلگنے کا تماشا دیکھ سکوں۔ اس دن اسے شکستہ کرنے کا مجھے بہت قلق ہوا۔ ایک چھری سیدھی سینے میں اتر گئی۔
وہ دعوت کھانے تو نہ آئی تھی بلکہ مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ محبت کے کیا قرینے ہوتے ہیں۔ پیار کے کیا سلیقے ہوتے ہیں۔

اس نے دعوت میں کچھ نہ کھایا۔ میں نے اس کے گھر کچھ نہ کچھ تو کھایا تھا مگر اس نے صرف دو گھونٹ پانی کے پیے۔ وہ مجھے جتلا رہی تھی کہ رابی غریب ہے مگر خودداری اور عزت میں تم سے کہیں بڑھ کر ہے۔
جعفر اپنی بیوی اور سالی کے ہمراہ اس کی بہن کو اپنا پورشن دکھلانے لے گیا۔ وہ اور میں اب کمرے میں اکیلے تھے۔ اس کی نظروں میں میرے لیے اب بھی پیار تھا۔
مجھ سے اس کا یہ اجڑا اجڑا روپ دیکھا نہ گیا۔ اس کے ٹوٹنے بکھرنے کا عکس چہرے پر صاف نظر آرہا تھا۔ شاید اسی لیے فوزیہ کا عکس دب گیا۔
میں نے اپنی بے بسی کی غلط تاویلیں دینا شروع کر دیں۔ اپنے پیچھے ہٹنے کی جھوٹی وجوہات بتائیں۔ اپنی فرضی مجبوریاں گنوائیں مگر وہ خاموش بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو برف کی طرح سرد تھا۔ اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ میں نے خود چھوڑا تو ڈھلک گیا۔ میرا دل چاہا کہ ایک بار وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو دے مگر مجھے

محسوس ہوا کہ وہ یہ نہ کہہ دے کہ کم ظرف کے آگے رونے سے بندہ بے آبرو ہوتا ہے۔ بے وفا کے کندھے پر سر ٹکانے سے رہ ہمیشہ کے لیے جھک جاتا ہے۔

وہ جانے تک مجھے ٹکٹکی باندھے تکتی رہی تھی۔ آنکھوں میں وہی پیار، فنا ہونے کی آرزو، وارفتگی، دلبری اور مٹ جانے کی تمنا تھی۔

پھر وہ چلی گئی۔ وہ روٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد دوبارہ اس کا چہرہ میں نے کبھی نہ دیکھا۔

دوسرے دن شام کو جب میں فیکٹری سے واپس آیا تو جعفر مسکرا کر بولا۔ ''میری سالی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔ آج تمہارا کمرا اسی نے صاف کیا ہے۔ تمہاری الماری سے سب چیزیں نکال کر دوبارہ لگائیں ہیں۔ سارا وقت تمہارے کمرے میں گزارا۔''

میں طنزیہ ہنس کر بولا۔ ''میرے بھی کیا اعلیٰ نصیب ہیں۔ ایک رابی کو رات واپس بھیج دیا تو دوسری تم صبح کو لے آئے۔''

وہ سر جھکائے شرمندہ کھڑا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ رابی کو کل رات لاتے وقت کیا کچھ غلط سلط میرے بارے میں بتایا ہوگا۔ جعفر کی چالاکی میں سمجھ چکا تھا۔ وہ اپنی سالی کے لیے راستہ صاف کر رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر تو فوزیہ چھا رہی تھی، اس حالت میں اس کی سالی کا جادو کیسے چل سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے بے دھڑک سنا دی تھی۔

رابی کا بھائی کچھ دن بعد آیا کہ باجی بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ ان دنوں بہت مصروف ہوں گھر بھی شفٹ کرنا ہے۔ اگلے دن میں دفتر کے کام سے جانے سے پہلے ملنے ضرور آؤں گا۔

چند دن گزر گئے۔ اگلے ہفتے مجھے اپنے نئے اور خوب صورت گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ ترقی کا لیٹر مجھے کمپنی کی جانب سے مل چکا تھا۔ نئی گاڑی بھی بک ہو چکی تھی مگر میں اداس تھا، کوئی خوشی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی۔ لگتا تھا کہ کچھ میں نے غلط کر دیا ہے۔ کوئی مبارک باد دینے آتا تو بھاری دل سے وصول کرتا۔

رابی سے میل ملاقات بالکل موقوف ہو چکی تھی۔ اب تو اس کا نام بھی ذہن سے محو ہو رہا تھا کیونکہ میرا زیادہ وقت فوزیہ کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ ہر شام ہم کہیں نہ کہیں باہر ضرور ملتے تھے۔ رات کا کھانا اکٹھے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھاتے۔ اس روز بھی ہم لاروش کے نیم تاریک ہال میں بیٹھے تھے کہ مرکزی دروازے سے آٹھ دس لڑکیاں داخل ہوئیں۔ یہ نوجوانوں کی فطرت ہے کہ نسوانی ہنسی سن کر ادھر دیکھتے ضرور ہیں۔ نقرئی گھنٹیوں جیسی آواز کی ہنسی نے مجھے مڑ کر ادھر دیکھنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک ایسا لمحہ تھا جس نے مجھے ساکت کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان لڑکیوں میں رابی بھی تھی جو وہیں سے مڑ گئی تھی۔ شاید اس نے مجھے فوزیہ کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ فوزیہ کا داہنا ہاتھ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ یہ منظر بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ واپس مڑ گئی ہے مگر میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی اور پھر سے فوزیہ کی طرف جھک گیا۔

اگلے دن مجھے ہیڈ آفس جانا تھا وہاں سے ارجنٹ کال آئی تھی۔ صبح کی فلائٹ سے میں کراچی کے لیے چل دیا تاکہ ایک دن وہاں گزار کر واپس آ سکوں۔ ٹریولنگ ایجنٹ نے واپسی کی سیٹ بھی کنفرم کرا دی تھی اس لیے میں دو دن بعد اپنے گھر آ گیا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو دروازے کے قریب ایک لفافہ پڑا دیکھا۔ اٹھا کر نظر ڈالی تو اس پر رابی کا نام لکھا تھا۔

ڈاکیہ ڈال گیا تھا۔ دکھی دل سے وہ خط لیے کمرے میں آیا۔ اسے کھول کر پڑھنے والا ہی تھا کہ باہر بیل ہوئی۔ گیٹ کھولا تو رابی کا بھائی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے بہت دیر تک روتا رہا ہو۔ اس کی پریشان حالت دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ سب ٹھیک ہے ناں؟''

وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بھائی جان! رابی آپا مر گئی ہے۔''

ایک برچھی تھی جو میرے کلیجے کے پار اتر گئی۔

میرے قدم لڑکھڑائے تو گھر کے گیٹ سے جا لگا۔ میرا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ میں ڈوبنے لگا تو اس کا چھوٹا بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ ''بھائی جان! آپ کو کیا ہو رہا ہے؟''

میں بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔ ''ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟''

بولا۔ ''رات آپا نے ابا کی ساری گولیاں کھا لی تھیں۔ امی نے صبح اٹھایا لیکن وہ نہیں اٹھی۔ وہ مر گئی تھی۔''

میں وہیں گیٹ سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ساتھ میڈیکل اسٹور تھا۔ وہاں سے کوئی میرے لیے پانی لے آیا۔ میں بلندیوں سے پاتال میں آ گرا تھا۔ دماغ میں آندھیاں

چل رہی تھیں۔ سڑک پر چلتے رکشے، موٹر سائیکل اڑ کر میرے گرد گھومنے لگے تھے۔ میرے زمین و آسمان ٹکرا گئے۔ میرے ہونٹوں سے متواتر یہی الفاظ نکل رہے تھے۔ رابی تو مرگئی۔ واقعی تو مرگئی، نہیں تو نہیں مر سکتی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ خواب ہے مگر جب اس کے بھائی کی آنکھوں میں دیکھا تو لگا نہیں یہ سچ ہے۔ وہ مرگئی ہے۔

کچھ لوگ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ بستر پر لٹا دیا۔ لوگ واپس چلے گئے۔ رابی کا بھائی وہیں تھا۔ اس سے پوچھا۔ ''رابی اب کہاں ہے؟''

چھوٹا بچہ تھا معصومیت سے بولا۔ ''آپا قبر میں ہے۔''

میں پتھریلی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ نہ مجھے یقین آرہا تھا اور نہ ہی میں یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ مرگئی ہے۔ شدت غم سے اپنا منہ بازوؤں میں چھپالیا۔ کمرے میں کسی اور کی موجودگی گراں لگ رہی تھی۔ اس کے بھائی کو گھر بھیج دیا۔

اکیلا ہوا تو گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔ میں دوہرے عذاب میں گھر چکا تھا۔ اس کے مرنے کا دکھ اور اپنے پچھتاوٴں کا بوجھ میرے دونوں دکھ ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔

جعفر گھر آیا تو میں بستر پر بیٹھا آنسوؤں کی تسبیح گھماتا رہا۔ پریشان ہو کر پوچھا۔ ''نوید رو کیوں رہے ہو؟''

''تم نے کہا تھا ناں رابی کو ٹھینگا دکھا کر چلتا کرو مگر وہ خود ہی چلی گئی۔''

جب اسے بتایا کہ رابی مرگئی تو بے اختیار اس کے منہ سے یااللہ! یااللہ نکلنے لگا۔ باہر میڈیکل اسٹور سے شاہد کو فون کیا اور اندر آ کر رونے بیٹھ گیا۔

رابی کا خط پڑھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ وہ میں نے اپنی الماری میں بغیر پڑھے رکھ دیا تھا۔

شاہد حواس باختہ پہنچا تو رنگ اس کا فق تھا اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھا اور نظریں چرالیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو رابی کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس سے کیوں گلا ہوتا، یہ دیوار تو خود میں نے اپنوں ہاتھوں سے ڈھائی تھی۔ رابی کی محبت کی تضحیک تو میں نے کی تھی مگر شاہد نے اپنے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر رکھ دیئے۔ روتے ہوئے بولا۔ ''معاف کردے یار! قسم سے سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں مگر یہ مختلف کیوں نکلی؟ یہ وہ نہ تھی جو میں سمجھا تھا۔ یہ وہ نہ تھی یار یہ کوئی اور چیز تھی۔''

شاہد جب یہ کہتا کہ یہ وہ نہ تھی تو میں اپنے آپ سے پوچھتا یہ نہ تھی کا مطلب یہ کہ اب نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میرا کلیجہ چھلنی ہوجاتا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس دن تو وہ نہیں بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ میں اب سمجھا تھا کہ وہ آخری بار دیکھ رہی تھی۔ کاش وہ مجھ سے نفرت کرتی۔ اتنی محبت نہ کرتی تو کبھی نہ مرتی۔

شاہد کہہ رہا تھا۔ ''میں رابی کو عام لڑکی سمجھ بیٹھا تھا جو تمہیں پھنسانے آئی تھی ورنہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ لڑکیوں کے دل نازک ہوتے ہیں۔ کانچ کی طرح۔ ہم ان کو ٹھوکروں پر رکھے ہوتے ہیں۔ انہیں سبز باغ دکھاتے ہیں۔ بڑی بڑی قسمیں اٹھاتے ہیں۔ وعدے کرتے ہیں۔ محبت جتلا کر دشمنی کرتے ہیں جیسے کوئی انتقام لے رہے ہوں۔ کھینچ تان کر انہیں محبت کے جال میں پھنساتے ہیں۔ جب وہ ہماری محبت کا دم بھرنے لگتی ہیں تو پھر انہیں بھٹکی ہوئی لڑکی سمجھنے لگتے ہیں۔ پھر یہی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ پھنس سکتی ہے تو کسی کے ساتھ بھی پھنس سکتی ہے۔ ہماری نظر میں وہ کمزور کردار کی بن جاتی ہے۔''

میں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ شاہد کو بھیج دیا۔ جعفر اپنے کمرے میں جالیٹا۔ میں کمرے میں اندھیرا کر کے لیٹ گیا، وہ رات میری زندگی کی کٹھن ترین رات تھی۔

اس رات تیسرے پہر میرا دل گھبرایا تو باہر چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ وہ بینچ دیکھنے تھا جہاں وہ بیٹھی مسکرا کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ وہ بینچ دیکھ کر دبی دبی سسکیاں میرے حلق سے نکلنے لگیں۔ اسی بینچ پر بیٹھا میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہا تھا۔ اس کی یاد میں گھل رہا تھا۔ رل رہا تھا۔ ماضی کی یادوں نے مجھ پر یلغار کردی تھی۔

میں گزرے ہوئے لمحوں کو ذہن کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا کہ ہم پارک میں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ وہ بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ رہی ہے اور جب علیحدہ ہوتی تو پھر لپٹ جاتی۔ میں اس سے وعدے کرتا تو یہی کہتی کہ وعدے مت کرو، یہ مت کہو کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ بار بار مجھے یقین دلاتی کہ اسے میرا وجود نہیں پیار چاہیے۔ وہ جب بھی یہ کہتی کہ میرے پیار کے سہارے ساری زندگی بتا دے گی تو میں ہنس پڑتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی زیادہ سچی ہے کہ جیسے ہی احساس ہوا کہ میرا پیار بھی ڈھونگ تھا تو پھر جی نہ سکی۔

مجھے چند دنوں پہلے کی بات یاد آرہی تھی جب اس کے گھر دعوت پر گیا تھا۔ نیلے سوٹ میں دلہن لگ رہی تھی۔ کتنی افسردہ ہوگئی تھی جب میں نے اسے بری طرح نظر انداز کیا تھا۔ وہ حیرت اور سکتے کی حالت میں مجھے دیکھتی رہ

گئی تھی۔ میرے گھر میں بیٹھی تھی تو بجھی بجھی، سلگتی اور راکھ ہوتی۔ وہ وقت واپس آجائے کاش۔ میں اسے منالوں۔ معافی مانگ لوں اس کے قدموں میں سر رکھ کر کہوں۔ رابی اپنی سرکار کو ایک بار معاف کردو۔ ایک موقع دے دو مجھے۔

چند دن بعد فیکٹری گیا۔ اس درخت تلے بیٹھ کر میں اور سلیم دونوں روئے۔ سلیم کہتا تھا کہ ماں جی سے جاکر مل لو۔ وہ تم کو بہت یاد کرتی ہیں۔ جاکر ان کے گلے لگ جاؤ۔ شاید تمہیں سکون مل جائے۔

رابی کے گھر جانے سے پہلے میں شیشے میں اپنا گناہ گار چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے سارے نقش بدل گئے تھے۔ میرے گناہوں نے میرا چہرہ گہنا دیا تھا۔ چہرہ اتر چکا تھا۔

میرا چہرہ تو بار بار اترتا رہا تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں اترا۔ پھر اس کی محبت کے سمندر میں ڈوبا اور پھر اس کی نظروں سے اترا۔ آج پچھتاؤں کی دلدلوں میں اترا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میں اپنے آپ پر ہنس پڑا کہ اس سے تعلق توڑنے کے لیے میں کسی خوب صورت موڑ کے انتظار میں تھا۔ واہ رابی کیا خوب صورت موڑ تم نے میرے لیے چنا۔ کس طرح راستے علیحدہ کرلیے۔

رابی کے گھر گیا تو صحن میں ماں جی میرا انتظار کررہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس طرح سے وہ روتی تھیں کہ لگتا تھا گھر کے در و دیوار ماتم کررہے ہوں۔ اس کی بہنیں برآمدے میں دروازے کی دہلیز پر کھڑی رو رہی تھیں۔ مجھے اسی صوفے پر بٹھایا مگر اب کوئی اجلی چادر نہ تھی۔ سامنے وہی کرسی پڑی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ نیلا سوٹ پہنے بیٹھی مجھے تکے جارہی ہے۔ گھر اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ ایک ایک کونا ماتم کدہ تھا۔ ایک برباد گھر جس کی تباہی کا میں اکیلا ذمہ دار تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔ ماں جی بتارہی تھیں۔ ”وہ چند دنوں سے متواتر کہتی چلی آرہی تھی۔ میں نے نوید سے شادی نہیں کرنی۔ وہ بہت دور کا پردیسی ہے۔ مجھے وہ میری ماں سے دور کردے گا۔“

پھر ماں جی مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”تم نے اپنی مجبوریاں اسے بتائی ہوں گی؟“ میں خاموش اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا رہا۔

ماں پھر سے بتانے لگیں۔ ”وہ شروع سے بہت حساس تھی۔ ابھی تو انیس سال کی تھی مگر میرے دکھ بانٹنے لگی تھی۔ خاموش تو شروع سے رہتی تھی مگر پچھلے کئی ماہ سے بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ میں جانتی ہوں بیٹا وہ کیوں خاموش تھی۔ صرف تمہاری وجہ سے وہ ہنسنے لگی تھی۔ پچھلے دنوں کہنے لگی اماں، جہیز کے کپڑوں سے ایک سوٹ اپنے لیے سلوا لوں۔ برا لگتا ہے دوسروں کے کپڑے پہن کر نوید صاحب کے سامنے جانا۔ میں نے کہا چلو سلوا لو تو اس نے نیلا سوٹ سلوایا جو تمہاری دعوت پر اس نے پہنا تھا۔“

یہ سن کر ایکدم میں نے اپنے چہرے پر رکھے ہاتھ ہٹائے۔ ماں جی کو دیکھا اور رو پڑا۔ ماں جی کہے جارہی تھیں۔ ”وہ اپنا سوٹ بار بار مجھے دکھلا رہی تھی مگر میں نے نظر بھر کر اس کی جانب دیکھا بھی نہ تھا۔ میں اٹھ کر زمین پر جا بیٹھا اور ماں جی کے قدم پکڑ کر رونے لگا۔ وہ رابی کی باتیں بتارہی تھیں۔

”اس کا رشتہ آیا تھا۔ اب کہتی تھی ماں اس کے لیے ہاں کردو۔ میں نے تمہارا ذکر کیا تو لڑنے لگی۔ کہتی تھی ان کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ وہ میرے ساتھ شادی تو کرلیں گے مگر ان کی زندگی خراب ہوجائے گی۔ ان کے خاندانی جھگڑے ہیں۔ مجھے ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا، مجھے نوید کے ساتھ شادی نہیں کرنی، آپ بس اس رشتے کے لیے ہاں کردیں۔“

کچھ لمحے رک گئیں۔ بیٹی نے پانی لاکر دیا تو مجھے پلایا اور وہی خود بھی پیا اور بولیں۔ ”میں تو اس رشتے پر خوش تھی مگر مجھے رابی کے دل کا معلوم تھا کہ وہ صرف تمہارے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ جس لڑکے کا رشتہ آیا تھا وہ امریکا میں رہتا ہے۔ لڑکے کی بہن کی شادی پر رابی بھی تھی۔ لڑکے نے شادی کے فوٹو دیکھے تو رابی کو پسند کرلیا۔ اس کے گھر والے منتیں کررہے تھے۔ سب لوگ مجھے کہتے تھے کہ لڑکا امریکا میں ہے خوب صورت ہے، پڑھا لکھا ہے۔ وہیں سے ڈگری لی ہے۔ پہلے تو رابی اس کے نام سے بگڑتی تھی مگر اب کہتی ہاں کردو۔“

میں حیرت سے بیٹھا یہ سب سن رہا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ مجھ سے شادی کی لالچ میں مجھے اپنی اداؤں سے پھنسا رہی ہے مگر وہ تو اتنے اچھے رشتے سے میرے لیے انکار کررہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں زندہ اس میں دفن ہوجاؤں۔ میں ماں کا چہرہ دیکھ کر روتا رہا۔ ماں کہتی رہیں۔

”بیٹا تم روؤ مت، اس کی روح کو تکلیف ہوگی۔ میں نے تمہیں اس لیے گھر بلایا تھا کہ رابی اس رشتے کے لیے ہاں کہنے پر مجھ پر زور دے رہی تھی تم سے مشورہ کرنا تھا مگر تم خود اتنے مصروف تھے کہ نہ آسکے۔“ ماں جی مجھ کو بتاتی رہیں۔

”بیٹیوں کا چہرہ ماں کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ مائیں ان کا دل ان کے چہرے میں دیکھ لیتی ہیں۔ میں اب تم سے اس لیے

ملنا چاہتی تھی کہ تم میری بیٹی کا پیار ہو۔ وہ تم سے عقیدت رکھتی تھی مگر جب سے تم دعوت سے گئے تھے۔ وہ پھر سے اداس نظر آنے لگی تھی۔ وہ اس رات روتی رہی تھی۔ پھر ہر دن مصلے پر بیٹھی دعا کرتی رہتی۔ بیٹا! ماں ہوں۔ جانتی ہوں۔ وہ تم کو نہیں مانگتی تھی۔ تمہاری زندگی کی دعا مانگتی تھی۔ خوشیوں اور کامیابیوں کی دعا مانگتی تھی۔ اس رات بھی رو رو کر دعا مانگ رہی تھی۔ اذانوں کے وقت اپنے ابا کو نماز کے لیے اٹھایا۔ خود بھی نماز پڑھی اور پھر سو گئی۔ وہ سوئی تو مجھے سکون ملا کہ کچھ دیر تو آرام کرے گی۔ مجھے کیا معلوم کہ ہمیشہ کے لیے سونے جا رہی ہے۔ دن چڑھ گیا تھا۔ اٹھایا تو نہیں اٹھی۔ ضد کر کے سوتی رہی اور سوتے سوتے قبر میں جا اتری۔"

میرے بہتے آنسوؤں سے گھر کا فرش گیلا ہو رہا تھا۔ مرتے مرتے مجھے سرخرو کر گئی۔ ایک حرف بھی میرے خلاف زبان پر نہ لائی تھی۔ میں روتے ہوئے ماں سے بولا۔ "بڑا ظلم کیا ہے رابی نے مجھ پر۔ خود مر گئی اور مجھے پوری زندگی کا روگ لگا گئی۔ مجھے زہر دے دیتی مگر یہ درد اور اذیت نہ دیتی۔ کیسے گزریں گے میرے یہ دن۔ کیسے بیتے گا میرا یہ جوگ۔"

میں نے ماں سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

پوچھا۔ "بیٹا کہاں جا رہے ہو؟"

"معلوم نہیں کہاں جاؤں گا مگر یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔ اس شہر میں رہا تو مر جاؤں گا اور مجھے آپ لوگوں کے لیے ابھی نہیں مرنا۔ بیٹی گئی مگر بیٹا آپ کے سر کا سائبان بنے گا۔"

اسی رات میں اپنے گھر آیا۔ الماری سے رابی کا خط نکالا اور زمین پر آلتی پالتی مارے، وہ خط پڑھنے لگا۔

میری سرکار!

ہمیشہ سلامت رہیں۔ آپ کی رابی اپنی زندگی سرکار کے حوالے کر رہی ہے۔ ہم بہن بھائی بہت مشکل حالات میں پل رہے ہیں۔ ہمیں تو کھانا بھی ڈھنگ کا نہ ملتا تھا تو اتنا پیار کہاں سے ملتا جو آپ نے دیا۔ یہ پیار میرے لیے زندگی کی بہت بڑی نعمت تھی۔ آپ کا پیار اور پھر اس کا اظہار بہت دلکش تھا۔ پھر خبر بھی نہ ہوئی اور اپنا دل آپ کو دے بیٹھی۔ آپ کے پیار میں جدائی کا خدشہ بھی تھا۔ میں آپ سے جدائی برداشت کر لیتی مگر یہ برداشت نہ کر سکی کہ آپ نے مجھ سے کبھی پیار کیا ہی نہیں۔ اگر پیار کرتے تو ہوٹل میں آپ کے ساتھ جو لڑکی بیٹھی تھی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر یوں نہ سہلا رہے ہوتے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آپ پیار نہیں کرتے اور یہ سب ایک کھیل تھا تو میں اسی دن مر گئی تھی۔

رابی آپ کو سب گناہوں پر معاف کرتی ہے۔ دل سے معاف کرتی ہے۔

آپ نے پیار نہیں کیا تو کوئی بات نہیں۔ میں تو آپ سے محبت کرتی ہوں اور مر کر بھی کرتی ہوں گی۔

ایک وعدہ کریں مجھ سے کہ کسی لڑکی سے جھوٹے وعدے نہیں کریں گے۔ کسی ایک کے ہو کر رہیں، سچ کہتی ہوں یہی زندگی ہے یہی بندگی ہے۔

ہمیشہ کے لیے اللہ حافظ

رابی

پھر میں نے جاب چھوڑ دی۔

سب میرے اس فیصلے پر متعجب تھے۔ میں نے استعفیٰ اپنے ڈائریکٹر کو دیا تو اس نے کہا۔ "ایک بار پھر سوچ لو۔"

میں نے کہا کہ اب زندگی بھر فیصلے کر کے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میں نے استعفیٰ رکھا اور ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ماں جی سے ملنے گیا۔ بہت دیر ان کے پاس بیٹھا رہا۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "بیٹا تمہاری آنکھوں میں ابھی تک رابی بیٹھی ہے۔ مجھے نظر آتی ہے۔"

میں نے گھر کا سارا سامان جعفر کے حوالے کر دیا۔ صرف اپنے چند کپڑے اور کچھ کتابیں لے آیا۔ شاہد سے کہا مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑ دو۔ راستے میں اس سے ایک بار پھر قبرستان جانے کا کہا تو اس نے گاڑی قبرستان کی جانب موڑ دی۔ ڈھیروں پھول اس کی قبر پر چڑھائے۔ اس کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ قبر کے کتبے پر لکھا تھا۔

رابعہ کمال۔ عمر 19 سال۔

ٹرین شہر سے باہر نکلی اور میرے وجود میں آندھیاں چلنے لگیں۔ میں اس کی قبر پر اس سے آخری وعدہ کر کے آیا تھا کہ جس لڑکی کی قربت نے اسے مجھ سے بدظن کیا اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا کیونکہ فوزیہ کی محبت ایک چمک تھی جو آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے لیکن رابی کی محبت دائمی ہے۔ ہر پل ساتھ رہے گی۔ تب سے میں ملک ملک آوارہ بادل بنا پھر رہا ہوں۔ کچھ دن ایک ملک میں گزارتا ہوں پھر کسی اور ملک کے لیے چل دیتا ہوں۔ گویا پردیس کی قانونی الجھنوں میں بار بار خود کو پھنسا کر اپنے آپ کو سزا دے رہا ہوں۔ مجھے نہ فوزیہ کی کوئی خبر ہے نہ اپنے گھر والوں کی۔ بس ایک دعا ہے کہ میں وقت آخر تک اسی طرح ہرجائی پن کی سزا خود کو دیتا رہوں۔